من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا
الله عليه فمنهم من قضى نحبه و
منهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا

سیرت
سید احمد شہید

رحمۃ اللہ علیہ

ابو الحسن علی

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ

سیرتِ
سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

یعنی

حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مفصّل سوانحِ حیات، آپکے اصلاحی و تجدیدی کارنامے
اور
غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریکِ جہاد و تنظیم، اصلاح و تجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ

حصّۂ اوّل

ولادت سے بیعتِ امامت تک

از

ابو الحسن علی ندوی
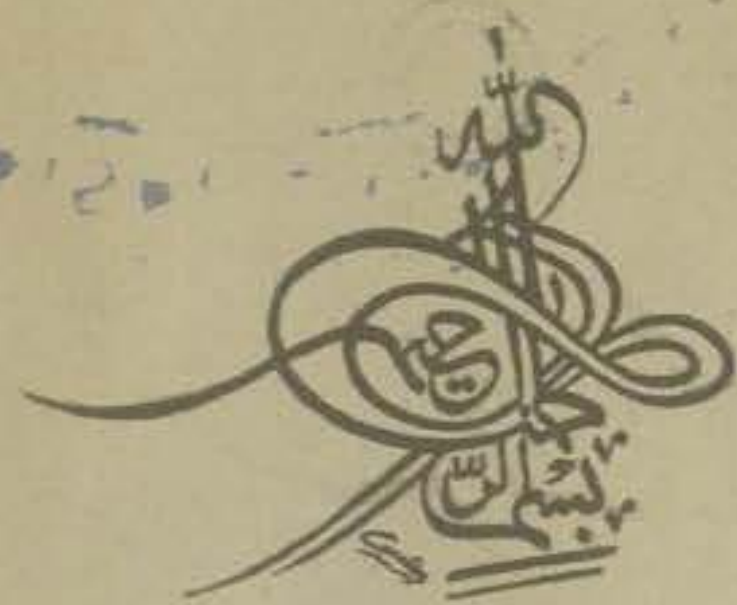
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(سُورۃ الأحزاب : ألاٰية ۲۳)

اُن ایمان والوں میں کُچھ لوگ اَیسے ہَیں کہ اُنھوں نے جس بات کا اللّٰہ سے عَہد کیا تھا، اُسے سچ کر دکھایا۔ پھر اُن میں کُچھ وُہ ہیں جو اپنی نذر پُوری کر چُکے؛ اَور کُچھ وُہ ہیں، جو (شہادت کے) مُشتاق ہَیں اَور اُنھوں نے ذرا سا بھی ردّ و بَدل نہیں کیا۔

(۳۳ : ۲۳)

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

بجلوت اند و کمندے بمہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند

بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہاے کہن را جنازہ بر دوشند

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

دیباچۂ طبعِ چہارم

الحمدُ للہ کہ "سیرۃ سیّد احمد شہیدؒ" کی چوتھی اشاعت کی نوبت آرہی ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۹۳۹ء میں نکلا تھا، اس وقت سے اس وقت تک اصل کتاب میں اتنے اضافے ہوچکے ہیں کہ موجودہ اڈیشن کو بعض حیثیتوں سے مستقل تصنیف کہنا بے جا نہ ہوگا۔

"سیرۃ سیّد احمد شہیدؒ" کی تالیف کا خیال کس طرح پیدا ہُوا، اس کی تالیف کس طرح عمل میں آئی، اس کا پہلا اڈیشن کن حالات میں شائع ہُوا، اس کی تکمیل کا سامان کس طرح فراہم ہُوا، یہ ایک مستقل داستان ہے، جس کا کتاب اور مصنّفِ کتاب سے گہرا تعلق ہے۔ کچھ بے محل نہ ہوگا کہ مختصر طریقے پر یہ داستان بھی سُنا دی جائے۔

راقمِ سطور نے جب ہوش سنبھالا اور عقل و شعور کی آنکھیں کھولیں، تو خاندانی مجلسوں میں سیّد صاحبؒ کا ذکرِ خیر سُنا۔ مجھے بزرگوں کی اُن مجلسوں میں اس سن میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہُوا، جس سن میں بچّے عام طور پر ان مجلسوں میں شرکت کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اس زمانے میں خاندان کے سب سے سن رسیدہ اور باوقار بزرگ مولوی سیّد خلیل الدّین صاحب تھے۔ اُن کے دادا مولوی سیّد سعیدُالدّین صاحب مرحوم سیّد صاحبؒ، رحمۃُ اللہ علیہ، سے بیعت تھے۔ مولوی سیّد سعیدُالدّین صاحب کے بڑے بھائی مولانا سیّد محمّد ظاہر حسنی سیّد صاحبؒ کے خلفا میں سے تھے۔ سیّد خلیل الدّین صاحبؒ نے دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ بڑی عظمت و شغف کے ساتھ سیّد صاحبؒ کا تذکرہ کرتے تھے۔ جہاں تک یاد آتا ہے، سب سے پہلے انھیں مجلسوں میں سیّد صاحبؒ کا نامِ نامی کان میں پڑا۔

سیّد صاحبؒ سے تعارف کرانے میں اور اُن سے عقیدت اور اُن کی عظمت پیدا کرنے

میں سب سے بڑا حصّہ میرے برادرِ معظّم و مُربّی ڈاکٹر مولوی سیّد عبد العلی صاحب، مُدّظلّہٗ، کا ہے، جن کو سیّد صاحبؒ کی ذات سے والہانہ تعلّق ہے۔ ابھی مَیں پڑھ ہی رہا تھا کہ رسالۂ "توحید"، امرتسر، میں، جو مولانا داؤد غزنوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہُوا تھا، مولوی محی الدّین احمد صاحب قصُوری کا ایک سلسلۂ مضامین نکلنا شروع ہُوا، جس کا عنوان غالباً "تیرھویں صدی کا مجدّدِ اعظم" تھا۔

بھائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ اُنھوں نے مجھے اس مضمون کو عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا اَور اس کے لیے مُناسب ہدایات اَور مشورے دیے۔ مَیں نے عربی میں اس کا آزاد ترجمہ اَور تلخیص کی اَور اپنے فاضل اُستاذ ڈاکٹر تقی الدّین الہلالی المراکشی کے مشورے سے علّامہ سیّد رشید رضا مصری کی خدمت میں بھیج دیا۔ علّامۂ موصُوف نے اس کو نہ صرف اپنے رسالے "اَلْمَنَار" میں شائع کیا، بلکہ "ترجمة السيّد الإمام أحمد بن عرفان الشهيد" کے نام سے اس کو علٰحدہ رسالے کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت میری عُمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مَیں اس مقالے کی تحریر کے زمانے میں خُود سیّد صاحبؒ کی عظمت اَور مرتبے سے واقف نہ تھا اَور نہ میرا اس موضُوع پر براہِ راست مطالعہ تھا۔ یہ رسالہ کوئی بڑی علمی قیمت تو نہیں رکھتا، لیکن اس لحاظ سے اہمیّت رکھتا ہے کہ وہ "سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ" کے سلسلۂ تصنیف کی تمہید اور تقریب ہے۔

خاندانِ علمُ اللّٰہی کی جس شاخ سے مجھ ناچیز کا تعلّق ہے، اُس کو حضرت سیّد صاحبؒ سے رُوحانی طریقے پر بہت گہرا اَور مُسلسل تعلّق رہا ہے۔ میرے دِدھیالی اَور ننھیالی بزرگ سیّد صاحبؒ ہی کے سلسلے سے وابستہ اَور اس سلسلے میں صاحبِ اجازت ہُوے ہَیں۔ والدِ ماجد مولانا حکیم سیّد عبد الحیّ قلبی اَور ذہنی طور پر سیّد صاحبؒ کی محبّت میں ڈوبے ہُوے تھے۔ مجھ پر سب سے گہرا اثر ان کی ایک قلمی کتاب "ارمغانِ احباب" کا پڑا۔ یہ اُن کے اُس سفر کا روزنامچہ ہے، جو اُنھوں نے ۱۳۱۲ھ میں کیا تھا۔ اس وقت تک سیّد صاحبؒ کے بعض دیکھنے والے بقیدِ حیات تھے اَور وہ لوگ تو بکثرت تھے، جو سیّد صاحبؒ کے رُفقاء و اصحاب کی صُحبت سے مشرف ہُوے تھے۔ والدِ ماجد نے اُن سے جو کچھ سُنا، بے تکلّف

اور سادے طریقے پر اس کو نقل کر دیا۔ اس سفرنامے میں بڑی حلاوت و سلاست ہے، خاص طور پر جہاں وہ سید صاحبؒ کا تذکرہ کرتے ہیں، وہاں بڑا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل و دماغ پر سید صاحبؒ کی غیر معمولی شخصیت کا سب سے گہرا نقش اسی سفرنامے کے مطالعے سے پڑا اور مجھے ذہنی و ایمانی لذت و حلاوت کا نمایاں طور پر احساس ہوا۔

اس وقت تک سید صاحبؒ کی سیرت و زندگی پر اردو میں صرف دو کتابیں معروف تھیں: ایک "سوانح احمدی"، دوسری "حیاتِ طیبہ"، جو اصلاً مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی سیرت و حیات ہے لیکن جس میں ضمناً سید صاحبؒ کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔ میری بد قسمتی یا اُفتادِ طبع یا زمانے کا اثر تھا کہ میں ان دونوں کتابوں سے متاثر نہ ہوسکا۔ یہ دونوں کتابیں اگرچہ عقیدتمندانہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور آخرالذکر کتاب میں خاصی انشا پردازی بھی ہے، لیکن دل نے ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ ان دونوں کے مقابلے میں خود "سوانح احمدی" کے مصنف مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم کی چھوٹی سی کتاب "تواریخ عجیب"، جو "کالا پانی" کے نام سے معروف ہے، کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ ان دو تین کتابوں کے علاوہ اردو میں کوئی اور کتاب اس موضوع پر اُس وقت دستیاب نہ تھی۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ اصحاب کے معلومات سید صاحبؒ سے متعلق بہت ناقص اور سطحی تھے۔ ان کے متعلق عام تصور یہ تھا کہ وہ پچھلی صدی کے ایک صاحبِ کرامات شیخِ طریقت تھے، جنھوں نے مجاہدین کی ایک جماعت مہیا کر کے رنجیت سنگھ کی سلطنت کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور چند معرکوں کے بعد اپنے مخلص رفیقوں کے ساتھ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوگئے اور اس طرح ان کی مجاہدانہ سعی کا خاتمہ ہوگیا۔ سنجیدہ علمی اور سیاسی حلقوں میں ان کی ذات اور ان کی شخصیت اور کارناموں کا اس سے زیادہ بلند اور واضح تصور پایا نہیں جاتا تھا اور نہ ان کی سیرت و حالات کی تحقیق و جستجو اور تبلیغ و اشاعت کی کوئی سنجیدہ کوشش و تحریک پائی جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کا حافظہ رفتہ رفتہ اس عظیم شخصیت اور اس کے کارناموں کو فراموش کردے گا۔

۱۹۳۵ء میں جب یہ راقمِ سطور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خدمتِ تدریس انجام دیتا

تھا اور اپنے مخلص و فاضل دوست مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ ایک ہی کمرے میں مقیم تھا، اس عزیز و محبوب موضوع پر اکثر گفتگو ہوتی، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم خاندانِ صادق پور کے ذریعے سید صاحبؒ کی ذات سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اپنی عربی تصنیف "حَاضِرُ الهِنْدِ وَغَابِرُهَا" کے سلسلے میں وہ ہندوستان کی اسلامی تحریکوں اور احیائے دین کی کوششوں کے ضمن میں ہندوستان کی اس سب سے بڑی تحریک کا مطالعہ کر چکے تھے۔ انھیں مجلسوں اور مذاکرات میں میرے قلب میں سید صاحبؒ کی سیرت لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ مجھے اس کی سعادت بخشی جائے۔ میری زندگی کا حقیقۃً وہ نہایت ہی مبارک دن تھا، جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا، اس لیے کہ اس سے میری زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۹۳۶ء کی گرمیوں کی تعطیل میں میں اپنے محترم و محسن استاذ مولانا حیدر حسن خاںؒ، شیخ الحدیث و مہتممِ دار العلوم ندوۃ العلما کی دعوت پر ان کی معیت میں ٹونک گیا، جس سے ہمارے خاندان کے ایک صدی کے تعلقات تھے اور جہاں سید صاحبؒ کے اخلاف اور اُن کے خاندان کا ایک بڑا حصہ مقیم تھا۔ اس وقت سید صاحبؒ کی حیات و سیرت کا سب سے بڑا مواد و مسالہ وہیں تھا۔ میں نے وہیں اس کام کا آغاز کیا۔ میں مولانا کے ساتھ دریائے بناس کے کنارے چند روز کے لیے مقیم تھا۔ ایک روز آفتاب نکلنے سے پہلے اس دریا کے کنارے، جہاں کبھی سید صاحبؒ کا قافلہ ٹھیرا تھا اور اُن کے پاکباز مجاہدوں نے اس کے پانی سے بارہا وضو کیا تھا، ایک پتھر پر بیٹھ کر اس سلسلے کا آغاز کیا۔

اس وقت تک میرے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ زمانے کے مذاق اور اسلوب کے مطابق شگفتہ زبان میں ایک مختصر سیرت مرتب کر دی جائے، جو اس گرامی شخصیت اور اس کی عظیم تحریک کے تعارف کا کام دے۔ اس وقت کچھ تو اپنی نو عمری اور تصنیفی ناتجربہ کاری کی وجہ سے،(۱) کچھ اپنی فطری عجلت کی بنا پر اس کی تصنیف کا بہت مختصر و محدود پیمانہ رکھا گیا۔ اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ کتاب

(۱) اس وقت مصنف کی عمر تئیس چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی اور یہ اس کی اوّلین تصنیف تھی۔

وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور مسلمانوں میں مخصوص سیاسی اسباب کی بنا پر سید صاحبؒ کی سیرت کے مطالعے کا ایسا شغف پیدا ہو گیا ہے اور ان میں ایسی تشنگی ہے کہ بڑی سے بڑی ضخیم و مفصل کتاب بھی ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی اور مسلمانوں کا ذوقِ مطالعہ پھر بھی ھَلْ مِنْ مَّزِیْد پکارتا رہے گا

اس وقت ٹونک میں ہمارے خاندان میں، نیز ریاست کے کتب خانے میں، حالات و واقعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود تھا، اور وہ اپنی دسترس میں تھا، کہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک ضخیم اور مکمل سیرت تیار کی جا سکتی تھی، لیکن طبیعت پر کتاب کے جلد شائع کرنے کا تقاضا غالب تھا۔ اس بنا پر اس وسیع ذخیرے کو کھنگالنے کا وقت نہ نکالا جا سکا اور ان کتابوں کے اہم و مختصر اقتباسات پر اکتفا کی گئی۔ ٹونک سے واپسی پر کتاب کی ترتیب و تالیف کا کام جاری رہا۔ اس کی مشغولیت اتنے سرور و سکون کا باعث تھی اور اس میں ایسا حظ و کیف محسوس ہوتا تھا کہ جب اس سے فراغت ہوئی، تو ایک گونہ قلق ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں "سیرۃ سید احمد شہیدؒ" کے نام سے یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے تقریباً چار سو صفحات پر شائع کر دی گئی۔ استادِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ازراہِ شفقت اس پر مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں نو عمر مصنف اور اس کی اولین کوشش کی فراخ دلی اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ ہمت افزائی کی گئی۔

یہ کتاب اپنی تمام کوتاہیوں کے ساتھ پہلی کتاب تھی، جو عصرِ حاضر کے مذاق کے مطابق شائع کی گئی اور اس میں سب سے پہلے سید صاحبؒ کی دعوت و تحریک کے وسیع تر اور بلند تر مقاصد کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور ان کی جماعت اور رفقا کی ایمانی کیفیات، اخلاقی خصوصیات اور ان کی حیرت انگیز تنظیم و جدّ و جہد اور قربانیوں کی رُوداد پیش کی گئی۔ نیز اس میں پہلی مرتبہ یہ دکھایا گیا کہ سید صاحبؒ کا مقصود محض پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کا سدِّ باب کرنا نہ تھا، بلکہ خلافتِ اسلامیہ کا احیا اور حکومت علیٰ منہاجِ النبوّت کا قیام و تاسیس تھا اور ان کی کوشش کا میدان صرف پنجاب کی سکھ حکومت نہ تھی، بلکہ اصل مقصود وہ ہندوستان تھا، جو اس وقت انگریزوں کے اقتدار و تسلط میں آ گیا تھا۔ اس کتاب میں انگریزوں کے خلاف سید صاحبؒ کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور انگریزوں کے ظلم و ستم اور انبالہ جیل اور انڈمان کے مظلومین کے صبر و استقامت کی داستان بھی سنائی گئی تھی۔

اگرچہ اپنی مصروفیت، انتشارِ طبع اور انتشارِ اوقات کی وجہ سے مسلسل اور باطمینان اس کام کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا، پھر بھی بڑا مواد فراہم ہو گیا اور پھر قلب میں اس کی اشاعت کا تقاضا پیدا ہوا۔ کتاب سفرِ حج تک مکمل ہوئی تھی کہ سنہ ۱۹۴۷ء میں سفرِ حج پیش آگیا۔ واپسی پر کتاب کی اشاعت کی کوشش کی گئی۔ اس وقت تک جنگ کے اثرات موجود تھے۔ کاغذ بڑا کمیاب تھا اور اشاعت و طباعت پر بڑی پابندیاں تھیں۔ بڑی کوشش سے سنہ ۱۹۴۹ء میں کتاب کا صرف پہلا حصہ شائع ہو سکا، جو سید صاحبؒ کے سفرِ حج تک کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا۔ دوسرے حصے کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اس وقت تو اپنی اس مجبوری سے بڑی کوفت تھی، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت تھی۔ کتاب اگر اسی وقت شائع ہو جاتی، تو اس میں بڑے نقائص و خلا باقی رہ جاتے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اس کتاب کے سلسلے میں جو آخری تکمیلی کوشش ممکن تھی، وہ کر لی جائے اور کتاب اپنے اندازے اور امکان کے مطابق مکمل صورت میں شائع ہو۔

اس طویل عرصے میں ذہن اور ذوقِ جستجو اپنا کام کرتے رہے اور نیا مواد اور مسالہ برابر ملتا رہا۔ پرانی قلمی تحریریں، یادداشتیں، دستاویزیں اور خطوط ایسی جگہوں سے اور اس طرح ملے کہ یَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵ : ۳) کی ایک تفسیر نظر آئی۔ ان تحریروں، دستاویزوں اور خطوط سے بہت سے واقعات کے سنین اور ان کا زمانہ متعین ہوا، جو پہلے متعین نہیں ہو سکا تھا۔ بعض واقعات کے سنین جو میں نے یا دوسرے مصنفین نے متعین کیے تھے، وہ غلط ثابت ہوئے۔ بعض نئے واقعات و تفصیلات کا علم ہوا۔ "وقائعِ احمدی" سے استفادے اور اقتباس کا کام بھی جاری رہا۔

یہاں تک کہ مواد و معلومات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ "منظورۃ السعداء" کا وہ حصہ، جو مصنف کے چشم دید واقعات و مشاہدات پر مبنی ہے، پہلے نہیں مل سکا تھا۔ اس سے بھی استفادے کا موقع ملا اور اس طرح کتاب پہلی اشاعت کے مقابلے میں سہ چند ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ کی کتاب شائع ہو گئی، جس کا اہلِ ذوق کو اور سب سے بڑھ کر اس راقمِ سطور کو برسوں سے انتظار تھا۔ مہر صاحب پندرہ بیس سال سے اس موضوع پر کام کر رہے تھے۔

تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ پورا علمی تعاون کیا تھا۔ میرے پاس جو کچھ مآخذ و ذرائعِ معلومات تھے، جب کبھی ضرورت پیش آئی، مہر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے میں کبھی تامّل نہیں کیا۔ اسی طرح مہر صاحب نے اپنی علمی تحقیقات و جستجو کے نتائج سے فائدہ پہنچانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ ایک کہنہ مشق اور پختہ کار مصنّف و ادیب ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر سند اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب، جس کے چار حصّے شائع ہو چکے ہیں، توقع کے عین مطابق تھی۔ بلا تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک وہ سیّد صاحبؒ کی سیرت و تاریخ میں سب سے بڑی محقّقانہ اور مورّخانہ تصنیف ہے۔ راقمِ سطور کو اس کتاب سے بڑی قیمتی مدد ملی، بہت سی چیزوں کی طرف اس کتاب سے رہبری ہوئی۔ اس نئے اڈیشن میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مہر صاحب کی کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد بھی "سیرۃِ سیّد احمد شہیدؒ" کی نئی اشاعت کا تقاضا اور اس کی ضرورت کا احساس باقی تھا۔ کسی موضوع پر کوئی تصنیف حرفِ آخر نہیں کہی جا سکتی۔ تحقیق اور جستجو کا کام برابر جاری رہتا ہے اور ہر تصنیف و تحقیق کے بعد اہلِ طلب و اہلِ ہمّت کے کانوں میں یہ صدا آتی رہتی ہے کہ

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مُغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

سیّد صاحبؒ کی سیرت اور ان کے حالات و واقعات کے سلسلے میں جو نیا مواد اور خاندانی تحریروں اور یادداشتوں کا جو نیا ذخیرہ حاصل ہوا، اس سے خود ان معلومات و واقعات کی ترتیب اور سنین کی تعیین میں تغیّر و تبدّل ہوا، جو خود "سیرۃِ سیّد احمد شہیدؒ" کی پہلی اشاعتوں میں اور اب مہر صاحب کی کتاب میں اختیار کی گئی ہے۔

اس اشاعت کا ایک بڑا محرّک یہ ہے کہ سیّد صاحبؒ کے حالات اور تذکرے کے وسیع کتب خانے میں خصوصاً "وقائعِ احمدی" میں واقعات و روایات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، جن میں وہ تاثیر وہ دلآویزی اور وہ طاقت ہے، جو قرنِ اوّل کے بعد کسی تاریخ اور تذکرے میں نہیں ملتی۔ ایمان و یقین کے جذبات و کیفیات پیدا کرنے کے لیے، دینی جماعتوں کی اخلاقی و روحانی تربیت اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ان کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے اور ان سے بہت بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف ایک صدی قبل کے واقعات ہیں اور ہمارے ہی ملک میں پیش آئے ہیں۔ اس لیے زمانے کے بُعد کا عذر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسا مصنّف،

جس پر تاریخی نقطۂ نظر غالب ہے، ان کو نظر انداز کر سکتا ہے یا ان میں اختصار سے کام لے سکتا ہے، لیکن دعوت و تزکیہ کے نقطۂ نظر اور سید صاحبؒ کے اصل مقصد و مدعا کے لحاظ سے یہ واقعات ساری سیرت و تاریخ کا جوہر و روح ہیں۔ اس لیے ان کی بڑی سی بڑی مقدار بھی غیر ضروری اور زائد نہیں کہی جا سکتی۔ ناچیز مصنف نے "وقائع احمدی" میں سے ان مؤثر واقعات کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں انتخاب کیا اور ان کی زبان میں بھی کم سے کم تغیر کیا تاکہ ان کی سادگی و دلآویزی قائم رہے۔ مصنف نے اپنے قارئین کو اپنے تأثرات میں شریک کرنے کی کوشش کی ہے اور ان مؤثر و دل نشین واقعات کا ایک بڑا مجموعہ پیش کر دیا ہے، جو آج بھی ایمان میں حرکت دل میں حرارت اور آنکھوں میں اشکِ ندامت پیدا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے جو چبھے دل میں، وُہی تنکے لیے

اس کتاب کی اشاعت کا تیسرا محرک ذاتی و جذباتی ہے۔ "سیرۃ سید احمد شہیدؒ" اس بے بضاعت کی عزیز ترین متاع اور ایک بڑی محسن کتاب ہے۔ اس کم سواد نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے اور بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں، لیکن جس ذوق و شوق سے یہ کتاب لکھی، کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کتاب نے کسی اور کو کوئی فیض پہنچایا ہو یا نہ پہنچایا ہو، اس نے خود اپنے مصنف کو حلاوتِ ایمانی سے لذت یاب کیا۔ اس نے اُن اہلِ یقین اور اربابِ عزیمت سے متعارف کیا، جن کی نظیر اسلام کی پچھلی صدیوں میں آسانی سے نہیں ملتی۔ پھر اسی کتاب نے اس دور کے ان اہلِ یقین تک پہنچایا، جن کو اس دولت سے حصہ ملا تھا اور ان کے دلوں میں جگہ پیدا کی۔ اس کو مصنف کی خود غرضی کہیے یا جذبۂ شکر گزاری کہ وہ اس کتاب کو اپنے نقوشِ قلم میں اولین مقام دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ نقوش بار بار تازہ اور روشن ہوں۔

یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ مصنف نے کوشش کی ہے کہ صاحبِ سیرت اپنی اصلی صورت میں نظر آئے۔ اس نے نہ مشرقی سوانح نگاروں کی طرح رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور نہ مغربی مورخین کی تقلید میں خواہ مخواہ کتاب کو بے رُوح اور بے اثر بنانے کی کوشش کی ہے، نہ زمانے کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی ہے اور نہ کسی خواہش و تخیل کے ماتحت تاریخ سازی کا ارادہ کیا ہے، بلکہ روایات و واقعات کی زبان میں بھی کم سے کم تغیر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی بڑا فضل ہے کہ اس نے اس کتاب کی اشاعت کا بھی ایسا سامان فرمایا، جو مصنّف کے بس میں نہ تھا۔ سنہ ۱۳۶۹ھ کے سفرِ حج میں مدینۂ طیّبہ میں مولانا ظفر اقبال صاحب، ایم اے (ابنِ جناب غلام قادر فصیح صاحب مرحوم) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس تعلّق و عقیدت کی بنا پر، جو انھیں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی جماعت سے ہے، مجھ سے وعدہ لیا کہ "سیرتِ سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ" کی چوتھی اشاعت کا اہتمام اور ذمّہ داری ان کے سپرد کروں گا۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کتابوں کو صحّت و تحقیق اور اعلیٰ معیار کے مطابق شائع کرنے کا خاص ذوق عطا فرمایا ہے۔ وہ ہر کتاب کو اس صحّت و اہتمام کے ساتھ شائع کرنا چاہتے ہیں، جو اہتمام صرف مذہبی صحیفوں کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے سلسلے میں جو زحمت برداشت کی اور جو اہتمام فرمایا، وہ شکریّے سے بالاتر ہے۔ اس کی جزا اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ میں اپنے محترم عزیز و بزرگ مولانا حکیم سیّد حسن مثنّیٰ صاحب رضوی امروہی کا شکریّہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں، جنھوں نے خاندانی حالات کے سلسلے میں بعض قیمتی معلومات عطا کیں اور بعض غلطیوں پر مطّلع کیا۔

ناچیز مؤلّف خواجہ گلزار محمّد صاحب (خلفُ الصّدق جناب خواجہ دل محمّد صاحب، ایم اے) کا بھی شکر گزار ہے، جنھوں نے پورے اہتمام اور کمال قدردانی سے اس کتاب کو اپنے مطبع "گلزارِ عالم پریس" میں شائع کرنے کی ذمّے داری قبول فرمائی۔ نیز اس کتاب کے کاتب منشی جمیل احمد صاحب "تنویر رقم" کا بھی ممنون ہے، جنھوں نے نہایت ذوق و شوق سے فرائضِ کتابت ادا کیے اور اس سلسلے میں ایثار سے بھی دریغ نہیں کیا۔ عزیزہ رفعت اقبال، ایم اے (عربی و اسلامیات)، شعبۂ علومِ اسلامی لاہور کالج فار ویمن، لاہور اور عزیزہ سعیدہ اقبال، ایم اے (علومِ اسلامی)، معلّمہ، لیڈی میکلیگن گرلز ہائی اسکول، لاہور کا شکریّہ بھی واجب ہے، جنھوں نے کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح میں اپنے والدِ محترم مولانا ظفر اقبال صاحب کی قابلِ قدر امداد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمائے!

اللہ تعالیٰ اِس اشاعت کو بھی پہلی اشاعتوں کی طرح قبول فرمائے اور اسے مصنّف و قارئین کرام کے لیے دینی ترقّیات اور ایمانی کیفیات کے حصول کا ذریعہ بنائے!

۳۲، گلبرگ روڈ
۷؍ جمادی الآخرہ، سنہ ۱۳۷۷ھ
(۱۹ جنوری سنہ ۱۹۵۸ء)

ابوالحسن علی

فہرستِ مضامین

باب	عنوان	صفحہ

باب	عنوان	صفحہ
۱۱	بنارس تا کلکتہ	۲۵۵
۱۲	کلکتے میں	۲۷۷
۱۳	کلکتے سے مکۂ معظمہ تک	۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسافرِ اسلام

ہندوستان کے غربت کدے میں!

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

صحیح حدیث میں ہے: "اسلام کا آغاز مسافرانہ بے کسی میں ہوا اور پھر وہ مسافرانہ بے کسی میں ہوگا، تو مسافرت کے بے کسوں کو مبارکباد ہو۔" اسلام کا آغاز اس وقت ہوا، جب حق کی آواز بند ہو چکی تھی، دینِ ابراہیم، علیہ السلام کا وجود سایہ ہو کر رہ گیا تھا، کفر اور شرک کی تاریکی ہر طرف پھیلی تھی، نبوت کا نور چھ صدیوں سے زیرِ نقاب تھا، توحید کی دعوت ایک بیگانہ آواز تھی، جو مسافرانہ بے کسی کے عالم میں محمد بن عبداللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، کی زبانِ مبارک سے بلند ہوئی۔ پورب، پچھم، دائیں، بائیں، ہر طرف اس صدائے حق کو اجنبی اور نامانوس سمجھا گیا۔ آواز دینے والے نے حسرت سے چاروں طرف دیکھا اور ہر طرف اس کو وہی بیگانگی، اجنبیت اور مسافرانہ بے کسی کا منظر نظر آیا۔

رفتہ رفتہ یہ اجنبیت دور ہوئی، بیگانگی کافور ہوئی، آواز کی کشش اور نوائے حق کی بانسری نے دلوں میں اثر کیا، کان والے سننے لگے اور جو سننے لگے، سر دھننے لگے، یہاں تک کہ وہ دن آیا کہ سارا عرب اس کیف سے معمور اور اس شراب سے مخمور ہو گیا اور اسلام کا مسافر

اپنے گھر پہنچ کر اپنے عزیزوں اور دوستوں میں ٹھہر گیا۔

اب وہ قافلہ بن کر آگے چلا۔ عرب کے ریگستانوں سے نکل کر عراق کی نہروں اور شام کے گلستانوں میں پہنچا۔ پھر آگے بڑھا اور ایران کے مرغزاروں اور مصر کی وادیوں میں آکر ٹھیرا۔ اس سے آگے بڑھا، تو ایک طرف خُراسان و ترکستان ہو کر ہندوستان کے پہاڑوں اور ساحلوں پر اس کا جلوہ نظر آیا اور دُوسری طرف افریقہ کے صحراؤں کو طے کر کے اس کا نُور بحرِ ظُلمات کے کنارے چمکا۔

اب آہستہ آہستہ قافلے کے لوگ چھٹنے لگے۔ تماشائی تماشا کرتے دُور نکل گئے۔ کتنے حُسنِ ظاہر کے طلبگار اور طبعی مناظر کے شیفتہ ان تماشوں میں اپنے سفر کے مقصد کو بُھول گئے اور جہاں پہنچ گئے، وہیں رہ گئے۔

اب وہ مُسافر پھر تنہا تھا۔ اُس کی آواز میں پھر بیگانگی آگئی۔ صدائے حق صدا بصحرا ہو گئی۔ آخر قافلے کی بانگِ درا خاموش ہوگئی اور کارواں یکسر خوابِ غفلت میں محو ہو گیا۔

اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گزر گئے اور مسافر کے آغازِ سفر پر ہزارواں برس گزر رہا تھا۔ یہ اکبر کا دور تھا، جب عجم کے ایک جادوگر نے آکر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پُھونکا کہ دینِ عربی کی ہزار سالہ عمر پُوری ہوگئی۔ اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہِ اُمّی کے ذریعے نبیِ اُمّی، عَلَیْہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَام، کا دین منسُوخ ہو کہ دینِ الٰہی کا ظُہور ہو۔ مجُوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے، برہمنوں نے بُت آراستہ کیے اور جوگ اور تصوّف نے مل کر کعبہ اور بُت خانے کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا۔ اس بیچ میل تحریک کا جو اثر ہُوا، اُس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے، تو "دبستانِ مذاہب" کا مطالعہ کرے۔ کتنے زُنّار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زُنّار نظر آئیں گے! بادشاہی آستانے پر کتنے امیروں کے سر سجدے میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے اور مسجدوں کے منبر سے یہ

صدا سنائی دے گی :-

تَعَالٰی شَانُہٗ، اَللّٰہُ اَکْبَر![1]

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی : "راستہ صاف کرو کہ راستے کا چلنے والا آتا ہے"۔ ایک فاروقی مجدّدِ فاروقی شان سے ظاہر ہوا۔ یہ احمد سرہندی رح تھے۔ جہانگیر کے طوق و سلاسل نے بڑھ کر اُن کے قدم لیے اور وہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اسیرِ زِنداں ہوئے۔ اس یوسفِ زندانی نے بھی یوسفِ کنعانی کی طرح ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّار[2] کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے نے سوتوں کو جگا دیا۔ مسافرِ اسلام کی دِرا کی دِھیمی دِھیمی آواز پھر سنائی دینے لگی۔

سرہند کے اس فاروقی مجدّد کی آواز نے دِلّی کے ایک اور فاروقی خاندان کو گرما دیا۔ یہ شاہ عبدالرحیم دہلوی تھے، جو عالمگیر کے مُعاصِر تھے۔ اُن کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ ہوئے، جن کو ملّت نے حکیم الاُمّت کا خطاب دیا۔ یہ اس دوسرے دَور کے مجدّد ہوئے۔ اس دَور میں جس کو ملا، اُن سے ملا اور جس نے پایا، اُن سے پایا۔[3]

شاہ صاحب ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ شاہ صاحبؒ کے اخلاف نے پوری صدی تک وہ چراغِ ہدایت جو اُن کے پدرِ بزرگوار نے جلایا تھا، روشن رکھا۔ کتاب میں ان بزرگوں کے نام اکثر آئیں گے۔ اس لیے اُن کا یہ شجرہ مع تاریخِ وفات

(۱) اُس کی شان بلند ہے؛ اللہ اکبر۔

(۲) جُدا جُدا معبود اچھے یا خدائے یگانہ برتر؟ (۱۲ : ۳۹)

(۳) "تفہیماتِ الٰہیہ" میں شاہ صاحبؒ نے خود اس کی تصریح کی تھی اور واقعہ نے اس کی تصدیق کی۔

نظر کے سامنے رہے :-

شجرہ

شاہ وجیہ الدین فاروقی معاصرِ سلطان اورنگ زیبؒ

شاہ عبدالرحیمؒ (۱۱۳۱ھ)

شاہ اہل اللہؒ (۱۱۸۷ھ) — شاہ ولی اللہؒ (۱۱۷۶ھ)

شاہ ولی اللہؒ کے فرزند:

- شاہ عبدالقادرؒ (۱۲۳۰ھ)
- شاہ عبدالعزیزؒ (۱۲۳۹ھ)
  - دختر (زوجہ شاہ محمد افضل)
    - شاہ محمد یعقوبؒ (۱۲۸۲ھ)
    - شاہ محمد اسحٰق محدثؒ (۱۲۶۲ھ)
  - دختر (زوجہ شاہ عبدالحیؒ ۱۲۴۳ھ رفیق شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)
    - شاہ عبدالقیومؒ (۱۲۹۹ھ)
- شاہ رفیع الدینؒ (۱۲۳۳ھ)
  - شاہ مخصوص اللہؒ (۱۲۷۳ھ)
- شاہ عبدالغنیؒ (۱۲۲۷ھ)
  - شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ)
    - شاہ محمد عمرؒ (۱۲۶۸ھ)
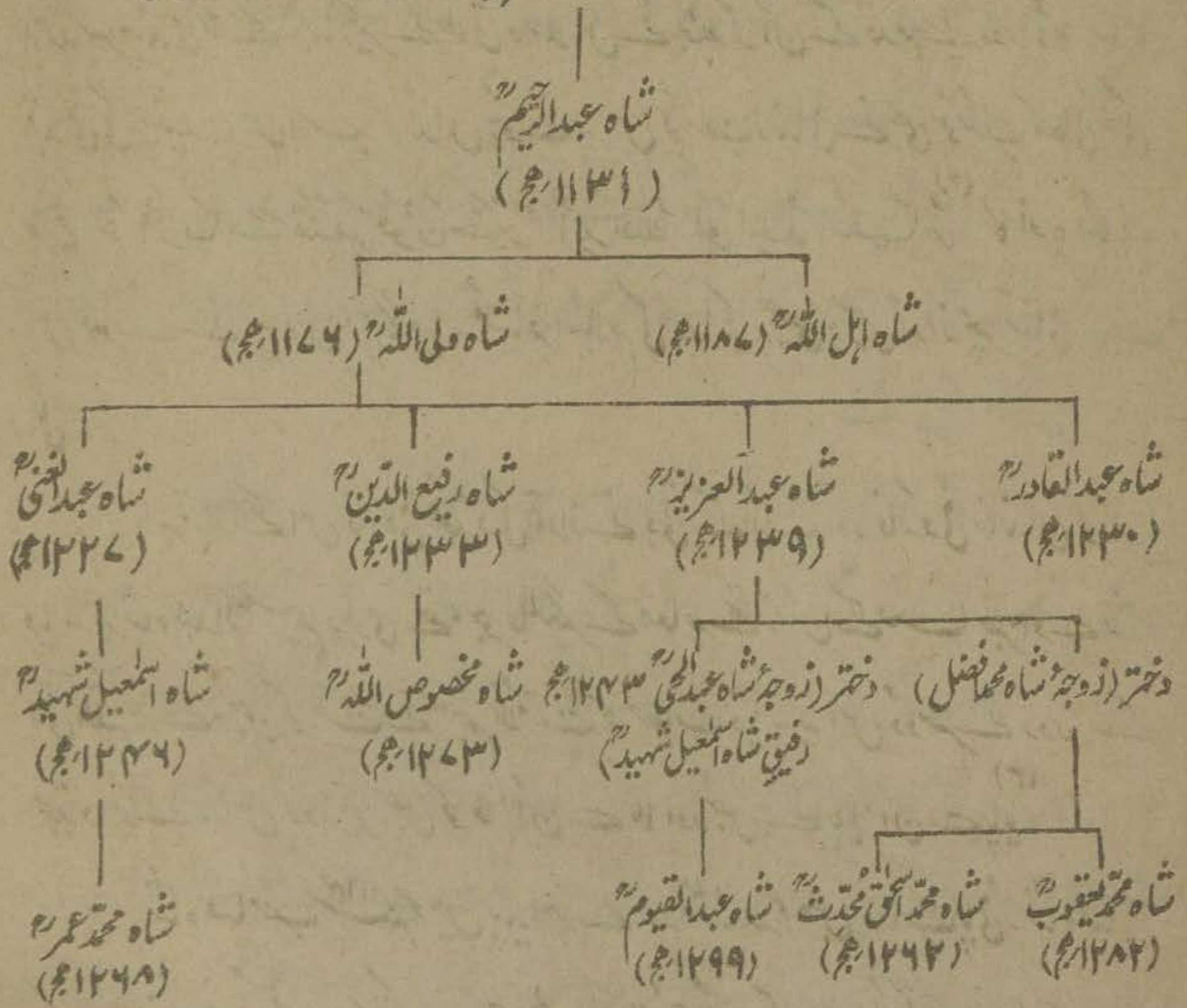
ایں سلسلۂ طلاے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

شاہ وجیہ الدین، جیسا کہ اُن کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، سلطان اورنگ زیبؒ کی فوج میں تھے اور جنگِ برادران میں بڑی بہادری سے اورنگ زیبؒ کی طرف سے لڑے تھے۔ بادشاہ جب دکن میں ہنگامہ آرا تھے، تو شاہ صاحبِ ممدوح بھی جہاد میں شرکت کے لیے دکن جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں سے لڑائی ہوئی اور شہادت پائی۔ شاہ عبدالرحیمؒ کے مجاہدانہ

جذبات کا پتہ اُن کے خطوط سے ملتا ہے۔ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعۂ عثمانیہ، حیدر آباد کے کُتُب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا ایک خط نظامُ الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے، جس میں اُنھوں نے نوابِ مرحُوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات کو پڑھ کر کوئی اس کا پتہ بھی نہیں پا سکتا کہ اُن کے زمانے میں جو سیاسی انتشار اور پراگندگی تھی، اس کا اُن کی جمعیتِ خاطر پر کچھ بھی اثر پڑا ہے۔ مگر ذرا "حُجّۃُ اللّٰہِ البَالِغہ" کے اُس باب پر کوئی غور کی نظر ڈالے، جو بادشاہ اور ارکانِ حکومت کے فرائض پر لکھا ہے اور "ازالۃُ الخفاء" میں خلافت اور امامت کا جو خاکہ کھینچا ہے، اُس کو کسی نے ذرا گہری نظر سے دیکھا ہے، تو معلوم ہوگا کہ دادا نے جو نقشہ تیار کیا تھا، پوتے نے اسی نقشے کو اپنے خُون سے رنگ کر تیار کرنا چاہا۔

شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی تعلقات تیموریوں کی گرتی ہوئی قوت کے ساتھ نہ تھے، بلکہ روہیلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ تھے اور نواب نجیب الدولہ افغان کی رسلکِ فُضلا میں منسلک تھے۔(۱)

مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃُ اللّٰہِ علیہ کے مجاہدانہ کارنامے عالم آشکارا ہیں اور اُن سے کتاب کے صفحات لبریز ہیں۔

مجدّدِ سرہندیؒ اور مجدّدِ دہلویؒ کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشے سے رائے بریلی کے خُمکدے میں ایک اور سہ آتشہ تیار ہُوا۔ یہ سادات حسنی کا خاندان تھا، جس میں مجدّدِ الفِ ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کا فیض آکر مل گیا تھا۔ اس خاندان کا آغاز شیخ الاسلام امیر کبیر قطب الدین محمد مدنی سے ہُوا، جنھوں نے ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہندوستان آکر کڑا مانک پور کے نواح میں جو اس زمانے میں الٰہ آباد سے پہلے الٰہ آباد تھا، جہاد کیا۔

(۱) جامِ جہاں نما قلمی، مؤلفہ قدرت اللہ سنبھلی، تالیفِ سنہ ۱۱۹۱ھ موجودہ کُتب خانۂ جامعۂ ملیّۂ دہلی۔

اس خاندان کے آخری مورث شاہ سید علم اللہ ہیں، جو عالمگیر رح کے زمانے میں تھے اور حضرت مجدد الفِ ثانی رح کے مشہور خلیفہ اور جانشین حضرت آدم بنوری رح کے فیض سے مستفیض اور مشرق کے دیار میں اُن کے خلیفۂ خاص تھے۔ اس خاندان کے ممتاز افراد مجددِ دہلوی رح کے فیضِ درس اور فیضِ صحبت سے سیراب تھے۔ اس طرح اس خاندان میں حضرت مجددِ سرہندی رح اور مجددِ دہلوی رح کی برکتیں اور سعادتیں جمع ہوگئیں۔

تیرھویں صدی کا آغاز تھا کہ اس خاندان میں چودھویں کا چاند طلوع ہوا، یعنی ۱۲۰۱ھ میں مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد شہید، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، کی پیدائش ہوئی۔ چند سال کے بعد یہ چاند مجاہدہ و عرفان کا آفتاب بن گیا۔

کتاب کا موضوع اسی آفتابِ عالمتاب کے انوارِ کمالات کی تابش و بینش ہے۔

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم، ہمہ ز آفتاب گویم!

تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مُشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا، مولانا اسمٰعیل شہید رح اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدیدِ دین کی نئی تحریک شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا، جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اُٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی، جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیجِ بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس مجددانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہوگئے، حالانکہ یہ واقعہ اس کی پوری تاریخ کا صرف ایک باب ہے۔

یہ مسلمانوں کی ایک عظیم الشان تحریک تھی، جس کی کُھل کر پوری تاریخ لکھنی بھی اب

سے پہلے مشکل تھی۔ اس کے متفرق مضامین رسالوں اور کتابوں میں بکھرے تھے۔ کچھ معلومات بزرگوں کے سینوں اور کچھ قلمی کتابوں کے دفینوں میں بند تھے۔ ان سب کو سمیٹ کر ایک دفتر میں فراہم کرنا بھی ایک کام تھا۔ ہم کو خوشی ہے کہ اس کام کے لیے بھی اس خانوادے کے ایک نوجوان کو، جس کو علم و عمل اور فکر و ذوق کی دولت سے حصۂ وافر ملا ہے، توفیق بخشی گئی مولوی سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی، شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلما نے بڑی کوشش سے ان ۵ متفرق معلومات کو یکجا کیا ہے اور اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ تاریخی داستان کے بجائے نوجوان مسلمانوں کے لیے عملی روح کا سامان بن گیا ہے۔

ان مجاہدوں کی تاریخ بتلائے گی کہ اُن کی تحریک کا یہ ناکام انجام کیوں ہوا۔ واقعہ ڈھکا چھپا اور اسباب نامعلوم نہیں۔ دینی جماعتوں کا نفاق اور اُمرا کا اختلاف اُن کی ناکامی کا سبب ہوا، جو ہمیشہ سے ناکاموں کی ناکامی کا سبب بنتا رہا ہے۔ پشاور کے پٹھان اُمرا اگر وفاداری سے کام ۱۰ لیتے، تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

اس تحریک نے اپنے پیرووں میں للّٰہیت، خلوص، اتحاد، نظم، سیاست اور تنظیم کا جو جوہر پیدا کر دیا تھا، اس کے سمجھنے کے لیے کتاب کا چوتھا باب کافی ہے۔ بنگال کی سرحد سے لے کر پنجاب تک اور نیپال کی ترائی سے لے کر دریائے شور کے ساحل تک اسلامی جوش و عمل کا دریا موجیں مار رہا تھا اور حیرت انگیز وحدت کا سماں آنکھوں کو نظر آ رہا تھا۔ ۱۵

سید صاحبؒ کے خلفا ہر صوبے اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے، مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں، نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے، وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے،[1] شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں، تاڑی اور سیندھی کے خُم چھوڑے جا رہے تھے، بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی ۲۰

(۱) کہتے ہیں کہ اس تحریک سے چالیس ہزار مسلمان ہوئے۔

کے لیے علما حجروں سے اور اُمرا ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آرہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے۔

کتاب[1] میں پہلے چند ابتدائی عنوان ہیں اور یہ کہنا چاہیے کہ کتاب کے پانچ سو صفحوں میں جو کچھ ہے، اس کی رُوح انھیں چند ابتدائی عنوانوں میں کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد چار باب ہیں۔ پہلے باب میں اس تحریک کے بانی حضرت سیّد صاحب شہید رح کے حالات بچپن سے حج تک ہیں، دُوسرے باب میں ان کے جہاد کے اغراض و مقاصد اور سفرِ جہاد کی پُر اثر کیفیتیں اور دشمنوں سے معرکہ آرائی کی تفصیلات اور شہادت کا حال لکھا ہے، تیسرے باب میں سیّد صاحب رح کی تجدید، امامت اور تزکیے کے حالات ہیں، ساتھ ہی اس باب میں اصُولِ تزکیۂ رُوحانی پر جو کچھ لکھا ہے، بہت خُوب لکھا ہے اور چوتھے باب میں، جو آخری ہے، سیّد صاحب رح کے خلفا کے سوانح اور اُن کے کارنامے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ اس ایک آفتاب کے پرتو سے کتنے ذرّے چمک اُٹھے تھے اور اس گئی گذری حالت میں بھی طبیعتوں میں کتنی اچھّی استعدادیں موجُود تھیں۔

مصنّف نے یہ کتاب بڑے دقّت سے لکھی ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں رُشد و ہدایت اور عزم و ہمّت کا ایک صحیفہ دے دیا ہے۔ کیا عجب کہ مسلمان اس تاریخی موقع پر اس کتاب سے اصلاح و ہمّت کا فائدہ اٹھائیں اور اپنے ماضی کے آئینے میں اپنے مستقبل کی شکل و صورت دیکھیں۔

وَالسَّلَام۔

دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
۲۸ ذوالحجہ ۱۳۵۷ھ

سیّد سلیمان ندوی

(۱) کتاب کا یہ تعارُف کتاب کی پہلی اشاعت کے لیے لکھا گیا تھا۔ موجُودہ اڈیشن میں تغیّر و اضافہ ہُوا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

کتاب کے مقاصد

اس کتاب کی تالیف کے چند مقصد ہیں :۔

۱۔ ایک نہایت رنجیدہ منظر یہ ہے کہ بہت سے ہمت و عزم کے جوان، قوتِ ارادی اور قوتِ عمل کے مالک بے توفیقی، کم نگاہی یا مسلمانوں کی بدقسمتی سے اپنی کارآمد قوتیں بے کار اور اکثر مضر چیزوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ ان آوارگانِ فکر و عمل کو اگر صحیح راستہ نظر آجائے اور خدا کی توفیق سے اس پر قدم اٹھائیں، تو بہت جلد منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسلام کی خدمت اور نوعِ انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحۂ عمل ہے، جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے اور وہ وہی ہے، جس کے مطابق جناب رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آپ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددینِ امت نے عمل کیا، یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا۔

اسی طرح سے مسلمانوں کی منزلِ مقصود کا بھی صرف ایک راستہ ہے اور وہ وہی راستہ ہے، جس سے اس امت کا پہلا قافلہ منزل تک پہنچا ہے۔ لَنْ یُّصْلِحَ اٰخِرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّلَھَا: اس امت کے پچھلوں کی اصلاح صرف وہی چیز کر سکتی ہے، جس نے اس کے اگلوں کی اصلاح کی تھی، یعنی دینِ خالص اور اس کی پیروی۔

۲۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہت سے سلیم الفطرت، خوش نیت، سادہ ذہن انسان اپنے ماحول کی مادیت اور جمود سے اکتا چکے ہوتے ہیں۔ روحانیت اور سکونِ قلب کے پیاسے ہوتے

ہیں۔ فطری طور پر ان میں مذہب کے قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جب پانی کا کوئی چشمہ نظر آتا ہے تو پیاسوں کی طرح اس پر گر جاتے ہیں۔ اکثر یہ چشمہ گندہ، اکثر زہر آلود اور اکثر محض سراب ہوتا ہے۔ بہت بڑی انسانی خدمت ہو گی کہ ان پیاسوں کو صاف چشمے کے کنارے کھڑا کر دیا جائے کہ پیاسے کی پیاس بجھانا بڑا صدقہ ہے۔

۵ بہت سے لوگ اپنی پستی اور کمزوریوں کے معترف ہوتے ہیں۔ وہ اخلاق و عمل، ہمّت و عزم، ایثار و قربانی، رُوحانیت و تقدّس کا اپنے سے بلند نمونہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا کم اتفاق ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی ہے اور ہمیشہ خالی رہی۔ جب اپنے سے کچھ بلند نمونہ دیکھ لیتے ہیں یا سُن پاتے ہیں، تو اپنے دل و دماغ اور اپنے ایمان و اعتقاد کی ساری دولتیں آنکھ بند کر کے اس کی نذر کر دیتے ہیں۔

۱۰ اس میں وہ طبقہ زیادہ مبتلا ہے، جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے :

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ — شُستہ رُو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود، مومن بغیر — خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر
(اقبال)

میرے نزدیک غیر اسلامی تحریکوں کی کامیابی کا بڑا سبب (خصوصاً نوجوان طبقے میں)

۱۵ یہی ہے اور اس کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ ان لوگوں کو انسانی عظمت اور اسلامی کمالات کے پہاڑ کی اس چوٹی پر کھڑا کر دیا جائے، جہاں سے ایسے تمام دعویدار اپنی پوری پستی میں نظر آئیں اور اس مقام سے مقامِ نبوّت کی بلندی کا تصور کرایا جائے کہ جب نبی کے ایک اُمّتی اور خادم کا یہ مقام ہو سکتا ہے، تو نبی کا مقام کیا ہو گا۔

۴ ۔ انسان کی طبیعت پر جس قدر ایثار و قربانی اور سرفروشی کا اثر پڑتا ہے، کسی چیز کا نہیں

۲۰ پڑتا۔ اس کے سامنے پوری منطق اور تمام بحث و استدلال بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا تن آسان اور عافیت کوش بھی ایسے لوگوں کا کلمہ پڑھتا ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں

اُن کی عقیدت اور عظمت محسوس کرتا ہے۔ ہمارے نوجوان دُوسری قوموں اور اپنے ملک کے قائدین و محبانِ وطن کے شاندار اور سحر انگیز سوانح اور تذکرے پڑھتے ہیں اور اُن کے کارنامے اپنے کانوں سے سُنتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، تو طبعاً متأثر ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں (اپنی خُود فراموشی یا ناواقفیت سے) سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر میں اندھیرا ہے۔ اس کا اثر براہِ راست مذہب پر پڑتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں میں سیاست کی راہ سے ۵ الحاد بڑی سُرعت سے آ رہا ہے۔ اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اپنے ہی ملک کے اُن دینی قائدین و مجاہدین کے حالات کی اشاعت کی جائے، جو قُربانی اور سرفروشی میں بھی منزلوں آگے ہیں۔

۴۔ اُردُو میں صُوفیہّ و مشائخ کے تذکروں کی کمی نہیں۔ مجاہدینِ اسلام کے تذکروں کی کمی ہے، مگر وُہ بھی معدوم نہیں۔ لیکن قرآن کی اشاعت اور رسُول اللّٰہ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، ۱۰ کی سیرت کے بعد صرف اُنھیں حضرات کی سیرت پُورے طور پر مفید ہو سکتی ہے، جو سَیْف و تسبیح کے جامع ہوں اور جن سے محبت و شوقِ الٰہی کے ساتھ حرکت و عمل کی قُوت پیدا ہو۔ ایک عارف، ایک مُصلح اور ایک مجدّد کی حیثیت سے بھی یہ سیرت مکمل ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقے کے مطالعے کے لائق۔

نوجوانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ وُہ خُود بدلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی ہمت ۱۵ کریں۔

نازکیا اُس پہ، جو بدلا ہے زمانے نے تُمھیں
مرد وُہ ہیں، جو زمانے کو بدل دیتے ہیں!

سلطنتوں کو فتح کرنے کا حوصلہ رکھیں کہ نوجوانوں نے یہ بھی کیا ہے۔ جسم کی آسائش و زیبائش چھوڑ کر بزمِ جہاں کی آرائش کی فکر کریں اور دیکھیں کہ کیا چیزیں کم ہیں کہ پوری کر دیں، کیا ۲۰ رخنے ہیں کہ بھر دیں، کیا چیزیں بیکار ہو گئی ہیں کہ نکال دیں۔

اہلِ خانقاہ اور مشائخ کو اس کا پیغام ہے کہ

اے پیرِ حرم، رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے اِن کو سبق خود شکنی، خود نگری کا

تُو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارُو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

(ضربِ کلیم)

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ
(۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء)

دائرۂ شاہ علم اللہ رح
رائے بریلی

کتاب کے مآخذ

سیّد صاحبؒ کی سیرت میں اتنی کتابیں، اور اس شرح و بسط کے ساتھ، لکھی گئی ہیں، جو غالباً کم نامورانِ اسلام اور مشائخ و مجاہدین کے حالات میں لکھی گئی ہوں گی۔ اس کے کئی سبب ہیں۔

ایک سبب تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں کتابت و تصنیف بہت عام تھی اور سیّد صاحبؒ کے ۵ فوراً بعد آپؒ کے رُفقا و معتقدین نے اس طرف توجّہ کی۔ اس لیے اُن کو زیادہ تر وہ چشم دید بیانات اور جزئیّات و تفصیلات مل سکیں، جن کا بعد میں فراہم ہونا مشکل ہوتا ہے۔

دوسرے نوّاب وزیرالدّولہ مرحوم والیِ ریاست ٹونک (۱) نے، جن کو سیّد صاحبؒ کے ساتھ عقیدت و ارادت ہی نہیں، عشق تھا، اس کام کے لیے اپنی ریاست میں سیّد صاحبؒ کے اعزّا و رُفقا اور عوام کی ایک جماعت مقرّر کر دی تھی، جس نے سیّد صاحبؒ کے حالات و واقعات کا ایک ۱۰ ضخیم دفتر تیار کر دیا۔

لیکن اِن کتابوں کی موجودگی میں ایک ایسی نئی کتاب کی ضرورت پیش آئی،

(۱) جو اِن سب کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھی جائے،

(۲) جس میں سیّد صاحبؒ کی شخصیت و حیثیت اور آپ کے مقاصد و عزائم واضح کیے جائیں اور آپؒ کی عظیم الشّان تحریک کے دینی و سیاسی اثرات و برکات بیان کیے جائیں، ۱۵

(۳) جس میں غیر ضروری جزئیات و تفصیلات اور محض کرامات کے بجائے ضروری واقعات اور تاریخی اشارات ہوں، اور

(۴) جس میں وہ مضامین و مباحث درج کیے جائیں، جو اقتضائے وقت اور مجبوری سے چھوڑ

(۱) نواب امیر خاںؒ بانیِ ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے فرزند ارجمند۔ پیدائش ۱۲۲۲ھ، مسند نشینی ۱۲۵۰ھ، وفات ۱۲ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء۔

دیے گئے تھے۔

جن کتابوں سے اس کتاب کے واقعات و مضامین ماخوذ ہیں، اُن کے نام ضروری تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔

قلمی:

۱۔ آثرُ الابرار (فارسی) مولانا شاہ اہل اللہؒ (برادرِ حضرت شاہ ولی اللہؒ)، مولانا نور اللہؒ، مولانا شاہ محمد عاشقؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز، رحمۃ اللہ علیہ، اور اُن کے خاندان کے دوسرے اکابر نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد حضرت شاہ سید ابوسعید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام مفصّل خطوط لکھے ہیں، جن سے اُس زمانے کے بہت سے حالات اور خاندان کے اہم واقعات اور بزرگوں کے سنینِ وفات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور شاہ ابوسعیدؒ کے اس خاندان سے تعلق اور اُن کے مرتبے اور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولوی سید ابوالقاسم ہسوی، رحمۃ اللہ علیہ، نے ان خطوط کو "مآثرُ الابرار" کے نام سے یک جا جمع کر دیا ہے، جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔

۲۔ وقائع احمدی (اُردو) یہ کتاب اُسی جماعت کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے، جس کو نواب وزیرالدولہ مرحوم نے سید صاحبؒ کی وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس میں سید صاحبؒ کے بعض خاص اعزہ، آپؒ کے رفقائے سفر و جہاد اور آپؒ کے خدام تھے۔ ہر ایک اپنی معلومات اور چشم دید واقعات بیان کرتا اور کاتب اس کو لکھ لیتا۔ یہ سید صاحبؒ کے حالات اور جنگی تفصیلات کا سب سے وسیع ذخیرہ اور معلومات کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ پیشِ نظر کتاب کا بھی سب سے بڑا ماخذ ہے۔ مؤلف کے پاس جو نسخہ ہے، وہ تین مرتب ضخیم جلدوں اور چند متفرق اور مکرر اجزا پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ مولانا سید عرفان، مولانا سید مصطفٰے اور حافظ سید محمد یونس (نبیرگانِ حضرت سید صاحبؒ) کی ملکیت ہے اور عمّۂ محترمہ، اہلیۂ سید عبدالحفیظ، دخترِ حافظ سید محمد یونس صاحبؒ مرحوم کی عنایت سے حاصل ہوا۔ اِس نسخے کی پہلی جلد کے ابتدائی اوراق ناقص تھے۔ اِس کی تکمیل "وقائعِ احمدی" کے اُس نسخے سے کی گئی، جو سید نور احمد

صاحبؒ پسر سید محمد اسحٰق صاحبؒ مرحوم سے مستعار ملا اور وہ "وقائع" کی صرف پہلی جلد ہے۔

۳۔ منظورۃ السعداء (فارسی) اس کتاب کا پورا نام مَنظُورَۃُ السُّعَدَآءِ فِيْ أَحْوَالِ الْغُزَاۃِ وَالشُّهَدَآءِ ہے۔ "تاریخِ احمدیہ" تاریخی نام ہے، جس سے تاریخِ تالیف ۱۲۷۲ھ نکلتی ہے۔ یہ کتاب مولوی سید جعفر علی نقوی ساکن مجھواامیر (ضلع بستی) کی تالیف ہے اور سید صاحبؒ کے حالات میں نہایت معتبر و مبسوط کتاب ہے۔ مولوی سید جعفر علی، اُن کے والد اور بھائی سید صاحبؒ سے وابستہ اور آپؒ کے مخلصین میں سے تھے۔ رمضان ۱۲۴۵ھ میں سرحد پہنچے اور اپنی علمیت اور تحریری قابلیت کی بنا پر منشی خانے سے وابستہ ہو گئے۔ جنگِ بالاکوٹ میں شریک تھے۔ بالاکوٹ کے واقعے کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے اور اصلاحی اور دعوتی کاموں میں مشغول ہو گئے۔[1] نواب وزیر الدولہ مرحوم کے عہدِ ریاست میں غالباً اُنھیں کی تحریک سے یہ کتاب لکھی۔ ۱۲۴۵ھ تک کے حالات میں ان کا ماخذ اور ذریعۂ معلومات "مخزنِ احمدی"، "مکاتیبِ سید حمید الدین" اور مجاہدین کے بیانات و روایات اور منشی خانے کے کاغذات ہیں۔ ۹ رمضان ۱۲۴۵ھ سے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ تک وہ واقعات کے چشم دید راوی اور بہت سے موقعوں پر خود شریکِ واقعہ ہیں۔

اس کتاب کے متعدد نسخے مظفر جنگ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں (خلف نواب محمد علی خاں مرحوم) کے کتب خانوں میں دیکھے، مگر سب صرف حصۂ اوّل پر مشتمل تھے۔ مکمل نسخہ، جو بالاکوٹ تک کے حالات پر مشتمل ہو، ٹونک میں نظر سے نہیں گزرا۔ ایک نسخہ، جو حصۂ ثانی پر بھی مشتمل ہے، حافظ محمود خاں شیرانی ٹونکی مرحوم کو کہیں سے حاصل ہوا اور اُن کے ذخیرۂ کتب میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہو گیا۔ یہ نسخہ بھی ناقص ہے۔ اس کے بعض اجزا غائب، بعض کرم خوردہ ہیں۔ ٹونک کے نسخے سے اس نسخے کی، اور ٹونک کے

(۱) مولوی سید جعفر علی صاحب کا مفصل تذکرہ خلفا و مریدین کے سلسلے میں ملاحظہ ہو۔

نسخے کی اس نسخے سے تکمیل ہوتی ہے۔ مؤلّفِ کتاب کو دونوں نسخوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

۴۔ مکتوبات (فارسی) یہ سیّد صاحبؒ، مولانا اسمٰعیلؒ اور سیّد حمید الدینؒ (خواہر زادہ سیّد صاحبؒ) کے خطوط کا مجموعہ ہے، جو زیادہ تر میدانِ جنگ سے اعزّہ و احباب، اُمرا و سلاطین اور اہلِ ہندوستان کو بھیجے گئے۔ ان سے سفرِ ہجرت، رجہاد کے واقعات اور میدانِ جنگ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ سیّد حمید الدینؒ کے خطوط نہایت مفصّل اور واضح اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہیں اور اُن سے سفرِ ہجرت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ صاحبزادہ عبدالرحیم خان صاحب کے کُتُب خانے[1] میں اور ہندوستان کے بعض دُوسرے کُتُب خانوں میں اس کے متعدد مجموعے ہیں، جن میں خطوط کی تعداد میں کمی بیشی ہے۔ جو نسخہ مؤلّف کے پیشِ نظر ہے، وہ خاندانی ہے اور غالباً سیّد حمید الدینؒ یا سیّد عبدالرحمٰنؒ (خواہر زادگانِ سیّد صاحبؒ) کے پاس رہا ہے۔ اس میں خطوط کے علاوہ بعض جنگوں اور واقعات کی رُوداد، جو غالباً ہندوستان روانہ کی گئی ہے، فرامین اور اجازت نامے بھی ہیں۔ درمیان میں دو فارسی قصیدے بھی ہیں۔ یہ نسخہ نہایت خوش خط، لیکن اغلاط سے پُر ہے۔ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات پر تمام ہوا ہے۔

یہ خطوط گراں قدر فوائد پر مشتمل ہیں اور قرآن و حدیث کا بیش بہا خزانہ اور جہاد کے نہایت ولولہ انگیز اور ایمان افروز خطبے ہیں، جن کا لفظ لفظ شمشیرِ برّاں کا کام دیتا ہے۔

۵۔ ارمغانِ احباب (اُردو) یہ راقمِ سطُور کے والدِ مرحوم مولانا حکیم عبدالحی صاحب کا سفرنامہ اور روزنامچہ ہے۔ آپ نے ۱۳۱۲ھ میں دہلی، پانی پت، دیوبند، سہارن پور، نگینہ، سرہند وغیرہ کا سفر کیا۔ علما و مشائخِ وقت سے ملاقات کی۔ اُن بزرگوں سے علمی و رُوحانی تذکروں کے علاوہ جناب سیّد صاحبؒ کے متعلق بیسیوں ایسی روایات سُنیں، جو انھوں نے اپنے بزرگوں

(۱) یہ کتب خانہ دُوسرے کتابی ذخیروں کی طرح ریاست کے کتب خانے میں ضم کر دیا گیا ہے۔

سے سُنی تھیں یا خود اُن واقعات میں شریک تھے اور سید صاحبؒ کی عام تاریخوں میں نہیں ملتیں۔ یہ کتاب اگرچہ سید صاحبؒ کے تذکرہ و سیرت کے موضوع پر نہیں ہے، لیکن سید صاحبؒ کے تذکرے میں اس سے نہایت بیش قیمت مدد ملی۔ یہ رسالہ اس وقت کی علمی، دینی، اخلاقی تصویر ہونے کے علاوہ سید صاحبؒ کے بہت سے حالات و کمالات کا آئینہ ہے۔[1]

۶۔ **نُزہۃُ الخَواطِر وَ بَہجۃُ المَسَامِعِ وَالنَّوَاظِر (عربی)** یہ آٹھ جلدوں میں مشاہیرِ ہندوستان کا تذکرہ ہے اور والدِ مرحوم مولانا سید عبدالحئی رَحمۃُ اللّٰہِ عَلَیْہ کی تصنیف و سرمایۂ حیات ہے۔ اس میں تیرھویں صدی کے اعیان میں سید صاحبؒ اور اُن کے رُفقا کا تذکرہ ہے۔[2]

۷۔ **قدیم تحریریں اور دستاویزیں** مخطوطات اور غیر مطبوعہ کتابوں کے علاوہ خاندانی ذخیروں میں بعض ایسی قدیم تحریریں، یادداشتیں، خطوط اور دستاویزیں ملیں، جن سے بعض اہم تفصیلات اور واقعات کی جزئیات معلوم ہوئیں، سنین کی تعیین ہوئی اور عام مطبوعہ تذکروں اور بعض اوقات بعض قدیم ماخذوں کی غلطیوں کا علم ہوا۔

ان قدیم تحریروں اور یادداشتوں میں سفرِ حج کی ایک یادداشت ہے، جو روزنامچے کی شکل میں سید صاحبؒ کے رفقائے خاص میں سے کسی رفیق کے قلم کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں بنارس کی منزل سے لے کر جہاز سے واپسی تک کے اہم واقعات بقیدِ تاریخ لکھے ہوئے ہیں۔ یہ یادداشت مولوی محمد سعید صاحب نصیر آبادی کے خاندانی کاغذات میں ایک کتاب کے اندر نشانی کے طور پر رکھی ہوئی ملی جس سے سفرِ حج کی منزلوں کی تاریخ لکھنے میں بڑی مدد ملی اور بعض نئے واقعات کا علم ہوا۔

دستاویزوں میں بعض اقرار نامے اور خاندانی ہبہ نامے وغیرہ تھے، جن میں سے بعض اپنے گھر کے خطوط اور قدیم قلمی تحریروں کے مرقع میں ملے۔ بعض مولوی سید محمد علی صاحب "مخزنِ احمدی" کے صاحبزادے بخشی سید نور الہدیٰ صاحب مرحوم کے قلمی ذخیرے میں ٹونک میں دستیاب ہوئے۔ ان میں سے بھی بڑے مفید معلومات حاصل ہوئے اور عام کتابوں کے متعدد

(۱) رسالۂ معارف (دار المصنفین، اعظم گڑھ) ۱۹۳۹ء میں مسلسل شائع ہو چکا ہے۔ (۲) اس وقت تک اس کتاب کے ۶ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں، ساتواں زیرِ طبع ہے۔

غلط اور مشہور سنین کی تصحیح ہوئی۔

قدیم حسابات کے کاغذات سے بھی بڑی مدد ملی اور بعض مشہور اغلاط کی تصحیح ہوئی۔ اُن میں رائے بریلی کے موضع لوہانی پور کی مسجد (تعمیر کردہ سیّد صاحبؒ) کے حسابات کے کاغذات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو مُہتمم تعمیر محمّد زمان خاں مرحوم کے پوتے ماسٹر محمّد زمان خاں ولد اولاد محمّد خاں کے ہاں سے دستیاب ہوئے۔ جَزَاھُمُ اللّٰہُ خَیْراً!

مطبوعہ:

۱۔ مخزنِ احمدی (فارسی) سیّد صاحبؒ کے بڑے بھانجے مولوی سیّد محمّد علی کی تصنیف اور سیّد صاحبؒ کے حج سے واپسی تک کے ابتدائی حالات میں سب سے بڑا ماخذ ہے۔ مولوی صاحب مرحوم سیّد صاحبؒ سے عمر میں بڑے، اکثر واقعات کے چشم دید گواہ اور رفیقِ سفر تھے۔ نوّاب محمّد علی خاں کے عہد میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اب نایاب ہے۔

۲۔ سوانحِ احمدی اور ۳۔ تواریخِ عجیب (اردو) پہلی کتاب سیّد صاحبؒ کے حالات میں مقبول و مشہور کتاب ہے، جس سے سیّد صاحبؒ کے حالات کی بہت اشاعت ہوئی۔ مولوی محمّد جعفر صاحب تھانیسری، اسیرِ پورٹ بلیئر و متّہمِ مقدمۂ سازش کی تصنیف ہے۔ آپ سیّد صاحبؒ کے خلفا سے بیعت اور سیّد صاحبؒ کے سچّے اور پُرجوش معتقد تھے۔ جس زمانے میں یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے، اُس وقت اس سے زیادہ تصریح شاید خطرے سے خالی نہ تھی اور اُس وقت اس کی اشاعت ہی ایک خطرناک کام تھا۔ شاید اسی وجہ سے مصنّفِ کتاب کو خطوط کی عبارتوں میں بھی کہیں کہیں ردّ و بدل کرنا پڑا۔

دوسری کتاب "تواریخِ عجیب" مصنّف کی آپ بیتی ۱۸۶۴ء کے مشہور مقدمۂ سازش انبالہ جیل اور کالے پانی کی سرگزشت اور مصائب و استقامت کی نہایت عبرت ناک اور مؤثر داستان ہے۔ اس کا دوسرا نام "کالا پانی" ہے۔

۴۔ وصایا الوزیر علیٰ طریقۃ البشیر والنّذیر (فارسی) یہ نوّاب وزیر الدّولہ مرحوم والیِ ریاست

ٹونک کی تصنیف ہے، جو "وصایائے وزیری" کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحب زادے محمد علی خاں مرحوم والیِ ریاست ٹونک کے عہدِ حکومت میں مرتب ہو کر ۱۲۸۴ھ میں مطبعِ محمدی، ٹونک میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں نواب صاحب مرحوم نے اپنے جانشینوں کو اتباعِ سنت، احکامِ شریعت کے اجرا اور سید صاحبؒ کے مسلک پر چلنے کی تلقین کی ہے اور ریاست و حکومت سے متعلق خاص خاص وصیتیں اور ہدایتیں کی ہیں۔ کتاب میں مختلف مناسبتوں سے ۶۵ مقام پر نواب صاحبؒ نے عاشقانہ وارفتگی اور مریدانہ عقیدت مندی کے ساتھ حضرت سید صاحبؒ اور آپؒ کے رفقا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حالات و کمالات درج کیے ہیں، جن میں سے اکثر آپ کے چشم دید ہیں۔

۵۔ رسائلِ خلفا | رسالہ "دعوت" از مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، رسالہ "نصائح" و رسالہ "وصول" از مولانا سخاوت علیؒ، "ذخیرۂ کرامت" از مولانا کرامت علیؒ، "احسن الوصایا" و "دافع الفساد" و "نافع العباد" از پیر مرتضیٰ خاںؒ رام پوری، "ملہماتِ احمدیہ" از مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ۔

۶۔ اَلدُّرُّ الْمَنْثُوْر فِیْ تَرَاجِمِ اَہْلِ صَادِق پُوْر (اردو) | یہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری، اسیرِ پورٹ بلیئر و متہم مقدمۂ سازش ۱۸۶۴ء کی تالیف ہے۔ اپنے خاندانی حالات و انساب کا مجموعہ اور سید صاحبؒ کے خلفاء و متبعین کی سب سے بڑی پُرجوش و سرفروش، مخلص اور کارگزار جماعت اہلِ صادق پور کا تذکرہ ہے۔ اس کا دوسرا نام "تذکرۂ صادقہ" بھی ہے۔

۷۔ امیر الروایات اور ۸۔ ارواحِ ثلاثہ (اردو) | امیر شاہ خاں مرحوم نامی ایک بزرگ خورجے کے متوطن اور بینڈو، ضلع علی گڑھ میں رہتے تھے۔ آپ بہت سے اکابر و فضلا کے صحبت یافتہ تھے اور حدیث کی طرح خاندانِ ولی اللّٰہی کے بزرگوں اور اکابرِ سلسلۂ دیوبند کے حالات و واقعات سناتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان زبانی روایات کو قلم بند کرا لیا اور اس مجموعے کو "امیر الروایات" کے نام سے شائع فرما دیا۔ بعد میں بعض دوسرے اضافات کے ساتھ یہ مجموعہ "ارواحِ ثلاثہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں اگرچہ بعض فروگزاشتیں اور تاریخی مسامحات

ہیں، لیکن جنابِ سیّد صاحبؒ، شاہ اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ کے متعلق بعض کارآمد معلومات اور دلچسپ واقعات ہیں، جو اپنے اپنے موقع پر کتاب میں درج ہیں۔

۹۔ آبائی اور خاندانی حالات کے مآخذ اس خاندان کے اکابر اور بزرگوں کے جستہ جستہ حالات اور واقعات تاریخ و سِیَر و انساب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ "تاریخِ فیروز شاہی"، "عُمدۃُ الطّالب"، "تذکرۃُ السّادات"، "منبعُ الانساب"، "بحرِ زخّار"، "تاریخِ آئینۂ اودھ" اور "نزہۃُ الخواطر" اس باب میں ماخذ ہیں۔

خاص خاندانی حالات اور قریب کے اجداد کی سیرت و وقائع کے لیے "اَعلامُ الہُدیٰ" سب سے بہتر اور معتبر ماخذ ہے، جو سیّد صاحبؒ کے عمِ حقیقی مولانا سیّد نعمان کی تالیفات در حضرت شاہ عَلَمُ اللہؒ اور اُن کی اولاد و احفاد کے سِیَر و حالات کا مجموعہ ہے۔ مولانا سیّد نعمان نے ان میں سے اکثر بزرگوں کا زمانہ پایا، اور ان کی صحبتیں اٹھائیں اور اپنے مشاہدات و معلومات قلم بند کیے۔

مولانا سیّد نعمان کے بعد اس خاندان کے ایک رُکن سیّد عبدالشکور (۱۲۲۴ھ - ۱۲۸۲ھ) نے خاندان کے انساب میں "گلشنِ محمودی" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس سے بعد کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔

خاندانی حالات و معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ اس خاندان کے مؤرخ اور عالمِ انساب مولوی سیّد فخرالدین، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہ، نے فراہم کیا۔ آپؒ نے "اَعلامُ الہُدیٰ" میں اضافہ کیا اور "سیرۃِ عَلَمیہ" نام رکھا۔[1] اُن کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آں حضرت، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، سے لے کر اپنے زمانۂ وفات (۱۳۲۶ھ) تک اس خاندان کے تمام افراد کے نام و نسب اور حتّی الامکان سنین و حالات و خصوصیات بڑی تحقیق و جستجو سے فراہم کیے اور "سیرۃُ السّادات" کے نام سے ایک مفصّل نسب نامہ مرتب کیا، جو خاندانی انساب، سنین و وفیات اور ممتاز افرادِ خاندان کی سیرت و خصوصیاتِ زندگی معلوم کرنے کا اس وقت واحد ماخذ ہے۔

---

(۱) مولوی سیّد فخرالدین رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہ کے صاحبزادے مولانا حکیم سیّد عبدالحیؒ نے اس میں اضافہ کیا۔ اس آخری مجموعے کا نام "تذکرۃُ الابرار" ہے۔

سیّد صاحبؒ کی سیرت پر اجمالی نظر

رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپؐ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک نہیں ہونے پاتا، آپؐ کا نمونہ آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا، آپؐ کی اُمّت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتیں اور وہ اس طرح کہ آپؐ کی مشعلِ نور سے براہِ راست مسلسل طریقے پر سیکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہی ہیں اور قیامت تک ہوتی رہیں گی۔ آپؐ کی کامل پیروی سے ہر زمانے میں، اور تقریباً ہر جگہ، کم و بیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے، جن سے آپؐ کی یاد تازہ ہوتی تھی اور انبیا کی شان نظر آتی تھی، جن سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا، اللہ کا دین زندہ ہے، رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، کی پیروی ہر زمانے میں ممکن ہے اور انھیں کی وجہ سے خَاتَمُ النَّبِیّٖن کے بعد کسی نبی کی عملاً ضرورت نہیں۔

اُن بزرگوں کے کئی طبقے ہیں۔ پہلے اور سب سے اُونچے طبقے کو صحابۂ کرامؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس طرح رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، نے نبُوّت و کمالاتِ نبُوّت کی تکمیل کر دی، اُسی طرح اُن حضرات نے آپؐ کی کامل پیروی کا حق ادا کر دیا۔ اُن کے بعد سلفِ صالحین، اولیائے کاملین، مجاہدین، مُرشدین، مُصلحین، مُجدِّدین مختلف طبقات ہیں اور یہ سب رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، کے تلامذہ و مُریدین، آپؐ کے کفش بردار اور آپؐ کے دین کے خادم ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اُن لوگوں سے اللہ ہمیشہ اپنا کام لیتا رہا، اُن سے ہزاروں کی آنکھیں روشن کیں، ہزاروں کے دل کے کنول کھلائے، ہزاروں کو جگایا، بندوں پر اپنی حُجّت تمام کی۔ اُن کا ذکر عبادت ہے، اُن کی محبت ذخیرۂ آخرت ہے، ان کی سیرت رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، کی سیرت کا ایک جز ہے۔ اگرچہ اُن میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں کامل تھا، لیکن اُن کا طلوع

میں بھی کامل وہ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کا نمونۂ کامل ہے، جس میں صحابہؓ کی شان سب سے بڑھ کر تھی، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کے مذہب و مقصد کی زیادہ خدمت و ترقی ہوئی، جس کی صحبت و تربیت سے ایسی جماعت تیار ہوئی، جس نے خیرُ القرون کی یاد تازہ کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی سیرت ایک بار ملاحظہ ہو اور آپؐ کی جامعیت پر نظر کی جائے: علم و عمل کے جامع، دین و دنیا کے جامع، شب بیدار و شہسوار، اللہ کے لیے اگر محبت کرتے تھے، تو اللہ ہی کے لیے دشمنی بھی کرتے تھے، نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد بھی کرتے تھے۔

لیکن صحابہؓ کو چھوڑ کر ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھیے۔ بہت سے لوگوں کے جسم پر یہ مسلّم قبا نظر نہیں آئے گی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کا نمونہ دیکھنا ہے، تو اُن میں سے ایک کو نہیں دیکھنا چاہیے، ورنہ آپؐ کی شان کا ناقص تصوّر ہوگا، اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی تیئیس سالہ زندگی کے صرف مخصوص اوقات کا نمونہ ہیں۔ اگر کامل نمونہ دیکھنا ہے، تو سب کو جمع کر کے دیکھنا چاہیے۔

لیکن صحابہؓ کی صف کو چھوڑ کر کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است"، ہر صف میں چند ایسے لوگ نظر آئیں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی سیرت کا مکمّل صحیفہ ہیں، جنھوں نے آپؐ کے کمالات میں سے انتخاب نہیں کیا، بلکہ ان کو مسلّم لیا۔ یہ وہ افراد ہیں، جن میں سے ہر فرد اپنی جامعیت میں ایک پوری اُمّت ہے۔ آئندہ اوراق سے معلوم ہوگا کہ انھیں افرادِ اُمّت میں سے سیّد احمد شہیدؒ بھی ایک فرد ہیں، جو زمانے کے لحاظ سے پیچھے، لیکن مرتبے کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔

اس کے بعد دوسری حیثیت پر غور کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپؐ کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومتِ الٰہی کا قائم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظامِ سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ پشاور کے فاتح اور بیرونی

صدی کے امیر المؤمنین کی زندگی میں اتباعِ نبوی کی یہ حیثیت بہت نمایاں نظر آئے گی اور اسی
چیز نے مشائخِ امت میں اس جوان کا سر اونچا کر دیا ہے۔ مصلحین اور علماء و مشائخ نے بے شبہ
اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو ان سے
ہدایت ہوئی، ہزاروں کو ان کی وجہ سے کلمہ نصیب ہوا، ہزاروں کے خاتمے اچھے ہوئے،
آج بھی رسول اللہ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، کا یہ فیض ان سے جاری ہے، لیکن ان سب کے حلقے ۵
اور عمل کے دائرے محدود ہیں۔

سید صاحب، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی کے قیام
اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ
کندن و کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی، لیکن ضرورت
فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپؒ اسی نقشے پر کام کرنا چاہتے تھے، جس پر رسول اللہ، ۱۰
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور
پائیدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لیے وہی نظامِ عمل ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں
اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ
زمانے کی فضا، طبیعتِ بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے، اور عقائد کے ساتھ ۱۵
ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے
قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو
صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو، اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لیے نمونہ ہوں۔
اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحبِ اقتدار جماعت کے
اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:- ۲۰

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ — یہ مظلوم مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انھیں

أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۲ : ۴۱)	صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی، اُن کا حکم چلنے لگا)، تو وہ نماز قائم کریں گے، اور اے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، بُرائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجامِ کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

۵ ایک نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پُورا عمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے نظامِ عمل کا ایک مُستقل حِصّہ ایسا ہے، جو حکُومت پر موقُوف ہے۔ حکُومت کے بغیر قرآنِ مجید کا ایک پُورا حِصّہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے۔ خُود اسلام کی حفاظت بھی قُوّت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا پُورا نظامِ مالی و دیوانی و فوجداری معطّل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن غلبہ و عزّت کے حصُول پر زور دیتا ہے اور اسی لیے خلافتِ اسلامی بہت اہم اور ۱۰ مقدّس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابرِ صحابہؓ نے رسُولُ اللہ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم، کی تجہیز و تکفین پر مقدّم رکھا، جسے بہُت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لیے حضرتِ حُسینؓ نے اپنی قُربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور وُہ نااہل ہاتھوں میں جانے نہ پائے۔

"اَمر بالمعرُوف" اور "نہی عَنِ المُنکر" اِسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اُمّت کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا ہے:-

۱۵ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳ : ۱۱۰)	تم بہترین قوم ہو، جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اور قیامت تک کے لیے مُسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ ۲۰ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ (۳ : ۱۰۴)	تم میں ایک ایسی جماعت رہنی چاہیے، جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی رہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور بُرائی سے روکتی رہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے اَمْر (حُکْم) اور نَہی (مُمانعت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ اَمر و نَہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکُّم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کے لیے درخواست و عرض کریں گے۔ پس امر و نہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادّی قوّت کی ضرورت ہے اور اُمّت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔

صحیحین کی مشہور حدیث ہے: ۵

مَنْ رَّأٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا، فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ، فَبِلِسَانِہٖ؛ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ، فَبِقَلْبِہٖ وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ۔

تم میں سے جو شخص کوئی بُرا کام دیکھے، اُسے ہاتھ سے روک دے؛ اگر ہاتھ سے نہ روک سکے، تو زبان سے روکے؛ اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے بُرا سمجھے اور یہ آخری درجہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ ۱۰

ظاہر ہے کہ "تَغْیِیْر بِالْیَد" (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لیے قوّت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لیے بھی کچھ قوّت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں، تو تیسرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی، جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد بعض روایات کے مطابق ایک ذرّہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا۔ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں دل سے بُرا سمجھنا اور زِشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔ ۱۵

جو تھا ناخوب، بتدریج وُہی خُوب ہُوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

اگرچہ سیّد صاحبؒ کی تاریخ میں اس کارنامۂ جہاد اور احیائے خلافتِ اسلامیہ نے اِتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عام لوگ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، لیکن خواص کی بھی اِس کے مقاصد و اسرار پر نظر نہیں۔ خُدا کو ابھی ہماری ناقدری اور نااتفاقی کی سزا دینی تھی، ۲۰ ورنہ دُنیا خلافتِ راشدہ کے بعد ہندوستان میں حکومتِ شرعیہ کا نقشہ دیکھ لیتی۔

اس موقع پر ایک چیز کی وضاحت نہایت ضروری ہے: قوموں کی تاریخ میں، اور خود مسلمانوں کی تاریخ میں، ایسے اشخاص کی کمی نہیں اور اس وقت بھی ہر ملک و قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں، جنھوں نے ذاتی برتری و اقتدار یا قومی عزت و سربلندی یا ملک و وطن کی آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کی، قوم کی تنظیم کی، وطن کو آزاد کرایا، عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں، کامرانی و اقبال مندی کی زندگی حاصل کی یا عظمت و فتحمندی کی موت مرے۔ یہ اپنے کارناموں کے درجے اور ترتیب کے مطابق انسانوں کے احترام اور ہمارے انصاف کے مستحق ہیں۔ لیکن سیّد صاحبؒ اس فہرست کے اشخاص میں سے نہیں ہیں۔ وہ اُن مجاہدین میں سے ہیں، جنھوں نے محض اللہ کے نام کی بلندی اور اس کی بات اونچی کرنے کے لیے، خالص اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے "مسلمان" نام ایک قوم کے غلبے کے لیے نہیں، بلکہ "اسلام" نام ایک مذہبی، اخلاقی، روحانی اور سیاسی نظام کو قائم کرنے کے لیے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مظلوم شریعت کو جاری کرنے کے لیے اپنے خون کا پہلا اور آخری قطرہ بہایا۔ اس کے علاوہ کسی راستے میں ان کے پسینے کا بھی کوئی قطرہ نہیں بہا۔ ایسے مجاہدین و شہدائے اسلام، ایسے اکابر و قائدینِ اسلام کی فہرست اتنی طویل نہیں، جتنی سمجھی جاتی ہے۔ زندگی اور موت کی یہ ترازو ایسی بلند معیار ہے، جس پر ہزاروں میں سے چند ہی پورے اترتے ہیں۔

اس کے بعد سیّد صاحبؒ کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالیے اور وہ یہ کہ آپؒ نے تھوڑے زمانے میں ایک دینی فضا قائم کر دی اور ایک ایسی جماعت پیدا کر دی، جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے: ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے، اللہ کے لیے جان دینے والے، شریعت پر جینے اور مرنے والے، بدعت سے نفور، شرک کے دشمن، جہاد کے نشے میں سرشار، متقی و عبادت گزار، اور بڑی بات یہ ہے کہ ہم رنگ و یک آہنگ۔ تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس یک رنگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد مشکل سے ملے گی۔ کیفیات

ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخِ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی، نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوشِ جہاد، ایمان و احتساب، شوقِ شہادت اور یقینِ آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری اور مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے ایسے محیّر العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں، تو کم یاب ضرور ہیں۔

ان آخری صدیوں میں ہم کو دُنیائے اسلام میں کسی ایسی مذہبی تحریک کا علم نہیں ہُوا، جو ہندوستان کی اس تحریکِ احیائے سُنّت و جہاد سے زیادہ منظّم و وسیع ہو اور جس کے سیاسی اور مذہبی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دُور رس ہوں۔ ہندوستان کی کوئی اصلاحی جدّ و جہد اور مسلمانوں کی کوئی سیاسی تحریک ایسی نہیں، جو اس تحریک سے متاثّر نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برِّصغیر میں موجودہ اسلامی زندگی، مذہبی اصلاح، مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملک میں مسلمانوں کے وجود کی اہمیت اور ان کا سیاسی وزن بڑی حد تک اسی طویل جہاد کا رہینِ منت ہے۔ آئندہ اوراق اسی اجمال کی تفصیل اور انھیں اشارات کی توضیح کے لیے ہیں۔

رود بناس
ریاست ٹونک
(راجپوتانہ)

مئی سنہ ۱۹۳۶ء

سیّد صاحبؒ کا زمانہ

تیرھویں صدی کی دُنیائے اسلام تیرھویں صدی یا اسلامی تاریخ کی پچھلی صدیوں میں دُنیائے اسلام میں جو عالمگیر دینی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط نظر آتا ہے، وہ دفعتہً پیدا نہیں ہُوا اور وُہ کسی وقتی واقعے یا فوری تبدیلی کا نتیجہ نہیں، بلکہ تدریج کے ساتھ پیدا ہُوا ہے۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تاریخ اسلام کے بہُت سے مسائل حل کرنے کے لیئے نیز مُصلحین و مُجاہدینِ اسلام کی مشکلات کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی ابتدائی تاریخ اور اِس کے تدریجی ارتقا پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔

اِسلام ایک دین ہے اس کے لیے ایک خاص قسم کی اعتقادی، ذہنی، اخلاقی تربیت اور انقلاب کی ضرورت ہے، نیز بہت بڑے ایثار اور قُربانی کی: جان و مال کا ایثار بھی اور اس کے خلاف ہر قسم کے خیالات و رجحانات اور ارادوں اور خواہشوں کی قُربانی بھی۔ اِسلامی دعوت کے علَمبرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وُہ قدیم و جدید تمام مخالف مؤثرات، ماحول اور مُخالف ذہنی تربیت کے اثرات سے آزاد ہو چکے ہوں اور اس کے اصُول و نظام پر پُورا ایمان لا چکے ہوں اور ذہنی اور عملی طور پر اس کے حلقہ بگوش ہو چکے ہوں۔ اسلام کے ابتدائی تیس سال تک وہ لوگ مُسلمانوں کی زندگی پر حاوی رہے، جنھوں نے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی اور صُحبتِ نبوی کی انقلاب انگیزی اور کیمیا اثری کے باوجود سالہا سال اُن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی گئی تھی۔ ان کے دل و دماغ اور ان کی زندگی کے ہر گوشے میں جاہلیّت اور اسلام کی کشمکش آخری طور پر ختم ہو چکی تھی اور صرف اسلام باقی رہ گیا تھا۔ وہ اِسلام کی عملی تصویر تھے اور ان کا عہد حکومتِ الٰہی اور حیاتِ اسلامی کا مُستند اور معیاری عہد تھا۔

ان کے بعد مُسلمانوں کی رہنمائی ان لوگوں کے حصّے میں آئی، جن کی ذہنیت اور زندگی میں جاہلیت اور اسلام کی یہ غیر فانی کشمکش ختم نہیں ہُوئی تھی اور ان میں غیر اسلامی رُجحانات

اور اثرات موجود تھے۔ بعد کے لوگوں میں یہ کشمکش جاہلیت کے غلبے اور اسلام کی مغلوبیت کی صورت میں ختم ہوئی اور قدیم جاہلیت جدید لباسوں میں ظاہر ہوتی رہی: کبھی ملوکیت کے بھیس میں، کبھی عربی قومیت کے روپ میں، کبھی دین و سیاست کی تفریق کی شکل میں اور کبھی شاہانہ شان و شوکت اور آزادانہ عیش و عشرت کے رنگ میں۔ صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مختصر عہد اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ انھوں نے اپنے مجددانہ کارناموں سے ثابت کر دیا کہ اس مجددِ وقت سلطان کے پاس وہ آبِ حیات ہے، جس سے وہ ایک پوری قوم کی گزری ہوئی جوانی واپس لا سکتا ہے، مگر ہوا کے اس طوفان میں تاریخِ بنی امیہ کا یہ فاروقی ورق جلد الٹ گیا اور سابق مضمون کا تسلسل پھر قائم ہو گیا۔

اسلام نے اپنے پیرووں میں وہ سچا عشق پیدا کر دیا تھا، جس نے نفسانیت اور انانیت کو بالکل مغلوب کر دیا تھا اور جس کی آگ نے نفس کے میل کچیل کو بالکل جلا دیا تھا۔ لیکن جب عشق کی یہ آگ بجھی اور حمیتِ اسلامی کا یہ چڑھا ہوا دریا اترا، تو وہ چیزیں نمودار ہوئیں، جو دریا کے اتار کے بعد نمودار ہوتی ہیں۔ نفسانیت و انانیت، اختلاف و خانہ جنگی، رقابت اور سازشوں نے ہر جگہ گل کھلائے، غفلت اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہوئی اور مسلمان ایک بے اصول و بے بصیرت عام حاکم قوم بن کر رہ گئے۔

اس عام زوال کا بڑا سبب خلافتِ راشدہ کا خاتمہ ہے۔ خلافت دین کی پاسبان و سرپرست اور اس کے مقاصد و مصالح کی آلۂ کار تھی۔ یہ ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو یا تو اس کے مقاصد و مصالح سمجھتے نہ تھے یا ان کے پابند نہیں رہنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کے لیے دین میں کوئی بلند نمونہ نہیں تھے۔ جب تک عہدِ نبوی کا قرب رہا، دینی ماحول اور فضا باقی تھی۔ اس انقلاب کا اثر زیادہ ظاہر نہیں ہونے پایا اور صرف انتظامی اور فوجی شعبوں تک محدود رہا۔ خلفا سے زیادہ صحابہ و علما کا اثر تھا۔ بے ضابطہ طریقے پر احتساب قائم تھا۔ علما امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے تھے۔ وہ خلفا کو ٹوک دیتے تھے اور وہ ان کی باتیں سن لیتے تھے۔ ایسے

نمونے موجود تھے، جنھیں دیکھ کر دین کا شوق پیدا ہوتا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جب یہ لوگ اُٹھنے لگے، تو اہلِ حکومت کا تسلّط بڑھا۔ علماء اہلِ دین کا اقتدار کم ہوا، تو دین کا رنگ پھیکا پڑنے لگا، اہلِ علم ودین خوف سے یا امید سے حکومت کے دامن سے وابستہ ہونے لگے، احتساب ختم ہو گیا، اسی وقت سے اسلام اپنے گھر میں پردیسی اور انتہائی دُنیاوی شوکت و عروج وحکومت کے زمانے میں بےکس ہو گیا، دیندار طبقہ اقلیّت میں ہو گیا، اہلِ حق گوشہ نشین ہو گئے اور اپنے اپنے حلقے میں اپنا فرض انجام دیتے رہے، لیکن اُن کی حالت بالکل ذمّیوں کی سی ہو گئی تھی۔

یہ حقیقت کہ خلافتِ اُمویہ یا عبّاسیہ کے عروج کا زمانہ اور ولید بن عبدالملک، ہارون و مامون اور عبدالرحمٰن الناصر کا عہد اصولی حیثیت سے معیار اور مستند نہیں ہے، ان لوگوں کے لیے نئی ہوگی، جو اسلام کے معنے "اسلامی تمدّن" سمجھتے ہیں اور اسلامی تمدّن سے ان کی مُراد بغداد و قرطبہ، دمشق و غرناطہ کا تمدّن ہوتا ہے۔ وہ اسلام کی ترقی کو میناروں کی بلندی، فنِ تعمیر کی ترقّی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ لیکن جو سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک عملی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی مذہب ہے، ان کو اس کی ترقّی بغداد اور قرطبہ کے عالی شان دارالخلافوں اور سربفلک مسجدوں کے بجائے مدینے کے جھونپڑوں میں نظر آئے گی۔

دُنیادار بادشاہ و اُمرا تو پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، زمانے کے اقتضا اور حالات کے تغیّر سے دُنیادار علماء و مشائخ کا گروہ پیدا ہوا اور یہی وہ تینوں عناصرِ فساد ہیں، جو اسلام کے درخت کو دیمک کی طرح کھاتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں:

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ
وَأَحْبَارُ سُوْءٍ وَّ رُهْبَانُهَا[1]

خلافت کا نظامِ شرعی اور اس کی برکتیں تو پہلے ختم ہو چکی تھیں، احتساب اُٹھ جانے، ہر قسم کی آزادی اور سامانِ عیش و دولت کی فراوانی سے سخت اخلاقی ابتری پیدا ہوئی، فواحش و

(۱) دین کو بعض بادشاہوں، بُرے عُلما اور تارک الدنیا پیروں نے خراب کیا۔

منکرات عام ہو گئے، شراب کا دور چلنے لگا، معصیت کی وہ تمام قسمیں رائج ہو گئیں، جن کی وجہ سے گزشتہ قوموں پر عذاب آیا تھا،(۱) علما کی آوازیں منبروں اور درس کے حلقوں تک اور مشائخ وصوفیہ کا تزکیہ اور اصلاحیں خانقاہوں تک محدود رہ گئیں۔

پہلی ہی صدی میں عجمیوں کے اختلاط نے دین کی صورت اور تخیل کو مسخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اپنے اس مرکز سے ہٹ گیا، جس پر رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، نے ۵ اس کو چھوڑا تھا۔ اس مسخ و تحریف کی انتہائی صورت، بقول ڈاکٹر سٹاڈرڈ، ایران کی شیعیت ہے، جس سے اسلام کو سیاسی اور دینی کچھ کم نقصان نہیں پہنچا۔

اس زمانے میں اسلام میں اعتقادی و عملی بدعات ظاہر ہوئیں اور یہ مصیبت پہلی مصیبت سے کم نہ تھی کہ وہ اسلام کے جسم پر حملہ تھا اور یہ اس کے دل و دماغ پر۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرا مذہب بن گیا، جس کی ایک مستقل شریعت تھی، جس کا علم کلام الگ تھا اور علم فقہ الگ۔ اگر رسول اللہ، ۱۰ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابۂ کرامؓ دوبارہ دنیا میں تشریف لاتے، تو کبھی اس کو نہ پہچان سکتے اور اگر حضرت عمرؓ زندہ ہوتے تو ان کے تازیانے کی مصروفیت بہت زیادہ ہوتی۔

رفتہ رفتہ عملیت بھی ختم ہو گئی اور اسلام عیسائیت کی طرح چند اعتقادات اور چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ سیاسی زوال کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ بغداد و اندلس کا سقوط اس وقت کے اہم واقعات ہیں، جن سے مسلمانوں کے سیاسی زوال پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ ۱۵

اگرچہ سیاست کا دین کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا، مگر سیاسی زوال کے ساتھ مذہب و اخلاق و معاشرت کو بھی زوال ہوتا گیا۔ ترکوں نے مسلمانوں کے گرتے ہوئے سیاسی اقتدار کو سنبھالا، مگر مذہب میں بوجوہ چند کوئی جان نہیں پڑی۔ سلطان صلاح الدین اعظم،

(۱) عہد اموی اور عہد عباسی میں مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کی تصویر اور اسلامی معاشرے میں عجمی عادات و تعیّشات کا نقشہ دیکھنا ہو تو ابوالفرج الاصبہانی کی تالیف "کتاب الاغانی" اور الجاحظ کی "کتاب الحیوان" ملاحظہ ہو۔

رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ نے اِسلامی جہاد کو زندہ کیا اور اس سے مُسلمانوں میں مُجاہدانہ رُوح پیدا ہو گئی لیکن جنگِ صلیبی کے خاتمے پر (اگر یہ صحیح ہے کہ اس کا اس وقت خاتمہ ہو گیا تھا) قُویٰ میں پھر اِضمحلال پیدا ہو گیا۔ اُس وقت سے عَالَمِ اِسلامی کے ہر گوشے میں وقتاً فوقتاً مُصْلِح اور مُجدِّد پیدا ہوتے رہے، جن سے مُسلمانوں میں زندگی اور بیداری پیدا ہوئی، عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی، ۵ کہیں کہیں میدانِ جہاد بھی آراستہ ہُوا اور کارگزار و صحیحُ الخیال جماعتیں پیدا ہُوئیں لیکن مُسلمانوں میں عالمگیر بیداری پیدا نہ ہُوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ رُوحانی، اخلاقی، دینی و سیاسی، عِلْمی و ذِہنی اِنحطاط کے لحاظ سے یہ صدیاں اِسلام کی تاریخ میں "قُرُونِ مُظْلِمَہ" تھیں۔

ہندوستان کی حالت

مذہبی حالت | اسلام کو عربوں کی ذہنی تربیت کا زیادہ زمانہ اور زیادہ موقع ملا اور انھوں نے براہِ راست رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت و صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اس لیے اسلام ان کی طبیعتِ ثانیہ، ان کی تہذیب و تمدّن اور اخلاق و معاشرت بن گیا تھا اور بہت سے عقلی و طبعی اسباب کی بنا پر اُن کا دماغ اس کو بآسانی قبول کر چکا تھا اور وہ اس کو صحیح روح، صحیح منشا اور شارع کے مقصد کے مطابق سمجھتے تھے۔ ان میں اس کی اشاعت اور غلبے کا جوش بھی دوسروں سے زیادہ تھا اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور چیز نہیں تھی اور اس لیے جہاں جہاں اسلام ان کے ذریعے پہنچا، وہ تازہ دم اور اپنی صحیح اور ابتدائی شکل میں تھا۔ اس میں جذب کی قوّت بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے وہاں کے مذاہب، عقائد، اخلاق و معاشرت کو فتح کر لیا اور اپنے قالب میں ڈھال دیا اور وہ قومیں عربوں کا مثنّی اور نقل بن گئیں۔ چنانچہ بگڑتے بگڑتے بھی ان میں دینِ حجازی کی شکل قائم رہی۔ ان کی خرابیاں اور کمزوریاں بھی اسی نوع کی تھیں، جس نوع کی خود عربوں کی۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام ایران و افغانستان کا چکّر کاٹ کر پہنچا اور راستے میں اپنی بہت سی تازگی اور زندگی کھو کر۔ یہاں کا اسلام سکنڈ ہینڈ تھا۔ ترک و مغل فاتحین اسلام کے اسلام میں کوئی شک نہیں، لیکن مذاہب و تہذیب فتح کرنے کے لیے اتنی روحانی قوت کافی نہیں، جتنی ان میں تھی۔ وہ خود اس درجے میں تھے کہ اُن کی دینی تربیت کی جاتی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ خود ان کی خاص تہذیب و معاشرت تھی، جو اُن کے ساتھ جاتی تھی۔ ان کا مستقل نظامِ سلطنت تھا اور وہ مبلّغ و داعی سے زیادہ حکمراں و کشور کشا تھے۔ پھر جس ملک میں وہ داخل ہو رہے تھے، اس کا خود ایک مذہب، ایک تصوّف اور ایک تہذیب تھی۔

جس وقت حریفوں کی تلواریں باہم میدانِ جنگ میں دست و گریباں ہوتیں، اُس وقت اُن کی تہذیبیں اِستفادہ و تعارُف میں مشغول ہوتی تھیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بقول ڈاکٹر لیبان اِسلام ہِندُوستان میں جتنا اثر انداز ہُوا، اُس سے زیادہ مُتأثّر ہُوا اور تھوڑے دنوں میں ایک بَین الاقوامی اور بَین المذاہب عربی، ایرانی، افغانی اور ہندوستانی مذہب و تہذیب پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں کے اسلام میں وُہ ساری کمزوریاں تھیں، جو ایران و افغانستان کے اِسلام میں تھیں اور وُہ بھی، جو ہِندو مذہب و تہذیب و تصوّف کے اختلاط سے پیدا ہُوئی تھیں۔ جو لوگ یہاں اپنے پُرانے مذہب سے اسلام میں داخل ہُوئے، وہ طبعًا اپنے ساتھ اپنی بہت سی مذہبی و قومی خصُوصیات، عقائد و خیالات لائے، جو قائم رہے اور بعد میں مذہب میں داخل ہو گئے۔ بیوہ کا نکاحِ ثانی دُنیا جہان میں کہیں عَیب نہیں، لیکن ہِندُوستان کے مُسلمانوں میں یہ جُرم گردن زدنی تھا۔

اِس زہر کا تریاق اور اسلام کی شکل محفُوظ رکھنے کے لیے دُنیا میں دو چیزیں ہیں: قُرآن و حدیث۔ قرآن کے سمجھنے کے لیے یا تو عربی زبان کی ضرُورت ہے یا ترجمے کی۔ عربی زبان تو ہندوستان میں مدارس سے باہر کبھی تھی ہی نہیں اور ترجمے کا یہ حال ہے کہ مشہور ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، نے ہِندُوستان میں سب سے پہلے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، جس پر علما میں قیامت برپا ہو گئی کہ عوام قرآنِ مجید پڑھیں گے اور گُمراہ ہوں گے۔ رہی حدیث، سو اس کے متعلق تسلیم ہے کہ گجرات اور چند ساحلی مقامات چھوڑ کر ہِندُوستان میں حدیث شیخ عبدالحق صاحب مُحدِّث لائے، یعنی، گیارھویں صدی تک ہندوستان میں حدیث نہیں آئی تھی اور آنے کے بعد بھی شاہ ولی اللہ صاحب رح اور اُن کے جانشینوں سے پہلے حدیث کا سکّہ ہندوستان میں چلا نہیں تھا۔

بعض ادوارِ حکُومت میں مذہب حکُومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت سے قطعًا محرُوم رہا، بلکہ اس کی مخالفت کی گئی اور "بادشاہِ اسلام" نے اس کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ حضرت مجدّدِ الفِ ثانی، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہ، عہدِ اکبری کے متعلق ان الفاظ میں شہادت دیتے ہیں:۔

غربتِ اسلام نزدیک بہ یک قرن بہ نہجے
قراریافتہ است کہ اہلِ کفر بمجردِ اجرائے
احکامِ کفریّہ برملا در بلادِ اسلام راضی
نمی شوند - می خواہند کہ احکامِ اسلام
بالکل زائل گردند و اثرے از مسلماناں و
مسلمانی پیدا نہ شود - کار تا بآں سرحد
رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانے از شعائرِ اسلام
اظہار نماید، بہ قتل می رسد -

(مکتوبات ص۱۰۶)

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

در قرنِ ماضی (عہدِ اکبری) کفّار برملا و
بطریقِ استیلا اجرائے احکامِ کفر در
دارالاسلام می کردند و مسلماناں از اظہارِ
احکامِ اسلام عاجز بودند و اگر می کردند بقتل
می رسیدند - وَاوَیلَاہٗ وَاحُزنَاہٗ! وَامُصِیبَتَاہٗ!
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کہ محبوب
ربّ العالمین است، مصدقانِ او
ذلیل و خوار بودند و منکرانِ او بعزّت و
اعتبار - مسلماناں با دلہائے ریش در تعزیتِ
اسلام بودند و معاندان بسخریہ و استہزا
بر جراحت ہائے ایشاں نمک

ایک صدی میں اسلام کی غربت اس درجے کو پہنچ
گئی ہے کہ اہلِ کفر اس پر راضی نہیں ہیں کہ محض
کفر کے احکام کا علانیہ اسلامی بلاد میں اجرا ہو جائے۔
وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیّہ مٹا دیے
جائیں اور مسلمانوں اور اسلام کا کوئی اثر باقی نہ
رہے - بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر
کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار
کرتا ہے، تو اس کو قتل کے انجام تک پہنچا
دیا جاتا ہے -

اکبر کے زمانے میں کفّار برملا اور غلبے کے طور
پر کفر کے احکام دارالاسلام میں جاری کرتے
تھے اور مسلمان احکامِ اسلام کے اظہار سے
عاجز تھے اور اگر کر بیٹھتے تھے، تو قتل
کر دیے جاتے تھے - وَاوَیلَاہٗ! وَاحُزنَاہٗ!
وَامُصِیبَتَاہٗ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کہ
محبوبِ ربّ العالمین ہیں، آپ کی تصدیق
کرنے والے ذلیل و خوار تھے اور آپ کے
انکار کرنے والوں کی عزت ہوتی تھی انھیں
کا اعتبار تھا - مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ
اسلام کی تعزیت میں مشغول اور کفّار اُن کا

پارشیدند۔ آفتابِ ہدایت در تحتِ ضلالت مستور شدہ بود و نورِ حق در حُجُبِ باطل منزوی۔
(مکتوب نمبر ۴۶، ص ۶۵ ج ۱)

مذاق اُڑا کر اُن کے زخموں پر نمک چھڑکا کرتے تھے۔ آفتابِ ہدایت گمراہی کے پردے میں چھپ گیا تھا اور حق کا نُور باطل کے حجابوں میں سمٹ گیا تھا۔

اس کی تفصیل دیکھنا ہو، تو عہدِ اکبری کے مُؤرِّخ ملا عبدُالقادر بدایُونی کی تاریخ "مُنتخبُ التَّوارِیخ" ملاحظہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا، تو یُوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے، اس کی حفاظتِ دین کے طریقے ہزار ہیں، لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اُتنا بگڑ جاتا، جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مُسلمانوں کے جلیلُ القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امامِ ربّانی مجدّدِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی، رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہِ، اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی، رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہِ ہیں۔ احیاے اسلام اور خدمتِ شرع کے تذکرے میں ان نائبانِ رسُولُ اللہ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، اور درویشوں کے ساتھ ایک "دُنیادار" بادشاہ مُحیُ الدّین اورنگ زیب عالمگیر مرحُوم کا نام بھی زبان پر آتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ[1] (۶۲ : ۴)

تیرھویں صدی میں ہندوستان میں مُسلمانوں کی جو مذہبی، اخلاقی اور سیاسی حالت تھی، اس کے تصوّر کے لیے موجُودہ حالت ذہن میں لانا چاہیے۔ یہ خیال رہے کہ یہ حالت بڑی جِدّ و جُہد اور اصلاح و تجدید کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی شاید بہ یک وقت سب گوشے نظر نہ آسکیں۔ اس لیے ہم اس کا ایک ناقص اور دُھندلا سا خاکہ کھینچتے ہیں۔

اگر شرک و بُت پرستی دُنیا میں کوئی چیز ہے اور لُغت اور عُرف و شرع میں اس

(۱) یہ اللہ کا فضل ہے؛ جسے چاہتا ہے، عنایت فرماتا ہے۔

کے کچھ معنے ہیں، تو وُہ صاف صاف مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی۔ قبروں اور مُردوں کے متعلق ایک مستقل شریعت بن گئی تھی، جس کے واجبات اور مستحبات ہیں انھیں سجدہ کرنا، ان سے دُعا مانگنا، بوسہ دینا، نذریں اور چادریں چڑھانا، مَنّتیں ماننا، قُربانیاں کرنا، طواف کرنا، گانا بجانا، میلہ لگانا، تہوار منانا، چراغاں کرنا، عورتوں کا جمع ہونا اور مختصر اور صحیح الفاظ ہیں اُن کو قبلہ و کعبہ اور ملجا و ماوٰی سمجھنا تھا۔ اولیاءُ اللہ اور بزرگانِ دین کے متعلق وہ سب عقائد و خیالات موجود تھے، جن کی وجہ سے نصرانی، یہودی اور مشرکینِ عرب بدنام ہیں۔ ہندوؤں اور شیعوں کی تمام رسُوم مُسلمانوں کی مُعاشرت کا جُز بن گئی تھیں اور ان سے کوئی گھر خالی نہ تھا۔ ان کی پابندی قرآن و حدیث و اسلامی فرائض سے زیادہ کی جاتی تھی۔ شرک و بدعت اور اسراف و جہالت ان کے اجزائے ترکیبی تھے۔

سُنّت و شریعت بے معنٰی الفاظ تھے، جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے۔ بدعت کی تعریف ہی کسی فعل پر صادق نہیں آتی تھی اور ہر بدعت بدعتِ حسنہ تھی۔ بہت سے حرام حلال ہو گئے تھے اور بہت سے حلال حرام۔ اسلامی شعائر اُٹھ رہے تھے اور ان کی جگہ ہندوانہ شعائر لے رہے تھے اور لے چکے تھے۔ قرآن و حدیث کے بہت سے احکام منسُوخ ہو گئے تھے، مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیمِ میراث شُرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مُستحب و فرض سے حرام و متروک ہو گئے تھے۔ ہر مسلمان کو شریعت میں ترمیم اور مستقل تشریع (قانُون سازی) کا حق تھا اور جس کو عام مُسلمان اچھا سمجھ لیں، وُہ تو مستند شریعت تھی۔

قرآن ایک مُعمّا تھا، جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اور نہ اس میں غور کرنے کی ضرُورت تھی۔ اِس لیے اس پر عمل کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور اس کا بہت سا حصّہ منسُوخ ہو کر بے کار ہو چکا تھا اور وُہ خود وقتِ ضرُورت کے لیے ادب و احتیاط کے ساتھ محفوظ

رہتا تھا۔ وہ مُردوں کے لیے تھا، زندوں کے لیے نہیں۔ وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھا اور اس کو پڑھ کر ان کی گمراہی کا اندیشہ تھا۔ رہے علما، اُن کو شرعی و ضروری علوم سے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ قرآن پر غور و تدبر کریں۔

فرائض و عبادات سے غفلت تھی، اس لیے کہ زندگی میں مقررہ مجلسیں اور بزرگوں کے کھانے، مرنے کے بعد قرآن خوانی، فاتحہ، قُل، سوُم، تیجا، چالیسواں اور سب سے بڑھ کر پیر کا وسیلہ نجات کے لیے کافی تھا، پھر اس کے علاوہ مشقت حماقت تھی۔ شعائر و آدابِ اسلام کے زوال و انحطاط کا حال اس سے معلوم ہوگا کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلامِ مسنون کی رسم ہی اُٹھ گئی تھی، حتّٰی کہ شاہ عبدالعزیز، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، کے شریعت کدے میں بھی "آداب" و "تسلیمات عرض" کا رواج تھا۔ اس سُنّت سے اتنا بُعد ہو گیا تھا کہ عالمگیر جیسا مُتشرّع اور فقیہ بادشاہ بھی اس کا متحمّل نہیں تھا۔ مشہورِ عالم مؤرّخ میر سیّد عبدالجلیل بلگرامی کے صاحب زادے میر سیّد محمّد اپنی کتاب "تبصرۃ النّاظرین" میں سنہ ۱۹ جلوسِ عالمگیری (۱۰۸۶ھ) کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

بست و ہفتم شعبان آب وارے بر زینہ ہائے مسجدِ جامع نزدیک رسیدہ سلام علیک گفت۔ حکم شد، حوالۂ کوتوال نمایند۔[1]

۲۷ شعبان کو ایک سقّے نے جامع مسجد کے زینے پر بادشاہ کے نزدیک آکر سلام علیک کہا۔ حکم ہُوا کہ کوتوال کے حوالے کیا جائے۔

اخلاقی حالت اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی حالت بعینہ وہ تھی، جو قوموں کے انحطاط اور حکومتوں کے زوال و تداخل[2] کے موقع پر ہوتی ہے۔ ان کی معاشرت اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ

(۱) "تبصرۃ النّاظرین"، مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ ص ۵۹ (افادۂ مولانا مسعود عالم ندوی)

(۲) جس طرح دو موسموں کے تداخُل کا ایک زمانہ ہوتا ہے اور اُس میں بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح قوموں اور سلطنتوں کے تداخُل کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے، جب ایک قوم یا سلطنت کا چل چلاؤ ہوتا ہے اور دوسری قوم یا سلطنت اس کی جگہ لیتی ہے۔ اس موقع پر بھی بے شمار اجتماعی و اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

مؤرخ کا قلم بھی اس کی تصویر کھینچتے شرماتا ہے۔ فسق و معصیت ان کے آداب و تہذیب میں داخل ہو کر معاشرت کا جُز بن گئی تھی اور وہ اس پر علانیہ فخر کرتے تھے۔ شراب نوشی عام تھی۔ نشہ آور چیزوں (افیون، بھنگ، تاڑی وغیرہ) کا استعمال گھر گھر تھا، جس سے اخلاق کے ساتھ قُوائے عقیلہ اور صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔ بازاری عورتیں دینی مجالس سے لے کر ہر مجلس کی زینت تھیں۔ حد یہ ہے کہ بعض شرفا اپنے لڑکوں کو ان کے پاس زبان اور علمِ مجلسی ۵ کی تعلیم کے لیے بھیجتے تھے۔ سید انشا کی "دریائے لطافت" (سنِ تصنیف ۱۲۲۳ھ) سے اندازہ ہوتا ہے کہ اربابِ نشاط کا ہر طرف دَور دَورہ تھا۔ بیسوا اور زنانِ بازاری شہری زندگی اور معاشرت کا اہم عُنصُر اور جُزءِ لاینفک تھیں، جن کی حکایات و روایات، محاورات و اصطلاحات اور تلمیحات و کِنایات سے ادب و زبان، تحریر و انشا اور اخلاق و عادات سب مُتاثّر و رنگین تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت اور مجلسی اور خانگی زندگی کا جو نقشہ "دریائے ۱۰ لطافت" میں نظر آتا ہے، اس سے تہذیب کی آنکھیں نیچی اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہے۔[1]

بہت سے لوگ نکاح میں کسی تعداد کے، بلکہ نکاح کے بھی پابند نہ تھے۔ مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہو رہے تھے اور اس درخت کو گھُن لگ چکا تھا۔ اُمرا اور متوسط طبقے کے افراد سے لے کر غُربا تک تعیُّش عام تھا۔ ہر ایک نشے میں سرشار تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ مسلمانوں کے لیے نازک ترین وقت تھا، سب بے فکر اور عیش و ۱۵ نشاط میں مشغول تھے۔ گھر گھر یہی چرچا تھا۔ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔ غربا بھی اُمرا کی نقّالی کرتے تھے اور اُمرا کی تو دُنیا ہی الگ تھی۔ ان کے لیے نہ قانونِ شریعت تھا، نہ قانونِ فطرت ع

سزاوار ہے اُن کو، جو ناسزا ہے

اخلاقی انحطاط اور قومی بے حسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے ۲۰

(۱) ملاحظہ ہو "دریائے لطافت" مطبوعۂ آفتابِ عالمتاب، مرشد آباد، ۱۸۵۰ء۔

آغاز میں کہ انگریزوں کے قدم حاکمانہ طور پر ابھی ہندوستان میں جمے نہیں تھے اور ان کا وہ رُعب وداب، جو ۱۸۵۷ء کے بعد قائم ہُوا ہے، ابھی ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر نہیں تھا، متعدد مُسلمان عورتیں یورپین تاجروں اور حکام کے گھروں میں تھیں۔ کانپور کے منڈرو فرنگی، اور آسٹس بروک ناظمِ بنارس کا ذکر تو نام کے ساتھ ہے، باقی بغیر ناموں کے بھی بعض انگریزوں کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں اور سفرناموں میں آتا ہے، جن کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں۔ ۵

سیاسی حالت سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ مدت ہوئی، بکھر چکا تھا۔ سارے ہندوستان پر یا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط تھا یا اس کے معتمدین اور حلیفوں کا۔ بچا کھچا ملک اُن قسمت آزما رئیسوں اور سرداروں کے قبضے میں تھا، جو یکے بعد دیگرے شکست کھاتے اور ملک حوالے کرتے چلے جا رہے تھے۔ شاہ عالم، جن کے عہد میں سیّد صاحبؒ پیدا اور جوان ہُوئے، صرف نام کے شاہِ ہندوستان تھے۔ سیّد صاحبؒ کی ولادت سے بائیس سال قبل ہی ۱۷۶۵ء ۱۱۷۹ھ میں بنگال، بہار، ۱۰ اُڑیسہ تینوں صُوبوں کی دیوانی بلا شرکتِ غیرے بطورِ اَلتمغا[1] "سرکارِ کمپنی" کو دی جا چکی تھی۔ سرکارِ بنارس اور غازی پور بطورِ جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے۔ اب خاندانِ تیمُوریہ کے بادشاہ (شاہ عالم) کے پاس ملک میں سے صرف صُوبۂ الٰہ آباد تھا اور آمدنی میں وُہ روپیہ تھا، جو انگریز اس کو دیتے تھے۔ ۸ مارچ ۱۷۸۷ء میں یعنی، ۱۲۰۲ھ میں، جب سیّد صاحب دو سال کے تھے، کلکتہ گزٹ میں مُشتہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر اور ذلیل ہو گئی ہے، ہندوؤں ۱۵ سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے۔"

اس کے اگلے ہی سال ۱۷۸۸ء (۱۲۰۳ھ) میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اور اس انسان کو، جو تیموری سلطنت کی عظمت و شان کا نشان اور شاہجہان و اورنگ زیب کا جانشین تھا، سخت ذلیل کیا۔ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں لارڈ لیک اپنی انگریزی فوج لے کر دلی میں داخل ہُوا، مرہٹوں کو باہر نکالا اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سال مقرر ۲۰ کردی۔ شاہ عالم اور ان کے جانشین اکبر شاہ (سن جلوس ۱۲۲۱ھ، وفات ۱۲۵۳ھ) نے اپنی بقیہ زندگی ایک وظیفہ خوار

(۱) اَلتمغا (ترکی): انعامی یا عطا شدہ جاگیر کی سند۔ اصل معنے "سُرخ مُہر"، جو اکثر شاہی فرمانوں پر پڑتی تھی۔

رئیس کی حیثیت سے گزاری، جس کا ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہ تھا اور جس کے اختیارات "قلعۂ معلّی"
کے حدود تک محدود تھے۔

زوالِ سلطنت کہنے کو تو دو لفظ ہیں، لیکن یہ کسی قوم اور ملک کی تاریخ میں قیامت سے
کم نہیں۔ سلطنت کو کمزور پاکر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دکن سے لے کر دہلی تک کا ملک اور جو کچھ
مُلک میں ہوتا ہے، مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ پنجاب سے لے کر افغانستان کے حدود تک سکھوں کا ۵
راج تھا، جن کی تاخت اور دستبُرد سے ہندوستان کا شمالی اور وسطی حصّہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ دہلی اور
اطرافِ دہلی مرہٹوں اور سکھوں کی غارتگری کا نشانہ رہتے تھے اور یہ سب جب چاہتے تھے اور جب
ان کو موقع ملتا تھا، اس آباد اور مرکزی علاقے کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتے، مال و املاک کو
لُوٹتے اور شہری شُرفا و معزّزین کو بے عزّت کرتے چلے جاتے۔ شہروں کی زندگی میں تھوڑے تھوڑے
وقفے کے بعد یہ مدّ و جزر آتے رہتے اور کوئی سکُون کے ساتھ زندگی نہ گزار سکتا۔ اس قسم کا جو سیلاب ۱۰
بھی آتا، وہ دہلی کے سر پر سے ضرور گزرتا۔ اس لیے وہاں سب سے زیادہ انتشار رہتا۔ مرہٹوں،
سکھوں اور جاٹوں کے حملے کے وقت شہر کے پُرامن باشندے اور شُرفا قصبات اور دیہات
کی طرف منتقل ہو جاتے۔ حملہ آوروں اور غارت گروں کے سیلاب کے نکل جانے کے بعد پھر
واپس آجاتے۔

بارھویں صدی ہجری کے آخر اور اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط تک یہی کیفیت تھی۔ ۱۵
اس زمانے کے خطُوط سے اس بے امنی، انتشار اور طوائفُ الملوکی کا پُورا اندازہ ہوتا ہے۔ اس
عہد کے بزرگوں اور مشاہیر کے خطُوط میں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ
سیّد شاہ ابُوسعیدؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

ایں حالت عجب حالت است۔	یہ حالت بھی عجیب حالت ہے۔ کافر سکھوں،
بسببِ غلبۂ کُفّار سکھ و مرہٹہ و جٹ بر	مرہٹوں اور جاٹوں کے مسلمانوں کے شہروں پر ۲۰
بلادِ مُسلمین و نہیبِ اموالِ ایشاں و	غلبہ پا جانے، ان کے مالوں کو لُوٹنے اور ان کو

رانتہاکِ حرکاتِ ایشاں دل و جان آسائش رافراموش نمودہ۔ چنانچہ فقیر مع قبائل بمراد آباد انتقال نمودہ است و تمام میان دو آب زیر و زبر بہ نعالِ فرسان ایں بدکیشاں شد۔ ("مآثر الابرار" قلمی)

بے عزت و بے آبرو کرتے رہنے کی وجہ سے آرام و آسائش خواب و خیال ہو گئی۔ چنانچہ فقیر اپنے متعلقین کے ساتھ مراد آباد منتقل ہو گیا ہے اور دوآبے کا سارا علاقہ ان مفسدوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہو رہا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

از تشویشاتِ ہرروزۂ دہلی تنگ آمدہ ام۔[1]

دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں اور بے اطمینانی سے تنگ آگیا ہوں۔

ایک دوسرے مکتوب میں اطلاع دیتے ہیں:-

از ہر طرف فتنہ قصدِ دہلی می کند۔[2]

ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رُخ کرتا ہے۔

ایک مکتوب میں حکومت کی بدنظمی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:-

در امورِ سلطنت نسقی نماندہ۔ خدا خیر کند![3]

سلطنت کے معاملات میں اطمینان نہیں رہا، خدا خیر کرے!

۱۱۸۶ھ (۱۷۷۳ء) میں مرہٹوں کے ایک حملے، لوٹ مار اور دیہات اور قصبات کی ویرانی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

از آشوب و ہنگامہ کہ دریں حدود بسببِ غلبۂ افواجِ جنوبی و فرارِ قومِ روہیلہ واقع شدہ و قصبات و دیہات بتاراج رفتہ چہ نویسد؟[4]

دکنی افواج (مرہٹوں) کے غلبے اور روہیلوں کے فرار کی وجہ سے ان حدود میں جو گڑبڑ اور ہنگامہ برپا ہوا ہے اور قصبات اور دیہات جس قدر ویران ہوئے ہیں، اس کا حال کیا لکھا جائے؟

(۱) "کلماتِ طیّبات"، مکتوب ۴۰
(۲) مکتوب ۴۵
(۳) مکتوب ۳۱
(۴) مکتوب ۴۶

دار السلطنت کی بد امنی اور اہلِ شہر کی پریشاں حالی کا تذکرہ فرماتے ہیں :-

احوالِ مردمِ شہر از بیماریِ عام و ناامنی تا کجا نویسد؟ خدا ازیں بلدۂ موردِ غضبِ الٰہی بر آرد کہ نسقے در امورِ سلطنت نماندہ۔ خدا خیر کند! (۱)	عام بیماری اور بد امنی سے اہلِ شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے؟ اللہ تعالیٰ اس شہر سے، جو موردِ غضبِ الٰہی بن رہا ہے، نجات دے! امورِ سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا۔ خدا اپنا فضل فرمائے!

ہندوستان کے اصل سیاسی شاطر انگریز تھے، جو اس بساطِ شطرنج پر مہروں کو لڑاتے اور آگے بڑھاتے اور پیچھے ہٹاتے رہتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں آخری منظم کوشش سلطانِ شہید سلطان ٹیپوؒ نے کی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ پچھلی صدی کے اس دورِ تجارت و سیاست میں ملک کی جو سیاسی و اخلاقی حالت تھی اور اسلامی سیاست کے مرکزوں میں اس نے جو رقابت اور تفرقہ پیدا کر دیا تھا، اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے عربی قصیدے کے ایک شعر سے ہو سکتا ہے :-

وَإِنِّيْ أَرَى الْإِفْرَنْجَ أَصْحَابَ ثَرْوَةٍ
لَقَدْ أَفْسَدُوْا مَا بَيْنَ دِهْلِيْ وَكَابُلِ (۲)

ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (Lothrop Stoddard) مشہور امریکی مصنف نے اپنی کتاب "جدید دُنیائے اسلام" (New World of Islam) میں اس دور کی سیاسی و مذہبی و اخلاقی تصویر کھینچی ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنے حواشی میں بالکل سچ لکھا ہے کہ اگر کوئی باریک بیں مسلمان حکیم و فلسفی اور اسلام کے اجتماعی امراض سے پورے طور پر باخبر مؤرخ بھی ان پچھلی صدیوں کی تصویر کھینچنا چاہے اور اس کا حال بیان کرے، تو اس سے زیادہ صحیح، مطابق

(۱) "کلماتِ طیبات" مکتوب ۸۶۔ (۲) فرنگی سرمایہ داروں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے۔

اور بلیغ تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ڈاکٹر سٹاڈرڈ لکھتا ہے:۔

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دُنیا اپنے ضُعف کی اِنتہا کو پہنچ چکی تھی۔ صحیح قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ہر جگہ جمُود و تنزّل نمایاں تھے۔ آدابِ اخلاق قابلِ نفرت تھے۔ عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ مذلّت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ تعلیم مُردہ ہو گئی تھی اور چند درسگاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں، وہ افلاس اور غُربت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ سلطنتیں مُطلق العنان تھیں اور ان میں بدنظمی اور خُون ریزی کا دَور دَورہ تھا۔ جگہ جگہ کوئی بڑا خُود مُختار، جیسے سلطانِ ٹرکی یا ہند کے شاہانِ مُغلیہ کچھ شاہی شان قائم رکھے ہُوئے تھے، اگرچہ صُوبہ جات کے اُمرا اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں، جو ظُلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں، قائم کرنے کے بہت کوشاں تھے۔ اسی طرح اُمرا متواتر سرکش، مقامی رئیسوں اور قُطّاعُ الطّریق کی جماعتوں کے خلاف، جو ملک کو آزار پہنچاتے تھے، برسرِ پیکار تھے۔ اس منحُوس طرزِ حکومت میں رعایا لُوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی۔ دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے۔ لہٰذا تجارت اور زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سدِّ رمق کے لیے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر اُمور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوّف کے طفلانہ توہّمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ عوامِ جُہّال ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ، گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فُقرا اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے اور ان کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع و

ولی کے طور پر کی جاتی تھی، کیونکہ ان جُہّال کا خیال تھا کہ خُدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے۔ قرآنِ مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پسِ پشت ڈال رکھا تھا، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔ افیون و شراب خواری عام ہو رہی تھی۔ زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کُھلم کُھلا بیحیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ، یعنی، مکّہ اور مدینہ افعالِ قبیحہ کے قعرِ مذلّت بن گئے تھے اور حج، جس کو رسُولُ اللہ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ، نے فرائض میں تعلیم کیا تھا، بدعات کی وجہ سے حقیر بن گیا تھا۔ فی الجُملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے رُوح رسمیات اور مُبتذل توہّمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اگر محمد، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ، پھر دُنیا میں آتے، تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بُت پرستی پر بے زاری کا اظہار فرماتے۔"[1]

تیرھویں صدی کے باکمال اور مشاہیرِ رجال پچھلے صفحات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ علمی، ذہنی اور دینی و رُوحانی حیثیت سے تیرھویں صدی کا یہ زمانہ بالکل تاریک اور ویران تھا اور اس ملک کے ایک گوشے سے دُوسرے گوشے تک خاک اُڑ رہی تھی، کہیں زندگی کے آثار اور کہیں روشنی کے مینار نہیں پائے جاتے تھے، صلاحیتیں یکسر مفقود ہو چکی تھیں، دل و دماغ کے سوتے بالکل خُشک ہو چکے تھے، خانقاہیں اور مدرسے اُجڑ چکے تھے اور ہندوستان کمال اور اہلِ کمال سے خالی ہو چکا تھا۔

اس کے برخلاف تیرھویں صدی کا یہ ابتدائی زمانہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا قابلِ ذکر عہد ہے اور علمی و روحانی حیثیت سے ایسا مردُم خیز اور شاداب زمانہ ہے، جو اس ملک کی علمی و رُوحانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بعض ایسی باکمال و مُمتاز ہستیاں موجود تھیں، جن کی نظیر گزشتہ دَور میں آسانی سے اور پچھلے دَور میں مشکل سے بھی

(۱) "جدید دُنیائے اسلام" مترجمہ جمیل الدین صاحب بدایُونی علیگ۔

نہیں ملے گی۔

دینی و علمی کمالات کی جامعیت کے لحاظ سے دیکھیے تو سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) اور بیہقیِ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) جیسے اکابر اسی عہد کی زینت و رونق تھے، جن کی علمی فضیلت اور روحانی فیض کا سکّہ عرب و عجم میں رواں تھا۔ شاہ صاحبؒ کے فتاویٰ اور تفسیر "فتح العزیز" اور قاضی صاحبؒ کی "تفسیرِ مظہری" اور "مالا بدّ منہ" اس دور کی مقبول ترین تصانیف ہیں۔ علومِ دینیہ اور کتاب و سنّت کے وسیع علم اور صحیح ذوق کے لحاظ سے ترجمان القرآن حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ صاحبِ "موضح قرآن" (م ۱۲۳۰ھ)، شارحِ حدیث مولانا سلام اللہ محدّث صاحبِ "محلّٰی" (م ۱۲۲۹ھ)، صاحبِ فتاویٰ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڑہانویؒ (م ۱۲۴۳ھ) اور مسندِ ہند شاہ اسحٰق دہلویؒ (م ۱۲۶۲ھ) جیسے علمائے راسخین موجود تھے، جن کا فہمِ قرآن، علمِ حدیث، فقہی نظر اور خدمتِ دین تاریخی مسلّمات میں سے ہے۔

دوسری طرف "سُلّم و مُسلّم" کے شہرۂ آفاق شارح ملک العلما مولانا عبدالعلی بحر العلوم (م ۱۲۲۵ھ) جیسے سرآمدِ روزگار، "ابطال الابراہینِ الحکمیہ" اور "تشحیذ الاذہان" اور دوسری مجتہدانہ فنی کتابوں کے مصنّف شاہ رفیع الدین دہلویؒ (م ۱۲۳۳ھ)، صاحبِ "تلخیص الشفاء" و صاحبِ "حواشیِ میر زاہد و مُلّا جلال" مولانا فضل امام خیرآبادی (م ۱۲۴۳ھ)، اور فنونِ عقلیہ کے باکمال معلم مولانا حیدر علیؒ رامپوری (م ۱۲۷۳ھ) جیسے فاضلِ یگانہ اسی زمانے میں تھے، جن کو علومِ عقلیہ میں درجۂ اجتہاد حاصل تھا۔

ذکاوت و استعداد و ملکۂ علمی میں "عبقات" اور "منصبِ امامت" کے مصنّف مولانا محمد اسمٰعیل (م ۱۲۴۶ھ) اور "ہدیہ سعیدیہ" اور "حواشیِ منطقیہ" کے مؤلف اور عربی کے قادر الکلام ناظم و ناثر مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے طبّاع، حاضر دماغ اور صاحبِ فنون عالم موجود تھے۔

علومِ ریاضیہ میں دیکھیے، تو "شرحِ مخروطات" اور "رسائلِ جبر و مقابلہ" کے مصنف نواب تفضل حسین خاں علامہ (م ۱۲۱۵ھ) "السّتۃ الجبریۃ" کے مصنف قاضی القضاۃ نجم الدین کاکوروی (م ۱۲۲۹ھ)، "فوائد الافکار" اور "تحفۂ نعمانیہ" کے مؤلف خواجہ فرید الدین (م ۱۲۴۴ھ) اور "شمس الھندسہ" اور "رسالۂ شمسیہ" کے مؤلف شمس الامرا نواب فخر الدین حیدر آبادی (م ۱۲۷۹ھ) جیسے مجتہدِ فن و موجد اسی دور کی یادگار ہیں، جن کی تالیفات فنِ ریاضی و ہیئت کا قیمتی ذخیرہ ہیں۔ ۵

مفتی اسمٰعیل لندنی، مولانا اوحد الدین بلگرامی صاحبِ "نفائس اللغات" و "مفتاح اللسان" (م ۱۲۵۰ھ) اور مولانا عبدالرحیم صفی پوری صاحبِ "منتہی الارب" (م ۱۲۶۷ھ) نے اسی دور میں اپنی لغوی تحقیقات اور علمی خدمات کی یادگاریں چھوڑیں۔

درس و تدریس کے لحاظ سے دیکھیے تو ملا مبینؒ فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ)، مولانا نور الحق لکھنویؒ (م ۱۲۳۸ھ)، مولانا حیدر علی سندیلویؒ (م ۱۲۲۵ھ)، مولانا عبدالباسط قنوجیؒ (م ۱۲۳۵ھ)، مولانا غلام جیلانی رامپوریؒ (م ۱۲۳۴ھ)، مولانا ولی اللہ لکھنویؒ (م ۱۲۷۰ھ) جیسے جہاں استاد موجود تھے، جنھوں نے برسوں درس و تدریس کا بازار گرم رکھا اور سیکڑوں طلبہ کو مرجعِ تلامذہ بنا دیا۔ ۱۰

تصنیف و تالیف و تبحرِ علمی کے لحاظ سے دیکھیے، تو مولانا باقر مدراسی (م ۱۲۲۰ھ)، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ)، مولانا رشید الدین خاں (م ۱۲۴۳ھ) جیسے مصنف و مؤلف اور وسیع النظر عالم و متکلم موجود تھے، جن کی ہر علم و فن میں تصنیفات ہیں۔ ۱۵

شعر و شاعری کے لحاظ سے یہ دور اردو شاعری کا عہدِ شباب اور موسمِ بہار ہے، جس میں وہ اساتذہ پیدا ہوئے جو اردو شاعری کا سرمایۂ فخر ہیں۔ اگر اس سے کسی قوم و نسل کی دماغی صلاحیت و زرخیزی کا اندازہ ہوسکتا ہے، تو میر حسن دہلوی (م ۱۲۰۱ھ)، میر تقی (م ۱۲۲۵ھ)، سید انشا (م ۱۲۳۳ھ)، استاد مصحفی (م ۱۲۴۰ھ)، شیخ امام بخش ناسخ (م ۱۲۵۴ھ)، ۲۰

خواجہ آتش (م ۱۲۶۳ھ) مومن خاں (م ۱۲۶۸ھ) اور ذوق (م ۱۲۷۱ھ) و غالب (م ۱۲۸۵ھ) جو اس دور کے نوجوان شاعر تھے، اس عہد کی دماغی شادابی، لطافتِ ذوق اور ذہانت و طباعی کا بہترین ثبوت ہیں۔

مشائخِ طریقت تصوف و طریقت کو دیکھیے تو ہر سلسلے کے ایسے اکابر شیوخ موجود تھے جنھوں نے اپنے طریق کو زندگیِ تازہ بخشی اور لاکھوں بندگانِ خدا ان کے انفاسِ قدسیہ سے بہرہ یاب تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ پر نظر ڈالیے تو حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) کی ذاتِ گرامی پر نظر پڑے گی، جن کے فیوض سے ہندوستان، ترکستان، عراق و شام و روم فیض یاب تھے اور جن کے متعلق بہت سے اہلِ نظر کا خیال ہے کہ فیض و افادہ کے لحاظ سے اگر ان کو تیرھویں صدی کا مجددِ طریقت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

حضرت شاہ غلام علیؒ کے علاوہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی (م ۱۲۱۸ھ) اور شاہ مراد اللہ تھانیسری (م ۱۲۴۸ھ) لکھنؤ میں، شاہ محمد آفاق (م ۱۲۵۱ھ) دہلی میں، شاہ حسین علی مکانوی پنجاب میں، شاہ درگاہی نقشبندی (م ۱۲۲۶ھ) اور شاہ رؤف احمد مجددی (م ۱۲۴۹ھ) رام پور و بھوپال کی ریاستوں میں، مولانا احمدی کرسوی، شاہ امین الدین کاکوروی (م ۱۲۵۳ھ) حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ قاضی عبدالکریم جوراسی اور ان کے خلیفہ قاضی عبدالکریمؒ نگرامی (م ۱۲۴۹ھ) اودھ میں نسبتِ مجددیہ کے حامل اور مرکزِ ہدایت و ارشاد تھے۔

سلسلۂ چشتیہ میں دیکھیے تو مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ و چشم و چراغ مولانا قطب الدین (م ۱۲۳۳ھ)، شیخ صابر بخش (م ۱۲۳۰ھ) اور شاہ میر محمدی (م ۱۲۴۲ھ) دہلی میں، شاہ نیاز احمد بریلوی (م ۱۲۵۰ھ) اور شاہ عبدالباری امروہوی (م ۱۲۲۶ھ) روہیلکھنڈ میں، شاہ سلیمان تونسوی (م ۱۲۶۷ھ) پنجاب میں، شاہ علی اکبر فیض آبادی (م ۱۲۱۰ھ)،

صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی (م ۱۲۴۵ھ)، شاہ کریم عطا سلونی (م ۱۲۴۸ھ)، شاہ پناہ عطا سلونی (م ۱۲۷۵ھ) اودھ میں، شاہ نعمت اللہ پھلواروی (م ۱۲۴۷ھ) بہار میں سلسلۂ نظامیہ اور سلسلۂ صابریہ کے برکات کے امین تھے۔

سلسلۂ قادریہ میں دیکھیے تو مولانا انوار الحق فرنگی محلی (م ۱۲۲۶ھ) لکھنؤ میں، سید آلِ احمدؒ (م ۱۲۳۵ھ) مارہرہ میں، شاہ اجملؒ (م ۱۲۳۶ھ) الٰہ آباد میں، سید صبغۃ اللہ بن محمد راشدؒ سندھ میں طالبینِ خدا کی تربیت و ارشاد میں مشغول نظر آئیں گے۔

مذہبی زندگی کے آثار اس دور میں ابھی دین کی اتنی طلب اور قدر باقی تھی کہ مدرسے طلاب علوم دینیہ سے اور خانقاہیں مردانِ خدا سے معمور تھیں، اور جن اکابر اہلِ درس و اہلِ طریق کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سے ہر ایک، ایک مستقل اور آباد مدرسہ اور خانقاہ تھا اور کہیں کہیں یہ دونوں مرکز جمع تھے۔ دہلی، لکھنؤ، روہیلکھنڈ میں بریلی، رام پور، پیلی بھیت، شاہ جہاں پور، اور اودھ کے قصبات میں گوپامئو، بلگرام، سندیلہ، خیرآباد، اس کے علاوہ قنوج، جونپور، الٰہ آباد، عظیم آباد، بوہار (بردوان)، کلکتہ، مدراس اس زمانے کے مشہور تعلیمی مرکز تھے، جن میں سینکڑوں طلبہ استفادہ و تحصیلِ علوم میں مشغول تھے۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مدرسے میں بیرونِ ہند کے طلبہ بھی اور مدراس کے مدرسۂ والاجاہی میں مولانا بحر العلوم کے درس میں ہندوستان کے اطراف واکناف کے طلبہ جمع تھے۔

خانقاہوں کے روحانی مقناطیس نے اس سے بھی زیادہ دور دور کے ذرّوں کو کھینچا تھا۔ حضرت شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ میں پانچ پانچ سو طالبین جمع رہتے تھے، جن کی ضروریات کا تکفّل خانقاہ کی طرف سے ہوتا تھا۔(۱) بیرونی ممالک میں سے سمرقند، تاشقند، بخارا، قندھار، کابل، غزنی تک کے اور ہندوستان میں مغرب میں پشاور اور شمال میں کشمیر سے لے کر مشرق میں ڈھاکے اور جنوب میں حیدرآباد تک کے لوگ ہوتے تھے۔(۲) پنجاب

(۱) آثار الصنادید، بابِ چہارم (۲) دُرّ المعارف از حضرت شاہ رؤف احمد مجددی

بیں مکان کی خانقاہ معمور خانقاہوں میں سے تھی۔ اس صدی کے آخر تک یہ حال تھا کہ شاہ امام علی صاحب کے وقت میں مہمانوں کے لیے دو سو بکرے روزانہ ذبح ہوتے تھے۔

دین سے غفلت روزافزوں تھی، مگر آنکھوں میں حیا اور دلوں میں گداز باقی تھا۔ اللہ کے نام کا ادب اور اس کی کہلانے والی چیزوں (شعائر اللہ) کا احترام رخصت نہیں ہوا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ توبہ و انابت کی توفیق سلب نہیں ہوئی تھی۔

فسق و فجور میں ترقی تھی، مگر فسق و فجور پر اصرار اور معاصی و محرمات کے اظہار و اعلان کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اہلِ دنیا کی وقعت اور اہلِ حکومت کا رعب ضرور تھا، مگر اہلِ دین کی توقیر اور اہلِ علم کا اعزاز بھی قائم تھا اور دین کے ساتھ تمسخر و استہزا کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ محکومی و غلامی کے لیے تیاری شروع ہو گئی تھی، مگر اسلاف کی مردانگی و سپہ گری کا بچا کھچا سرمایہ باقی تھا۔ شجاعت و دلیری، وفاداری، وضعداری، پختگی، استقامت، عالی ہمتی، فراخ حوصلگی، جفاکشی و مستعدی، جوہر شناسی، ذہانت و طباعی سے ابھی ہندوستانی مسلمانوں کا دامن خالی نہیں ہوا تھا۔

لیکن دین و علم کے یہ بڑے بڑے ذخیرے، جو سلف کی کوششوں سے جمع ہوئے تھے، مسلسل خرچ اور عرصے سے آمد بند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اضافہ و ترقی کا دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔

قوتوں کا غلط رُخ

زندگی کا صحیح مقصد اور قوتوں کا صحیح مصرف نہ ہونے کی وجہ سے اکثر قوتیں ضائع ہو رہی تھیں اور اعلیٰ انسانی صفات اور جذبات نے غلط رُخ اختیار کر لیا تھا۔

شجاعت و دلیری اکثر خاندانی مناقشات، رقابتوں اور حریفانہ مقابلوں میں صرف ہو کر رہ جاتی تھی۔ وفاداری کو چھوٹے چھوٹے آقاؤں اور خداوندانِ نعمت کی خدمت کے سوا کوئی اور بلند مصرف نہیں ملتا تھا۔ وضعداری چند خود ساختہ اصولوں اور

چند معاشری و مجلسی قوانین کی پابندی کا نام بن کر رہ گئی تھی۔
پختگی و استقامت تھی، مگر وہ زیادہ تر اپنی آن کے قائم رکھنے میں اور جوانی کے مشغلوں کو بڑھاپے میں نباہنے میں صرف ہوتی تھی۔
عالی ہمتی تھی، مگر وہ اکثر غربت کو چھپانے اور تنگ دستی میں امیرانہ حوصلہ مندی کے اظہار کے لیے رہ گئی تھی۔ ۵
غیرت و حمیت کا ظہور عموماً انفرادی و شخصی معاملات میں ہوتا تھا۔ دین کی مظلومی و غربت اور اُمت کی زبوں حالی پر اس میں حرکت و اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔
فیاضی و فراخ حوصلگی کا مہمان نوازی، صدقہ و خیرات یا امیرانہ داد و دہش کے علاوہ کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
جفاکشی و مستعدی تھی، مگر وہ عوام میں معاش کی تگ و دو اور آقاؤں کی خدمت، ۱۰ اُمرا میں سیاسی مہمات اور حریفوں کی سرکوبی، اہلِ دین میں مجاہدہ و عبادت اور سلوک و ریاضت کے حدود سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی۔
جوہر شناسی تھی، مگر اس کا موضوع شعرا، نغمہ سراؤں اور مصاحبین کی پرورش اور سرپرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔
ذہانت و طباعی تھی، مگر وہ اہلِ ادب میں محض شاعرانہ نازک خیالی اور نکتہ ۱۵ آفرینی اور اہلِ علم میں دقیق متنوں کی شرح و تحشیہ، اقوال کی توجیہ اور مشکلاتِ فن کی گرہ کشائی سے آگے بڑھنے نہیں پاتی تھی۔
اس نسل میں بہترین صلاحیتیں اور جوہر موجود تھے، مگر ضائع ہو رہے تھے۔ افراد تھے، مگر جماعت نہ تھی۔ اوراق تھے، مگر کتاب نہ تھی۔ کچا مال تھا، مگر کوئی کاریگر نہ تھا۔ پرزے تھے اور بہت سے متحرک بھی تھے، مگر دینی زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس لیے ۲۰ عام اور مفید حرکت نہ تھی۔

امام کا کام | اس وقت ایک ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی جو دین و علم اور صلاحیتوں کے اس بچے کھچے سرمائے سے وقت پر کام لے لے اور اس کو ٹھکانے لگائے؛

جو خانقاہوں کا حال اور درس گاہوں کا قال، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کر دے؛ جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں اور دوڑتے بھاگتے مدرسے، گھوڑوں کی پیٹھ پہ عالم ہوں اور محرابوں میں مجاہد؛

جو دلوں کی بجھتی ہوئی انگیٹھیاں دوبارہ دہکا دے، افسردہ دلوں کو ایک بار پھر گرما دے اور ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک طلب اور دین کی تڑپ کی آگ لگا دے؛

جو مسلمانوں کی خداداد قابلیتوں اور فطری صلاحیتوں کو ٹھکانے لگائے؛ جس کی سعی سے شجاعت و دلیری کا رُخ میدانِ جہاد اور حقیقی دشمن کی طرف پھر جائے؛ جذبۂ وفاداری خداوندِ حقیقی کی بندگی میں لگ جائے؛ وضعداری پختگی و استقامت فرائض و عبادات کی پابندی اور میدانِ جہاد کی ثابت قدمی میں، عالی ہمتی دین کی خدمت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مراتب کے حصول میں، غیرت و حمیت دین کی مظلومی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے احساس میں، فیاضی و فراخ حوصلگی مجاہدین کی امداد، مہاجرین کی نصرت اور جہاد و غزا کی اعانت اور دینی بھائیوں کی خدمت میں، جفاکشی و مستعدی سفرِ جہاد کی صعوبتوں کے تحمل، میدانِ جہاد کے مصائب اور دینی فرائض کی سربراہی میں، جوہر شناسی اہلِ لیاقت کی قدردانی، دین کے خادموں اور سپاہیوں کی شناخت اور تربیت میں کام آئے؛ ذہانت و طباعی دعوت و اصلاح کی حکمت، امورِ جماعت میں معاملہ فہمی و فراست، میدانِ جنگ کی تدبیر اور حکومتِ اسلامی کی دینی سیاست میں اپنے جوہر دکھائے؛ جس کی نگاہ دُور رس اور جس کی ذات مسیحا نفس کسی بیکار چیز کو بھی بیکار نہ سمجھے اور کسی بے جان کو بھی مُردہ نہ کہے اور جو اُمت کے ذخیرے کے ہر دانے اور اس کے خیابان کے ہر تنکے سے پُورا پُورا کام لے لے، جس کے متعلق ساری دُنیا کا فیصلہ ہو کہ یہ کسی مصرف کا نہیں، اس کی نگاہ کا فیصلہ ہو کہ یہی سب سے بڑھ کر

کار آمد ہے۔ جس پتھر کو ہر معمار رد کر چکا ہو، وہ کہے کہ یہی کونے کا پتھر ہے جو ساری عمارت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ وہ سنگریزوں سے دیکھتے دیکھتے ایسا کحل الجواہر تیار کر دے، جو ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں کھول دے اور عالم کو روشن کر دے؛ جو منتشر افراد سے منظم جماعت، پراگندہ اوراق سے مکمل کتاب، کچے بلکہ گلے ہوئے مال سے بہترین مصنوعات تیار کر دے۔ متضاد عناصر، مختلف مزاجوں اور متقابل طبائع کو آپس میں جوڑ کر ان کے اختلاف ۵ و تنوع سے نئی قوت حاصل کرے اور ان کو شیر و شکر کر دے۔ ہر قابلیت اور ہر ہنر سے دین کا کام لے۔ شعرا کی شاعری کو حق کے دفاع میں، علما کی قوتِ استدلال کو حق کے اثبات اور دماغوں کی سلوٹ دور کرنے میں، اہلِ باطن کی قلبی قوت کو دین کے سپاہیوں اور کارگزاروں کی تربیت و تزکیۂ نفس اور دلوں کی گرہ کھولنے میں، اہلِ قلم کی تصنیفی قابلیت و قوتِ تحریر کو توحید و سنت کی اشاعت اور جہاد کی ترغیب و تحریض میں، مقرروں کی گویائی و خطابت ۱۰ کو دین کی دعوت اور نفیرِ عام میں، دولت مندوں کی دولت کو مجاہدین کا سامان درست کرنے میں صرف کرے۔ غرض ہر پرزے کو دین کی مشین میں لگائے اور اپنی اصلی جگہ پر جمائے، پھر ہٹی ہوئی چول کو اپنی جگہ پر لا کر ساری مشین کو اس طرح حرکت دے کہ زندگی کا پورا محور گھوم جائے۔

جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو، اس کو اسلام کی بلیغ و معجز اصطلاح میں "امام" کہتے ۱۵ ہیں اور اس کی جگہ تیرھویں صدی کے تمام اہلِ کمال اور مشاہیرِ رجال کی موجودگی میں خالی تھی۔

پہلا باب

خاندان

امیر سیّد قطب الدینؒ اور اُن کی اولاد

محمّد ذوالنّفس الزکیّۃ شہیدؒ کی بارھویں پُشت میں سیّد رشید الدّین کے فرزندِ رشید شیخ الاسلام سیّد قطب الدّین محمّد الحسنی[1] ایک عالم و عارف اور عالی ہمّت بزرگ تھے، جن کو اللّٰہ تعالیٰ نے علم و تقویٰ کی دولت کے ساتھ شجاعت کا جوہر اور جہاد کا جذبہ عطا فرمایا تھا۔ سنہ ۶۰۷ھ میں خواب میں رسُولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف سے آپ کو جہاد کے لیے ہندوستان جانے کا حکم اور فتح کی بشارت ہُوئی اور آپ غزنی کے راستے سے اعزّا و سادات اور غزنی کے رؤسا و شرفا و مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دہلی تشریف لائے۔ دہلی سے پُورب کا قصد کیا اور اوّل قنوج، پھر مانک پور اور کڑا پر، جو اس زمانے میں ایک مستقل حکومت کا مرکز تھا، حملہ کیا اور اس تمام علاقے کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔[2]

امیر سیّد قطب الدین رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، ایک مُدّت تک دہلی میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز رہے۔ دِہلی کے تمام مشائخ و علما اور تمام سلاطین اپنے اپنے وقت میں آپ کا ادب و احترام کرتے رہے۔ آپ نے دہلی سے منتقل ہو کر کڑے میں مستقل سکونت اختیار فرمالی تھی، جہاں چھیانوے سال کی عمر میں ۲ رمضان سنہ ۶۷۷ھ میں وفات پائی۔[3]

---

(۱) صاحبِ "بحر الانساب" نے آپ کی تاریخِ ولادت سنہ ۵۸۱ھ لکھی ہے۔

(۲) صاحبِ "تاریخِ آئینۂ اودھ" نے سفرِ جہاد اور حملے کے مفصّل واقعات سیّد قطب الدین صاحب، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ، کے عربی ملفوظ سے نقل کیے ہیں (صفحہ ۵۰-۵۴)۔ اس ملفوظ کی صحت اور تاریخی استناد کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۳) "نزہۃ الخواطر" بحوالۂ "وفیاتُ الأعلام" از شیخ محمد یحییٰ۔

مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے امیر قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا نہایت بلند الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ قاضی ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے سید قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا آپؒ کے بعض دوسرے معاصرین کے ساتھ ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:-

من کہ مؤلف تاریخ فیروز شاہیم
از ثقات معتمر شنیدہ ام: در عصر بلبن
چند بزرگ از بقایا بزرگان شمسی
ماندہ بود و چند ملک از نوادر ملوک و
اعوان و انصار او پیدا آمدہ
کہ عہد و عصر سلطان بلبن ازاں بزرگان
وازاں ملوک آراستہ شدہ بود
و اعتبارے تمام گرفتہ۔ چنانکہ از سادات
کہ بزرگ تر بزرگان امت اند، قطب الدین
شیخ الاسلام شہر جد بزرگوار قاضیان بداؤں
و سید منتخب الدین و سید جلال الدین پسر
سید مبارک و سید عزیز الدین و سید معین الدین
سامانہ و سادات گردیزہ جد ان سید چھجو و
سادات عظام کیتھل و سادات جنجہر و
سادات بیانہ و سادات بداؤں و چندیں
سادات دیگر کہ از حادثہ چنگیز خان
ملعون دریں دیار آمدہ بودند و ہر یکے در

خاکسار مؤلف "تاریخ فیروز شاہی" نے معتبر و
معتمر بزرگوں سے سنا ہے کہ سلطان غیاث الدین
بلبن کے عہد میں چند ہستیاں جو سلطان
شمس الدین التتمش کے مبارک عہد کی یادگار تھیں،
باقی رہ گئی تھیں اور اس دور کے چند یکتائے روزگار ملوک
و امرا و اعوان سلطنت بھی موجود تھے۔ یہ بزرگ
ہستیاں اور یہ ملوک و امرا سلطان بلبن کے عہد
کے لیے باعث زینت و فخر تھے۔ چنانچہ سادات
میں سے کہ بزرگان امت کے سرتاج ہیں دارالسلطنت
دہلی کے شیخ الاسلام قطب الدین، جو بدایوں کے قاضیوں
کے جد بزرگوار ہیں اور سید منتخب الدین، سید جلال الدین
(فرزند سید مبارک) سید عزیز الدین و سید معین الدین
سامانہ، نیز گردیزی سادات (جو سید چھجو کے اجداد ہیں)
اسی طرح کیتھل کے سادات عظام و سادات جنجہر و
سادات بیانہ و سادات بداؤں اور دوسرے
متعدد سادات کرام، جو چنگیز خان ملعون
کے حادثے کی وجہ سے اس ملک میں تشریف لائے تھے

صحتِ نسب و بزرگی عدیم المثال بودند و بکمالِ تقویٰ و تدین آراستہ بر ہمہ برصدر رجحان بودند۔(۱)

ان میں سے ہر ایک صحیح النسبی اور عالی حسبی میں بے نظیر اور کمالِ تقویٰ و تدین سے آراستہ رونق بخشِ وجود تھا۔

امیر سید قطب الدین کی صحتِ نسب و علوِ خاندان کی شہادت تمام مؤرخین و مبصرین نے دی ہے۔ حضرت سید علی ہمدانی، صاحبِ "عمدۃ الطالب"، شیخ احمد اکبر آبادی صاحبِ "تذکرۃ السادات"، سید حامد بخاری سندھی اور صاحبِ "منبع الانساب" اور "صاحب بحر الانساب" نے اس کی توثیق کی ہے اور بعض نے لکھا ہے کہ "صحتِ نسبِ قطب العارفین رئیس الواصلین سید قطب الدین محمد الحسنی الحسینی از تواریخ انساب بتواتر پیوستہ"۔(۲)

حضرت سید قطب الدین کی اولاد کو اللہ نے بڑی دینی و دنیوی برکت عطا فرمائی۔ سیادت و امارت کے ساتھ علم و فضل، زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال رکھا۔ آپ کے ایک صاحبزادے سید تاج الدین تھے، جو مدت تک اودھ اور پھر بدایوں کے عہدۂ قضا پر رہے، مؤلفِ "تاریخِ فیروز شاہی" ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

و یکے ازاں سادات عظام کہ ایں دیار بوجودِ ہمایونِ او معظم و مکرم بود، سید السادات سید تاج الدین پسرِ شیخ الاسلام سید قطب الدین بودہ است۔ سید تاج الدین مذکور پدرِ سید قطب الدین و جدِ سید عز الدین از قاضیانِ بداؤں بودند سالہا قضائے اودھ حوالتِ او بود، سلطان علاء الدین اورا از اودھ معزول کردہ و قضائے بداؤں

ان سادات میں سے ایک بزرگ جن کے وجودِ مبارک سے اس ملک کو عزت و افتخار حاصل تھا، سید السادات سید تاج الدین فرزندِ شیخ الاسلام سید قطب الدین تھے۔ سید تاج الدین موصوف سید قطب الدین کے والدِ ماجد اور سید عز الدین کے جدِ بزرگوار بدایوں کے قاضیوں میں سے تھے اور سالہا سال اودھ کا منصبِ قضا ان کے سپرد رہا، سلطان علاء الدین نے اس سے سبکدوش کرکے بدایوں کا

(۱) "تاریخ فیروز شاہی" صہ ۱۱، عہدِ سلطان غیاث الدین بلبن (۲) "تذکرۃ السادات"

و او و سیّد تاج الدین علیہ الرحمۃ والغفران، بزرگوار سیدے بودہ است و چندیں صالحان و خدا طلبان مصطفیٰ را علیہ الصلوٰۃ والسلام بصورت او در خواب دیدہ بودند و تمثیلِ او مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، برہانے قاطع در صحتِ نسب او و مکارمِ اخلاق و محاسنِ اوصافِ سیّد قطب الدین پسر و نبسۂ آں سیّد بزرگوار مشاہدۂ معاصرانِ عصر است و ہر یکے از ساداتِ مذکور بزرگیِ علم و حلم و سخاوت و سائرِ فضائلِ نظیرِ خود ندارند۔ (1)

قاضی مقرر کیا۔ سید تاج الدین علیہ الرحمہ بڑے جلیل القدر سید تھے۔ متعدد بزرگوں اور طالبانِ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سید تاج الدین کی صورت میں خواب میں دیکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُن کی شکل میں نظر آنا اُن کی صحتِ نسب کے لیے دلیلِ قطعی ہے۔ قطب الدین اور اُن کے صاحبزادے اور نواسے کے اخلاقِ کریمانہ اور محاسن و اوصاف آپ کے معاصرین کے چشم دید واقعات تھے۔ ان ساداتِ کرام میں سے ہر بزرگ بزرگیِ علم و حلم، سخاوت اور دوسرے فضائل میں بے نظیر تھا۔

امیر سیّد قطب الدین کے بڑے صاحبزادے سیّد نظام الدین نے ایک فرزند یادگار چھوڑا، جن کا نام سیّد رکن الدین تھا۔ آپ ہی حضرت سید احمد شہید، رحمۃ اللہ علیہ، کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ قاضی ضیاء الدین برنی نے سیّد رکن الدین صاحب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :۔

و سیّد رکن الدین برادر زادہ سیّد تاج الدینِ مذکور قاضیِ کڑا بودہ است و باری تعالیٰ سیّد رکن الدین را جامعِ فضائل آفریدہ بود و بکشف و کرامت آراستہ و ہم صاحبِ سماع بود و ہم وجدے و حالتے عجیب داشت و روزگارِ بزرگیِ او در ترک و تجرید و ند

سیّد رکن الدین جو سیّد تاج الدین ممدوح کے بھتیجے ہیں کڑے کے قاضی تھے۔ اللہ نے سیّد رکن الدین کو ہمہ صفت موصوف پیدا کیا تھا، صاحبِ کشف و کرامت تھے، صاحبِ سماع تھے اور عجیب وجد و کیفیات رکھتے تھے، ترک و تجرید اور سخاوت درویشانہ میں آپ کا پایہ بہت

(1) "تاریخِ فیروز شاہی"، ص ۲۴۸، ص ۲۴۹۔

اِعطا در ابیات کرانہ شدہ است ۔ مؤلفِ
"تاریخ فیروز شاہی" سعادتِ ملاقاتِ سیّد
تاج الدّین و سیّد رکن الدّین رحمہما اللّٰہ دریافتہ
است و شرائطِ پاے بوسِ ایشاں بجا آوردہ
۵ من مثلِ آں سادات بزرگوار و اوصافِ سنیّہ
و حشمتے کہ دادۂ خدا ایشاں داشتند کمتر دیدہ
است ۔ سیادت ہمہ مآثر است و فرزندیِ
رسولِ ربّ العٰلمین ہمہ شرف و بزرگی و
منقبت و جلالت است کہ اگر خواہم کہ در
۱۰ محامدِ آں سادات و سائرِ سادات کہ نورِ دیدگانِ
مصطفیٰ ؐ و جگر گوشگانِ مرتضیٰ رض بودہ اند و
ہستند چیزے بنویسم سراسیمہ میشوم و بعجزِ
خویش معترف می گردم (۱)۔

بلند تھا۔ مؤلفِ "تاریخ فیروز شاہی" نے سید
تاج الدین و سید رکن الدین رحمہما اللہ کی ملاقات
و قدم بوسی کی سعادت حاصل کی ہے۔ میں نے
ایسے ساداتِ عظام، ایسے بلند اوصاف،
ایسی شوکت و حشمت کم دیکھی ہے، جو اللہ تعالیٰ
نے آپ کو نصیب کی تھی۔ سیادت خلاصۂ
مناقب ہے اور جناب رسول اللہ، صلی اللہ
علیہ وسلم، سے نسبتِ فرزندی سب سے
بڑا اعزاز ہے۔ اگر چاہوں کہ ان سادات اور
دوسرے سادات کی تعریف میں کہ نورِ دیدۂ مصطفیٰ
اور جگر گوشۂ مرتضیٰ ہیں، کچھ لکھوں تو حیران
رہ جاتا ہوں اور اپنے عجز کا اعتراف کرنا
پڑتا ہے۔

امیر سید قطب الدین کی اولاد پوری ایک صدی تک بڑی نیک نامی، عزت و حرمت
۱۵ اور دین داری اور بزرگی کے ساتھ کڑے میں مقیم رہی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید قطب الدین
ثانی نے کڑے سے جائس (ضلع رائے بریلی) نقلِ سکونت کی۔ سنہ ۷۸۶ھ میں ان کے پوتے (سید علاء الدین
کے صاحبزادے) قاضی سید محمود جائس سے نصیر آباد منتقل ہوئے، جو جائس سے صرف چار میل
کے فاصلے پر ایک آباد قصبہ اور شرفاء و سادات کا قدیم مسکن تھا۔ اس وقت سے نصیر آباد اس خاندان
کا وطن قرار پایا۔
۲۰ قاضی سید محمود کے صاحبزادے قاضی سید احمد مشہور بہ سید راجی رحمہ اس بنا پر کہ وہ ان مقدم

(۱) "تاریخ فیروز شاہی" ص ۳۴۹، عہدِ سلطان علاء الدین خلجی، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۶۲ء۔

میں ایک فریق کی زبان سے یہ لفظ نکلے کہ "از چنیں حکم شریع بیزارم" ترکِ وطن کر کے رائے بریلی تشریف لے آئے۔ ان کا خاندان اور اولاد نصیر آباد میں مقیم رہی۔ آپ کے فرزند سید محمد معظم نے دو نامور فرزند چھوڑے: سید محمد اسحٰق و سید محمد فضیل۔

سید محمد اسحٰق کے تین صاحبزادے تھے: دیوان خواجہ احمد صاحب[1]، مولانا سید ہدایت اللہ اور سید تاج الدین۔ دیوان خواجہ احمد صاحب اور مولانا ہدایت اللہ صاحب علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور کمالاتِ ظاہری و باطنی میں نہایت بلند پایہ تھے۔

سید محمد فضیل کے دو صاحبزادے تھے: حضرت شاہ داؤد اور حضرت سید شاہ علم اللہ۔ سید شاہ علم اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے جدِ امجد ہیں۔

حضرت سید شاہ علم اللہؒ دو شنبہ، ۱۲ ربیع الاوّل ۱۰۳۳ھ میں ولادت ہوئی۔ والدِ ماجد کا تقریباً ڈھائی مہینے پہلے اور والدۂ ماجدہ کا دو تین سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ماموں سید ابو محمد نے کہ امرائے شاہجہانی میں سے تھے، پرورش کی۔ تعلیم اپنے چچازاد بھائی دیوان خواجہ احمد صاحب سے حاصل کی۔ جوان ہوئے، تو ماموں نے ملازمت کی کوشش کے لیے لشکر میں طلب کیا، لیکن ملازمت سے پہلے ہی دُنیا طلبی سے دل برداشتہ ہو کر خدا طلبی کی راہ اختیار کی۔ اسبابِ امارت کو وقفِ عام کر دیا اور دو سال لشکر گاہ میں ٹھیر کر نفس کی تہذیب و تربیت کے لیے خدماتِ شاقہ انجام دیتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مجددِ الفِ ثانی، رحمۃ اللہ علیہ، کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوریؒ کا آفتابِ ہدایت و ارشاد پُورے عروج پر تھا۔ حضرت سید شاہ علم اللہ حضرت سید کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت کی اور تھوڑی مدت میں اس راہ کے تمام منازل طے کر کے اس کے انتہائی کمالات حاصل کیے اور خلافت و نیابت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت سید آدمؒ نے اپنا عمامہ اور حضرت مجددؒ کی دستارِ مبارک عنایت کی اور وطن کی طرف رخصت

(۱) آپ کی چھٹی پشت میں حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی ہیں۔ آپ کی اولاد میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ اور راقم سطور کے والدِ ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ ہیں۔

ہونے لگے، تو عرض کیا: "اس طرف اودھ میں بہت سے اولیا اور عالی مرتبہ لوگ ہیں۔ میری ان میں حیثیت ہی کیا ہوگی؟" حضرتِ سیّد آدمؒ نے کچھ دیر مُراقِب ہو کر فرمایا: "اُن میں تمھاری نسبت ایسی ہوگی جیسے چراغوں میں شمع کی۔" پھر کچھ دیر مُراقبے کے بعد فرمایا: "سیّد، خاطر جمع ہو کر جاؤ اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ تمھاری نسبت ان میں ایسی ہوگی جیسے ستاروں میں آفتاب کی۔"

حضرت آدم بنوریؒ ہندوستان سے ہجرت فرما رہے تھے۔ شاہ علم اللہؒ نے بھی ہجرت کا عزم کیا۔ حضرت سیّد نے فرمایا: "جا سکتے ہو، لیکن اگر کوئی مردِ خدا اُنھیں کہیں روک لے، تو ٹھیر جانا۔"

شاہ علم اللہ صاحبؒ اہل و عیال کو لے کر سفرِ حجاز کی نیت سے نصیر آباد سے رائے بریلی آئے، تو یہاں ایک خدا رسیدہ بزرگ شاہ عبدالشکورؒ مجذوب نے شیخ کا قول یاد دلا کر باصرار رائے بریلی کے قیام پر آمادہ کر لیا اور سئی ندی کے کنارے ایک جگہ قیام کے لیے تجویز کر دی۔ شاہ صاحبؒ نے وہیں طرحِ اقامت ڈال دی۔ ۱۰۷۵ھ میں آپ نے حج کیا[1] اور واپس تشریف لائے اور کچھ مدت قیام کر کے تقریباً ۱۰۸۲ھ میں دوبارہ حرمین تشریف لے گئے۔ واپسی میں کعبے کا نقشہ اور صحیح پیمائش ساتھ لائے اور ۱۰۸۳ھ[2] میں اس نقشے اور پیمائش کے مطابق اپنے نئے مسکن میں سئی کے بالکل کنارے اپنے اور اپنی اولاد کے ہاتھ سے خدا کا گھر تعمیر کیا، جس کی بنیادوں میں آبِ زمزم ڈالا[3] اور اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سنّت کے مطابق اپنی اولاد کو وہیں اسی نیت سے آباد کیا۔ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (۱۴ : ۳۷)، یعنی، "اے ہمارے پروردگار، میں نے اپنی اولاد کو یہاں اس لیے ٹھیرایا ہے کہ یہ نماز قائم کریں۔"

۱۰۹۶ھ میں عالمگیر کے عہد میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں مدفون ہوئے۔ انتقال کی شب کو عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ آج کی رات جنابِ

(۱) صاحبِ "نتائج الحرمین" ۱۰۷۵ھ میں آپ سے مکّۂ معظمہ میں ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۲) "قبلۂ شان" تاریخِ تعمیر ہے، جو مسجد کے جنوبی دروازے پر کندہ ہے۔

(۳) "اعلام الھدیٰ"

سید صاحب کا وطن اور آنکے جد امجد شاہ علم اللہ، رحمۃ اللہ
علیہ ! کا مسکن و مدفن - لب دریا سفید عمارت مسجد کی ہے -
اس کی دائیں جانب مدفن ہے -

شاہ علم اللہ ، رحمۃ اللہ علیہ ! کی تعمیر کی ہوئی مسجد
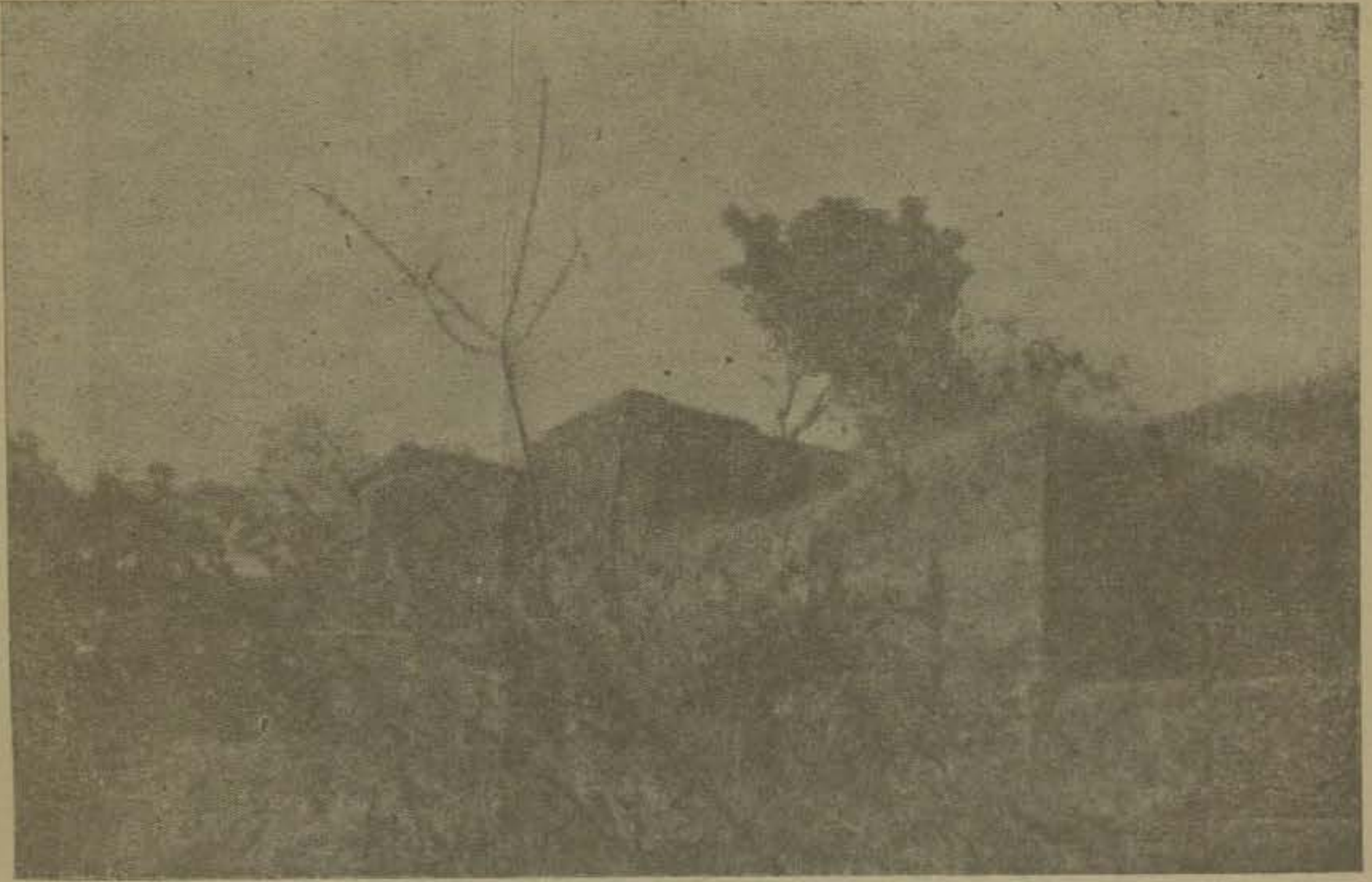
سید صاحب کے مکان کے آثار
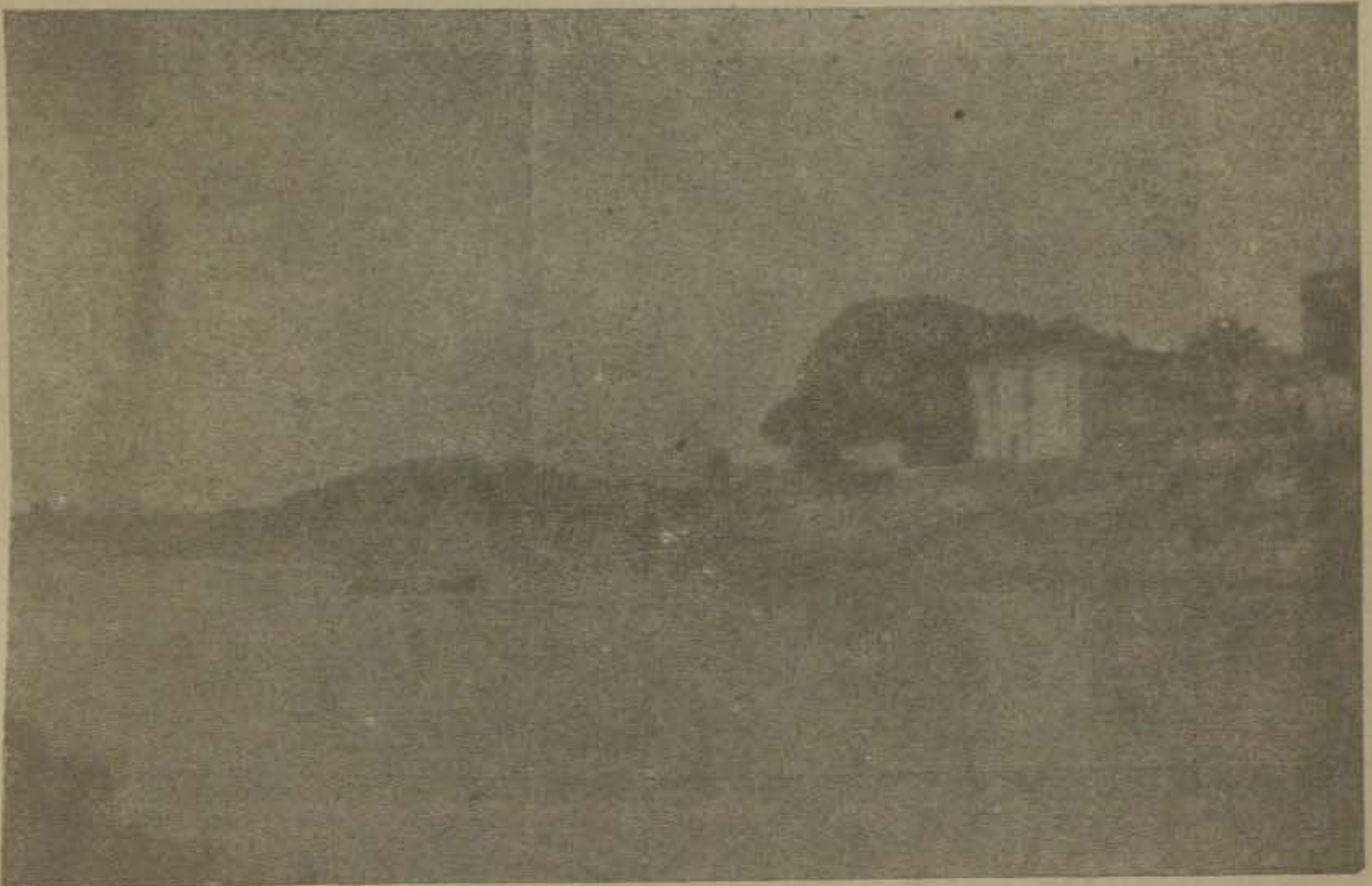
دائرۂ شاہ علم اللہ، رحمۃاللہ علیہ ! کا عمومی منظر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی۔ علما سے تعبیر دریافت کی، تو انھوں نے کہا: "اس رات سید علم اللہؒ صاحب کی وفات ہوئی ہوگی کہ وہ اتباعِ سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم تھے"۔ سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو جنابِ ممدوحؒ نے انتقال کیا۔[1]

شاہ صاحبؒ، رحمۃ اللہ علیہ، کی سیرت کا اصل جوہر، جس نے آپ کو اپنے معاصرین میں ۵ ممتاز کر رکھا تھا، عبادات کے ساتھ روزمرہ کی زندگی اور عادات میں بھی اتباعِ سنت، ہمیشہ عزیمت پر عمل اور تقویٰ تھا۔

خواجہ محمد امین بدخشیؒ، جو حضرت سید آدم بنوریؒ کے مجاز و مقرب تھے، "نتائج الحرمین" میں شاہ صاحبؒ کے ایک فیض یافتہ شیخ عبدالحکیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

> حضرت میر سید علم اللہ کہ حضرت آدم بنوری کے خلفا میں نہایت متقی، ۱۰
> کامل العلم والاحوال بزرگ ہیں، نسباً حسنی الحسینی ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن کمال اتباع سنت سے آراستہ اور ان کی ساری زندگی اور تمام اوقات سنن و مستحبات سے معمور رہیں اور وہ خود اور ان کے تمام پیرو ہمیشہ فقر و فاقہ سے گزر کرنے والے، دنیا کی بو بھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ ہندوستان اور عرب میں بھی ان کے تقویٰ اور استقامت کا غلغلہ ہے۔ اکثر مشائخ کو ان کا تقویٰ اور ریاضت و استقامت دیکھ کر ۱۵ رشک آتا ہے اور حسرت ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ دیکھو، مقبولانِ ازلی کو اللہ کی طرف سے ایسی استعداد و قابلیت نصیب ہوتی ہے۔ اپنے دوستوں، رفیقوں اور فرزندوں میں بھی ان کا عمل عزیمت ہی پر ہے۔ اپنے بیٹوں اور جاننے والوں میں سے کوئی اگر کسی امرِ مباح یا رخصت پر عمل کرے، تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں اور اگر، نعوذ

(۱) اس خواب کا تذکرہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے ملفوظات "درّ المعارف" میں بھی ہے۔ "بحرِ زخار" میں ہے کہ عالمگیرؒ نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ اور راہِ مدینہ منورہ کا اجتماع دیکھا اور کسی آشنا مشرب صوفی نے یہ تعبیر دی۔

باللہ، کسی سے کوئی بدعت کا فعل سرزد ہو جائے، تو اس سے اس درجے بیزار ہو جاتے ہیں کہ اس کا منہ دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے جب تک کہ وہ از سرِ نو تائب و متقی نہ ہو جائے۔

فقرا اور فرزندوں پر اور گھر کے اندر اور باہر کھانے کی تقسیم مساوی طور پر کرتے ہیں۔

جو عمل بھی سنّت یا مستحب ہے، اس سے ذرا تجاوز نہیں کرتے۔ ایک رسالہ "قوّت العمل" کے نام سے تحریر فرمایا ہے، جو امر بالمعروف اور ایسے بہت سے حقائق و معارفِ الٰہیہ پر مشتمل ہے کہ عارفین کے سوا ہر شخص کما حقّہٗ نہیں سمجھتا۔ اپنے احوال کا بہت اخفا فرماتے ہیں اور اپنی عاجزی اور شکستگی ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ان کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ شاید صحابۂ کرام رضؓ ایسے ہی ہوں گے۔ پابندِ شرع دوستوں اور طالبین کے ساتھ بڑی خوش خلقی اور تواضع کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[1] (۶۸ : ۴) کی متابعت کا پرتو آپ میں بہت نمایاں ہے۔

ہدایا اور نذر متقی کے سوا کسی سے قبول نہیں کرتے۔ منقول ہے کہ ایک روز دلیل خاں، جو عہدِ شاہجہانی کے امرائے کبار میں سے تھے، ملاقات کے لیے آئے۔ ان کو آپ نے امر بالمعروف کیا اور تمام امورِ خلافِ شرع سے توبہ کرائی۔ توبہ کے بعد جو نذر وہ لائے تھے، قبول فرمائی۔ وہ رخصت ہو کر تقریباً ایک کوس گئے ہوں گے کہ ان کے لشکر سے نقارے کی آواز آئی۔ اسی وقت نذر واپس بھیج دی۔

میاں شیخ عثمان شاہ جہاں پوری نے، جو حضرت آدم بنوری کے لوگوں میں تھے[2]، آپ کی تنگیِ معاش کا حال سن کر سلطان اورنگ زیب کو رقعہ لکھ کر میر سید علم اللہ اور میاں شیخ سلطان

---

(۱) اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔ (۲) حضرت سیّد آدم بنوریؒ کے نہایت ممتاز و جلیل القدر خلفا میں سے تھے جو پہلے میں سلسلۂ نقشبندیہ کے دو امام تھے: شیخ محمد سلطان ساکنِ بلیا اور سید علم اللہ ساکن رائے بریلی۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو "نتائج الحرمین"۔

کی خدمت کی ترغیب دی اور ان کا استحقاق ثابت کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میاں شیخ سلطان کے فقراء خانقاہ کے لیے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا جائے۔ چونکہ بادشاہ کو معلوم تھا کہ سید صاحب موصوف (شاہ علم اللہؒ) روزینہ قبول نہیں فرمائیں گے، اس لیے فرمایا کہ جس حلال مال سے ہمارے کھانے کا انتظام ہے، اس میں سے دو سو روپے سید صاحبؒ کی خدمت میں نذر کے طور پر پیش کیے جائیں لیکن شاہ علم اللہ صاحبؒ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ کا زہد و تقویٰ روز بروز رو بہ ترقی تھا، بخلاف اکثر مشائخ کے کہ سلوک کی ابتدا میں ریاضتیں کر کے آخر میں فارغ و سبکدوش ہو جاتے ہیں لیکن شاہ صاحبؒ نے اول تنگی و سختی و فقر کو راحت سمجھ کر اور فقر و فاقہ کو سنت کی پیروی میں جو اختیار کیا تو آخر تک اس میں ذرا فرق نہیں آنے پایا اور لذاتِ دنیاوی کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔"(۱)

صاحبِ بحرِ زخار نے آپ کے تذکرے میں یہ لفظ لکھے ہیں:۔

"مجاہداتیکہ ازاں یگانۂ زمانہ در بابِ نفرتِ دنیا باتباع طریقۂ نبویہ بظہور آمدہ بعد از صحابۂ کرامؓ در دیگر اولیاے امتِ متاخرین کمتر یافتہ می شود۔"

صاحبِ "بحرِ زخار" اور صاحبِ "اعلام الہدیٰ" لکھتے ہیں:۔

"مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے لوگ آپ کی اس قوتِ عمل، کمالِ اتباع اور عزیمت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے هٰذَا كَأَبِي ذَرٍّ" یعنی شاہ علم اللہؒ اس زمانے میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا نمونہ ہیں اور یہ فقرہ حرمین میں زبان زد ہو گیا تھا۔"

شیخ عبدالحمید ابدال (شاہ صاحبؒ کے ایک معاصر بزرگ) فرماتے تھے کہ اتباعِ سنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں سید علم اللہ صاحبؒ کی مثال اس زمانے

(۱) "نتائج الحرمین"

میں نہیں ہے اور سلف میں بھی خاص خاص لوگ اس درجے کے ہوئے ہیں۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرزندی کے علاوہ آپ کی محبوبیت بھی حاصل ہے۔ چنانچہ آپ کی اس مقبولیت اور محبوبیت کے بہت سے واقعات اور رویائے صادقہ کتابوں میں مذکور ہیں۔

شیخ عبدالحکیم اپنے زمانے کی شہادت لکھتے ہیں :-

۵ "دریں زمانہ مشہور است کہ ہم چنیں باستقامت در شریعت و طریقت و مطابقت سنت کم کسے خواہد بود الا ماشاء اللہ۔"

شاہ صاحبؒ حد درجے کے متواضع اور سادہ تھے۔ خورد و کلاں، حتیٰ کہ نوکر چاکروں کو تعظیم سے خطاب کرتے، اپنے ہاتھ سے سب کام کرتے، جھاڑو دیتے، پانی بھرتے، لکڑی کاٹ کر لاتے، کھانا پکانے میں نوکروں کے ساتھ شریک ہوتے۔ ایک مرتبہ سیلاب کے بعد ایک مخلص نے
۱۰ حویلی کی کرسی بلند کرنے کے لیے پانچ سو روپے بھیجے۔ آپ نے صاحبزادوں اور ساتھیوں سے فرمایا: "یہ رقم آئی ہے۔ چاہیے، مزدوروں سے کام لیا جائے اور اُن کو مزدوری دی جائے؛ چاہیے، تم خود محنت کرو اور مزدوری لو۔" سب نے اسی کو منظور کیا۔ شاہ صاحبؒ نے سب کی شرکت میں روزانہ محنت کر کے حویلی تعمیر کی اور سب کام سب کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کیے۔

ہر کام میں دوسرے کا ہاتھ بٹاتے اور کسی سے خدمت نہ لیتے۔ بازار سے سامان خرید کر
۱۵ سر پر اُٹھا کر لاتے۔ شیخِ وقت اور مخدومِ خلائق ہونے کے باوجود شیخیت و مخدومیت کی بُو بھی نہیں پائی جاتی تھی۔

شاہ صاحبؒ کو رسوم و بدعات اور خلافِ شریعت رواج سے بڑی نفرت تھی۔ اس رنگ کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، جو شیخ عبدالحکیمؒ نے شاہ صاحبؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے :-

۲۰ "عید الاضحیٰ کے روز سویرے نکلے آپ مسجد سے نکل کر مکان تشریف لائے۔ دروازے پر پہنچے تھے کہ دو سپاہی حضرت کی ملاقات کے لیے آئے۔ آپ دروازے

سے واپس ہوئے اور اُن کی خاطر سے اپنی نشست گاہ میں آکر بیٹھ گئے۔ آپؒ نے
اُن سے فرمایا: "تم شادی غمی میں اپنے عزیز و اہلِ برادری کے ساتھ کیا عمل کرتے ہو، سُنّت
کے موافق یا بدعت؟" ان میں سے ایک نے، جو حضرت سے پہلے سے تعلق رکھتا تھا،
جواب دیا: "ہمارا عمل حضرت کی مرضی اور ارشاد کے موافق ہے اور ہم شادی غمی میں
کسی بدعت کی محفل میں شریک نہیں ہوتے۔" فرمایا: "جَزَاکَ اللہ۔" اُس کے
ہمراہی نے کہا: "ہمیں جب اللہ توفیق دے گا، تو ہم بھی بدعت کے ان کاموں سے
باز آجائیں گے۔ ہمارا اس میں کچھ اختیار نہیں۔" حضرت نے فرمایا: "اس طرح مت کہو۔
ہر عاقل و بالغ کو اللہ نے اختیار دیا ہے اور یہ کہنا کہ 'اللہ توفیق دے' کل قیامت
کو اللہ کے حضور میں یہ دلیل کچھ کام نہیں آئے گی۔ اگر یہ دلیل کارآمد ہو، تو ہر شخص کی
گلو خلاصی ہو جائے۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ ان کا گیہوں کھانا
ایک تقدیری امر تھا، لیکن اُنھوں نے بھی اپنی تقصیر کا اعتراف کیا اور کہا: رَبَّنَا
ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (۷: ۲۳) یعنی 'اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا' اور
یہ نہیں کہا: 'اے اللہ، گیہوں نہ کھانے کی توفیق تُو نے کیوں نہیں دی؟' کسی آدمی کا
کسی پر قرض ہوتا ہے اور وہ آدمی اس سے مطالبہ کرتا ہے، تو قرضدار یہ نہیں کہتا: 'اگر
خدا توفیق دے گا تو تیرا قرض ادا کر دوں گا'، بلکہ چار و ناچار کہیں نہ کہیں سے انتظام کرنا
پڑتا ہے یا نہ ہونے پر بالکل عذر کرتا ہے یا اسے معاف کروا لیتا ہے یا کسی دوسرے وقت
پر رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ اسلام کے مفہوم پر عمل کریں۔ اسلام
کیا ہے؟ اللہ کے احکام کے آگے سر جھکا دینا اور اس کے ممنوعات سے بچنا۔ پس اللہ کے احکام
کے آگے سر جھکا دینا چاہیے اور ان تمام چیزوں سے، جن سے اللہ نے روکا ہے، مجتنب
رہنا چاہیے اور سنّت کی پیروی کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ بندہ جب نیک کام
اختیار کرتا ہے، تو حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کی امداد و اعانت فرماتا ہے اور اس کو خیر کی

زیادہ توفیق دیتا ہے۔ جب بندے کا اخلاص اللہ سچا دیکھتا ہے، تو اس کی طرف سے
فضل و کرم ہی کا معاملہ ہوتا ہے۔ البتہ بندے کو استقامت سے کام لینا چاہیے۔"

شاہ صاحبؒ کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر سختی سے عمل تھا۔ کوئی خلافِ شرع یا
خلافِ سُنّت بات دیکھتے، تو بے تامّل ٹوک دیتے۔ کسی کا رسُوخ و وجاہت، ریاست و امارت
۵ یا علم و فضل اس سے مانع نہ ہوتا۔

حضرت شاہ پیر محمّد لکھنوی، رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زمانے کے نہایت جلیل القدر عالم،
شیخِ وقت اور اودھ کے اکثر علما کے اُستاد تھے۔ ایک مرتبہ رائے بریلی آپ کی قیامگاہ پر تشریف
لائے اور دونوں جلیل القدر معاصرین کی ملاقات ہُوئی۔ شاہ پیر محمّد صاحبؒ کے جسم پر اس وقت
ایک رنگین گلابی لباس اور گردن میں مالا پڑی ہُوئی تھی۔ شاہ علم اللہ صاحبؒ نے فرمایا: "جناب
۱۰ رئیس العلما اور کتاب و سنّت سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ یہ فرمائیں کہ اس مالا اور زُنّار کے
درمیان بافت اور تافت کے سوا کیا فرق ہے"۔ شاہ صاحب ممدوح نہایت منصف مزاج بزرگ تھے۔
بے تامّل مالا گردن سے اُتار دی۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے بعد فرمایا: "یہ رنگین گلابی کپڑے بھی خلافِ
سُنّت لباس اور ہندوستان کے جوگیوں کی پوشاک ہے۔ آپ جیسے خواص کے شایانِ شان نہیں"۔
شاہ پیر محمّد صاحبؒ نے فرمایا: "یہ رنگ میل نہیں قبول کرتا اور ذرا دیر میں دھونے کی ضرورت ہوتی ہے
۱۵ اس لیے حالتِ سفر میں مُباح ہے۔" شاہ علم اللہ صاحبؒ نے فرمایا: "یہ توجیہ تکلّف سے خالی نہیں۔
جناب کا یہ کُرتہ اور چادر اور عمامہ جس قیمت کا ہے، اس میں اس بات کی کیا رُخصت ہو سکتی ہے؟ پھر
جناب کے خُدام کو یہ زحمت برداشت کرنی چاہیے۔" شاہ پیر محمّد صاحبؒ نے اس کا اعتراف فرمایا اور
شاہ صاحبؒ کی بات قبُول کی۔ جب رُخصت ہو کر وہاں سے تشریف لے گئے، تو خادموں اور شاگردوں
نے عرض کیا: "جناب نے شاہ علم اللہ صاحبؒ کے اعتراض کو اس قدر جلد قبُول کر لیا تو ہم خُدام بڑے محجُوب
۲۰ ہُوئے۔ حضرت ملک العلما اور یکتائے زمانہ ہیں۔ بہت سی توجیہات فرما سکتے تھے۔" شاہ پیر محمّد صاحبؒ چون
کہ علمائے راسخین اور اولیائے کاملین میں سے تھے اور نفسانیت اور انانیت کا کانٹا دل سے نکل چکا

تھا۔ رُفقا سے فرمایا: "سید صاحبؒ کا ارشاد بالکل حق اور سُنّت کے موافق تھا۔ ایسی بات میں سینہ زوری کرنے سے حق بات کا انکار اور رسُول اللہ، صَلّی اللہُ علیہ وسلم، کے حکم کی مخالفت کا خطرہ تھا۔"

دُوسرے مشائخ و علما اور نامور معاصرین حضرت شاہ پیر محمد سلونی اور مولانا شیخ احمد صاحب "تفسیرات احمدیہ" (مُلّا جیون صاحب) سے سماع اور غنا کے باب میں اسی طرح کے مکالمے منقول ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خواص کا یہ عذر بھی مقبول نہیں تھا کہ ہمیں اپنے گھر والوں پر اختیار نہیں۔ آپ کے پیشِ نظر یہ حدیث رہتی تھی أَلَا، كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ، یعنی سُن لو، تُم میں ہر شخص صاحبِ رعیّت اور ذمّے دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیّت (اس کے زیرِ دست اور متعلقین) کے متعلق سوال ہوگا۔ بزرگوں کا عمل دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا تو شاہ صاحبؒ فرماتے: "عمل کے لیے مجتہدوں کا قول درکار ہے، بزرگوں کا عمل نہیں۔" آپ کے معاصرین اختلافِ مسلک و ذوق کے باوجُود آپ کی بزرگی اور اتباعِ سُنّت کا اعتراف کرتے۔

عزیمت اور صبر و استقامت کی مثال یہ ہے کہ محبُوب فرزند سید ابُو حنیفہ صاحبؒ نے بتیس ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا، لیکن گھر سے کوئی آواز اور آہٹ بھی ایسی نہیں سُنی گئی، جس سے اس واقعے کا علم ہوتا۔ اہلِ خانقاہ کو کانوں کان خبر نہ ہُوئی۔ شاہ صاحبؒ نے صُبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ نماز کے بعد خلافِ معمُول مُصلّے سے اٹھ کر دروازے تک آئے اور خُدّامِ خاص میں سے ایک کو بُلا کر فرمایا: "رات میاں ابُو حنیفہ کا انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا چاہیے۔" اُسی دن دفن کرنے کے بعد متوجہ ہو کر فرمایا: "اَلحمدُ لِلّٰہ، میاں ابُو حنیفہ اس دُنیا سے دولتِ ایمان کے ساتھ گئے۔" اس خُوشی میں پانچ روپے کی مٹھائی تقسیم کی۔ ایک ضعیفہ روزانہ چرخہ چلایا کرتی تھیں۔ گھر تشریف لے گئے۔ فرمایا: "آج چرخہ کیوں بند ہے؟" ان بڑی بی نے عرض کیا: "حضرت! ایسا لائق و جوان بیٹا دُنیا سے اُٹھ جائے، اُس کے غم میں ہم اپنا چرخہ بھی بند نہ کریں؟" فرمایا: "یہ سب قضا و قدر کی باتیں ہیں۔ اللہ کے حکم میں کسی کو دم مارنے کا چارہ نہیں۔ زندگی مُستعار ہے۔ راضی برضا رہنا چاہیے۔ تم اپنا کام بند نہ کرو۔"

حضرت شاہ علم اللہؒ کی اولاد حضرت شاہ صاحبؒ کی اولاد میں اتنے جلیل القدر مشائخ اور مقبول اولیاءاللہ اس تسلسل اور کثرت سے ہوئے، جس کی نظیر دوسرے خانوادوں میں مشکل سے ملے گی۔

شاہ صاحبؒ کے چاروں صاحبزادے حضرت سید آیت اللہؒ، سید محمد ہدیٰؒ، سید ابو حنیفہؒ اور سید محمد جیؒ آفتاب و ماہتاب تھے۔ حضرت سید آیت اللہؒ کے صاحبزادوں میں سید محمد ضیا و سید محمد صابر، سید محمد ضیا کے صاحبزادے حضرت شاہ ابو سعید صاحبؒ (خلیفۂ شاہ ولی اللہ صاحبؒ و جدِّ مادری حضرت سید احمد شہیدؒ) اور سید محمد صابر کے صاحبزادے مولانا سید محمد واضحؒ، پھر ان کے صاحبزادے مولانا سید قطب الہدیٰ محدثؒ، اور سید قطب الہدیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے برادر زادے مولانا سید محمد ظاہرؒ (خلیفۂ حضرت سید احمد شہیدؒ) اور آخر میں آپ کے برادر زادے سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اپنے وقت کے مرشد و ہادی تھے۔

اسی طرح سید محمد ہدیٰؒ کے صاحبزادے سید محمد نورؒ اور پوتے سید محمد جیا بن محمد ثنا اور سید محمد نورؒ کے صاحبزادوں میں مولانا سید نعمان اور سید عرفانؒ، سید عرفانؒ کے صاحبزادے مولانا سید محمد اسحٰق اور حضرت سید احمد اسی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں۔

سید ابو حنیفہ کے صاحبزادے سید محمد باقی اور حضرت سید محمدؒ کے صاحبزادے سید محمد حکم اور سید محمد عدل (عرف شاہ لعل) تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے فضائل و مناقب کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

این سلسلہ از طلائے ناب است
این خانہ تمام آفتاب است

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس خاندان کے بزرگوں نے ہمیشہ جہاد میں حصہ لیا۔ شاہ علم اللہؒ کے تین صاحبزادے جہاد میں شریک ہوئے اور دو پوتے میر عظیم الدینؒ ابن سید آیت اللہ اور سید محمد جامع بن میر محمد احسن بن سید آیت اللہ اور ایک بھتیجے اور داماد سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ شہید ہوئے۔[1]

(۱) تذکرۃ الابرار و "سیرۃ السادات"۔

حضرت شاہ علم اللہ کے فیض و کمالات سے اس خاندان کو ایسی باطنی ترقی اور رُوحانی امتیاز حاصل ہوا جو صرف مجددینِ طریقت کے قریبی سلسلوں میں ہوتا ہے۔ اس خاندان کے مشائخ کی ایک مخصوص نسبت تھی جو سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت و تاثیر نے خدا طلبی کا وہ ذوق اور دین کا وہ کیف پیدا کر دیا تھا، جس سے اس خاندان کے چھوٹے بڑے اور مرد و عورت سرشار تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے پوتے مولانا سیّد محمّد صابرؒ نے منازلِ سلوک حضرت مجدّدِ سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شیخ محمّد صدیق بن حضرت شیخ محمّد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں طے کیے تھے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ (زوجۂ حضرت سیّد آیت اللہ بن حضرت شاہ علم اللہؒ) نے جن کے متعلق صاحبِ "سیرۃِ علمیہ" کے الفاظ ہیں:-

"دریں راہ تربیت یافتۂ حضرت قدوۃ الاتقیا مولانا سیّد علم اللہ بودہ در طریقت بر بسیارے مردانِ راہروان مسابقت نمودہ و ہمّتِ مؤثرہ و انفاسِ عالیہ داشتہ۔"

آپ کو دِہلی سے طلب کر کے اسلافِ کرام کے سجّادے پر بٹھایا اور حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی نسبتِ خاصّہ، جس سے آپ حظِّ وافر رکھتی تھیں اور مجازِ ارشاد تھیں، آپ کو عطا کی۔ چنانچہ حضرت سیّد محمّد صابر طالبینِ راہ کو اکثر اس کی تعلیم کرتے تھے اور لوگ جُوق در جُوق فیضیاب ہوتے تھے۔

اِس خاندان کے بہت سے بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور آپ کے صاحبزادوں سے ظاہری و باطنی استفادہ کیا۔ حضرت شاہ محمّد واضح اور حضرت شاہ ابوسعید اور حضرت سیّد محمّد معین اور حضرت سیّد محمد نعمان (عمِّ حضرت سیّد صاحب) نے حضرت شاہ ولی اللہؒ سے اور مولانا سیّد قطب الہدیٰ اور مولانا سیّد محمّد اسحٰق (برادرِ حضرت سیّد صاحب) نے حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت شاہ عبد القادر سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدّدِ سرہندی اور حضرت مجدّدِ دہلوی کی برکتیں اور نعمتیں جمع ہو گئیں۔

حضرت سیّد محمّد ہُدیٰ آپ حضرت سیّد شاہ علم اللہؒ کے فرزندِ دوم اور حضرت سیّد صاحبؒ کے پردادا ہیں۔ سخاوت و ایثار کے باب میں صاحبِ حال تھے۔ سائل کے سوال پر "نہیں" کہنا نہیں

جانتے تھے۔ عین فاقے کی حالت میں اگر سائل نے سوال کر دیا، تو کھانا اُٹھا کر دے دیا اور بھوکے رہے۔ اگر دینے کو کچھ نقد نہ ہوتا، تو گھر کا زیور فروخت کر کے اُس کی ضرورت پوری کرتے۔ شاہی ملازمت میں تھے۔ مشاہرہ بھی ملتا تھا اور جاگیر کے گاؤں بھی تھے، جن میں سے دو گاؤں گھر والوں کے اخراجات کے لیے مخصوص کر دیے تھے اور دو تین گاؤں اہلِ محلّہ اور برادری والوں کو دے رکھے تھے۔ باقی

۵ اپنے خرچ، سخاوت اور اہلِ حاجت کی حاجت روائی کے لیے رکھ لیے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جاگیر سے بارہ ہزار دینار (سکۂ عالمگیری) آئے۔ ایک ہی مجلس میں تقسیم کر کے اُٹھے اور رات فاقے سے گزاری۔ ایک مرتبہ لشکر میں بڑا قحط پڑا۔ تین ہزار آدمیوں نے اپنے کو آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ قحط کے اُٹھ جانے کے بعد آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔ ایک روز لشکر میں آپ کو تین متواتر فاقے ہوئے۔ کہیں سے سو روپے آئے اور سائل بھی سُن کر آ گئے۔ سب اُٹھا کر اُن کو دے دیے اور

۱۰ چوتھا فاقہ کیا۔ مولانا سیّد محمد نعمان نے ایسے کئی واقعات لکھے ہیں۔(۱)

لباس اہلِ دُنیا میں درویش صفت تھے۔ صاحبزادی بیان کرتی ہیں "میں نے والدِ محترم کو دیکھا ہے کہ نصف شب میں اُٹھ جاتے، تہجّد کی نماز ادا کرتے، پھر قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ اکثر صبح تک ختم کر دیتے۔ پھر مراقبے میں مشغول ہو جاتے۔"

حضورِ مع اللہ اور نسبت یادداشت رکھتے تھے۔ معمولات و نوافل میں کبھی فرق نہ آتا۔

۱۵ صبح کی نماز کے بعد اور عصر و مغرب کے درمیان، جیسا کہ مشائخ کا معمول ہے، ذکر اور مراقبے میں مشغول رہتے۔ کبھی بڑی پوشیدگی کے ساتھ کسی طالبِ صادق کو طریق کی بھی تعلیم و تربیت کی ہے۔

دُنیا کی زیب و زینت کی طرف مطلق التفات نہ تھا۔ حیثیت و استطاعت کے باوجود رہنے کے لیے پختہ مکان بھی نہیں بنایا۔ اگر کسی نے کبھی اس کی ترغیب دی، تو فرمایا: "زندگی کی چند سانسیں ہیں۔ چھپّر کے نیچے گزر گئیں، یا پختہ حویلی میں۔ عمارت میں روپیہ لگانا روپے کو ضائع کرنا ہے۔ آخرت

۲۰

(۱) "اعلام الہدیٰ"

کی پائدار عمارت کی تعمیر کی فکر کرنا ہوشیاری کی بات ہے۔" کچا مکان بنایا اور جنگلی درختوں کی لکڑی کے شہتیر رکھے۔

شاہ گردی کے زمانے میں وطن ہی میں تھے۔ شاہ عالم بہادر شاہ کی سلطنت کا استقرار ہوا، تو لشکر میں تشریف لے گئے۔ صاحبزادے سید محمد سنا اور بھتیجے سید محمد باقی ہمراہ تھے۔ بادشاہ کا کوچ حیدر آباد کی طرف ہوا۔ آپ راستے میں برہان پور کے قریب بیمار ہوئے۔ احتضار شروع ہوا، تو ۵
پالکی رکھ دی گئی اور آپ کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ برہان پور میں کچھ دنوں تک جسدِ مبارک زمین میں امانت رہا۔ پھر رائے بریلی لاکر شاہ علم اللہؒ کی مسجد کے شمال مشرقی گوشے سے متصل سپردِ خاک کیا گیا۔[1]

سید محمد نورؒ حضرت سید محمد ہدیٰ کے فرزندِ اکبر اور سید صاحبؒ کے حقیقی دادا تھے۔ اپنے اسلاف کے جانشین وہمرنگ اور سخاوت و ایثار میں والدِ نامدار کی یادگار تھے۔ ۱۰

آپ اپنے دادا حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے خاص منظورِ نظر اور تربیت یافتہ تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اتباعِ شریعت اور ان کی اخلاقی و روحانی تربیت میں بہت کوشش فرمائی تھی۔ ان کے والدِ ماجد حضرت سید محمد ہدیٰؒ اکثر فرماتے تھے: "اس بچے کی تربیت کی وجہ سے امید ہے کہ اللہ میری مغفرت فرمادے گا۔"

والد کے حکم سے شاہزادہ محمد اعظم شاہ (پسرِ عالمگیرؒ) کی ملازمت کے لیے تشریف ۱۵
لے گئے۔ شمشیر خاں، جو حضرت شاہ علم اللہؒ کے مرید اور اعظم شاہی امیر تھے، درمیان میں واسطہ تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا: "میری ملازمت کی شرط یہ ہے کہ میں آدابِ شاہی تسلیمات و بندگی سے معاف رکھا جاؤں، ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔" شمشیر خاں نے مجبور ہو کر شاہزادے سے عرض کیا۔ اعظم شاہ نے فرمایا: "کوئی حرج نہیں، وہ صرف سلامِ مسنون پر اکتفا کریں۔ ایسے لوگ موجبِ برکت ہیں۔"

کچھ عرصے کے بعد ایک خواب کی بنا پر، جس میں اعظم شاہ کے رفض کی وجہ سے زوالِ ۲۰

(۱) "اعلام الہدیٰ" و "سیرۃ علمیہ"

سلطنت کی خبر دی گئی تھی، آپ نے ملازمت ترک کر دی۔

سید محمد نور، رحمۃ اللہ علیہ، بہت متقی اور محتاط بزرگ تھے۔ غیر دیندار اور غیر متشرع لوگوں سے کچھ قبول نہ کرتے۔ اپنے دادا حضرت سید علم اللہؒ کی طرح مشتبہ کھانے سے نہایت پرہیز کرتے اور اکلِ حلال کا بڑا اہتمام رکھتے۔ اپنے اوقات کو تلاوتِ قرآن، اورادِ مسنونہ اور باطنی اشغال کے ساتھ معمور رکھتے۔ لایعنی بات اور غیبت سے سخت نفرت تھی۔ غربا کی تجہیز و تکفین میں بڑی امداد کرتے۔ صلۂ رحمیِ اعزّا اور ہمسایوں کے حقوق کا بڑا خیال رکھتے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ سبقت کرتے۔ وفات کے وقت رقتِ قلب بہت بڑھ گئی تھی اور نسبتِ حضور و یادداشت بڑی ترقی اور قوت پر تھی۔ اکثر فرماتے تھے: "کوئی عمل اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل تو نہیں ہے، لیکن بعض بشارتوں کی بنا پر اللہ کی رحمت کی ضرور امید ہوتی ہے۔"

۶ ربیع الاول سنہ ۱۱۴۸ھ چہارشنبہ کے دن انتقال کیا اور نصیر آباد میں اپنے نانا حضرت شاہ داؤد (برادرِ حقیقی حضرت شاہ علم اللہؒ) کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔[1]

سید شاہ ابو سعیدؒ سید صاحبؒ کے نانا حضرت سید شاہ ابو سعید بن حضرت سید محمد ضیا، حضرت شاہ علم اللہؒ کے پوتے، اپنے زمانے کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے۔ جوانی میں اپنے عمِ محترم مولانا سید محمد صابر علیہ الرحمہ، کے ہاتھ پر بیعتِ طریقت کی۔ اپنے آبائے کرام کی نسبت اپنے والد کے خلیفہ شاہ محمد یونس سے حاصل کی۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ، رحمۃ اللہ علیہ، کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے، سلوک کی تکمیل کی اور بشاراتِ عظیمہ سے ممتاز ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ کے خلیفۂ اجل حضرت شاہ محمد عاشق صاحبؒ پھلتی سے استفادہ کیا اور اجازت حاصل کی۔

آپ کی نسبت بہت قوی اور آپ کی صحبت بڑی مؤثر تھی۔ آپ کے ذوق و کمالات اور معارف کا اندازہ اس خط و کتابت سے ہوتا ہے جو آپ کے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے

(۱) "اعلام الہدیٰ" و "سیرۃ السادات"۔

درمیان ہوئی" (۱) اور آپ کی عظمت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو شاہ اہل اللہ (برادر حضرت شاہ ولی اللہؒ) مولانا نور اللہؒ، حضرت شاہ محمد عاشق اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کے نام بھیجے۔

سید شاہ ابوسعید حضرت شاہ ولی اللہ کے مخصوص لوگوں میں تھے۔ شاہ صاحبؒ کے علوم وکمالات سے جن خوش قسمت افراد نے شاہ صاحب کی زندگی میں استفادہ کیا اور آپ کو پہچانا، ان کے ۵ پہلے طبقے میں سید شاہ ابوسعید کا شمار ہے۔ اس خصوصیت وتعلق کا اظہار ان حضرات کے خطوط کی ایک ایک سطر سے ہوتا ہے۔ مولانا سید نعمانؒ نے سید شاہ ابوسعیدؒ کو شاہ ولی اللہ، رحمۃ اللہ علیہ، کی وفات کے بعد جو خط شاہ صاحبؒ کے سانحۂ وفات کی اطلاع کے لیے لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:- (۲)

الحمدللہ، رضامندیِ حضرت صاحب قدس سرہ، ازاں صاحب وتوجہات عالیات برحالِ ایشاں زیادہ از حدِ بیان یافتہ اکثر اوقات استفسارِ احوالِ سامی فرمودند وماجرائے غارتگریِ ابدالیان ورسیدنِ آں صاحب درعینِ رستخیز والتظایافتنِ التہاب نہیب بسبب قدومِ گرامی از زبانِ دُرفشاں مودی ساختند (۳) وشاید منظورِ لقائے آخریں بضمیر منیر بودہ باشد۔ مرۃً فرمودند کہ میر ابوسعید	بحمد اللہ حضرتِ مرحوم کی جناب سے رضامندی اور آپ کے حال پر آں جناب کی توجہاتِ ۱۰ عالیات میں نے جتنی پائیں، وہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ اکثر اوقات جناب کے حالات دریافت فرماتے، ابدالیوں کی غارت گری کا واقعہ آپ کا عین ہنگامہ میں پہنچ جانا، لوٹ مار ۱۵ کی آگ کا فرو ہوجانا، زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کو آپ سے آخری ملاقات کا خیال تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا:

(۱) مجموعہ "مکتوب المعارف" مرتبہ مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہسویؒ، "کلماتِ طیبات" مطبوعہ۔

(۲) مجموعہ "مآثر الابرار" (قلمی)

(۳) جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔

ارادہ آمدن دارند۔ اگر زود برسند بہتر باشد۔ "سید ابوسعید آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر جلد پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔"

سید شاہ ابوسعید جود و سخاوت، مہمان و غربا پروری میں اپنے زمانے میں ممتاز تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ آیا۔ گھر کے باہر رکھ دیا اور وہیں سے ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیا۔ مدراس اور چیناپٹن میں آپ کا بڑا اثر اور مقبولیت تھی۔

۹ رمضان ۱۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد میر داد قاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، شیخ عبداللطیف حسینی مصری، حاجی امین الدین کاکوری اور شاہ عبدالقادر خاص پوری آپ کے ممتاز خلفا میں سے تھے۔(۱)

شاہ ابوسعیدؒ نے سید شاہ ابواللیث اور سید محمد احسن دو فرزند چھوڑے۔

مولانا سید نعمان سید محمد نور کے صاحبزادے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی چچا تھے۔ نصیر آباد میں ولادت ہوئی۔ کچھ مدت تک وطن ہی میں تحصیلِ علم کرنے کے بعد لکھنؤ جا کر مولانا عبداللہ امیٹھوی سے کتابیں پڑھیں۔ پھر رائے بریلی واپس آ کر حضرت سید محمد جی رحمۃ اللہ علیہ سے، جو حضرت سید شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے اور سب سے محبوب فرزند اور آپ کی نسبتِ خاصہ کے حامل تھے، بیعت کی اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کر استفادہ کرتے رہے۔ حضرت سید محمد کی وفات (۱۱۵۶ھ) کے بعد ان کے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ المشائخ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب (م ۱۱۹۲ھ) سے سلوک کی تکمیل کی اور ہندوستان کے مختلف شہروں اور دینی مرکزوں میں جا کر بڑے بڑے مشائخ اور علماء سے ملاقات اور استفادہ کیا۔ حضرت سید شاہ علم اللہؒ کے خلیفہ خاص شیخ محمود حسن نائب خود جی اور آپ کے دوسرے خلیفہ شیخ فتح محمد انبالویؒ کے صاحبزادے شیخ یوسف اور دوسرے حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر علمی و روحانی فیوض حاصل کیے۔

(۱) "تذکرۃ الابرار"، "سیرۃ السادات"، "نزہۃ الخواطر"۔

ذی قعدہ ۱۱۷۵ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیان حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے اور شاہ صاحبؒ کی وفات (۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ) تک حاضر رہ کر روزانہ ملاقات اور شاہ صاحبؒ کی خصوصی توجہات اور شفقت و التفات سے محظوظ ہوتے رہے۔(۱)

تقریباً ۱۱۹۳ھ میں حرمین کا سفر کیا۔ حج و زیارت کے بعد بیت المقدس اور الخلیل کی زیارت کی اور اسی سال ۵ جمادی الآخرہ کو وہیں انتقال کیا اور حضرت موسیٰ کے حظیرے میں مدفون ہوئے۔

تصنیفات میں سلوکِ طریقۂ نقشبندیہ میں ایک رسالہ اور ایک رسالہ اپنے آبائے کرام (حضرت شاہ علم اللہ اور ان کی اولاد و احفاد کے تذکرے میں) "اعلام الہدیٰ" آپ کی یادگار ہے۔(۲)

حضرت سید محمد عرفان اور اُن کی اولاد سید محمد نور کے چشم و چراغ اور سید صاحبؒ کے والد تھے۔ اپنے آبائے کرام کے قدم بہ قدم تھے۔ نہایت متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ۱۲۱۴ھ میں لکھنؤ سے وطن آ رہے تھے۔ رائے بریلی کے قریب پہنچ کر انتقال کیا۔ نعش رائے بریلی لائی گئی۔ شاہ علم اللہ صاحبؒ کی مسجد کے شمال مشرقی گوشے کے متصل حضرت سید ابو حنیفہ (فرزندِ سوم حضرت شاہ علم اللہؒ) اور اپنے جد حضرت سید محمد ہدیٰ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حضرت سید عرفان کی پہلی شادی سید محمد معین (برادرِ سید شاہ ابو سعیدؒ) کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے ایک صاحبزادی بی بی نجیبہ پیدا ہوئیں، جو مولوی عبدالسبحان(۳) صاحبؒ کی اہلیہ

(۱) مکتوب مولانا سید نعمان بنام حضرت سید شاہ ابو سعیدؒ۔

(۲) "سیرۃ السادات" و "نزہۃ الخواطر" جلد ۶

(۳) مولوی سید عبدالسبحان سید محمد عثمان کے صاحبزادے اور سید محمد عرفان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ عالم و متقی بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی اور تکیہ شاہ عبدالغنیؒ میں دفن ہوئے۔ (سیرۃ السادات)۔

اور مولوی سیّد محمد علیؒ، صاحب "مخزنِ احمدی" سیّد احمد علی شہیدؒ، سیّد حمید الدین اور سیّد عبدالرحمٰن کی والدہ ہیں۔

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد صاحبزادی کی تحریک و اصرار سے سیّد محمد عرفان نے سیّد شاہ ابو سعیدؒ کی صاحبزادی سے عقدِ ثانی کیا، جن سے تین صاحبزادے سیّد محمد ابراہیم، مولانا سیّد محمد اسحٰق اور حضرت سیّد احمد اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔

سیّد محمد ابراہیم نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ صالح اور بزرگ سیرت تھے۔ نوّاب امیر خاں (والیِ ٹونک) کے لشکر میں تھے اور ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔ سیّد محمد یعقوب آپ کے فرزند تھے۔

بہنوں میں دو (صاحب النسا اور حنیفہ) کی شادی یکے بعد دیگرے سیّد معصوم احمد صاحبؒ[1] سے ہوئی، تیسری بہن بی بی صالحہ، سیّد محمد مصطفیٰ[2] کے عقد میں تھیں۔

مولانا سیّد محمد اسحٰق سیّد صاحبؒ کے منجھلے بھائی مولانا سیّد محمد اسحٰق بڑے علما میں سے تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے پہلے لکھنؤ، پھر دہلی کا سفر کیا اور مولانا شاہ عبدالقادرؒ سے درسی کتابیں پڑھیں اور فقہ و حدیث کی تحصیل کی۔ شاہ عبدالعزیز، علیہ الرحمۃ، سے حدیث کی سند لی، بیعت کی اور طریقت کی تعلیم حاصل کی، پھر وطن واپس آکر درس تدریس اور اصلاح و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ تقویٰ و عمل میں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر تھے۔ مزاج میں ایثار و قناعت اور زہد تھا، وعظ مؤثر اور دلپذیر ہوتا تھا۔ تصنیف کا اچھا ذوق اور دلچسپی تھی۔ عربی و فارسی میں قادر الکلام تھے۔ فنون و مسائلِ علمیہ پر اچھی

(۱) سیّد معصوم احمد ابن مولانا سیّد محمد واضحؒ بن حضرت شاہ محمد صابر بن حضرت سیّد آیت اللہ بن حضرت شاہ علم اللہؒ، صاحبِ علم و وجاہت بزرگانِ خاندان میں سے تھے۔ ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی حکیمہ بی بی تھیں، جو سیّد عبدالباقی بن سیّد جامع بن شاہ محمد واضح کے عقد میں تھیں۔

(۲) سیّد محمد مصطفیٰ بن سیّد محمد ثانی بن مولانا سیّد محمد حکم بن حضرت سیّد محمد بن حضرت سیّد شاہ علم اللہؒ ذی علم، باوجاہت، فیاض، فراخ دست، پیر، بلند فطرت، ہر دلعزیز شخص تھے۔ ایک مرتبہ تیس ہزار روپیہ واصلات میں اکٹھا ملا۔ گھر پہنچتے ہی تمام اعزا و احباب کی تنخواہیں مقرر کر دیں اور دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا۔ دو صاحبزادے سیّد علی مرتضیٰ اور سیّد حسن مجتبیٰ اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔

دسترس اور استحضار تھا۔ علمی مضامین اور فنی مسائل کو نظم کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ میراث و حساب میں اَلْمَأْتَیْنُ کے نام سے دوسو اشعار کا قصیدہ اور اس کی مبسوط شرح اور مسائلِ نحویہ کے بعض منظومات آپ کی فضیلتِ علمی کے گواہ ہیں۔ ایک فارسی نظم بھی یادگار ہے جس میں اہلِ بدر، علیہم الرضوان، کے اسمائے گرامی جمع کیے ہیں۔[1]

۷ جمادی الآخرہ ۱۲۳۴ھ کو انتقال کیا اور اپنے نانا شاہ ابوسعید، رحمۃ اللہ علیہ، کے مقبرے میں دفن ہوئے۔　۵

آپ کی شادی سید شاہ ابوالليث (ابن حضرت شاہ ابوسعیدؒ) کی صاحبزادی (بی بی دلیہ) سے ہوئی تھی۔ سید محمد اسمٰعیل ایک فرزند یادگار چھوڑا۔[2]

---

(۱) "نزہۃ الخواطر" ج ۷، "سیرۃ السادات"

(۲) "سیرۃ السادات"

دُوسرا باب

ابتدائی حالات، تعلیم، سفرِ لکھنؤ

ولادت سید شاہ علم اللہ صاحبؒ کے اُس دائرے میں، جو اب تکیے کے نام سے مشہور ہے، صفر ۱۲۰۱ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی ولادت ہُوئی۔[1]

سلسلۂ نسب آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:۔

سید احمد بن سید محمد عرفان بن سید محمد نُور بن سید محمد ہُدیٰ بن سید علم اللہ بن سید محمد فضیل بن سید محمد معظم بن سید احمد بن قاضی سید محمود بن سید علاؤ الدین بن سید قطب الدین محمد ثانی بن سید صدر الدین ثانی بن سید زین الدین بن سید احمد بن سید علی بن سید قیام الدین بن سید صدر الدین بن قاضی سید رکن الدین بن امیر سید نظام الدین بن امیرِ کبیر سید قطب الدین محمد الحسنی الحسینی المدنی الکڑوی بن سید رشید الدین احمد مدنی بن سید یوسف بن سید عیسیٰ بن سید حسن بن سید ابی الحسن علی بن ابی جعفر محمد بن قاسم بن ابی محمد عبد اللہ بن سید حسن الاعور الجواد نقیب کوفہ بن سید محمد ثانی بن ابی محمد عبد اللہ الاشتر بن سید محمد صاحب النفس الذکیہ بن عبد اللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن امام حسنؓ بن امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب، کرم اللہ وجہہ۔[2]

حسن مثنیٰ کی شادی اپنے عمِ نامدار شہیدِ کربلا کی صاحبزادی فاطمہ صُغریٰ سے ہُوئی تھی۔ اس لیے اس خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے۔

---

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۱۲۔ چودھری غلام رسُول مہر کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کی ولادت ۶ صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) کو ہُوئی۔ (۲) "سوانحِ احمدی"، "آئینۂ اودھ"، "مخزنِ احمدی" وغیرہ۔

ایک قدیم تحریر، جس پر سید صاحب کے دستخط (سید احمد) ہیں

ایک قدیم تحریر، جس پر حمید صاحب کے دستخط (میر احمد) ہیں !

تعلیم | جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی، تو شرفا کے دستور کے مطابق آپ مکتب میں بٹھائے گئے، لیکن لوگوں نے تعجب سے دیکھا کہ آپ کی طبیعت خاندان کے اور لڑکوں اور اپنے ہم عمروں کے برخلاف علم کی طرف راغب نہیں اور آپ پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ نہیں کرتے تین سال مکتب میں گزر گئے اور باوجود استاد کی توجہ و شفقت اور بزرگوں کی تاکید و فہمائش کے صرف قرآن مجید کی چند سورتیں یاد ہو سکیں اور مفرد و مرکب الفاظ لکھنا سیکھ سکے۔ آپ کے بڑے بھائی صاحبان سید ابراہیم و سید اسحٰق صاحب کو آپ کی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا اور وہ بہت تاکید رکھتے تھے۔ والد ماجد نے فرمایا کہ میاں! ان کو خدا پر چھوڑ دو۔ جو ان کے حق میں بہتر سمجھے گا، کرے گا۔ ہماری تاکید کا کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔(۱)

آپ کے کھیل اور مشاغل | آپ کو بچپن میں کھیل کا بڑا شوق تھا، خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے اور اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا اور فتح کرتا۔(۲) اس طرح نادانستہ آپ کی جسمانی و فوجی تربیت کی جا رہی تھی۔

خدمتِ خلق | جب آپ سنِ بلوغ کو پہنچے، تو آپ کو خدمتِ خلق کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ اور خدا پرست انگشت بدنداں رہ گئے۔ ضعیفوں، اپاہجوں اور بیواؤں کے گھروں پر دونوں وقت جاتے، ان کا حال پوچھتے اور کہتے: "اگر لکڑی، پانی، آگ، وغیرہ کی ضرورت ہو، تو لے آؤں؟" وہ لوگ آپ ہی کے بزرگوں کے مرید اور خادم تھے، کہتے: "میاں! کیوں گنہگار کرتے ہیں؟ ہم تو آپ اور آپ کے باپ دادا کے غلام ہیں۔ ہماری مجال ہے کہ ہم آپ سے کام لیں؟" آپ ان کی خدمت گزاری اور اعانت کی فضیلت اس طرح سناتے کہ وہ زار و قطار رو دیتے اور باصرار ان کی ضرورتیں معلوم کر کے پوری کرتے۔ بازار سے ان کے لیے سودا لاتے، لکڑی لا کر اور پانی بھر کر لاتے اور ان کی دعائیں لیتے اور کسی طرح سے اس کام سے سیری نہ ہوتی۔ عزیزوں ہمسایوں کے گھروں میں جا کر دیکھتے کہ برتنوں میں پانی ہے، جلانے کے لیے لکڑی ہے یا نہیں

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۲　　(۲) روایت بزرگانِ خاندان۔

پانی نہ ہوتا، تو اپنے ہاتھ سے بھرتے۔ لکڑی نہ ہوتی، تو جنگل جاکر خُود کاٹتے۔ چادر میں گٹھا باندھ کر سر پر رکھتے اور گھروں میں پہنچا دیتے۔ آپ کے بعض بھائی اور عزیز اس پر چیں بجبیں ہوتے، سخت سُست بھی کہتے، مگر آپ اس کی پروا نہ کرتے اور کام کیے جاتے۔(۱)

عبادتِ الٰہی اسی کے ساتھ آپ کو عبادت و ذِکرِ الٰہی کا بے حد ذوق تھا۔ رات کو تہجد گزاری اور دن کو خدمت گزاری اور تلاوت و دُعا و مناجات میں مشغول رہتے۔ قرآنِ مجید میں تدبُّر فرماتے رہتے اور یہی آپ کا مشغلہ تھا۔

آپ کا ابتدائی شوقِ جہاد اور والدہ کا ایثار ایسی مائیں دُنیا میں بہت کم ہوں گی، جو بیٹے کی جان کے امتحان میں پُوری اُتریں اور اس کو مرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے رخصت کریں۔ سیّد صاحبؒ کو اللہ نے والدہ بھی ایسی دی تھیں جو حضرتِ اسما کا نمُونہ تھیں۔ "منظورہ"(۲) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہندو مُسلمانوں میں جنگ ہو گئی۔ سیّد صاحبؒ نے جانے کی آمادگی ظاہر کی؛ لیکن کھلانے والی نے کسی طرح جانے نہ دیا۔ والدۂ مُحترمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ سیّد صاحبؒ منتظر کھڑے تھے کہ آپ سلام پھیریں، تو جانے کی اجازت طلب کریں۔ آپ نے جب سلام پھیرا، تو دایہ سے کہا: "بی بی! تمھیں ضرور احمد سے محبت ہے، مگر میری طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ روکنے کا موقع نہ تھا۔ جاؤ بھیّا! اللہ کا نام لے کر جاؤ، مگر خبردار! پیٹھ نہ پھیرنا، ورنہ تمھاری صُورت نہ دیکھوں گی۔ اور اگر وہ نکل جانے کے لیے راستہ مانگیں اور کہیں کہ ہم کو جانے دیجیے، تو راستہ دے دینا۔" آپ جیسے ہی پہنچے، اُنھوں نے کہنا شروع کیا: "ہم کو راستہ دے دو، ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ سے کچھ مطلب نہیں۔ آپ کا بھی ہم سے کچھ جھگڑا نہیں۔" جیسے ہی آپ نے یہ سُنا، بھائیوں سے کہا: "ان کو جانے دو اور کچھ روک ٹوک نہ کرو۔ اسی میں خیر ہے۔"

آپ کی ورزشیں اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے، اس کے لیے اس کا سامان اور اس کا شوق پیدا کر دیتا ہے اور اسی قسم کی تربیت فرماتا ہے۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ۔

---

(۱) "مخزنِ احمدی" ص ۱۳ (۲) بحوالہ سیّد حسین علی برادر مولوی جعفر علی مؤلفِ "منظورہ" و دیگر بزرگان۔

سید صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا تھا، اُس کے لیے جسمانی قوّت و تربیت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ کو ابتدا سے بہت زیادہ توجہ اسی طرف تھی اور آپ کے بچپن کے کھیلوں میں بھی یہ چیز نمایاں تھی۔

سید عبدالرحمٰن صاحب مرحوم، سپہ سالارِ افواج نواب وزیرالدولہ مرحوم سید صاحبؒ کے چھوٹے بھانجے تھے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی عادت تھی کہ سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد ۵ تک ورزش اور کشتی میں مشغول رہتے۔ میں بچہ تھا۔ آپ کے بدن پر مٹی ملتا، یہاں تک کہ خشک ہو کر جھڑ جاتی۔ پیروں پر مجھے کھڑا کر کے پان سو ڈنڑ لگاتے، پھر کچھ ٹھیر کر پان سو اور۔ من بھر، بیس اور تیس سیر کے مگدر ہلاتے تھے۔ اس میں تعداد کا خیال نہیں تھا، بلکہ وقت کا اندازہ تھا، مثلاً، دو گھنٹے، تین گھنٹے، چار گھنٹے۔

معین خاں کے مقبرے کے پاس (تکیے کے قریب، ندی کنارے) پتھر کا ایک ستون ۱۰ ہے، چار ہاتھ لمبا اور بہت دبیز، نیچے سے موٹا، اُوپر سے پتلا۔ یہ شہ زوروں کی ورزش گاہ تھی۔ اُوپر سے ہر زور آور اس کو اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ نیچے سے کوئی زانو تک کوئی کمر تک لے آتا تھا۔ ایک روز چاندنی رات میں ہم وہاں سے گزرے، تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کو اُٹھانا چاہیے۔ یہ کہہ کر کُرتہ اُتار، کاندھے پر رکھ اور پتھر کے قریب کچھ جھک کر اس کو اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور بیس قدم چل کر اس کو زمین پر اس زور سے پٹکا کہ ایک ہاتھ کے قریب زمین کھُد ۱۵ گئی۔ دوسرے روز لوگ آئے اور اس کو اپنی جگہ سے اتنی دُور گڑھے میں پڑا دیکھا، تو کہنے لگے کہ کون دیو یا جن تھا، جس نے اس کو اتنی دُور لا کر ڈال دیا۔

پیرنے اور پانی میں ٹھیرنے کی آپ نے بڑی مشق بڑھائی تھی۔ نواب وزیرالدولہ مرحوم، والیِ ریاست ٹونک آپ کی شناوری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ مولوی علیم اللہ دہلی کے مشہور پیراک اُستاد اور مشہور اُستاد کے شاگرد کہتے تھے کہ یہ وصف سید صاحبؒ ہی میں دیکھا کہ سخت ۲۰ بہاؤ میں بہاؤ کے خلاف پیرتے تھے۔ میں باوجود اتنی مشق اور زمانے کے یہ نہیں کر سکتا۔[1]

(۱) "وقائعِ احمدی" و "منظورہ"۔

سفرِ لکھنؤ آپ جوان ہو چکے تھے، والد کا انتقال ہو چکا تھا، حالات کا اقتضا تھا کہ آپ دنیادارانہ زندگی میں قدم رکھیں اور تحصیلِ معاش کی فکر کریں۔ آپ کی عمر ۱۷، ۱۸ سال کی تھی کہ ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۱۹ھ میں اپنے سات عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ چلے۔ لکھنؤ رائے بریلی سے اُنچاس میل ہے۔ سواری صرف ایک ہی تھی اور باری باری اس پر سوار ہوتے تھے۔ لیکن جب آپ کی باری آتی، تو آپ سوار نہ ہوتے، بلکہ منت سماجت کر کے دوسروں کو سوار کرا دیتے۔ ہر ایک کے سر پر اس کا سامان بھی تھا۔ جب آدھی منزل طے ہو گئی، تو سب رُفقائے سفر تھک گئے اور مزدور کی جستجو ہوئی، لیکن مزدور نہ مل سکا۔ سیّد صاحبؒ نے، جو اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے، اپنے ساتھیوں سے بڑے عجز و انکسار سے کہا: "اس خاکسار کی ایک عرض ہے۔ اگر آپ سب اُسے قبول کرنے کا وعدہ فرمائیں، تو عرض کروں۔" لوگ مطلب نہیں سمجھے اور کہا: "بڑی خوشی سے۔" آپ نے فرمایا: "نہیں، پختہ وعدہ کیجیے۔" سب نے پختہ وعدہ کیا۔ آپ نے کہا: "سارا سامان ایک کمبل میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دیجیے۔ میں ان شاء اللہ پہنچا دوں گا۔" چونکہ لوگ زبان دے چکے تھے، مجبور ہو کر انھوں نے ایسا ہی کیا اور آپ ایسے خوش ہوئے، جیسے کوئی بڑی دولت ملی اور فرمایا: "عمر بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔" اور ہنستے بولتے لکھنؤ پہنچ گئے۔

لکھنؤ سیاسی و معاشی حیثیت سے سیّد صاحبؒ لکھنؤ تشریف لے گئے، تو نواب سعادت علی خاں خلف نواب شجاع الدولہ کا عہدِ حکومت تھا، جو ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء میں تخت نشین ہوئے۔ سلطنتِ اودھ کی پوری تاریخ میں اُن سے زیادہ منتظم اور بلند حوصلہ فرمانروا اودھ کے تخت پر نہیں بیٹھا، مگر اس سلطنت کی تعمیر اور اُس کے خمیر میں کچھ ایسی خرابیاں شروع ہی سے شامل تھیں کہ کبھی اس کی چُول ٹھیک نہ بیٹھی۔ اُن کے عہدِ حکومت میں بھی باوجود اُن کی بیدار مغزی، مستعدی اور کارپردازی کے رعایا کو حقیقی اطمینان اور فارغ البالی حاصل نہ ہوئی اور اُن زیادتیوں اور ظلم و ستم کا سدِّباب نہ ہوا، جو ابتدائے سلطنت سے جاری ۔ کچھ تو اُن کی طبیعت جُزرس تھی، کچھ اس بات نے کہ ان کو اپنی تخت نشینی کے عوض میں ۷۶ لاکھ روپے سالانہ، جو مزید اضافہ

ہو جانے کے بعد ۹۹۹، ۱۲، ۳۰، ۱ ہو گئے تھے، سرکارِ کمپنی کو ادا کرنے پڑتے تھے، اُن کو اور زیادہ
جُزرس اور کفایت شعار بنا دیا تھا۔ ملک کی تباہی، جو اودھ نوّابوں کے اِسراف، کاہلی اور عیّاشی سے
شروع ہوئی، وہ اُن کی کفایت شعاری اور جُزرسی سے برسرِ ترقّی ہوئی۔ متوسّلینِ سرکار اور مُستاجر
اور صاحبِ جاگیر اشخاص اور بڑے تاجروں کے سوا بے روزگاری اور پریشانی عام تھی۔ ۱۲۱۵ھ
(۱۸۰۰ء) میں کمپنی کے اصرار سے نواب نے فوج کا ایک بڑا حصّہ برطرف کیا۔ اس تخفیف میں
چالیس پلٹنیں پیادوں کی اور بارہ ہزار سوار موقوف ہوئے۔ اس تخفیف و برطرفی سے اودھ کے
ہزاروں سپاہ پیشہ اور سیکڑوں خاندان متاثّر ہوئے۔ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں کمپنی نے نواب
وزیر سے اودھ کی سلطنت کا ایک نہایت زرخیز اور شاداب علاقہ، جس کی سالانہ آمدنی سکّۂ
لکھنؤ سے ایک کروڑ پینتیس ۳۵ لاکھ سے اُوپر تھی، اُس رقم کے عوض میں جو نواب کمپنی کو دیتے تھے،
حاصل کر لیا۔ اس میں اضلاعِ دوآب و روہیلکھنڈ مع اضلاعِ علی گڑھ و گورکھپور تھے۔ نواب
کے پاس نصف آمدنی کا ملک باقی رہ گیا۔ اس کا اثر ملک کی معاشی حالت پر پڑنا ضروری تھا۔
غرض، سیاسی و معاشی حیثیت سے ملک داہلِ ملک سخت ضغطے میں تھے اور پریشانی عام تھی۔

رفقا کی تلاشِ روزگار اور سید صاحبؒ کی بے دلی

لکھنؤ پہنچ کر سب ساتھی روزگار کی تلاش میں اِدھر
اُدھر پھرنے لگے، مگر روزگار عنقا تھا۔ دن بھر دوڑ دھوپ کرتے، مگر بے کار۔ خرچ بھی ختم
ہو رہا تھا اور اب دو وقت کھانے کے بھی لالے پڑ رہے تھے۔ سوائے سید صاحبؒ کے ہر شخص
نہایت پریشان اور متفکّر تھا۔ کوئی ایک دو جُز کسی کتاب کریما، نامِ حق، مُقیماں وغیرہ کی کتابت کر کے
شام کو فروخت کرتا، کوئی بازار سے تھوڑا سا کپڑا خرید کر اس کی ٹوپیاں سی کر بیچتا اور کھانے کا انتظام
کرتا۔ خود سید صاحبؒ ایک امیر کے یہاں کہ خود اُن کی حالت اچھی نہ تھی، لیکن سادات سے نہایت
محبّت و اعتقاد رکھتے تھے، مہمان تھے۔ اُن کے یہاں سے دو وقتہ اچھا کھانا آتا۔ آپ اپنے
عزیزوں کے ساتھ جا کر شریک ہو جاتے، اپنا کھانا ان کے سامنے رکھ دیتے اور خود اُن کی دال
روٹی پر گزر کرتے۔ اُن کو باصرار اپنا کھانا کھلا دیتے اور خود اس میں سے ایک لقمہ نہ لیتے۔

کبھی وہ سب فاقے سے ہوتے، تو اپنا کھانا ان کو کھلا دیتے اور خُود کوئی عُذر کر دیتے۔ چار مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد ان امیر کو سرکارِ لکھنؤ کی طرف سے سو سوار بھرتی کرنے کا حکم ہُوا، مگر اس خبر کو سُن کر سو کے بجائے ایک ہزار مسلح اور آراستہ اُمّیدوار حاضر ہو گئے۔ امیر نے ہر دس امیدواروں میں سے ایک کو نوکر رکھ لیا اور دو اسامیاں سیّد صاحبؒ کے حوالے کر دیں۔ آپ نے یہ دو اسامیاں دو دُوسرے غریب امیدواروں کو دلا دیں اور اپنے عزیزوں کو فضلِ الٰہی کا امیدوار بنا دیا۔

اس عرصے میں والیِ لکھنؤ سیر و شکار کے لیے پہاڑوں کی طرف روانہ ہُوا اور وُہ امیر بھی جن کے یہاں سیّد صاحبؒ مہمان تھے، ہمرکاب ہُوئے۔ سیّد صاحبؒ بھی مع اعزّا ساتھ ہُوئے اور اسی شان سے، جس طرح رائے بریلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ تین مہینے اس سفر میں گزر گئے۔ سخت سردی کا موسم اور میدانوں اور پہاڑوں کا سفر، سخت مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سیّد صاحبؒ راستہ بھر سمجھاتے رہے، "عزیزو، اس تلاش و جستجو، اس تکلیف و مصیبت کے باوجود دُنیا تمھیں نہیں ملتی۔ ایسی دُنیا پر خاک ڈالو اور میرے ساتھ دہلی چلو اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا وجُود غنیمت سمجھو۔" لیکن آپ کے ساتھی دُوسرے عالم میں تھے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، بلکہ ہنستے تھے۔

سفرِ دہلی مولوی سیّد محمد علی صاحبؒ، صاحبِ "مخزنِ احمدی" کہتے ہیں[1] کہ جب سیّد صاحبؒ کو ساتھیوں سے مایُوسی ہُوئی، تو ایک رات مجھے الگ لے گئے اور خصُوصیت کے ساتھ سمجھایا اور کہا: "کل یا پرسوں ہم دہلی جائیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" میں نے کہا: "آپ کے پاس سوائے ان کپڑوں کے، جو بدن پر ہیں، کوئی سامان نہیں۔ آپ ہی ایسی بے سروسامانی کی حالت میں سفر کی ہمّت رکھتے ہیں، میں کم ہمت ایسے سفر کی طاقت نہیں رکھتا۔" اس طرح دو تین دن گزر گئے اور لشکر کا کُوچ ہو گیا۔ دوپہر کو ہم لوگ منزل پر پہنچے اور سب ہمراہی ایک جگہ اکھٹے ہُوئے، تو معلوم ہُوا کہ سیّد صاحبؒ نہیں ہیں۔ جہاں جہاں احتمال

(۱) مولوی سیّد محمد علی صاحب اس سفر میں ساتھ تھے۔ اس سفر کے حالات، انھیں کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

تھا، شام تک تلاش کیا، لیکن پتہ نہ چلا۔ چونکہ یہ سفر محمدی کے جنگل میں تھا اور وہ جنگل نہایت خطرناک
اور درندوں (شیر، بھیڑیے، ریچھ، ہاتھی) کے لیے مشہور تھا اور ہر منزل پر ایک دو آدمی ان کا شکار ہو جاتے
تھے، اس لیے ہم سب کو فکر ہوئی کہ نصیب دشمناں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ اس کا یقین آ گیا۔
تین دن رات ہم لوگ اسی رنج و الم میں مبتلا رہے۔ چوتھے روز محمدی کی طرف سے لشکر میں ایک آدمی
آیا۔ اس نے کہا کہ ایک میاں اس حلیے کے، جو صرف حضرت ہی کا ہو سکتا تھا، مجھے راستے میں دکھائی
دیے۔ ان کے سر پر اسباب کا گھڑا تھا اور پیچھے ایک سپاہی۔ میں نے کہا: "میاں سپاہی، یہ صاحبزادے
تو شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ماجرا ہے؟" اس نے یہ عجیب قصہ سنایا کہ "جب میں اپنے مکان سے چلا
تو ایک بوڑھے کے سوا کوئی مزدور نہیں ملا۔ وہ بوڑھا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا، لیکن اس پر کئی فاقے
ہو چکے تھے۔ اس نے اس امید سے کہ پیٹ بھرنے کی مزدوری مل جائے گی، بوجھ لے لیا اور گرتا پڑتا
بہزار خرابی میرے ساتھ چلا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ صاحب ملے اور مزدور کی یہ حالت دیکھ کر ان کے
آنسو نکل آئے اور مجھ سے کہا: بندۂ خدا! کچھ خدا کا خوف کر۔ کیوں اس بیچارے سے بے گار کرا رہا ہے؟
میں نے کہا: میں نے اس پر زبردستی نہیں کی، بلکہ اس کو مزدور کیا ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ
ہوئے، تو اس نے کہا: دو روز سے فاقہ تھا، میں نے کہا کہ یہ مزدوری کر لوں، شاید پیٹ بھرنے کا سامان
ہو جائے۔ آپ نے مجھ سے کہا: اگر مزدوری تمہارے پاس ہو، تو اس کو دے دو، ورنہ خدا کے غضب سے
ڈرو۔ میں نے اسی وقت پیسے نکال کر دے دیے۔ آپ نے کہا: اب تھوڑی دیر اس درخت کے
نیچے بیٹھ کر دم لے لو۔ میں بیٹھ گیا۔ آپ نے کہا: اب اس مزدور کو رخصت کر دو اور مجھے مزدور سمجھو۔
تمہارا بڑا احسان ہوگا۔ میں نے کہا: صاحبزادے، نیکی اور شرافت اور سمجھداری تمہاری شکل سے ٹپکتی
ہے، مگر اس وقت تم بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ اس جنگل میں تو رستم کا بھی جگر شق ہوتا ہے۔ خود
صحیح سلامت پہنچ جانا ہی بڑی بات ہے، اس بوجھ کے ساتھ ساتھ منزل پکڑنا بہت دشوار ہے۔
آپ نے فرمایا: اگر تم میرے ساتھ سلوک کرو گے، تو ساری عمر تمہارا احسان نہ بھولوں گا۔ میں نے
مجبور ہو کر گھڑا سر پر رکھ دیا اور آپ نہایت اطمینان سے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلے آئے۔"

یہ سُن کر عزیزوں کو اطمینان ہُوا کہ خدا کا شکر ہے، خیریت سے ہیں۔[1]

یہ بوجھ پہنچا کر آپ نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک مرتبہ ایک پیسے کے ستّو گُڑ میں گھول کر کھانے بیٹھے۔ ایک غریب آدمی نے پکارا کہ چار پہر سے فاقے سے ہُوں۔ کچھ تردّد ہُوا، پھر اس کو اُٹھا کر دے دیا اور رات فاقے سے گزار دی۔[2]

چلتے چلتے آپ کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ راستے میں ایک قصبے کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں ایک شخص نے صُورت دیکھ کر دریافت کیا: "کہاں سے آنا ہُوا اور کہاں کا قصد ہے؟" آپ نے کہا: "اگر وعدہ کریں کہ حائل نہ ہوں گے اور کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں گے، تو عرض کروں۔" انھوں نے وعدہ کیا، تو آپ نے نام و نشان کا پتہ دیا۔ وُہ آپ کے والد سیّد عرفان صاحبؒ کے مُرید نکلے۔ آپ کو ہاتھوں ہاتھ گھر لے گئے، ہاتھ منّھ دُھلایا۔ پاؤں سے خُون جاری تھا، اس پر مہندی اور ببُول کے پتّوں کا لیپ کیا اور وعدہ کر کے بہت پچھتائے، مگر مجبُور تھے۔ آپ کو سوار کرا کے دہلی تک پہنچا دیا۔[3]

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۱۷ (۲) "منظُورہ" بحوالہ شیخ عبدالقیوم (۳) "وقائعِ احمدی"۔

تیسرا باب

دہلی کا قیام، سلوک و تکمیل

شاہ عبدالعزیزؒ سے ملاقات سید صاحبؒ دہلی پہنچ کر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحبؒ نے مصافحہ و معانقہ فرمایا اور اپنے برابر بٹھایا اور دریافت کیا: "کہاں سے تشریف لائے؟" آپ نے فرمایا: "رائے بریلی سے"۔ فرمایا: "کس خاندان سے ہیں؟" کہا: "وہاں کے سادات میں شمار ہے"۔ فرمایا: "سید ابوسعید صاحب، سید نعمان صاحبؒ سے واقف ہیں؟" سید صاحبؒ نے فرمایا: "سید ابوسعید صاحب میرے نانا اور سید نعمان صاحبؒ میرے حقیقی چچا ہیں"۔ شاہ صاحبؒ نے اُٹھ کر دوبارہ مصافحہ و معانقہ کیا اور پوچھا: "کس غرض کے لیے اس طویل سفر کی تکلیف برداشت کی؟" سید صاحبؒ نے جواب دیا: "آپ کی ذاتِ مبارک کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طلب کے لیے یہاں پہنچا"۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: "اللہ کا فضل اگر شاملِ حال ہے، تو اپنے ددیال ننہال کی میراث تم کو مل جائے گی"۔ اس وقت آپ نے ایک ملازم کی طرف اشارہ فرمایا: "سید صاحب کو بھائی مولوی عبدالقادر صاحبؒ کے یہاں پہنچا دو اور آپؒ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے کر کہنا کہ اس عزیز مہمان کی قدر کریں اور ان کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں۔ ان کا مفصل حال ملاقات کے وقت بیان کروں گا"۔ چنانچہ سید صاحبؒ شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں اکبرآبادی مسجد میں رہنے لگے۔[1]

سلامِ مسنون کا رواج سید صاحبؒ جب شاہ عبدالعزیز، رحمۃ اللہ علیہ، کی خدمت میں پہلی

---

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۱۸

مرتبہ حاضر ہوئے، تو نہایت سادگی سے "السلام علیکم" کہا۔ یہ وُہ زمانہ تھا کہ سلامِ مسنُون کا رواج ہی ہندوستان سے جاتا رہا تھا، حتّٰی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان میں بھی اس کی رسم نہ تھی اور وہ جب سلام کرتے تھے، تو کہتے تھے "عبدالقادر سلام عرض کرتا ہے"، "رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے۔" شاہ صاحبؒ نے جب سیّد صاحبؒ کا سلام سُنا، تو بہت خُوش ہوئے اور آپ نے حکم ۵ دے دیا کہ سلام بطریقِ مسنُون کیا جائے۔(۱)

شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں سیّد صاحبؒ حسبِ ارشاد اکبر آبادی مسجد میں ترجمانِ قرآن حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی تربیت میں ٹھیر گئے۔ یہ بھی حُسنِ اتّفاق ہے کہ آپ کو اِس مُبارک خاندان کے دونوں بزُرگوں سے استفادے کا موقع ملا۔ شاہ صاحبؒ کو سیّد صاحبؒ سے بڑی محبت تھی اور ایک روایت کے مطابق اُنھوں نے سیّد صاحبؒ کی بعض ادائیں دیکھ کر شاہ عبدالعزیز ۱۰ صاحبؒ سے مانگ لیا تھا۔(۲) آپ نے شاہ عبدالقادرؒ سے کُچھ پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

بَیعت چند دنوں کے بعد ایک شب جمعہ کو آپ شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت ہو گئے اور آپ نے طرُقِ ثلٰثہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں آپ کو داخل فرمالیا۔(۳)

تعلیمِ تصوّرِ شیخ اور سیّد صاحبؒ کا عُذر تعلیمِ سلُوک کے ضمن میں حضرت شاہ صاحبؒ نے حسبِ معمُول تصوّرِ شیخ کی تعلیم کی۔ سیّد صاحبؒ نے نہایت ادب سے عرض کیا "حضرت! اس میں اور ۱۵ بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صُورت سنگی اور قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صُورتِ خیالی، جو دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجّہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ

(۱) یہ روایت امیر شاہ خاں صاحب کی "امیر الروایات" میں اس طرح پر ہے کہ سیّد صاحبؒ پہلی مرتبہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے بیعت کی اور کچھ روز رہ کر تشریف لے گئے۔ پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے الی آخرہٖ۔ لیکن اس میں کھلی ہُوئی فروگزاشت ہے، اس لیے کہ سیّد صاحب کی ولادت بالاتفاق ۱۲۰۱ھ کی ہے اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہو گئی تھی اور سیّد صاحبؒ کا پہلا سفر ۱۲۲۲ھ میں ہُوا۔ دونوں کے درمیان ۴۶ سال کا فصل ہے۔ (۲) "امیر الروایات"

(۳) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۱۸

نے حافظؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کُن اگرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسمِ منزلہا

سید صاحبؒ نے فرمایا: "شرک کی کسی طرح ہمت نہیں ہو سکتی۔ ہاں، کتاب و سنّت و اجماعِ اُمّت سے کوئی سند لائیں اور اچھی طرح سے اطمینان ہو جائے کہ دونوں ایک چیز نہیں، تو خطرہ ۵ دُور ہو سکتا ہے۔"

ولایتِ انبیاء سے مُناسبت شاہ صاحبؒ نے یہ سُن کر سید صاحبؒ کو فرطِ مسرت سے گود میں لے لیا اور کئی مرتبہ پیشانی کا بوسہ دیا اور فرمایا: "اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے فضل و انعام سے تم کو ولایتِ انبیاء سے نوازا۔" سید صاحبؒ نے اس کی تشریح چاہی، تو شاہ صاحبؒ نے اس کی تفصیل اس طرح فرمائی:۔

۱۰ "سادہ اور مطلق ولایت تو یہ ہے کہ اللّٰہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو دُوسرے بندوں کے مقابلے میں اپنے قُرب سے برگزیدہ کرے۔ اس برگزیدگی کی نشانی یہ ہے کہ اللّٰہ کی محبت اس کے دل کی گہرائی میں اس طرح پیوست ہو جائے کہ اس کو دُنیا اور دُنیا کی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہ رہے اور اولاد اور جاہ و مال کی محبت اس کے دل سے مٹ جائے۔ اپنے نفس، قلب، جوارح اور اعضا سے وُہ قُربِ الٰہی کا جویا اور ۱۵ رضائے خداوندی کا طالب بن جائے اور اس میں وُہ اس طرح مشغُول و منہمک ہو جائے کہ عوام النّاس اس کو مجنُون و دیوانہ سمجھیں۔ تبع تابعین میں سے ایک شخص نے حضرت سُفیان ثوری سے کہا: "صحابہؓ اور ہماری کیا نسبت ہے؟" فرمایا: "اگر تم ان کو دیکھتے تو دیوانہ سمجھتے اور اگر وہ تم کو دیکھیں، تو کافر و منافق سمجھیں اور تمھارے سلام کا جواب دینے کے روادار نہ ہوں۔" اسی طرح سے صاحبِ ولایت نفس کے مجاہدے، صوم و صلوٰۃ، ۲۰ کثرتِ نوافل، خدمتِ خلائق میں مشغُول ہوتا ہے۔ آیت کے مضمُون کے مطابق وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵: ۶۳)، یعنی جب جاہل

اُن کے مُنہ لگتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں: بھائی، سلام ہو (ہم کو معاف کرو)۔ مجرمین و فاسقین سے تعرض نہیں کرتا۔ گوشہ گزینی اس کو محبوب ہوتی ہے۔ اس کا عمل اکثر اشارۃ النص اور قرآن کی تاویل یا صوفیوں کی اصطلاح پر ہوتا ہے۔ ان اعمال کو قربِ نوافل کہتے ہیں۔

۵ لیکن جس کو اللہ تعالیٰ ولایتِ انبیاء سے سرفراز کرے، اُس کے دل کی جڑ میں اللہ کی محبت اس طرح گڑ جاتی ہے اور اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ اس ایثار کا جو حکم لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[1] (۳: ۹۲) میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ کے اُن نیک و برگزیدہ پیغمبروں کی عادات جن کے متعلق وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ[2] (۳۸: ۴۷) میں فرمایا ہے ۱۰ اور جن کی تفصیل وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ ۱۵ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ[3] (۲: ۱۷۷) میں

(۱) تم ہرگز نیکی نہیں حاصل کر سکتے، جب تک راہِ خدا میں اپنی محبوب چیزیں صرف نہ کرو۔

(۲) وہ ہمارے برگزیدہ اور نیک بندے ہیں۔

(۳) بڑی نیکی یہ ہے، جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے مال اس کی محبت پر رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دیا کرے اور جب عہد کریں، تو اپنے اقرار کو پورا کرنے والے اور سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے۔ یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔

کی گئی ہے، وہ ایثار اور یہ پیغمبرانہ اخلاق و عادات اس کی صورت و سیرت میں نمایاں
ہو جائیں اور یہ خصائلِ حمیدہ نفسانی و جسمانی ظلمتوں اور کدورتوں کو معدوم کر دیں
وہ ہمیشہ خلقِ خدا کی ہدایت، مجرمین و فُسّاق کو نصیحت، اللہ کے فرائض کو جاری اور
قائم کرنے اور انبیائے مُرسلین کی سُنّتوں کو زندہ کرنے، کفّار کے خلاف کوشش،
اشرار کی تادیب اور گنہگاروں کی تعزیر میں مشغول رہے۔ اکثر مسلمانوں کی مجلسوں اور
ان کے مجمعوں میں جاکر ان کو وعظ و نصیحت کرے، اگرچہ اہلِ مجلس اس کے سُننے کی
طرف متوجہ نہ ہوں۔ اس مشرب کو صوفیوں کی اصطلاح میں قُربُ الفرائض کہتے
ہیں۔ اس مشرب کے لوگوں کا عمل اکثر عبارۃُ النّص اور تنزیلِ قرآنی پر رہتا ہے۔
اس مرتبے کو ولایت کے تمام مرتبوں سے اعلیٰ یقین کرنا چاہیے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ
اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۤءُ (۲) وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۱) (۶۲ : ۴)

تصوّرِ شیخ سے معذرت کی وجہ سید صاحبؒ نے تصوّرِ شیخ سے اس شدّت کے ساتھ معذرت
کیوں کی اور اس میں کیا قباحتیں اور خطرات ہیں، اس کی تفصیل خود سید صاحبؒ کی زبان سے
سننے کی ہے۔ "صراطِ مستقیم" میں فرماتے ہیں:۔

"جو اشغال کہ بدعت ہیں، انھیں میں سے شغلِ برزخ (تصوّرِ شیخ) بھی ہے کہ جو اکثر
سلاسلِ طریقت کے پچھلے منتسبین میں بہت شائع و ذائع ہے، بلکہ بعض اکابر کے
کلام میں اور تعلیم میں بھی وہ شامل ہے۔ اس شغل کی حقیقت یہ ہے کہ خطرات و
وساوس کے ازالے اور توجہ کی مرکزیت و یکسوئی کے لیے شیخ کی صورت کو تعین
و تشخیص کے ساتھ ذہن میں جماتے ہیں اور پورے ادب و تعظیم اور اپنی پوری توجہ
و ہمت کے ساتھ اس خیالی صورت کی طرف متوجہ رہتے ہیں، گویا تمام آداب
و تعظیم کے ساتھ شیخ کے روبرو بیٹھے ہیں اور دل کو پورے طور پر اس کی طرف

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۲۰، ۲۱۔ (۲) یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔

متوجہ کر لیتے ہیں۔ اس شغل کی حقیقتِ حال اور اس کا حکم تصویر کی حقیقتِ حال سے
معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تصویر کا بنانا گناہِ کبیرہ اور عظیم معصیت ہے،
اس کو دیکھتے رہنا بالخصوص تعظیم و توقیر کے ساتھ حرام ہے۔ حضرت ابراہیم،
علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام، کا اپنی قوم سے فرمانا کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ
الَّتِيٓ أَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُونَ ۝ (۲۱ : ۵۲) یعنی یہ کیسے بت ہیں، جن پر تم
جمے بیٹھے رہتے ہو؟ چونکہ ایسے الفاظ میں ہے، جو کہ مطلق ہیں اور ان میں کوئی قید
اور تخصیص نہیں، اس لیے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ بتوں پر "عکوف" ممنوع ہے اور
عکوف کے معنے ہیں "لزومِ حضور" خواہ قعود و نشست کی شکل میں ہو، خواہ قیام و وقوف
کی شکل میں۔ اس تعظیم و ادب و محبت کے ساتھ یہ دوامِ حضور اور اس کا لزوم اس آیت
کے تحت میں آتا ہے۔ اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ ظاہری تصویر کے ساتھ جو بھی یہ
عمل کرے گا، عاصی و گنہگار ہوگا۔ اس ظاہری تصویر کے ساتھ مندرجۂ بالا عمل کرنے
والے اور شغلِ برزخ (تصورِ شیخ) کے عامل میں، جو سالک اور راہِ حق کا طالب ہے،
صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں کاغذ یا کسی ایسی ہی چیز پر ایک رنگین تصویر ہوتی
ہے اور دوسری شکل (شغلِ برزخ) میں صفحۂ خیال پر شیخ کی ہوبہو صورت اپنے پورے
خط و خال اور حلیے کے ساتھ مرتسم کی جاتی ہے۔ یہ عمل اگرچہ ظاہری نگاہ میں تصویر پرستی
نہیں معلوم ہوتا، لیکن حقیقتاً وہ صاف صاف صورت پرستی ہے۔ کاغذی تصویر میں
صورت و حلیے کی اس قدر باریکیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں، جیسی کہ صورتِ خیالی میں
نمایاں ہوتی ہیں، حالانکہ وہ دونوں بے جان اور بے روح ہیں۔ اس لیے جہاں تک تصویر
کے مقصد و معنی کا تعلق ہے، صورتِ خیالی صورتِ قرطاسی سے آگے بڑھی ہوئی ہے،
اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان صرف اس بات سے تفریق کی جا سکتی ہے کہ اگر کاغذ
یا پتھر کی تصویر کی اجازت دے دی جائے، تو ظاہری شریعت کے نظام میں بڑا خلل

دافع ہوگا، لیکن دُوسری شکل (صُورتِ خیالی) میں شریعت کے ظاہری نظم و انتظام کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فاعل کے ذہن و قلب پر اپنے اس عمل کا جو اثر پڑتا ہے، وہ صُورتِ خیالی کی شکل میں کہیں زیادہ مؤثر اور خطرناک ہے۔ اس بات کا تقاضا ہے کہ خیالی صُورت کا جمانا اور اس کی طرف متوجہ رہنا بدرجۂ اولیٰ حرام قرار دیا جائے۔

اس کے علاوہ شغلِ برزخ کا رواج ناقصوں اور مبتدیوں کو رفتہ رفتہ کا غذی یا ظاہری تصویر تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ ظاہری تصویریں بنا کر وہ تمام تعظیمی حرکات و آداب، جو صاحبِ تصویر بزرگوں اور مشائخ کے سامنے بجالاتے ہیں، سب ان کی ان تصاویر کے سامنے بجالانے لگتے ہیں اور صاف صاف صنم پرستوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شغلِ برزخ اس فعلِ حرام کی سرحد تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے (اصُولِ شرعیہ کا تقاضا ہے) کہ یہ عمل، جو اس فعلِ حرام کا مقدمہ ہے، شریعتِ محمدیہ میں حرام ہو۔ اسی احتیاط و پیش بندی کی بنا پر کہ صُورت پرستی مسلمانوں میں نہ آنے پائے، تصویر سازی کو مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا۔ شرائعِ سابقہ میں بعض اغراضِ صحیحہ کے حصُول کے لیے، مثلاً کسی غائب، زندہ یا مُردے کی شکل و شمائل معلوم کرنے کے لیے اس کی اجازت دی گئی تھی۔ جب شارع علیہ السّلام نے تصویر سازی کے بارے میں اتنی احتیاط و انتظام سے کام لیا ہے، تو آپ کے متبعین اور شریعتِ محمدیہ کے پیرووں کو شغلِ برزخ کو حرام و قبیح ہی سمجھنا چاہیے۔ جو شخص سیرتِ محمدیؐ پر نظر رکھتا ہے، اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر اس زمانۂ مبارک میں اس امر کے متعلق دریافت کیا جاتا، تو ضرور اس کی ممانعت کی جاتی اور اس کی حرمت بیان کی جاتی۔[1]

بیعت و تلقین کے بعد شاہ صاحبؒ نے ہدایت دے کر سید صاحبؒ کو رخصت کیا اور

(۱) صراطِ مستقیم، صفحہ ۱۱۸ ، ۱۱۹، مجتبائی۔

آپ اپنے مسکن پر آئے اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی ایک مدت تک آپ کو سلوک کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ (۱)

سلسلۂ تعلیم کا انقطاع اس زمانے میں سید صاحبؒ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے بعض کتابیں پڑھتے تھے۔ ایک روز عجیب واقعہ ہوا کہ آپ کتاب دیکھتے ہیں، تو سامنے سے حروف غائب ہو جاتے ہیں۔ آپؒ نے مرض سمجھ کر طبیبوں سے رجوع کیا، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو معلوم ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ باریک چیزوں کی طرف نظر کرو، تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی فرق نہیں، صرف کتابوں کی خصوصیت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ (۲)

بینی اندر خود علومِ انبیا
بے کتاب و بے معید و اوستا

سید صاحبؒ نے اگرچہ درسیات کی تکمیل نہیں کی، لیکن آپ کو دینی علوم سے ضروری واقفیت ہو گئی۔ آپ ہر وقت علما، مفسرین، محدثین، فقہا کی صحبت میں رہتے تھے، جہاں ہر وقت علم کا چرچا رہتا تھا، جہاں کا گھر بھی مدرسہ تھا اور جہاں کی تفریح بھی درس تھی، وہاں کی ہوا بھی علم پرور تھی اور وہاں کے بچے بھی دین کی سمجھ اور شریعت سے واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شریعت کدہ ہندوستان میں بالاتفاق علم کا سب سے بڑا مرکز تھا، جس میں منتخب علما و فضلا حاضر ہوتے تھے۔ ایک وقت میں صرف اس خاندان میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدین، مولانا عبدالحیؒ، مولانا اسمٰعیلؒ، مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ، مولانا محمد یعقوبؒ موجود تھے اور سید صاحبؒ کی صحبت انھیں حضرات سے تھی۔ قرآن مجید تو آپ نے خاص طور سے پڑھا۔ ترجمانِ قرآن حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی توجہ اور صحبت نے اس کو جلا دی۔

(۱) "ارواحِ ثلثہ" (۲) "امیر الروایات"۔

خلافِ شرع چیزوں سے حفاظت اس کے بعد آپ اپنے کام میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ شاہ صاحبؒ نے آپ کی خدمت کے لیے تین شخص جن کا خود صُلحا میں شمار ہوتا تھا، مقرر کر دیے وہ آپ کی ضروریات مہیّا کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ چند بے تکلف لوگوں نے جمنا کے کنارے ہندؤوں کے ایک میلے میں چلنے کے لیے آپ سے اصرار کیا اور باوجود آپ کے عُذر و انکار کے زبردستی آپ کو لے گئے، لیکن ۵ آپ میلے میں پہنچتے ہی بے ہوش ہو گئے اور اس میں شریک نہ ہو سکے[1] اور انھیں آپ کو مجبوراً واپس لانا پڑا۔ اس کے بعد ان کو پھر اس کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

باطنی ترقیات آپ کو چند دنوں میں اس قدر باطنی ترقی ہوئی اور وہ بلند مقامات حاصل ہوئے جو سالہا سال کی ریاضت و مجاہدہ سے بھی کم حاصل ہوتے ہیں اور آپ پر بیداری و خواب میں اس قدر انعاماتِ الٰہیہ کی بارش ہوئی، جس کی نظیر کم ملتی ہے۔ صاحبِ "مخزنِ احمدی" ۱۰ لکھتے ہیں:—

"قیامِ دہلی کے اثنا میں رمضان پڑا۔ اکیسویں شب کو آپ حضرت شاہ عبدالعزیز رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "اس عشرے کی کس رات میں شب بیداری کر کے شبِ قدر کی سعادت حاصل کی جائے؟" مولانا نے متبسم ہو کر فرمایا": "فرزندِ عزیز، شب بیداری کا جو روزانہ معمول ہے، اسی طرح ان ۱۵ راتوں میں بھی عمل کرو۔ صرف شب بیداری سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھو، چوکیدار اور سپاہی ساری رات جاگتے رہتے ہیں، مگر اس دولت سے بے نصیب و محروم رہتے ہیں۔ اگر تمھارے حال پر اللہ کا فضل ہے، تو شبِ قدر میں اگر تم سوتے بھی رہو گے، تو اللہ تم کو جگا کر ان برکات میں شریک کر دے گا۔" سید صاحبؒ یہ سن کر اپنے مسکن پر آ گئے اور عادت کے مطابق شب بیداری کا معمول رکھا۔ ستائیسویں ۲۰

---

(۱) صاحبِ "مخزنِ احمدی" نے اس واقعے کو نظم کیا ہے (صفحہ ۲۵، ۲۶)۔

شب کو آپ نے چاہا کہ ساری رات جاگوں اور عبادت کروں، مگر عشا کی نماز کے بعد
کچھ ایسا نیند کا غلبہ ہوا کہ آپ سو گئے۔ تہائی رات کے قریب دو شخصوں نے آپ کا
ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی دائیں طرف رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم،
اور بائیں حضرت ابوبکر صدیق، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بیٹھے ہیں اور آپ سے فرماتے ہیں
کہ احمد، جلد اٹھ اور غسل کر۔ سید صاحبؒ ان دونوں حضرات کو دیکھ کر دوڑ کر مسجد کے
حوض کی طرف گئے اور باوجودیکہ سردی سے حوض کا پانی یخ ہو رہا تھا آپ نے اس سے
غسل کیا اور فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت، صلی اللہ علیہ وسلم، نے
فرمایا: "فرزند، آج شبِ قدر ہے۔ یادِ الٰہی میں مشغول ہو اور دعا و مناجات کرو۔"
اس کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔ صاحبِ "مخزن" لکھتے ہیں کہ اس
کے بعد سید صاحب بارہا فرمایا کرتے تھے: "اس رات کو اللہ کے فضل سے واردات
عجیب و واقعاتِ غریب دیکھنے میں آئے۔ تمام درخت اور دنیا کی ہر چیز سجدے
میں تھی اور تسبیح و تہلیل میں مشغول۔ مگر ان ظاہری آنکھوں سے اپنی اپنی جگہ
کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت فنائے کلی اور استغراقِ کامل مجھے حاصل ہوا۔
صبح میں شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا، تو آپ نے بہت
مسرور ہو کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج کی شب تم اپنی مراد کو
پہنچ گئے۔ اس وقت سے ترقیات و علوِ درجات کے آثار ظاہر ہونے لگے"[1]۔

مولانا شاہ اسمٰعیل شہید "صراطِ مستقیم" میں لکھتے ہیں:

ایک بار خواب میں رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، نے سید صاحب کے منہ
میں تین چھوہارے دیے اور بہت شفقت و محبت سے کھلائے۔ جب آپ
بیدار ہوئے تو ان کی شیرینی آپ کے ظاہر و باطن سے ظاہر تھی۔ اس کے بعد

(۱) "مخزن احمدی"، صفحہ ۲۲، ۲۳

ایک روز سید صاحبؒ نے خواب میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو دیکھا، حضرت علیؓ نے اپنے دستِ مبارک سے آپ کو اس طرح نہلایا، جیسے باپ اپنے بچوں کو نہلاتے دھلاتے ہیں اور حضرت فاطمہؓ نے اپنے ہاتھ سے ایک لباس فاخر آپ کو پہنایا۔ اس کے بعد سے طریقِ نبوت کے کمالات آپ پر ظاہر ہونے لگے، یہاں تک کہ ایک روز اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے دستِ قدرت سے آپ کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اُمورِ قدسیہ میں سے ایک چیز، جو نہایت رفیع و بدیع تھی، آپ کو عنایت کی اور فرمایا کہ اور چیزیں بھی ہم تم کو دیں گے"۔[1]

رائے بریلی کو واپسی اور نکاح اس کے بعد آپ اپنے وطن رائے بریلی تشریف لائے۔[2] آپ اچانک پہنچے اور مسجد میں مسافرانہ جا کر بیٹھ گئے۔ آپ جس وقت گھر سے نکلے تھے، اس وقت ڈاڑھی مونچھ بھی نہیں نکلی تھی۔ اب تشریف لائے تو گھنی ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ لوگوں نے پہچانا نہیں اور سمجھے شاید کوئی مسافر یا درویش ہو۔ سب سے پہلے میاں عبدالقادر خاں نے (اور ایک روایت میں ہے کہ سید علم الہدیٰ نے) پہچانا اور گھر میں خبر کی۔ اعزا ملنے آئے اور ہاتھوں ہاتھ گھر لے گئے۔[3]

اس مرتبہ وطن میں کئی برس رہنا ہوا۔ اسی مدت میں آپ نے سید محمد روشن[4] کی صاحبزادی بی بی زہرہ سے نکاح کیا۔ یہ نسبت پہلے سے تھی، لیکن لڑکی کے گھر والوں کو آپ کی وضع اور عزائم دیکھ کر تامل تھا۔ اعزا نے کہہ سن کر راضی کیا اور یہ رشتہ ہو گیا۔ ۱۲۲۴ھ میں آپ کی بڑی صاحبزادی بی بی سارہ پیدا ہوئیں۔

---

(۱) "صراطِ مستقیم"، صفحہ ۱۶۴۔ (۲) خاندانی کاغذات اور دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۲۲۳ھ میں وطن میں موجود تھے (ملاحظہ ہو عکس وکالت نامہ سید محمد جامع و سید محمود و سید محی الدین مشمولہ کتاب) (۳) "منظورہ"۔ (۴) سید محمد روشن، شاہ علم اللہؒ کے حقیقی چچا سید اسحٰق کی پانچویں پشت میں ہیں: سید محمد روشن بن سید محمد شافع بن سید عبدالغفار بن سید تاج الدین بن سید اسحٰق بن سید محمد معظم۔

چوتھا باب

دہلی کا دوسرا سفر اور نواب امیر خاں کی رفاقت

دہلی کا دوسرا سفر رائے بریلی سے ۱۲۲۶ھ میں[1] آپ دہلی تشریف لے گئے۔ یہ دہلی کا دوسرا سفر تھا۔ کچھ مدت دہلی قیام فرما کر آپ ۱۲۲۷ھ میں[2] نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے جو وسطِ ہند کے بعض راجاؤں سے برسرِ پیکار تھے۔

نواب امیر خاں کی رفاقت اور سید صاحب کے مقاصد سید صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مقصد کے لیے

---

(۱) مرزا حیرت نے "حیاتِ طیبہ" میں رائے بریلی سے دوسرے سفر کی تاریخ تعین کے ساتھ جمادی الآخرہ ۱۲۲۴ھ پیش کی ہے (صفحہ ۲۸۹) اور اسی کو مہر صاحب نے "سید احمد شہیدؒ" میں اختیار کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مجھے اس کا ماخذ معلوم نہیں۔ اغلب ہے، یہ درست ہو۔ کم از کم اس کے اقرب الی الحقیقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں" (صفحہ ۸۲)، لیکن خاندانی دستاویزوں اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاریخ صحیح نہیں ہے اور محض قیاس پر مبنی ہے، اس لیے کہ

(الف) مولوی سید محمد علی، سید احمد علی، سید حمید الدین صاحبان نے اپنے والدِ مرحوم سید عبدالسبحان کے قرضے کا جو اقرار نامہ لکھا ہے اور جس کا عکس شاملِ کتاب ہے، اس پر سید صاحبؒ کی گواہی موجود ہے۔ اقرار نامے پر تاریخ تحریر ۲۰ ربیع الاول ۱۲۲۶ھ صاف پڑھی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۲۶ھ میں سید صاحبؒ رائے بریلی میں موجود تھے، اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ آپ دوسرے سفرِ دہلی پر روانہ ہونے کے بعد ۶، ۷ سال سے پہلے وطن واپس نہیں ہوئے۔

(ب) مولانا سید قطب الہدیٰ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع الاول ۱۲۲۶ھ میں اپنے بھتیجے مولانا سید محمد علی بن حسنیؒ کے نام اپنی تمام مملوکہ کتابوں کا ہبہ نامہ لکھا ہے۔ اس پر اعیانِ خاندانِ علم اللّٰہی کے دستخط اور مہریں ہیں۔ اس میں سید صاحبؒ کی مہر اسمہ احمد بھی ہے، جو آپ کی غیر موجودگی میں نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہبہ نامے کے آخر میں درج ہے: "تحریر فی التاریخ بست و ہشتم ربیع الاول ۱۲۲۶ھ المقدسہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام"۔ یہ ہبہ نامہ مصنف کے پاس محفوظ ہے۔

(ج) "منظورۃ السعداء" کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید قطب الہدیٰؒ کا انتقال آپ کے سامنے ہوا اور آپ جنازے کے وقت موجود تھے۔ صاحبِ "نزہۃ الخواطر" نے مولانا سید قطب الہدیٰ کی تاریخ وفات "گلشن محمودی" کے حوالے سے ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ لکھی ہے۔ اس لیے اس میں شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ سید صاحبؒ نے کم سے کم ربیع الآخر کے بعد سفر اختیار کیا، اور ۱۲۲۶ھ سے پہلے آپ وطن سے روانہ نہیں ہوئے۔

(۲) "وقائعِ احمدی" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب نواب کے لشکر میں پہنچے ہیں، تو وہ ٹونک کے قلعے کے محاصرے میں مصروف تھے۔ وقائع کے راوی نے خود آپ سے یہ روایت نقل کی ہے (وقائع، صفحہ ۲۱)۔ ٹونک کا محاصرہ "امیر نامہ" کے بیان کے مطابق ۱۲۲۶ھ میں پیش آیا۔ مولفِ "امیر نامہ" نے اس کو اسی سنہ کے واقعات میں بیان کیا ہے (زبیر نامہ اردو، صفحہ ۵۰۵)۔

تیار کیا تھا اور آپ نے جن بلند مقاصد کو اپنے پیشِ نظر رکھا تھا، ان کی سربراہی مزید تکمیل و پختگی
اور عملی مشق و تربیت کی متقاضی تھی۔[1] اگرچہ سیّد صاحبؒ نے شروع سے سپہگری اور سپاہیانہ اعمال
و اشغال اپنے فطری ذوق و رجحان سے سیکھے تھے، لیکن آپ کو عملی معرکہ آرائی اور میدانِ جنگ اور اس
کے نشیب و فراز سے گزرنے کا اس سے پیشتر موقع نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے کسی محاذِ جنگ کی ضرورت
تھی، جہاں رہ کر آپ فوجوں کی قیادت اور دست بدست جنگ کا عملی تجربہ حاصل کریں۔　۵

نیز ایک ایسے شخص کو، جو ہندوستان میں اسلام کے غلبے اور دینی حکومت کے قیام کے
لیے کوشاں ہو، سب سے پہلے اس کا جائزہ لینا ضروری تھا کہ اس ملک میں کہاں کہاں ایسی آزاد فوجی
طاقت پائی جاتی ہے، جو صحیح رہنمائی کے بعد اس عظیم مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اُنیسویں صدی کی ابتدا میں سارے ملک میں چار قابلِ ذکر طاقتیں تھیں: ایک بیدار مغز اور
نوخیز طاقت "انگریز"، جن کا ستارۂ اقبال روز بروز بلند ہوتا جا رہا تھا؛ دُوسرے، دکن میں نظام؛ تیسرے،　۱۰
شمالی ہند میں اودھ کی سلطنت، لیکن دونوں طاقتیں انگریزوں کی سرپرستی قبول کر چکی تھیں اور اس
ملک میں اسلامی اقتدار کے لیے ان سے اُمید رکھنا فضُول تھا؛ چوتھے، مرہٹے، جو وسطِ ہند اور دکن
میں اپنی ریاستیں قائم کیے ہُوئے تھے، لیکن ان کی آپس میں سخت رقابت اور خانہ جنگی تھی۔ اٹھارویں
صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے اوائل میں ان کے چار سردار دولت راؤ سندھیا، جسونت راؤ
ہلکر، باجی راؤ پیشوا، رگھوجی بھونسلہ اقتدارِ اعلیٰ کے لیے کشمکش کر رہے تھے۔　۱۵

ان چار طاقتوں کے علاوہ جن سے اسلامی اقتدار کے قیام کے لیے کسی مدد کی امید نہیں تھی،
ایک پانچویں بڑھتی ہُوئی آزاد طاقت تھی، جس کو وقت کا کوئی مُبصر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ
روہیلکھنڈ کے افغانوں کی طاقت تھی، جن کی قیادت سنبھل (ضلع مراد آباد) کا ایک حوصلہ مند
افغان زادہ، امیر خاں کر رہا تھا۔ امیر خاں کے ساتھ روہیلکھنڈ اور شمالی ہند کے دلیر اور حوصلہ مند
پٹھانوں اور سپاہ پیشہ نوجوانوں کی ایک کثیر التعداد اور طاقت ور جمعیت رہتی تھی، جس کو مرہٹہ　۲۰

(۱) یہ کسی عظیم المرتبت ہستی کے لیے کوئی نقص اور عیب کی بات نہیں۔ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔

سردار اور راجپوت والیانِ ریاست ہمیشہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں رہا کرتے تھے اور جن کی شمولیت فتح و شکست کے لیے اکثر فیصلہ کُن ثابت ہُوا کرتی تھی۔ اس جمعیت میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر، مسلمانوں کا گرم اور تازہ خُون، ہندوستان کی خارج طاقت کا بچا کُھچا سرمایہ اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے۔

امیر خاں

امیر خاں کا خاندان سالارزئی پٹھانوں کا ایک خاندان تھا، جو علاقہ بُنیر کے موضع جوڑ میں بُود و باش رکھتا تھا۔ اس خاندان کے پہلے فرد طالع خاں محمدؐ شاہ کے عہد میں ہندوستان آگئے اور سنبھل، ضلع مراد آباد سرائے ترین میں سکُونت اختیار کی۔ اس کے فرزند محمدؐ حیات خاں امیر خاں کے والد ہیں۔

امیر خاں ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے سپہگری کا شوق تھا۔ پڑھنے لکھنے سے مناسبت نہ تھی۔ ۱۲۰۲ھ میں قسمت آزمائی اور کشور کشائی کے لیے سنبھل سے نکل پڑے۔ راستے میں سپاہی پیشہ اور طالب روزگار آدمی شامل ہوتے رہے۔ کچھ عرصہ مختلف سرکاروں میں نوکری کی۔ پھر خود اپنی ایک جمعیت پیدا کر لی اور اپنی لیاقت اور شجاعت کا سکّہ بٹھا دیا۔ بارہا اپنی قلیل جمعیت سے فوج گراں کا مقابلہ کیا اور بڑے بڑے لشکروں کو شکست دی۔ ان کی جمعیت اور طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ ۱۲۱۵ھ میں جب وہ سرونج کی طرف گئے ہیں، تو ستّر اسّی ہزار سوار اور پیادے ان کے ہمراہ تھے۔ ۱۲۳۰ھ میں انھوں نے پچاس ہزار پیادے اور بارہ ہزار سوار اپنے ایک فوجی افسر میاں محمدؐ اکبر خاں کے سپُرد کیے۔ ان کی جنگی لیاقت اور فوجی اہمیت کی شہرت اتنی دُور دُور پہنچی تھی کہ ۱۲۲۹ھ میں شاہ شجاع نے ان کو کابل اور اعلیٰ نصیر خاں حاکم بلوچستان نے ان کو بلوچستان طلب کیا۔[1] بیس پچیس سال کابل، مالوہ، مارواڑ، راجپوتانہ اور دکن کی سرزمین ان کی رزم آرائیوں اور جنگ آزمائیوں کی جولانگاہ رہی۔ بڑی بڑی ریاستیں ان کی یلغار سے لرزہ براندام رہتی تھیں۔ ذاتی دلیری، پامردی، جفاکشی اور قوّتِ برداشت، رفیقوں کے ساتھ حُسنِ سلوک، فیاضی، اولوالعزمی اور سپاہیانہ اوصاف

(۱) "امیر نامہ" صفحہ ۱۶ ھ

میں وہ تاریخ کے قدیم فوجی سرداروں اور بانیانِ سلطنت کا نمونہ تھے، لیکن بلند اور واضح مقصد نہ ہونے کی وجہ سے، نیز رُفقا کی بے نظمی اور خود غرضی کے سبب سے، جو روپیہ ملنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے دھرنہ دے کر بیٹھ جاتے تھے اور ان کو حبس میں رکھتے تھے (ملاحظہ ہو "امیر نامہ") وہ نہ اسلام کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکے، نہ اپنے ہی لیے کوئی شایانِ شان مقام حاصل کر سکے۔ انھوں نے عرصے تک صرف مختلف ریاستوں پر حملہ کر کے یکمشت یا سالانہ رقم وصول کرنے پر اکتفا کی اور کبھی ایک فریق کی دوسرے فریق کے مقابلے میں مدد کر کے وقتی منفعت حاصل کر لی، کبھی دوسرے فریق کی پہلے فریق کے مقابلے میں حمایت کر کے رقم وصول کر لی۔ ان کی سپہ گری اور فوجی طاقت سے مرہٹہ سرداروں اور راجپوت رئیسوں نے زیادہ فائدہ حاصل کیا۔ ہلکر کی ریاست اندور محض ان کی سعی و کوشش اور وفادارانہ رفاقت کا نتیجہ ہے۔ آخر میں ۱۲۳۲ھ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے اور ان کی سرگرمیوں کا میدان اتنا تنگ ہو گیا کہ انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور راجپوتانا اور مالوے کے چند متفرق اور غیر اہم حصّوں پر قناعت کر کے، جن کے مجموعے کا نام ریاست ٹونک تھا، انھوں نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ اگر وہ اولوالعزمی اور دور بینی سے کام لیتے اور سید صاحبؒ سے مل کر منظم اور بلند مقصد جدّ و جہد کرتے، تو تاریخِ اسلام میں ان کا بڑا مقام ہوتا اور اس ملک کی تاریخ بھی بہت مختلف ہوتی۔

سید صاحبؒ نواب امیر خاں کے لشکر میں

سید صاحبؒ کا یہ سفر چونکہ اس عظیم مقصد (اقامتِ جہاد) کے ماتحت اور اشارۂ غیبی سے تھا،(۱) اس لیے اگرچہ دہلی سے نواب صاحبؒ کا لشکر بہت دور دراز فاصلے پر تھا اور عام بدامنی اور بے نظمی کی وجہ سے راستے پُرخطر اور سفر نہایت مخدوش تھا، لیکن آپ نے یہ سفر نہایت سکون و اطمینان اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ طے کیا۔ مولوی سید محمد علی

(۱) مولوی سید جعفر علی صاحب "منظورۃ السعداء" میں لکھتے ہیں:

بنا بر الہامیکہ در بابِ اقامتِ جہاد شدہ، رہگرائے لشکرِ ظفر اثر ... امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند

اقامتِ جہاد کے بارے میں آپ کو جو الہامِ ربّانی ہوا، اس کی بنا پر آپ نواب امیر خاں کے لشکر کی طرف تشریف لے گئے

"مخزنِ احمدی" میں لکھتے ہیں:

متوکلاً و معتصماً بحفظہٖ بفراغِ بال فرداً وحیداً شاداں و فرحاں مانندِ کسے کہ بہ سیرِ بوستاں یا خانۂ دوستاں می رود، از بلدۂ شاہجہان آباد نہضت فرمودہ بعدِ طئیِ مراحل و منازل کہ ہر مرحلہ ہفت خوانِ رستم و اسفندیار بود، طے فرمودہ بوجودِ فیض آمودِ خود لشکر را متور و مشرّف ساختند۔ (۱)	خدا کے توکّل اور اس کی حفاظت پر اعتماد کرتے ہوئے اطمینانِ قلب کے ساتھ آپ تن تنہا، شاداں و فرحاں، جیسے کوئی باغ کی سیر یا کسی دوست کے گھر جاتا ہے، شہر دہلی سے روانہ ہوئے اور ایسی منزلیں اور مرحلے طے کرتے ہوئے کہ ہر مرحلہ رستم و اسفندیار کے ہفت خواں سے کم نہ تھا، آپ نے لشکر کو اپنے شرفِ قدوم سے مشرّف فرمایا۔

"وقائعِ احمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اہلِ لشکر آپ سے ناواقف تھے۔ بعض لوگ اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے کہ آپ ایک مردِ صالح اور شریف النفس شخص ہیں۔

"حضرت سید المجاہدین کے حالِ خیر مآل سے اس فوجِ ظفر موج میں کوئی آگاہ نہ تھا۔ بعض بعض جانتے تھے کہ یہ شخص سید، آلِ رسولؐ، پرہیزگار، نیک کردار ہے۔" (۲)

لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ بہت جلد آپ کی للّٰہیت و پاک نفسی، عبادت و مجاہدہ، زہد و توکّل اور قبولیتِ دعا کا چرچا ہوگیا۔ لوگوں نے جب آپ کی مقبولیت کی علامتیں اور بزرگی کے واقعات دیکھے، تو بہت سے لوگوں کو اعتقاد ہوا۔ بعض ان واقعات کو ان چیزوں پر محمول کرتے تھے، جن کا اس زمانے میں رواج تھا۔ سید صاحبؒ سے تذکرہ ہوتا، تو آپ پوری بے تکلفی سے اس کی حقیقت بیان فرما دیتے۔ "وقائع" میں ہے:

"اس طرح کی جب کئی کرامتیں حضرت سے ظہور میں آئیں، تب لشکر کے اکثر لوگ معتقد ہوئے۔ بعض شخص کہتے تھے کہ یہ صاحبِ خدمت اس لشکرِ ظفر پیکر کے ہیں، اور بعض کہتے کہ مستجاب الدّعوات اور صاحبِ کرامات ہیں۔ لشکر میں نواب مستطاب مرحوم مغفور

(۱) صفحہ ۳۲ (۲) صفحہ ۲۲

کی کثرتِ سیر و دور کے سبب اکثر پیادے اور سواروں پر کھانے دانے کی تنگی اور
تکلیف ہوتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایتِ بے نہایت سے حضرت سید المجاہدین
کی جماعت میں سب طرح سے فراغت اور فراخی رہتی تھی۔ یہ حال خیال کر کے اکثر
مردمِ ناداں گمان کرتے تھے کہ ان کو نواب صاحب مرحوم شاید کچھ پوشیدہ بھیجتے ہیں،
یا ان کو کیمیا آتی ہے، یا دستِ غیب ہے، جو آپ کے یہاں تنگی و تکلیف نہیں، اور بعض ۵
یار و آشنا یہ بات آپ کے سامنے کہتے۔ آپ اُن سے فرماتے کہ ان تینوں باتوں
سے ایک بھی نہیں۔ میرا پروردگار محض اپنے فضل و کرم سے روزی پہنچاتا ہے۔ اور جس
روز نوابِ مستطاب سے کچھ عنایت ہوتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ میں لوگوں کو
اسی دم تقسیم کر دیتا ہوں۔" (۱)

لشکر میں اصلاح و تبلیغ آپ اپنی عبادات و ریاضات اور لشکر کی سپاہیانہ زندگی کے ساتھ اصلاح و ۱۰
ارشاد میں بھی مشغول تھے۔ یہ لشکر جس میں ایک ایک وقت میں چالیس چالیس، پچاس پچاس
ہزار مسلمان سپاہی رہتے تھے، دعوت و تبلیغ کا ایک وسیع میدان تھا۔ سپاہی پیشہ لوگ عموماً ناخواندہ
یا کم پڑھے، ضروریاتِ دین سے ناواقف اور دینی و علمی ماحول کے اثرات سے دور ہوتے ہیں۔ آپ
کی زندگی چونکہ خود سپاہیانہ تھی اور آپ ان میں گھلے ملے رہتے تھے، اس لیے آپ کو اپنے ساتھیوں کی
اصلاح و تربیت کے بہترین مواقع حاصل تھے۔ لشکر کے سپاہی اور شاگرد پیشہ آپ کو درویشِ باخدا ۱۵
سمجھ کر مختلف ضرورتوں اور پریشانیوں میں آپ کے پاس آتے اور دعا کی درخواست کرتے۔ آپ
سُنّتِ یوسفی کے مطابق ان کی دلجوئی اور کار برآری بھی کرتے اور عقیدۂ صحیحہ کی تعلیم بھی کرتے، خلافِ
شرع اُمور سے توبہ کر لیتے اور ارکان و فرائضِ دین کی پابندی کا اقرار لیتے۔ یہاں "وقائع" سے چند
واقعات نقل کیے جاتے ہیں، جن سے آپ کے طریقۂ تبلیغ اور اس کے اثرات کا اندازہ ہوگا:۔
"ایک سپاہی جو نارو میں مبتلا تھا، حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ۲۰

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۲۷

نے فرمایا: "اگر تم سب بُرے کاموں سے توبہ کرو اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا اقرار کرو، تو مَیں اپنے شافیِ مطلق اور معبودِ برحق سے دُعا کروں۔ وُہ اپنی عنایتِ بے نہایت سے شفا بخشے۔" وہ سپاہی بے چارہ مصیبت کا مارا اسی دم تمام افعالِ شنیعہ سے تائب ہُوا اور ادائے نمازِ پنجگانہ کا اقرار کیا۔ آپ نے اسی طور اس کے زخم پر بھی لبِ مبارک لگا دیا اور اسی طور فرمایا اور کہا: "جو کچھ دعا اس پر لگائی ہے، دُور کرے۔ اللہ تعالےٰ شفا دے گا۔" حکمتِ الٰہی سے کئی روز میں وُہ بھی چنگا ہو گیا۔ یہ خبر لشکر میں مشہور ہُوئی۔ ان دنوں لشکر میں کئی آدمیوں کے نارو نکلا تھا۔ جو آپ کے پاس آتا، اس کے زخم پر اپنا لبِ مبارک لگا دیتے اور فاسقوں بے نمازیوں سے وُہی اقرار لیتے۔ وہ چار روز میں فضلِ الٰہی سے چنگا ہو جاتا۔"(۱)

"پنساری مدار بخش نامی نے، جس کے یہاں سے آپ کے گھوڑے کا مسالہ آتا، اپنی دُکان میں برکت کی دُعا کی استدعا کی۔ آپ نے فرمایا: "تمھارا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو؟" اس نے عرض کی: "نام میرا مدار بخش، پھولا کیکڑی میں گھر ہے۔" آپ نے فرمایا: "جو ہم تم سے کہیں، اس کو مانو، تو ہم اپنے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔" اس نے کہا: "آپ جو ارشاد کریں گے، بلا عذر قبول کروں گا۔" فرمایا: "آج سے اپنا نام اللہ بخش رکھو اور سب بُرے کاموں سے تائب ہو، پانچوں وقت نماز پڑھو، جھوٹ نہ بولو، دغا فریب جان بُوجھ کر نہ کرو، اپنا مال کسی کو کم نہ دو اور کسی غیر کا زیادہ نہ لو۔" اُس نے عرض کی: "یہ سب مَیں نے مانا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی امر میں قصور نہ ہوگا۔" آپ نے فرمایا: "اب جاؤ، اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے گا۔ تمھاری دُکان میں برکت ہوگی۔" وُہ اپنی دُکان پر گیا۔ عنایتِ الٰہی سے اُسے ترقی ہونی شروع ہُوئی۔ اوّل تو اس کے پاس تین چار بیل لادنے اور ایک چھوٹا سا پال سایہ کرنے کو تھا۔ قریب دو سال کے

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۳۳

عرصے میں حضرت کی دُعا سے نو دس بیل اور چار اُونٹ اور چھ سات نوکر چاکر اور بڑا سا پال ہُوا۔ ایک روز حضرت امیر المؤمنین کے پاس آ کر التماس کی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا سے مجھ کو سب کچھ دیا۔ اب میری یہ آرزو ہے کہ جو کچھ دوا، مسالہ وغیرہ حضرت کی سرکار میں درکار ہو، ہمیشہ بے داموں میری دُکان سے آیا کرے۔" آپ نے فرمایا: "یہ ہرگز نہ ہوگا۔" اُس نے اس بات میں بہت مبالغہ کیا، آپ نے کسی طور نہ مانا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ خبردار، جو چیز ان کے یہاں سے آئے، کبھی بے قیمت نہ لینا۔"(۱)

"میرٹے کے قاضی اللہ بخش اور ناگور کے قاضی خدا بخش آٹھ نو مہینے آپ کے پاس رہے اور قرآن شریف درست کر لینے کے بعد آپ سے کہنے لگے کہ: "اب ہم کو حضورِ پُرنور سے رخصت کرا دیں، ہم اپنے غریب خانے کو جائیں گے۔" آپ نے فرمایا: "بہت خوب، مگر ایک نصیحت ہماری مانو اور سچ جانو، تو اللہ تعالیٰ تمھارا دین و دُنیا میں بھلا کرے گا۔" انھوں نے کہا: "آپ جو فرمائیں گے، بسر و چشم قبول ہے۔" آپ نے فرمایا: "شرک کے اقوال، افعال چھوڑ دو۔ یہی نصیحت ہے۔" اُنھوں نے عرض کی: "حضرت، شرک کیا چیز ہے؟ ہم کو نہیں معلوم۔" تب آپ نے تفصیل وار دیر تک سمجھایا اور توبہ کروائی اور دونوں کو ایک ایک ٹوپی عنایت فرمائی اور رخصت دلا دی۔ وہ اپنے وطن کو چلے گئے۔"(۲)

لشکر میں فیلبان اور سائیس عموماً غیر محتاط اور بد دیانت ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھی گھوڑوں کے راتب سے عام طور پر کچھ نکال لیا کرتے ہیں اور استعمال میں لاتے ہیں یا فروخت کر ڈالتے ہیں اور بے زبان جانور بھوکے رہتے ہیں۔ اس طبقے کا کوئی آدمی آپ سے دُعا کی درخواست کرتا، تو آپ خاص طور پر اس سے وعدہ لیتے کہ وہ جانوروں کے راتب میں سے خرد برد

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۵ (۲) صفحہ ۵۶

نہیں کرے گا اور جن کی بدولت خود اس کا پیٹ بھرتا ہے، اُن کو پیٹ بھر کر کھلائے گا۔ "وقائع" میں ہے :۔

"شیخ محمد عبدالسمیع، جو لشکرِ ظفر پیکر کے ہاتھی کا فیلبان بردار تھا، ایک روز اُس نے حضرت سیّد المجاہدین کی ضیافت کی۔ آپ نگرانوں کے حضرت سیّد ظہور احمد اور اُن کے بھائی سیّد عبدالرزاق اور شیخ محمد عارف کرنالی اور شیخ محمد ناصر نصیر آبادی وغیرہ قریب چودہ پندرہ آدمی لے کر ضیافت کھانے تشریف لے گئے۔ تناولِ طعام کے بعد صاحبِ دعوت نے آپ کی خدمت میں عرض کی: "حضرت، میں روپے پیسے سے تنگ حال اور شکستہ بال ہوں۔ حضورِ پُرنور ہمیشہ خرچ دینے کا وعدہ فرماتے ہیں، مگر ابھی تک کچھ ظہور میں نہیں آیا۔ آپ اس میں کچھ للہ فی اللہ کوشش کیجیے۔ شاید آپ کے وسیلے سے کچھ مل جائے!" آپ نے فرمایا کہ: "بھائی صاحب، ہاتھی کا جو راتب سرکار سے مقرر ہے، اس کی بخوبی حفاظت کیا کرو، کوئی اس میں دست اندازی نہ کرنے پائے۔ اللہ تعالیٰ تم کو فراغت عنایت فرما دے گا۔"

اس کے بعد رمضان خاں فیلبان نے اسی بات کا شکوہ آپ سے کیا کہ میں اسی بلا میں مبتلا ہوں۔ آپ نے اس سے فرمایا: "تم اس بات سے توبہ کرو کہ جو کچھ تمہارا ہاتھی راتب سے مقرر ہے۔ اس کے سوا اس کے راتب سے ایک چھپیہ بھر کوئی شخص نہ لینے پائے۔ تم کو بھی اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ خوش رکھے گا۔"[1]

عملی شرکت و رفاقت سیّد صاحبؒ کے کم از کم چھ سال نواب امیر خاں کی رفاقت اور ان کے لشکر میں گزرے۔ لشکر کی یہ رفاقت سخت مجاہدہ و جفاکشی اور بلند ہمتی کو چاہتی تھی۔ اودے پور، جے پور، جودھ پور، بھانپورہ (ہلکر کا مستقر)، بھرت پور، بیکانیر، اجمیر اور ان کے درمیان کے صدہا مقامات و قصبات ہمیشہ اس لشکر کی زد میں رہتے تھے۔[2] کبھی یہ لشکر مالوے میں ہے،

(۱) "وقائع" صفحہ ۵۰، ۵۱ (۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "امیر نامہ" از صفحہ ۹۰ تا صفحہ ۵۵۷

کبھی راجپوتانے میں، کبھی مارواڑ میں ہے اور کبھی میواڑ میں۔ بے آب و گیاہ ریگستان، گھنے جنگل، غنیم کے ملک، حریف کے قلعے، غرض جنگ کے ہر نشیب و فراز اور ہر گرم و سرد سے گزرنا پڑتا۔ بیماری، فاقہ، تنگی، خطرہ، فتح و شکست، قلت و کثرتِ افواج، سب سے سابقہ تھا۔ سید صاحبؒ ان تمام حالات میں لشکر کے شریکِ حال رہے۔ آپ نازک موقعوں پر نواب کو صحیح مشورہ دیتے، اہل حاجت کی سفارش فرماتے۔ نواب صاحب کا معاملہ بھی آپ کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ تھا۔ ۵

آپ صرف ریاضت و مجاہدہ، دعائے خیر و برکت اور وعظ و نصیحت ہی پر اکتفا نہ فرماتے۔ نازک موقعوں پر خود شریکِ جنگ ہوتے، فوج کا حوصلہ بڑھاتے اور قائدین کو جنگ کی تدبیر اور صلاح بتلاتے۔ جے پور کی فوج کشی کے موقع پر "وقائع" میں آتا ہے کہ موتی ڈونگڑی کے ورے جو نالہ تھا، اس میں کئی ہزار آدمی چھپے تھے۔ وہ وہاں سے بھاگ کر موتی ڈونگڑی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ نواب صاحب نے عمر خاں رسالے دار سے فرمایا کہ تم اپنا مورچہ اس نالے میں کر دو۔ رسالے دار صاحب ۱۰ نے پس و پیش کیا کہ میرے ہمراہ سوار ہیں اور نالے کی طرف سب پیادہ ہیں، ایسی صورت میں بڑا خطرہ ہے۔ وہ کچھ عذر سا کرنے لگے۔ سید صاحبؒ نے نواب صاحب سے فرمایا کہ اگر ارشادِ عالی ہو، تو میں عمر خاں کے ہمراہ رہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ہم آپ کو اپنے ساتھ رکھیں گے، یہاں ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ آپ نے عمر خاں رسالے دار سے فرمایا کہ بھائی صاحب، خدا کو یاد کیجیے، کوئی بے موت نہیں مرتا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی فتح اور دشمن کی شکست ہے۔ نواب صاحب نے ۱۵ بھی رسالے دار موصوف کو بہت تسلی دی اور پیادوں کی فوج عطا کی اور چند ضرب توپ بھی عنایت فرمائیں۔ وہ موتی ڈونگڑی کو داہنے طرف چھوڑ کر آگے بڑھے۔ اس عرصے میں مخبروں نے خبر دی کہ چاند سنگھ راجہ کا رسالے دار قریب تیس ہزار سواروں کے ساتھ ماجی کے باغ کی پشت پر کھڑا ہے۔ آگے چل کر جو دیکھا، تو رسالے دار مذکور کے سوار نمودار ہوئے۔ لشکر کے لوگ گھبرائے۔ آپ نے دعا کی اور نواب صاحب سے کہا: "میں آگے چلتا ہوں، آپ لشکر کو ہمراہ لیے ہوئے پیچھے ۲۰ پیچھے کچھ فرق سے آئیے۔" نواب صاحب نے فرمایا کہ آپ تنہا ہرگز نہ آئیں۔ آپ نے

کچھ خیال نہ کیا اور چھ سواروں کے ساتھ آگے بڑھے۔ جب دشمن کے سوار ایک گولے کی زد پر رہے، تو چاند سنگھ رسالے دار پیادہ و سوار کے ساتھ باجی کے باغ میں چلا گیا۔ سید صاحبؒ نے رومال ہلا کر اشارہ کیا کہ آپ جلد فوج لے کر چلے آئیں، رسالے دار پسپا ہو کر شہر میں چلا گیا۔ سید صاحبؒ نے باغ کے برج پر چڑھ کر رومال کے اشارے سے نواب صاحب کو بلایا۔ نواب صاحب باغ میں داخل ہو کر ایک مکان کے کوٹھے پر چڑھ گئے اور دوربین لگا کر مخالف کی فوج کو دیکھنے لگے۔ سید صاحبؒ برج سے اتر کر ایک آم کے درخت کے سایے میں باغبان کے جھونپڑے کے قریب بائیس آدمیوں کے ساتھ جا بیٹھے۔ وہاں بہ نسبت اور جگہ کے زیادہ امن تھا، ہر طرف توپوں کے گولے اولوں کے مانند گرتے تھے۔ کچھ دیر میں شام ہوئی۔ سید صاحبؒ دوبارہ آدمیوں کے ساتھ پھر اسی برج پر تشریف لے گئے اور نمازِ عصر وہیں ادا کی۔ نماز کے بعد لوگ آپس میں کہنے لگے کہ آج اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل فرمایا۔ ہم کو فتح عنایت کی اور چاند سنگھ باوجود اتنے سواروں کے ہمارے مقابلے سے ہٹ گیا۔"[1]

نواب امیر خاں کی انگریزوں سے مصالحت نواب امیر خاں اگرچہ بعض مرہٹہ سرداروں اور راجپوت رئیسوں کے حلیف اور رفیق رہے، لیکن اس پورے عرصے میں وہ انگریزوں کے حریف اور ان سے برسرِ جنگ رہے۔ ۱۲۲۱ھ میں جب جنرل لیک صاحب نے موٹھی صاحب، ناظمِ بندیلکھنڈ کے ذریعے نواب کے پاس پیغام بھیجا کہ اورنگ آباد میں جس قدر ملک واسلی صاحب وغیرہ نے آپ کو دینا چاہا تھا، اس پر تیرہ لاکھ روپے کا ملک اور اضافہ کر کے ہم دینا چاہتے ہیں، لے لیجیے اور اس تاخت و تاراج سے باز آئیے، تو نواب نے جواب دیا کہ ہمارا عزم ہے کہ تمام ہندوستان پر حکمرانی کریں، اتنا سا ملک و مال کیوں لیں؟"[2] وہ انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے پر یہاں تک آمادہ تھے کہ رنجیت سنگھ سے مدد حاصل کرنے کے لیے امرتسر تک پہنچ گئے۔ مؤلف "امیر نامہ" کا بیان ہے کہ پٹیالے سے اس عزم پر نہضت کی کہ رنجیت سنگھ سے سازش کر کے انگریزوں پر ٹوٹیں۔ اگر سکھ ساتھ نہ دیں، تو شاہ شجاع الملک بادشاہِ کابل سے ملیں۔ شاہ کے ظلِ حمایت میں معاندین سے انتقام لیں[3]۔ ۱۲۲۲ھ

(۱) "وقائع احمدی" (باختصار) صفحہ ۶۰-۶۵ (۲) "امیر نامہ" صفحہ ۲۲۳ (۳) "امیر نامہ" صفحہ ۲۶۰

میں جب ہلکر نے انگریزوں سے مصالحت کا فیصلہ اور ابتدائی بات چیت کرلی، تو نواب سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ رنجیت سنگھ وغیرہ رئیسوں میں ہمت نہیں کہ ہماری امداد کریں۔ شجاع الملک کا لانا کیسا؟ وہاں تک پہنچنے ہی کا خرچ ہمارے پاس نہیں۔ اب آپ کی کیا صلاح ہے؟ نواب نے جواب دیا:

> "رنجیت سنگھ وغیرہ میں ہمت نہیں، نہ سہی۔ میں کابل جاتا ہوں۔ بہر طور شاہ کو کمک پر لاتا ہوں۔ ہمارے پاس دس پندرہ لاکھ کے جواہر ہیں۔ یہ شاہ کو دوں گا۔ باقی دہلی، لکھنؤ سے وصول کرکے دینے کا اقرار کروں گا۔ انگریزوں کو ہند سے نکالوں گا۔"
>
> مہاراج نے کہا: "اور جو شاہ نہ آئے؟" امیر نے کہا: "کچھ پروا نہیں۔ اٹک تک جاکر اپنے ہم وطن، ہم قوم پٹھانوں کو جمع کروں گا، لاکھوں یوسف زئی ساتھ لے کر لوٹوں گا۔"(۱)

لیکن رفتہ رفتہ انگریز برسرِ جنگ طاقتوں اور ریاستوں کو توڑتے رہے اور خود اُن کے حالات، کوتاہ نظری، بے نظمی اور رفیقوں کی خود غرضی ان کو اس بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ مصالحت اور اپنے ذاتی مصالح کی حفاظت پر مجبور کرتی رہی، یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء میں ایک طرف پیشوا نے مسٹر الفنسٹن کے ساتھ معاہدہ کرلیا، کچھ ہی عرصے بعد سندھیا نے بھی ایک معاہدۂ صلح پر دستخط کردیے۔ بالآخر ۶؍ جنوری ۱۸۱۸ء کو نواب کے رفیقِ قدیم مہاراجہ ہلکر نے بھی مصالحت کرلی اور نواب تن تنہا رہ گئے۔

۱۲۳۲ھ میں نواب مادھوراجپورہ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، جہاں اخوند زادہ محمد ایاز خاں کے متعلقین، جو نواب کے اعزۂ خاص تھے، محصور و محبوس تھے۔ اس محاصرے نے بہت طول کھینچا۔ نواب نے دو بار قلعے کی تسخیر کی خاص سعی و تدبیر کی، لیکن ولائتیوں کی غلط فہمی اور فوج کی عجلت کی وجہ سے ناکام رہی۔(۲) اسی عرصے میں انگریزی افواج نے چار سمت سے بڑھنا شروع

(۱) "امیر نامہ" صفحہ ۲۴۴ (۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "امیر نامہ" صفحہ ۵۵۴ - صفحہ ۵۵۶

رکیا اور نواب کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جنرل ڈنکین بہت بڑی اور جرّار فوج کے ساتھ آگرے سے چل کر
راجپورہ سے پندرہ کوس کے فاصلے پر پہنچ گیا اور کوٹہ جانے کا راستہ بند کر دیا۔ دہلی سے جنرل
آکٹر لونی ایک زبردست فوج اور عظیم الشان توپ خانے کے ساتھ آیا۔ اب نواب کے لیے نہ پنڈاروں
سے ملنے کا موقع تھا، نہ سیندھیا اور ہلکر سے ربط قائم کرنے کا۔ ایک انگریزی جیش خود نوّاب کے
لشکر کے دو حصّوں میں حائل ہو گیا۔ خود انگریز مؤرخین کا بیان ہے کہ "کمپنی نے پہلی مرتبہ اپنی سب سے
بڑی فوجی طاقت، جو ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، پنڈاروں کی سرکوبی کے لیے جمع کی"[1] اس
سب کے ساتھ انھوں نے نواب کے بعض قدیم رفیقوں کو توڑ لیا۔ فیض اللہ خان بنگش نواب کے
قدیم رسالے دار انگریزوں سے مل گئے۔ نواب کو خطرہ ہوا کہ بعض رفقائے قدیم اور افسرانِ فوج ان
کو انگریزوں کے سپرد کر دیں گے۔ ان نازک حالات میں کہ یہ "شہباز" بالکل دام میں آگیا تھا، انگریزوں
نے نواب کے بعض معتمدین کے ذریعے نواب کو صلح کی ترغیب دی۔ مٹکاف صاحب نے دہلی سے
نرنجن لال کو ایک عہد نامے کا مضمون دے کر بھیجا کہ نواب اس پر دستخط کر دیں تو ہمارے ان کے
درمیان فوراً صلح ہو جائے۔ اس نے مصالحت کی خوبیاں اور آئندہ منافع کی توقعات نواب کے
ذہن نشین کیں اور مصالحت پر آمادہ کیا۔ نواب نے راجپورہ کے ٹھاکر سے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔
اخوند زادہ محمد ایاز خاں کے متعلقین کو رہا کرایا اور داتارام کو، جو جے پور میں نوّاب کے سفیر کے طور پر
مقیم تھا، لکھا کہ تم جنرل اختر لونی (آکٹر لونی) کے پاس جا کر ہماری طرف سے صلح کی آمادگی کا
اظہار کرو اور صلح نامہ مرتب کر لو۔ نواب اور جنرل آکٹر لونی کی ملاقاتیں اور ربط ضبط قائم ہو گیا۔

---

(1) (R.W. Frazer's "British India." P. 190) کمپنی نے پنڈاروں کی سرکوبی
کو اس فوجی نقل و حرکت کا سبب قرار دیا تھا، لیکن اس کا اہم مقصد ہندوستان کی آخری آزاد فوجی طاقت روہیلہ پٹھانوں
اور امیر خان کا انتظام تھا۔ انگریز مصنفین نے بڑی چالاکی کے ساتھ نواب امیر خاں کو پنڈارہ مشہور کیا، حالانکہ پنڈارے
جنوبی ہند کی ایک غیر منظم اور جنگ جو طاقت تھی، جو ہندوستان کے پچھلے عہدِ انتشار اور مرہٹہ گردی کے دور میں
پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر لیا اور حالات سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا تعلق نواب سے صرف اتنا تھا کہ
نواب نے بعض موقعوں پر ان کے بعض سرداروں کو پناہ دی تھی اور ان کو اپنی حمایت میں لیا تھا اور وہ کبھی کبھی نواب کا ساتھ دے دیا کرتے تھے۔

عہد نامے کا مسودہ دہلی بھیجا گیا اور ۹ نومبر ۱۸۱۷ء کو نواب کے وکیل نے اصل معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ ۱۵ نومبر کو گورنر جنرل نے اس معاہدے کی تصدیق کر دی۔ اس طرح نواب کی سی سالہ فوجی سرگرمیاں اور اولوالعزمیاں ختم ہو کر ریاست ٹونک کی بنیاد پڑ گئی، جو انگریزوں کی چالاکی اور نواب کی سادہ لوحی سے راجپوتانے اور مالوے کے چند متفرق و منتشر علاقوں پر مشتمل تھی، جو مہاراجہ ہلکر نے نواب کے سپرد کر رکھے تھے۔ فوج جس میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر تھا، جو پورے ملک کی طاقت کا سرمایہ ہو سکتا تھا، منتشر کر دی گئی۔ صرف اتنے آدمی رکھے گئے، جو علاقوں کے انتظام کے لیے ضروری سمجھے گئے۔ توپ خانہ اور ساز و سامان انگریزوں نے صلح کی ایک شرط کے مطابق خرید لیا۔ نواب نے عہد کیا کہ وہ کسی علاقے پر حملہ نہیں کریں گے، بلکہ پنڈاروں کی "سرکوبی" میں کمپنی کی مدد کریں گے۔ نواب نے اپنے وطنِ مالوف پرگنہ سنبھل کا بھی مطالبہ کیا تھا، جو ان کے مرکزِ حکومت سے بہت دور صوبجاتِ متحدہ میں واقع ہے، لیکن اوّل اس کا تبادلہ پلول سے کیا گیا، پھر اس کے بجائے بھی ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔(۱)

سید صاحبؒ کی طرف سے صلح کی مخالفت اور لشکر سے جدائی

صلح کی ساری کارروائی صیغۂ راز میں ہوئی۔ لوگوں کو اس بات چیت کا اس وقت علم ہوا، جب آخری مسودہ نواب کے پاس پہنچ گیا۔ نواب کے رفقا اور مشیرانِ کار میں سے اکثر کی رائے تھی کہ صلح کر لی جائے، لیکن سید صاحبؒ اس صلح کے مخالف تھے۔ آپ نے آخر آخر تک نواب کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا، لیکن نواب اپنے کو ان حالات میں بالکل مجبور و بے بس پاتے تھے۔ سالہا سال کی تگ و دو اور جانفشانیوں کا جو افسوس ہے کہ بے نظمی اور بے تدبیری کے ساتھ جاری رہیں، نتیجہ دیکھ کر ان پر ایسی افسردگی اور پست ہمتی طاری تھی اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال سے وہ اس درجے متاثر تھے کہ وہ چھوٹی سی ریاست کے گوشۂ عافیت کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔ سید صاحبؒ حالات سے اس درجہ متاثر نہ تھے۔ ان کے نزدیک مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی، نواب کو انگریزوں کا مقابلہ اور

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "امیر نامہ" صفحہ ۵۵۷ - صفحہ ۵۶۴

اس بڑھتے ہوئے خطرے کا سدِّ باب کرنا چاہیے تھا، جس کی زد میں سارا ہندوستان اور بالآخر سارا عالمِ اسلام تھا۔ ان کے نزدیک یہ ہندوستان کی آخری آزاد اور جنگجو طاقت تھی، جس کو اس آسانی کے ساتھ سپر انداز اور مقابلے سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر ان کو جلد معلوم ہو گیا کہ نوّاب کی قوّتِ مقابلہ جواب دے چکی ہے اور صُلح کے سب مراحل طے ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود بھی آپ نے "اتمامِ تفہیم" کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب یہ محسوس کر لیا کہ اب کوئی گفتگو کارگر نہیں ہو سکتی اور مصالحت ایک طے شدہ امر ہے، تو آپ نے لشکر سے مفارقت اور دہلی کو واپس آ جانے کا فیصلہ فرما لیا، گویا آپ کی رفاقت و شرکت کی شرط یہی تھی کہ نوّاب ایک آزاد طاقت کی حیثیت سے باقی رہیں اور مطمحِ نظر یہ تھا کہ آپ جلد یا بدیر اس آزاد طاقت کو صحیح رُخ پر لگائیں اور اس سے اسلامی اقتدار کے قیام اور ہندوستان کے استخلاص و استقلال کی مُہم میں کام لیں۔ جب یہ اُمید بالکل منقطع ہو گئی، تو آپ نے لشکر سے مراجعت فرمائی اور دہلی کا رُخ کیا۔ "وقائعِ احمدی" میں ہے:

> "مادھو راجپورے پر فوج کشی کے سلسلے میں انگریزوں سے صُلح کر لینے کا مشورہ ہُوا۔ حضرت کی رائے کسی طرح اس کی نہ تھی اور آپ کا مشورہ جنگ جاری رکھنے کا تھا۔ مصالحت کو کسی طرح مُناسب نہیں سمجھتے تھے۔ خود نوّاب صاحب کی بھی یہی خوشی تھی، مگر لشکر کی بے سروسامانی اور اہلِ لشکر کی خود غرضی اور نااتفاقی کا عُذر کرتے تھے اور خیال تھا کہ دس پانچ لاکھ روپیہ لے کر مہاراجہ ہلکر کی طرح لشکر کا ساز و سامان درست کر کے لڑیں گے۔ حضرت نے فرمایا: "مصالحت کرنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔" لیکن نوّاب صاحب ملنا ہی مصلحت سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس کی تیاری کی۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا آپ انگریزوں سے ملتے ہیں، تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ نوّاب صاحب نے بہت سمجھایا، مگر حضرت نے نہ مانا۔ چند آدمی ہمراہ لے کر جے پور چلے گئے۔ دوسری ملاقات میں فرمایا کہ نوّاب صاحب، ابھی کچھ نہیں گیا، اختیار باقی ہے۔ آپ کی فہمائش کو آیا ہوں۔ اگر میرا کہنا مانیے، تو ان سے لڑیے اور ہرگز نہ ملیے۔ ملنے کے

بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ کفّار بڑے دغاباز اور مکّار ہیں۔ کچھ آپ کے واسطے تنخواہ یا جاگیر وغیرہ مقرّر کر کے کہیں بٹھا دیں گے کہ روٹیاں کھایا کیجیے۔ پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی۔" یہ فرما کر آپ تشریف لے گئے۔ مصالحت کے بعد ایک مرتبہ پھر آپ لشکر میں تشریف لائے۔ جس کسی سے کچھ لینا دینا تھا، لیا دیا اور نواب صاحب سے ملاقات کی۔ نوّاب صاحب بہت آبدیدہ ہوئے اور کہا "حضرت، جو ۵ کچھ قسمت میں تھا، وُہی ہُوا۔ حکمِ الٰہی سے چارہ نہیں۔ اب آپ دہلی کو جاتے ہیں، تو صاحبزادہ محمّد وزیر خاں کے ہمراہ جائیے"۔ آپ نے قبول کیا اور کچھ دن کے بعد ایک خط شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو لکھا کہ "خاکسار قدمبوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے، اب ۱۰ یہاں رہنے کی کوئی صُورت نہیں"۔ (۱)

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۴۴ - صفحہ ۵۰ (باختصار)

پانچواں باب

دہلی کا تیسرا سفر اور دو آبے کا تبلیغی دورہ

دہلی کا تیسرا سفر سنہ ۱۲۳۲ھ میں مادھو راجپورے میں نواب امیر خاں کی انگریزوں کے ساتھ مصالحت کے بعد سید صاحبؒ جب اُن سے جدا ہو کر دہلی تشریف لائے، تو اگرچہ سن و سال کے اعتبار سے آپ جوان تھے، مگر اپنی اعلیٰ فطری استعداد و ملکات، منفرد صلاحیتوں، مجاہدات و ریاضات اور موہبت و تائیدِ الٰہی کی بنا پر ذہنی و اخلاقی و روحانی ارتقا کی وہ منزلیں طے کر چکے تھے، جو اس سے بڑی عمر میں بھی شاذ و نادر طے ہوتی ہیں۔ آپ کی باطنی استعداد اور اندرونی صلاحیتیں اپنے پورے بلوغ کو پہنچ چکی تھیں اور آپ کو دین و شریعت اور سلوک و طریقت کا لُبِّ لباب حاصل ہو چکا تھا۔ "صراطِ مستقیم" کا مطالعہ، جو سنہ ۱۲۳۳ھ میں مرتب ہوئی[1]، صاف بتلاتا ہے کہ نیتیس سال کا یہ جوان سال شیخ سلوک و تربیت اور حقائق و معارفِ الٰہیہ میں درجۂ اجتہاد و امامت کو پہنچ چکا ہے اور اس کا شمار تاریخِ اسلام کی ان ممتاز ترین شخصیتوں میں ہونا چاہیے، جو

(۱) "صراطِ مستقیم" کی ترتیب و تسوید سنہ ۱۲۳۳ھ میں دہلی میں ہوئی، نہ کہ سنہ ۱۲۳۴ھ کے بعد رائے بریلی میں، جیسا کہ "سیرت سید احمد شہیدؒ" کی پہلی اشاعتوں میں اور "سید احمد شہیدؒ" میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ خود اس کتاب کے مرتب مولانا شاہ اسمٰعیلؒ اس کتاب کی ترتیب کا سن ۱۲۳۳ھ لکھتے ہیں۔ فصلِ چہارم کے افادۂ پنجم (جہاد) میں فرماتے ہیں: "حالِ ہندوستان را دریں جزوِ زمان کہ سنِ یک ہزار و دو صد و سی و سوم است کہ اکثر ش دریں ایام دارالحرب گردیدہ الخ" (صراطِ مستقیم صفحہ ۹۵)

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ سید صاحبؒ کا دوآبہ (سہارنپور وغیرہ) کا دورہ بالاتفاق سنہ ۱۲۳۴ھ میں ہوا ہے۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ "ملہماتِ احمدیہ" میں لکھتے ہیں: "سنۃ الف و مائتین و اربع و ثلاثین در ماہ ربیع الاول بتاریخ ہفت و ہم بملازمتِ آں برگزیدۂ جناب الٰہی مجددِ طریقۂ رسالت پناہی فائز گردانید۔" اس سفر سے پیشتر "صراطِ مستقیم" تصنیف ہو چکی تھی۔ مفتی صاحب کو اسی سفر میں اس کی تلخیص کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے اس کام کو شروع کیا۔ تحریر فرماتے ہیں: "پس از کتابِ صراطِ مستقیم" کہ از ملفوظاتِ آنجناب فلک قباب است، بطورِ ایجاز و اختصار اجمالِ خاصہ لمعہ انتخاب نمودہ رسالۂ کافیہ و بلیغہ وافیہ برائے خود و دوستانِ خود تیار نماید" (ملہماتِ احمدیہ صفحہ ۲)۔

اس فن کی تدوینِ جدید اور تہذیب و تجدید کا فرض انجام دیتی ہیں۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا خواب دہلی پہنچنے سے ایک ہفتہ قبل، جس شب کو آپ نے لشکر سے دہلی کا رُخ فرمایا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت، صلی اللہ علیہ وسلّم، جامع مسجدِ دہلی میں تشریف رکھتے ہیں اور لوگ دُور دُور سے جُوق در جُوق زیارت کے لیے آرہے ہیں سب سے پہلے آنحضرت، صلّی اللہ علیہ وسلّم، نے شاہ صاحبؒ کو شرفِ باریابی عطا فرمایا اور عصائے مُبارک دے کر فرمایا کہ اس عصا کو لے کر مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو آنا چاہے، اندر آکر اس کا حال عرض کرو اور میری اجازت سے اندر بھیجو۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی تعمیل کی اور ہزارہا بندگانِ خدا نے حضورؐ کی زیارت کی۔

صُبح اُٹھ کر شاہ صاحبؒ سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علیؒ خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس تشریف لے گئے اور خواب کی تعبیر چاہی۔ شاہ غلام علیؒ نے فرمایا: "سُبحان اللہ! یُوسفِ وقت مُجھ سے تعبیر پُوچھتا ہے!" شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر مَیں آپ ہی کی زبان سے سننا چاہتا ہُوں۔ شاہ غلام علیؒ نے فرمایا کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یا آپ کے کسی مُریدِ رشید کے ذریعے رسُول اللہ، صلّی اللہ علیہ وسلّم، کی ہدایت و فیض کا سلسلہ جاری ہوگا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ میرے خیال میں بھی یہی تعبیر آئی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد سید صاحبؒ دہلی تشریف لائے اور حسبِ معمول اکبر آبادی مسجد میں قیام فرمایا اور لوگوں کا رجوع شروع ہوا۔[1]

اکبر آبادی مسجد میں قیام "وقائعِ احمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی پہنچ کر صاحبزادہ محمد وزیر خاں نو قاضی کے حوض پر بلند بیگ خاں کی حویلی میں اُترے اور سید صاحبؒ نے اجمیری دروازے کی سرائے میں قیام فرمایا۔ رات کو وہیں رہے۔ صُبح کو غسل کر کے اور پوشاک بدل کر آپ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پچیس روپے نذر دیے۔ شاہ صاحبؒ نے آپ سے نوّاب امیر خاں کے لشکر کا حال اور

[1] مخزنِ احمدی صفحہ ۴۴۔

تفصیلات دریافت کیں۔ آپ نے تفصیل کے ساتھ وہاں کے حالات سنائے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے خواب کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ اس خواب کو ایک ہفتہ نہیں گزرا کہ آپ کی آمد ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے آپ کے قیام کے لیے آپ کی قدیم جگہ مسجدِ اکبر آبادی تجویز کی اور مولانا محمد اسمٰعیل، مولانا عبدالحی، حافظ قطب الدین، مولوی محمد یعقوب، مولوی محمد یوسف اور مولوی وحید الدین اور کئی صاحبوں سے فرمایا کہ آپ کا اسباب سرائے سے مسجد میں منتقل کر دیں۔ مولانا شاہ عبدالقادرؒ کا کئی سال پیشتر[1] انتقال ہو چکا تھا۔ سید صاحبؒ مسجدِ اکبر آبادی میں داخل ہوئے، دو رکعت نماز ادا کی اور جس حجرے میں شاہ عبدالقادرؒ رہا کرتے تھے، تشریف لے گئے۔ پھر صحنِ مسجد میں آ کر بیٹھے اور لوگوں سے ملاقات کی۔[2]

ارشاد و تربیت کا آغاز اس زمانۂ قیام میں شاہ صاحبؒ کا معمول تھا کہ جو صاحبِ استعداد اور طالبِ صادق سلوک کی تعلیم اور توجہ و افادۂ باطنی کا طالب ہوتا، اس کو سید صاحبؒ کے سپرد کر دیتے۔ چنانچہ ایک بخاری عالم کو، جو ملا بخاری کے لقب سے مشہور تھے، سید صاحبؒ کے سپرد کیا۔ ملائے مذکور نے آپ کی سپاہیانہ وضع دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ یہ تو ایک مردِ سپاہی صورت ہیں، یہ مجھ کو کیا تعلیم دیں گے!" اور سید صاحبؒ سے پوچھنے لگے کہ "آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں اور کن علوم کی تحصیل کی ہے؟" آپ خاموش رہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "ملا صاحب! آپ کو اس بے فائدہ گفتگو سے کیا مطلب؟ یہ سمجھ لو کہ جو تم کو میرے پاس بارہ برس میں ملے گا، ان کی خدمت میں تم کو وہ بارہ دن میں حاصل ہوگا۔"[3] ملا صاحب نے سید صاحبؒ کے حجرے کے برابر دوسرے حجرے میں اپنا بستر ڈال دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور تھوڑے عرصے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اپنے وطن واپس گئے۔ سید صاحبؒ اکثر فرماتے تھے کہ ہم نے ایسا مشتاق

(۱) دو سال پیشتر ۱۲۳۰ھ میں۔ (۲) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۸۵، صفحہ ۸۷-۸۸

(۳) یہ مناسبت اور قوتِ افاضہ کی بات ہے اور مشائخِ کبار کے تذکروں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، اس میں کسی شیخِ کامل کا نقص نہیں۔ طالب کی مناسبت اور مربی کی قوتِ افاضہ کا معاملہ ہے جس کا ادراک شیخِ کامل اپنی فراست، بصیرت اور تجربے کر لیتا ہے۔

طالبِ خدا نہیں دیکھا اور وہ مُلّا صاحب یہ کہتے تھے کہ میں بہت شہروں میں پھرا، مگر ایسا مرشد شفیق تعلیم کرنے والا نہیں پایا۔(۱)

مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی ارادت بیعت

مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ تھے اور شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے بعد ہندوستان کے ممتاز ترین عُلما میں ان کا شمار تھا۔ علمی تبحرؔ، رُشد و صلاحیت اور تقویٰ و للّٰہیت میں اپنے ہم عمروں اور اقران و امثال میں مُمتاز تھے۔ ان کی علمی عظمت اور صحیح منزلت کا اندازہ شاہ عبدالعزیزؒ کے اس خط سے ہوگا، جو آپ نے منشی خیرالدین کو لکھنؤ حج کے متعلق لکھا ہے۔(۲) اس میں آپ نے مولانا عبدالحی کو شیخ الاسلام اور مولانا اسمٰعیل کو حُجّۃُ الاِسلام کے لقب سے یاد کیا ہے اور دونوں کو تاجُ المفسرین، فخرالمحدثین سرآمدِ عُلمائے محققین کا خطاب دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ دونوں حضرات تفسیر و حدیث، فقہ و اصُول، منطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں۔ جنابِ باری کی جو عنایت ان دونوں بزرگوں کے شاملِ حال ہے، اس کا شکر مُجھ سے ادا نہیں ہوسکتا۔ ان دونوں کو عُلمائے ربّانی میں شمار کرو اور جو اِشکال حل نہ ہوں، ان کے سامنے پیش کرو۔ بظاہر ان کلمات سے اپنی تعریف نکلتی ہے لیکن امرِ حق کا اظہار واقفوں پر واجب ہے۔(۳)

ایک روز مولانا عبدالحی نے اور ان کے بعد مولانا اسمٰعیل نے سیّد صاحبؒ سے بیعت کی درخواست کی اور دونوں حلقۂ ارادت اور سلکِ بیعت میں منسلک ہوگئے۔ ان کی بیعت کا واقعہ اور اس کا سبب مختلف کتابوں میں مختلف طریقے پر بیان ہُوا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مستند اور مفصّل روایت وُہ ہے، جو مولانا کرامت علی جونپوری نے خُود مولانا عبدالحی کے حوالے سے بیان کی ہے۔(۴)

(۱) وقائعِ احمدی، صفحہ ۹۰ - ۹۳ (۲) یہ خط حج کے سلسلے میں مفصّل نقل کیا جائے گا۔ (۳) مجموعۂ خطوط قلمی، کتب خانہ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں مرحوم ٹونک (۴) اس روایت کو مخزنِ احمدی کی روایت پر جس کو سیرتِ سید احمد شہیدؒ (طبع ۱، ۲، ۳) اور سید احمد شہیدؒ میں اختیار کیا گیا ہے کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے۔ اولاً اس میں یہ تصریح نہیں کہ یہ واقعہ راوی نے صاحبِ واقعہ (مولانا عبدالحی و مولانا اسمٰعیل) سے بلاواسطہ سُنا۔ دوسرے مخزن کی روایت میں یوں بھی اضطراب ہے کہ سید صاحبؒ کی طرف رجوع کا مشورہ دینے والے کا نام شاہ عبدالقادرؒ لکھا ہے، حالانکہ سید صاحبؒ کی آمدِ دہلی سے دو سال پہلے ان کی وفات ہوچکی تھی۔ ثالثاً مولانا کرامت علیؒ کی روایت میں بسط و تفصیل ہے اور محدثین کا اصُول ہے کہ زِیَادَۃُ الْقِصَّۃِ مُعْتَبَرَۃٌ۔ وُہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس حکایت کو ہم بجنسہٖ لفظ بلفظ بیان کریں گے"۔ اس لیے یہ روایت مقدم و مرجّح ہے۔

رسالہ "نُورٌ علیٰ نُور" میں لکھتے ہیں :-

"اس حکایت سننے کے پہلے یاد رکھو کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز، قُدِّسَ سِرُّہٗ، حضرت سیّد احمد صاحبؒ کو اُن کے ابتدائے وقت سے "میر صاحب" کہا کرتے تھے اور حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ اور ہم سب معتقد لوگ "میاں صاحب" کہا کرتے تھے اور مولانا عبدالحی مولانا محمد اسمٰعیل کو میاں محمد اسمٰعیل کہا کرتے تھے۔ چُونکہ اس حکایت کو ہم بجنسہٖ لفظ بلفظ بیان کریں گے اور یہ لفظیں اس میں آویں گی، اس واسطے ان لفظوں کے یاد رکھنے کو کہا۔ اب وُہ حکایت سُنو۔

ایک روز اس عاجزِ مسکین نے حضرت عالمِ ربّانی مولانا عبدالحی، رحمۃ اللہ، سے عرض کیا کہ آپ جو اس قدر میاں صاحب سے اعتقاد رکھتے ہیں اور روپے پیسے کپڑے وغیرہ دُنیاوی چیزوں کو چھوڑ کے میاں صاحب کی صحبت اختیار کیے ہیں اور آپ کے بدن پر جو کپڑا ہے، اس کے سوا آپ کے پاس کہیں کپڑا بھی نہیں اور آپ جب میاں صاحب کے رُوبرُو بات کرتے ہیں تو ترساں و لرزاں رہا کرتے ہیں، تو للہ آپ ہم سے سچ بیان کیجیے کہ آپ نے میاں صاحب سے کیا پایا، جو اپنا حال ایسا بنایا۔

تب مولانا مغفور نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں سچ بیان کروں گا۔ سُنو، میرا یہ حال تھا کہ میں سلوکِ الی اللہ اور مشاہدہ حاصل ہونے کا بڑا مشتاق تھا۔ تب میں نے مولانا شاہ عبدالعزیز، قُدِّسَ سِرُّہٗ، سے عرض کیا کہ مجھ کو آپ سلوکِ الی اللہ تعلیم کیجیے اور اس کے قبل میں بہت سے ہندی اور ولایتی مُرشدوں سے توجہ لے چکا تھا، مگر میرا مقصود حاصل نہ ہُوا تھا۔ تب آپ نے مجھ کو حضرت شاہ غلام علی، قُدِّسَ سِرُّہٗ، کے پاس بھیجا۔ وہاں بھی چند روز توجہ لیتا رہا، مگر میرا مقصد حاصل نہ ہُوا۔ تب میں نے حضرت مولانا سے پھر عرض کیا کہ یہ خادم حضور کی توجہ کا مُحتاج ہے اور حضور دُوسرے مقام میں بھیجتے ہیں۔ ہم کو آپ خود تعلیم کیجیے۔ تب حضرت مولانا نے فرمایا کہ میاں، میں

بہت بڈھا اور کمزور ہُوا اور مُجھ میں بہت دیر تک بیٹھنے کی طاقت نہیں۔ یہ مقصد تُمھارا میر احمد صاحب سے حاصل ہوگا۔ تُم اُن سے بیعت کرو۔ تب اس جناب کا یہ فرمانا مجھ کو بہت شاق گزرا اور میں ناراض ہو کر چُپ کر رہا۔ پھر کئی بار اور بھی عرض کیا، وُہی جواب پایا۔ آخر کو بعد چند روز کے یہ واقعہ درپیش ہُوا کہ میں اور حضرت میاں صاحب اور میاں محمد اسمٰعیل مدرسے کے ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔ ایک شب کو بعد عشا کے جب ہم تینوں شخص پلنگ پر سوئے، تب میاں صاحب نے فرمایا کہ "مولانا، مُجھ کو حضرت ربّ العٰلمین نے محض اپنے فضل و کرم سے بطور الہام کے خبر دیا ہے کہ فلانی تاریخ فلانے سفر میں تو جاوے گا، فلانے مقام میں یہ ہوگا، فلانے مقام میں وہ ہوگا اور اس قدر لوگ مُرید ہوں گے وعلیٰ ہٰذا القیاس سب باتیں بیان کیا۔ پھر دوسرے روز بھی ایسی ہی عجیب و غریب باتیں بیان کیا۔ اسی طرح سے کئی روز تک مکۂ معظّمہ کے سفر اور جہاد کے سفر اور جہاد کے واقعات کا بیان بتفصیلِ تمام فرمایا۔ تب ہم نے اور میاں محمد اسمٰعیل نے مشورہ کیا کہ اگر یہ سب باتیں سچ بیان کرتے ہیں، تو بلاشبہ یہ بہُت بڑے شخص اور قطب ہیں۔ ان سے کچھ فیض لینا بہت ضرور ہے۔ سو آؤ، کسی بات میں ان کا امتحان کریں۔ تب میاں محمد اسمٰعیل نے کہا کہ آپ ہم سے بڑے ہیں، آپ ہی تجویز کر کے کسی بات میں امتحان کیجیے۔ آخر کو جب پھر رات کو میاں صاحب نے پکارا کہ مولانا! تب ہم نے عرض کیا کہ حضرت، آپ کی بزرگی میں کچھ شبہ نہیں، مگر ہم کو ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟ کچھ ہم کو عنایت کیجیے۔ تب فرمایا کہ مولانا، کیا مانگتے ہو؟ تب ہم نے کہا کہ حضرت ہم یہی مانگتے ہیں کہ جیسی نماز صحابۂ کرام ادا کرتے تھے، ویسی ہی دو رکعت ہم سے ادا ہو۔ یہ کہنا اور میاں صاحب ایک بارگی خاموش ہو گئے اور اس روز پھر کچھ نہ بولے۔ تب ہم لوگوں نے جانا کہ فقط یہ زبانی باتیں تھیں، اصل باتوں

سے ان کو کچھ علاقہ نہیں! مگر ہمیشہ کی دوستی اور صحبت کی مروّت سے ہم لوگ کچھ نہ بولے کہ اب شرم دینا کیا ضرور، اور چُپ کر کے سو رہے۔ پھر آدھی رات کے کچھ قبل یا بعد حضرت میاں صاحب نے پکارا: "مولانا!" اِس پکارنے سے مجھ کو قشعریرہ[1] ہُوا اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس جناب سے مجھ کو بڑا اعتقاد آگیا۔ تب مَیں نے جواب میں کہا "حضرت"! تب فرمایا کہ "جاؤ اس وقت اللہ کے واسطے وضو کرو۔" تب میرے بدن پر پھر قشعریرہ ہُوا اور میں نے کہا کہ بہت خوب! دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا، "مولانا، سُن لو!" میں پھر کے حضرت کے پاس حاضر ہُوا۔ فرمایا، "تُم نے خُوب سمجھا، مَیں نے کیا کہا؟ میں نے کہا کہ اللہ کے واسطے وضو کرو۔" پھر میں نے کہا: "بہت خوب" اور چلا۔ دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور اسی طرح فرمایا۔ اسی طرح تین بار گیا، اور تیسری بار جا کے مَیں وضو کرنے لگا تو ایسا حضورِ دل اور حق سبحانہ، کے خوف سے میں نے ادب کے ساتھ وضو کیا کہ ایسا وضو کبھی نہ کیا تھا۔ پھر وضو کر کے حضرت کے حضور میں حاضر ہُوا۔ فرمایا کہ "جاؤ، اللہ ربّ العٰلمین کے واسطے اس وقت دو رکعت نماز پڑھو۔" تب میرے بدن پر قشعریرہ ہُوا اور نماز کے واسطے چلا۔ دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور میں حضور میں حاضر ہُوا۔ فرمایا کہ "تُم نے خُوب سمجھا یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جاؤ اِس وقت اللہ ربّ العٰلمین کے واسطے دو رکعت نماز پڑھو۔" میں نے کہا کہ "بہت خُوب!" اور نماز کے واسطے چلا۔ پھر تیسری بار بلایا اور ویسا ہی سمجھا دیا۔ تب میں نے ایک گوشے میں نماز شروع کیا تو تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ ہی ایسا مشاہدۂ جلال میں غرق ہُوا کہ ہوش نہ باقی رہا اور اس قدر رویا کہ آنسُو سے ڈاڑھی تر ہو گئی اور اس قدر نماز میں غرق ہو گیا کہ دُنیا کی یاد مطلق نہ باقی رہی اور نہایت خوف اور لذّت کے

(۱) لرزہ اور رونگٹے کھڑے ہو جانا۔

ساتھ مَیں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ جب دو رکعت پڑھا، تو خیال کیا کہ مَیں نے
سورۂ فاتحہ نہ پڑھا تھا۔ پھر سلام پھیر کے دوبارہ دُوسری بار دو رکعت کی نیت کیا۔
جب پڑھ چکا، تو خیال کیا کہ فاتحہ میں سُورہ کو ضم نہ کیا تھا۔ پھر شروع کیا۔ اسی طرح
ہر بار ایک ایک واجب کے ترک کرنے کا خیال آتا تھا اور نماز کو ناقص سمجھ کے دُہراتا
تھا۔ واللہ اعلم، سو رکعت یا زیادہ کم پڑھا ہوگا کہ صُبحِ صادق کا قریب ہُوا، پھر آخر کو
ناچار ہو کے سلام پھیرا اور بہت شرمندہ ہُوا کہ میری اِستعداد اس طرح کی ناقص
ہے کہ دو رکعت پُوری بھی حضُورِ دل کے ساتھ نہ پڑھ سکا اور اتنے بڑے کامل شخص کو
میں نے آزمایا۔ اب اگر وہ پُوچھیں کہ تم نے دو رکعت اللہ کے واسطے پڑھا، تو
مَیں کیا جواب دُوں گا، مَیں تو حضُورِ دل کے ساتھ جیسا کہ حق نماز پڑھنے کا ہے، وَیسا
دو رکعت بھی پڑھ نہ سکا۔ اسی سوچ میں شرم کے دریا میں غرق ہو گیا اور اپنے قصُور
کا مُعترف ہو کے اللہ سُبحانہٗ کے خوف سے استغفر اللہ! استغفر اللہ! کہنے شروع
کیا۔ جب اذان ہُوئی، تب مُجھ کو ہوش ہُوا اور یاد پڑا کہ صحابۂ کرام کا یہی حال تھا کہ
تمام رات عبادت کرتے اور پچھلی رات کو اِستغفار کرتے تھے۔ ان کی شان میں اللہ تعالیٰ
نے فرمایا وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ اور سوچا کہ بلاشبہ یہ بڑے کامل مرشد ہیں
کہ ان کے کلام سے میرا مقصد پُورا ہُوا اور جو نعمت مدّتِ دراز کی محنت سے حاصل نہ
ہُوئی تھی، سو ان کے ایک دم کے فرمانے سے حاصل ہُوئی۔ پھر مَیں مسجد میں گیا اور
قبل نماز فجر کے میں نے حضرت میاں صاحب سے بیعت کیا اور صبح کی نماز کے بعد
میاں محمد اسمٰعیل سے میں نے رات کا قصّہ پُورا بیان کیا۔ کیونکہ وہ مجھ کو صادق جانتے
تھے، اُنھوں نے بھی حضرت میاں صاحب سے بیعت کیا۔

پھر مَیں دن کو حضرت مولانا شاہ عبد العزیزؒ کے پاس گیا اور رات کا
قصّہ بیان کیا اور اپنے بیعت کرنے کا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: بارک اللہ! بارک اللہ!

خُوب کیا! میاں، مَیں تم سے اِسی واسطے کہا کرتا تھا۔ کیوں میاں، تم نے پیر صاحب کا کمال دیکھا؟" تب مَیں نے عرض کیا کہ "حضرت، مَیں نے بہُت درویشوں کی خدمت کیا اور بہت طریقوں کے موافق مَیں نے شغل اور مراقبہ کیا۔ میرا مقصد کبھی نہ حاصل ہُوا۔ حضرت سیّد صاحبؒ نے ایک بات زبان سے کہہ دیا اور مَیں اپنا دلی مقصد پاگیا۔ حضرت، یہ کون طریقہ کہلاتا ہے؟" تب فرمایا کہ "میاں، ایسے لوگ کسی طریقے کے محتاج نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ جو زبان سے کہیں، وُہی طریقہ ہے۔ ایسے لوگ خُود صاحبِ طریقہ ہوتے ہیں اور ایسے لوگ طریقہ نکالتے ہیں۔" حضرت مولانا کے فرمانے سے اور بھی زیادہ مُجھ کو حضرت میاں صاحب کے مرشدِ صاحبِ طریقہ ہونے کا یقین ہُوا اور میرا اعتقاد اور بھی زیادہ ہُوا۔ اس سبب سے مَیں میاں صاحب کی غلامی میں حاضر ہُوں اور اُن کی غلامی کے قابل بھی مَیں اپنے تئیں نہیں پاتا۔" تمام ہُوئی تقریر مولانا عبدالحی مرحُوم کی۔"(۱)

خاندانِ ولی اللّٰہی کے دُوسرے افراد و علما کی بیعت مرشدِ وقت شاہ عبدالعزیزؒ کی زندگی میں اِن اکابر کا کسی دُوسرے کی بیعت میں داخل ہونا معمُولی واقعہ نہ تھا۔ اس کا بڑا چرچا ہُوا۔ جُوق در جُوق عُلما و فُضلا و صالحین بیعت ہونے لگے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کے اکثر افراد، شاہ صاحبؒ کی اجازت سے اور مولانا محمد یُوسف(۲) نبیرۂ حضرت شاہ اہل اللہ (برادرِ حضرت شاہ ولی اللہؒ) مع خاندان، مولوی وجیہ الدّین، حکیم مغیث الدّین، حافظ معین الدّین وغیرہ مع اہلِ خاندان و اقربا مرید ہُوئے۔(۳) اور جو لوگ نہیں آسکتے تھے، انھوں نے اپنے اپنے وطن اور مقام کی دعوت دی۔

---

(۱) "نُورٌ علیٰ نُور" از مولانا کرامت علی جونپوری خلیفۂ سیّد صاحبؒ صفحہ ۹۸، صفحہ ۴۳ (اعظم المطابع جونپور)

(۲) مولانا محمد یُوسف پھلتی سیّد صاحبؒ کی جماعت کے ممتاز ترین فرد تھے۔ سیّد صاحبؒ سے نہایت گہرا اور والہانہ تعلق تھا۔ سیّد صاحبؒ ان کو لشکرِ اسلام کا قطب کہتے تھے۔ سیّد صاحبؒ کے اہلِ ارادت و تعلق میں ان کو اوّلیت اور بڑی خصوصیت حاصل تھی۔ (۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۳۷

مولانا محمد اسحٰقؒ کی آمد اسی زمانے میں آپ کے برادرِ معظم مولانا سید محمد اسحٰق آپ کی ملاقات کے لیے دہلی تشریف لائے اور آٹھ برس کے بعد دو بچھڑے ہوئے بھائی ملے۔ مولانا نے فرمایا کہ "مجھے نواب صاحب کے لشکر سے تمہاری واپسیِ دہلی کا علم ہوا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو تم کہیں دور چلے جاؤ، پھر ملاقات ہونی دشوار ہو۔ اس خیال سے میری طبیعت کو قرار نہ ہوا۔ میں جلد محسن خاں کو ساتھ لے کر وہاں سے اِدھر روانہ ہوا۔"(۱) سید صاحبؒ نے ان کو اطمینان دلایا اور فرمایا کہ ان شاء اللہ جلد وطن آؤں گا۔ ۵

مولانا سید اسحٰقؒ وطن واپس ہوئے، تو لکھنؤ میں اعزا اور برادری کے جو لوگ موجود تھے، ملاقات کے لیے آئے اور سید صاحبؒ کا حال پوچھا۔ مولانا نے فرمایا کہ

"عنایتِ الٰہی سے سید احمد کو وہ رتبہ حاصل ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا ہوں۔ اپنی تو عمر میں نہ اس رتبے کا آدمی دیکھا ہے، نہ سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایتِ بے غایت سے ایسا علمِ باطنی ان کو عطا فرمایا ہے کہ دہلی کے تمام علما اور فضلا اُن کی طرف رجوع ہیں اور ان کی تقریر کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا اور ہم سے مولویوں کا وہاں کیا شمار کہ ان کے آگے بولیں اور چون و چرا کا لب کھولیں۔ ان کو علمِ وہبی ہے، کسبی نہیں ہے۔"(۲) ۱۰

یہ سن کر برادری کے لوگ ہنسے اور کہنے لگے کہ وہ آپ کے بھائی ہیں۔ جو چاہیے، فرمائیے۔ ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ان میں یہ مادہ اور لیاقت کہاں؟ مولانا نے فرمایا کہ میں نے مبالغے سے کام نہیں لیا۔ جب وہ آئیں گے، تو تم خود دیکھ لوگے۔(۳) ۱۵

مقبولیت و شہرت اور سفر دن بدن آپ کی مقبولیت و شہرت بڑھتی گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتہً اپنے بندوں کے قلوب عموماً اور علما و صلحا کے خصوصاً آپ کی طرف پھیر دیے ہیں۔ باہر سے کثرت سے دعوت نامے آنے شروع ہوئے۔ جب بہت سے دعوت نامے جمع ہو گئے، تو آپ نے مولانا اسمٰعیل کے ہاتھ یہ سب دعوت نامے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیے اور عرض کیا کہ جیسا ارشاد ہو کیا جائے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنا لباسِ خاص پہنایا اور بڑی خوشی کے ساتھ ۲۰

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۱۱۱　(۲) "وقائع احمدی" صفحہ ۱۱۴　(۳) "وقائع احمدی" صفحہ ۱۱۴

رخصت کیا۔

دوآبے کا دورہ اس سفر میں جس کثرت کے ساتھ مسلمانوں نے آپ کی تشریف آوری سے دینی نفع اور خیر و برکت حاصل کی اور ان مقامات میں جیسی اصلاح ہوئی اور جس محبت و اخلاص اور گرمجوشی سے ہر جگہ آپ کا استقبال ہوا، اس کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے ایک رفیقِ سفر کے حوالے[1] سے اس سفر کی رُوداد پیش کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اس زمانے تک مسلمانوں میں دین کی کیسی طلب اور قدر، اہلِ دین سے محبت اور اثر پذیری اور صلاحیت موجود تھی اور وہ کس طرح دینی استفادے کے لیے پروانہ وار ہجوم کرتے تھے۔ اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ اس قلیل مدت اور آغازِ عمر ہی میں سید صاحب کی شہرت اور مقبولیت کس قدر پھیل گئی تھی۔

غازی الدین نگر دہلی سے چل کر پہلی منزل غازی الدین نگر[2] میں ہوئی۔ شہر سے باہر دو سو آدمیوں نے جو شہر کے ممتاز اور معزز لوگ تھے، بڑھ کر استقبال کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کو فرودگش کیا اور ضیافت کی اور عرض کیا کہ ہم مدت سے حصولِ فیض کے آرزومند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری آرزو پوری کی۔ شہر کے عمائدین سے چار صاحبوں (حافظ عبداللہ امامِ مسجد، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ رمضان، عبدالشکور خاں) نے بیعت کی۔ دوسرے روز بیعت کرنے والوں کا بڑا ہجوم ہوا۔ ہری رام تحصیلدار کشمیری بھی زیارت و قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور بہت سی شیرینی نذرانے کے ساتھ پیش کی۔ امام خاں جمعدار بیعت سے مشرف ہوئے اور بکثرت آدمیوں نے روحانی فیوض اور آپ کے رُفقا کی باطنی توجہات سے نفع حاصل کیا۔ پانچ روز قیام کے بعد وہاں سے کوچ ہوا۔ مولانا سید اسحٰق وہاں سے رائے بریلی روانہ ہوئے۔

مراد نگر مراد نگر میں مولوی ابوالقاسم صاحب، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے صاحبزادے جو وہاں تھانیدار تھے، برقندازوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے۔ مولوی ابوالقاسم نے دعوت کی اور تمام برقنداز بیعت سے مشرف ہوئے۔

---

(۱) مولوی سید جعفر علی صاحب بحوالہ محسن خاں خادم و رفیقِ قدیم حضرت سید صاحبؒ (منظورہ) (۲) موجودہ غازی آباد

میرٹھ میرٹھ سے دو کوس باہر قاضی حیات بخش اور ان کے صاحبزادے مولوی احمد اللہ نے پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ استقبال کیا اور عرض کیا کہ چار روز سے ہم لوگ منتظر ہیں، آج تشریف آوری کی خبر سن کر بے تابانہ روانہ ہوئے۔ نیت یہ تھی کہ جہاں بھی جناب کے قیام کا علم ہوگا، وہاں حاضر ہو کر ملاقات سے مشرف ہوں گے۔ وہاں سے یہ حضرات آپ کو اپنے مکان پر لائے۔ نماز کے وقت ایک مسجد میں، جو بڑی وسیع اور فراخ تھی، نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ رات کے ۵ کھانے کے بعد قاضی صاحب اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ بیعت ہو گئے۔

دوسرے روز بیعت کرنے والوں کا بے حد ہجوم ہو گیا اور بکثرت لوگوں نے فیضِ باطنی حاصل کیا۔ تیسرے روز داروغہ محمد راحم، منشی محمدی انصاری، مولوی محمد بخش اپنے دوسرے پندرہ ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ دو روز کے بعد میرٹھ کے ایک رئیس مولوی خدا بخش نے اپنے گھر پر پورے قافلے اور شہر کے بہت سے عمائد و معززین کو مدعو کیا اور خود ۱۰ اپنے اعزا و متعلقین و ملازمین و عملے کے ساتھ بیعت سے مشرف ہوئے۔ قیمتی پوشاک کے گیارہ بارہ خوان، عطر پاست اور آٹھ خوانِ شیرینی کے نقد کے ساتھ پیش کش کیے۔ ایک برہمن ان کے تمام کاروبار کا مختار اور ان کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ وہ بیعت سے مانع تھا، لیکن ایک اشارۂ غیبی کے بعد مولوی صاحب نے بیعت کی۔ ان کے بیعت میں داخل ہو جانے کے بعد برہمن کا طلسم ٹوٹ گیا۔ آلاتِ لہو، ساز اور باجے اور اس کے متعلقات باہر کر دیے گئے۔ برہمن بھی کچھ عرصے ۱۵ کے بعد مسلمان ہو گیا۔

ظہر کی نماز کے بعد بہت لوگ منتظر تھے۔ میرٹھ کے ایک ذی حیثیت اور دولتمند شخص قدن خاں نے عرض کیا کہ کل غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔ لوگوں کی بیعت کا یہ حال تھا کہ ظہر سے عشا تک بیعت کرنے والوں اور ہمراہیوں کو توجہ دینے سے فرصت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جو لوگ اس شہر میں دو تین روز پیشتر بیعت کر چکے ہیں، وہ نئے لوگوں کو توجہ دیں۔ رات کے کھانے اور عشا کی ۲۰ نماز سے فراغت کے بعد آپ نے مجمع میں کچھ وعظ و نصیحت فرمائی۔ پھر آرام فرمایا۔

صبح کو قدّن خاں کے بیٹے ایک پالکی اور دو گھوڑے لے کر آئے۔ آپ نے ان کو ایک گھوڑے پر اور دُوسرے گھوڑے پر حافظ قطبُ الدّین کو سوار کرایا اور خُود پالکی پر قدّن خاں کے یہاں تشریف لے گئے۔ خان صاحب نے مکان سے نکل کر استقبال کیا اور سلام اور مصافحے کے بعد دیوان خانے میں لائے اور انواع و اقسام کے کھانے کے خوان رکھے اور آپ کے تمام ہمراہیوں کی پُرتکلف ضیافت کی۔ کھانے کے بعد شرفِ بیعت حاصل کیا اور سات خوان، جن میں سے پانچ شیرینی کے تھے، اور دو قیمتی پوشاک اور عطریات کے، ایک سو تیس روپے نقد کے ساتھ پیش کش کیے۔ اس کے بعد پان کے بیڑے پیش کیے۔ آپ نے ایک بیڑا خان صاحب کو اور ایک ان کے بڑے صاحبزادے کو اپنے ہاتھ سے دیا۔ اُنھوں نے اپنا اپنا بیڑا اٹھا کر عرض کیا کہ اگر حکم ہو، تو ہم یہ پان اپنے گھر میں دیں۔ فرمایا کہ شیرینی کا ایک خوان بھی ہماری طرف سے لے جائیے۔ خان صاحب نے عرض کیا کہ کچھ اس میں سے جناب تناول فرمالیں۔ آپ نے اس میں سے ذرا سا اُٹھا کر کچھ کھایا، کچھ رکھ دیا۔ خان صاحب اس خوان کو اپنے سر پر اُٹھا کر گھر لے گئے۔ اس کے بعد آپ کو مستُورات کی بیعت کے لیے مکان تک زحمت دی۔ بیعت کے بعد خان صاحب کے چھوٹے صاحبزادے دو کشتی لائے، جن میں سے ایک شیرینی کی تھی اور ایک قیمتی پوشاک کی۔ اس سب سے فراغت کے بعد آپ کو جائے قیام تک پہنچایا اور اپنے اور مستُورات کے لیے توجّہ کی درخواست کی۔ آپ نے شادل خاں کے لڑکے کو، جس کی عُمر گیارہ سال ہوگی، مستُورات کی توجّہ کے لیے اور حافظ قطب الدین کو ان کو توجّہ دینے کے لیے مقرّر فرمایا۔ جب تک میرٹھ میں قیام رہا، یہ دونوں توجّہ دیتے رہے۔

صدر الدّین اور اُن کے بھائی کریم بخش روٹی والے حاضر ہُوئے۔ ان کی دُکان اس زمانے میں بہت چل رہی تھی۔ اُنھوں نے بھی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد محمّد تقی قصاب اور بدر الدّین حاضر ہُوئے۔ تمام چھاؤنی میں گوشت انھیں کی دُکان سے جاتا تھا۔ بیعت سے مشرف ہونے کے بعد پانچ سو روپے سے زائد اُنھوں نے پیش کش کی اور بہت شیرینی پیش کی۔ محمّد تقی نے دعوت کی درخواست کی اور آپ نے قبُول فرمائی۔ رات کا کھانا قدّن خاں کے ہاں تناول فرمایا اور ان کے

بیٹے کے حق میں دُعا کی۔ لوگوں نے آمین کہی۔

صُبح کے وقت محمّد تقی کے یہاں سے سواری آئی۔ چار گھڑی دن نکلے آپ ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ چھاؤنی کے اکثر مُسلمانوں نے بیعت کی۔ مجمع بہت تھا۔ کھانے کے بعد خواجہ خانساماں آئے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ کھانے کے بعد بیعت سے مشرّف ہُوے۔ محمّد تقی اپنے زنانہ مکان میں آپ کو لے گئے۔ ان کے خاندان کی تمام مستُورات، جو وہاں پہلے سے جمع تھیں، بیعت سے مشرّف ہُوئیں۔ باہر تشریف لانے پر شیرینی، پوشاک اور نقد پیش کیا۔ محمّد تقی کے رشتے دار اور اہلِ برادری دروازے پر منتظر تھے۔ اُنھوں نے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ نمازِ مغرب سے عشا تک لوگوں کی بیعت سے سر اُٹھانے کی مُہلت نہ تھی۔ آپ رُخصت ہو کر مکان پر تشریف لائے۔

دُوسرے روز صدرالدین صاحبؒ کے مکان پر دعوت تھی۔ آپ قافلے کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ جب آپ قریب پہنچے، مشتاقانِ زیارت استقبال کے لیے حاضر ہُوے۔ آپ نے فرمایا کہ "کھانا تیار رکھیں، مَیں ان بھائیوں کی بیعت سے فارغ ہو لُوں"۔

شہر اور چھاؤنی اور دیہات اور اطراف کے بکثرت مُسلمان حاضر ہو کر بیعت سے مشرّف ہُوے۔ مضافات اور اطراف سے بھی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جن لوگوں کا مکان میرٹھ سے دُور تھا، وہ اپنے اپنے یہاں دعوت کی تیاری کر رہے تھے۔ جب اس کی اطلاع ہُوئی کہ آپ کا قصد سردھنہ کا ہے، تو جن لوگوں کا ارادہ بیعت کا تھا، وہ سامانِ دعوت چھوڑ کر حاضرِ خدمت ہو گئے۔ بعض سردھنہ اور بعض بڑھانہ پہنچ کر بیعت سے مشرّف ہُوے۔ خواجہ محمّد خانساماں نے دو وقت دعوت کی اور اُن کے گھر کے تمام زن و مرد بیعت سے مشرّف ہُوے۔ شب کو آپ نے فرمایا کہ کل ہم سردھنہ جائیں گے۔ جس کو منظور ہو، وہ ہمیں رُخصت کرنے کے لیے آئے۔ سوتے وقت آپ نے اللہ کی عظمت و جلال کا مضمُون بیان کیا اور آرام فرمایا۔ صُبح چھاؤنی کے کثرت سے آدمی ملاقات کے لیے آئے۔ حافظ قطبُ الدّین صاحب کو وعظ کا حُکم ہُوا۔ حافظ صاحب نے نماز روزے کے فضائل بیان کیے۔ حضرت سب سے رخصت ہُوے اور جو

بچّے ہمراہ آئے تھے، ان کو مٹھائی دے کر رخصت کیا۔

روانگی کے وقت اہلِ شہر کا بڑا ہجوم تھا۔ ہر کہ دمہ موجود تھا۔ جس وقت آپ شہر کے دروازے پر پہنچے، سیکڑوں آدمی رقّت وزاری سے بے قابو تھے۔ آپ ہر ایک کو تسکین دیتے تھے، مگر ہر ایک بے قرار تھا۔ آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ آپ نے سلام رخصت فرمایا۔ بہت سے آدمی، جو سوار تھے، موضع دانتل و نولی تک پہنچانے آئے۔

میرٹھ کے نواح واطراف موضع دانتل میں پانچ یا چھ گھر مسلمانوں کے تھے۔ ان سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دعوت کے لیے عرض کیا۔ آپ نے معذرت کی اور وعدہ فرمایا کہ اگر واپسی اسی طرف سے ہوئی، تو تمھیں ضیافت کا موقع دیں گے۔ اس دیہات کے لوگوں کا بھی یہی حال تھا کہ آپ کی جدائی ان پر بہت شاق تھی۔ جب تک قافلہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گیا، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔

موضع پائلی میں دو ہی تین گھر مسلمانوں کے تھے، سب داخلِ بیعت ہوئے۔ آپ نے ایک گھڑی وہاں توقّف کیا۔ شیر بنی، جو ناشتے کے لیے ہمراہ تھی، وہاں تقسیم ہوئی۔

موضع کھرودی میں نمازِ ظہر ادا کی۔ وہاں مسلمانوں کے گھر بہت تھے۔ چار پانچ سادات کے گھر بھی تھے، جنھوں نے سب سے پہلے بیعت کی۔ پھر تمام مسلمان داخلِ بیعت ہوئے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ تشریف آوری کی خبر کئی روز سے سُنی جا رہی تھی اور ہم لوگ منتظر تھے۔ آج یہ تمنّا پوری ہوئی۔ اب کھانا یہیں تناول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم پائلی میں کھانے سے فراغت کر چکے۔ لوگوں نے شربت حاضر کیا اور تمام ہمراہیوں نے سیر ہو کر پیا۔

سردھنہ سردھنہ سے باہر پچّیس آدمیوں کی ایک جماعت نے استقبال کیا۔ ان میں شیخ بلند بخت، خواجہ محمد، حافظ امان اللہ نشان بردار، بوعلی بخش، نصر اللہ، ننّھے خاں اور اُن کے دو فرزند پیر خان و داراب خاں، سلو خاں رسالے دار، مراد خاں وغیرہ تھے۔ سرائے کی مسجد میں قیام فرمایا۔ نمازِ عصر کے بعد لوگوں نے بیعت کی۔ بیعت کے بعد ننّھے خاں اور دوسرے سپاہیوں

نے عرض کیا کہ آج آپ کی دعوت ہمارے ہاں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہم کہیں، وہی پکانا۔ یہ سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایک لمحے کے بعد عرض کیا کہ جو کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا: "باجرے کی روٹی اور ماش کی دال"۔ جب اہلِ دعوت اپنے گھر آئے، تو انھوں نے آپس میں کہا کہ پہلے تو ہمیں فکر ہُوئی تھی کہ دیکھیے، آپ کیا فرمائش کرتے ہیں، لیکن جب آپ نے فرمائش کی، تو معلوم ہُوا کہ یہ تو سب سے آسان اور سستا کھانا ہے، جس سے زائد تو غربا بھی اپنی دعوت میں اہتمام کرتے ہیں۔ ۵
آپ نے تو ضرور یہ فرمائش کی ہے، لیکن ہمارا فرض ہے کہ نان قلیہ بھی ضرور تیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے باجرے کی روٹی اور ماش کی دال کے ساتھ نان اور قلیہ گوشت بھی سامنے رکھا۔ آپ نے صرف اپنا فرمائشی کھانا تناول فرمایا۔ صبح کے وقت مدے خاں کمیدان اور سلو خاں رسالے دار حاضر ہُوئے سلو خاں نے پہلے دن بیعت نہیں کی تھی۔ کمیدان صاحب نے عرض کیا کہ پہلے روز میں حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ میری دُوسری جگہ حاضری تھی۔ بیگم صاحبہ تیز مزاج ہیں۔ آپ نے فرمایا: "مضائقہ نہیں ۱۰
اتنی بات ہے کہ اللہ تعالٰی کی فرمانبرداری میں بھی اسی طرح چُست و کمربستہ رہنا چاہیے"۔ دونوں صاحب بیعت سے مشرّف ہُوئے۔ آپ نے بہت نصیحتیں فرمائیں اور توجّہ کے لیے ان کو میاں صدرالدین کے حوالے کیا۔ کمیدان صاحب نے دعوت کی۔ کھانے کے بعد ان کے گھر کی تمام مستورات اور متعلّقین بیعت ہُوئے۔ ظہر کے وقت قصبے کے دُوسرے شرفا داخلِ بیعت ہُوئے شام کے وقت سلو خاں صاحب کے گھر پر دعوت تھی۔ اس رسالے کے سواروں نے بیعت کی اور ۱۵
ہدیے گزارے۔ صُبح کے وقت عظیم اللہ بیگ کمیدان اور اُن کے سپاہی داخلِ بیعت ہُوئے اور دعوت بھی کی۔ دوپہر کو حافظ امان اللہ نے دعوت کی۔

برڈھانہ سردھنہ سے آپ برڈھانہ تشریف لے گئے۔ قصبہ ابھی دو میل تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ آپ مولانا عبدالحیؒ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ مولانا محمدؐ رح، مولوی وحید الدین صاحب، مولوی محمد یُوسف صاحب، شیخ معین الدّین صاحب، سعدالدّین صاحب وغیرہ اور پھلت و برڈھانہ ۲۰
کے دُوسرے شرفا و علما استقبال کے لیے آئے ہُوئے تھے۔ برڈھانہ پہنچ کر آپ نے نمازِ عصر

ادا فرمائی۔ نمازِ عصر کے بعد مولانا عبدالحی صاحبؒ کے خُرد سال صاحبزادے عبدالقیومؒ[1] نے بیعت کی۔ مغرب کی نماز آپ نے مولانا عبدالحیؒ کے پیچھے پڑھی۔ نمازِ عشا کے بعد کھانے سے فراغت ہوئی صُبح کے وقت میاں نظام الدین چشتی، شیخ محمد حسن اور شہر کے بہت سے شُرفا و غُربا حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ اسی روز اور دُوسرے روز آپ مولانا عبدالحی صاحبؒ کے مہمان رہے۔ اُس کے بعد میاں جی نظام الدین چشتی نے دعوت کی اور وہ اور ان کے گھر کی تمام مستورات داخلِ سلسلہ ہوئیں۔ اِس کے بعد شیخ ابُوبکر کی طرف سے دعوت ہوئی اور انھوں نے اور اُن کے تمام گھر کی عورتوں نے بیعت کی۔

بارہ روز قصبۂ بڑھانہ میں قیام رہا۔ زیادہ تر مولانا عبدالحی کی طرف سے میزبانی اور دعوت رہی۔ مولانا کے ہاں زیادہ تر کھانا یہ ہوتا تھا کہ تنوری روٹی شوربے میں چُور کر کے ثرید تیار کیا جاتا تھا جس کا حدیث میں ذکر آتا ہے۔ آپ فرماتے کہ "مولانا، آپ اِس قدر کیوں تکلیف فرماتے ہیں؟" مولانا جواب دیتے کہ "حضرت، یہ کیا تکلیف ہے؟ اگر مَیں اپنا سارا گھر بیچ کر آپ کو کچھ بھی راحت و آرام پہنچا سکوں، تو اپنی سعادت سمجھوں گا۔" آپ نے بہت دُعائے خیر فرمائی اور بڑھانہ سے روانگی ہوئی۔

راستے کی منزلیں مولانا ممدوح اور قصبے کے دُوسرے بزرگ ہمراہ تھے۔ جب موضع ایڑٹی میں پہنچے، وہاں کا زمیندار دس پندرہ آدمیوں کے ہمراہ راستے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی تعظیم سے سلام کیا اور بڑے اخلاص کے ساتھ عرض کیا کہ: "آج غریب خانے پر قیام فرمائیں اور خاکسار کی دعوت قبول فرمائیں۔ جس روز سے مَیں نے تشریف آوری کی خبر سُنی ہے، روزانہ آپ کے انتظار میں یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ آج تو میں جانے نہیں دُوں گا۔" آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "بھائی، ہمیں بہت ضرورت ہے اور اپنی جگہ سے ہم دو کوس نکل آئے ہیں۔ قیام کرنے کی بالکل مُہلت نہیں۔" اس نے عرض کیا کہ: "اچھا، تو پھر ایک گھڑی ٹھہر کر ٹھنڈا پانی ہی پیتے جائیں۔" آپ نے قافلے کو ٹھہرنے کا حکم دے دیا۔ وہ زمیندار چار گھڑے گنّے کے رس کے اور چار گھڑے پکے ہوئے دُودھ کے لایا اور دونوں

(۱) مولانا عبدالقیومؒ مفتیِ بھوپال (م ۱۲۹۹ھ)

کو بلاکر آپ کو اور تمام اہلِ قافلہ کو شربت پلایا اور دو روپے دعوت کے نذر کیے اور دوسرے موضع تک ساتھ آیا۔

موضع چولی میں وہاں کا زمیندار حاضر ہوا اور گاؤں کے دوسرے مسلمانوں کو بلاکر سب بیعت سے مشرف ہوئے۔ وہاں سے موضع بہرسور پہنچے۔

پھلت میں پھلت سے باہر قصبے کے چالیس پچاس اشخاص استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ تین روز سے ہم منتظر ہیں۔ آپ شیخ ولی محمد کے مردانے میں مقیم ہوئے نمازِ عصر کے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میاں محمد فضیل، شیخ ولی محمد صاحب کے والد شیخ غلام محمد اور محمد عارف، دونوں بھائی غلام علی و حافظ معین الدین، حافظ احمد الدین اور عبدالعلی وغیرہ نے بیعت کی۔ کھانا بھی شیخ ولی محمد صاحب کے یہاں تناول فرمایا۔ دوسرے روز محمد عثمان بیعت میں داخل ہوئے۔ ان کی وضع بالکل سپاہیانہ تھی۔ آپ نے فرمایا: "بھائی، اگرچہ اس وقت تمھارا ظاہر اچھا نہیں، لیکن تمھارا باطن صاف ہے۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں ظاہر بھی باطن کی طرح ہو جائے گا۔" ان کے گھر کی مستورات بھی بیعت ہوئیں۔ شیخ ولی محمد صاحب کی والدہ اور دوسری مستورات بھی بیعت سے مشرف ہوئیں۔ مولوی وحید الدین صاحب نے دو وقت دعوت کی اور اپنے مکان لے جاکر مستورات کو بیعت کرایا۔ میاں عصمت اللہ اپنے والد شیخ عبداللہ کے ساتھ بیعت ہوئے۔ میاں سعد الدین نے بھی ضیافت کی اور ان کے گھر کی مستورات نے بھی بیعت کی۔ دوسرے روز حافظ محمد حسین نے بھی دعوت کی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے خالہ زاد بھائی میاں جمال، حافظ محمد عثمان اور عبدالرزاق نیز حافظ قطب الدین، حکیم قمر الدین، میاں صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم و عبدالرؤف اور دوسرے شرفا نے ایک ایک وقت دعوت کی۔

جب تک پھلت میں قیام رہا، معمول تھا کہ شیخ ولی محمد کے بالاخانے پر ورزش فرماتے۔ اس وقت شیخ ولی محمد، شیخ عبدالرؤف، سعد الدین، صلاح الدین، عبدالحکیم، محمدی انصاری اور محسن خاں بھی موجود ہوتے۔ ورزش کے بعد پانی میں بھیگے ہوئے چنے تناول فرماتے اور حاضرین

کو بھی عنایت فرماتے۔ محسن خاں کہتے ہیں کہ مجھے حکم تھا کہ میں بازو اور شانے پر مالش کروں۔ اس مکان کے صحن میں آپ نے مٹی کا تودہ تیار کرایا تھا۔ ورزش سے فراغت کے بعد تیر اندازی فرماتے تھے۔ ایک تیر انداز اپنے ساتھ لائے تھے اور تیر و کمان بھی خریدے تھے۔ پھلت کے بعض لوگ بھی اس مشق میں شرکت کرتے تھے۔

۵ سترہ دن کے قیام کے بعد آپ پھلت سے روانہ ہوئے۔ قصبے کے مسلمانوں نے دور تک مشایعت کی۔ موضع بھوپاڑی میں ناشتہ کیا۔ وہاں کے پٹھانوں نے بیعت کی۔ نمازِ ظہر سے پہلے وہاں سے روانہ ہوئے۔

مظفر نگر مظفر نگر میں تھانے دار نے چند پیادوں کے ساتھ استقبال کیا۔ قاضی نجم الدین نے بھی پندرہ آدمیوں کے ساتھ ایک میل بڑھ کر معانقہ و مصافحہ کا شرف حاصل کیا اور اپنے مکان

۱۰ پر لے گئے اور صاحبزادے اور بھتیجے سمیت بیعت سے مشرف ہوئے۔

دیوبند و نواح مظفر نگر سے آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ سید مقبول، جو قاضی نجابت علی خاں کی پیشی میں تھانے میں ملازم تھے، بیعت سے مشرف ہوئے۔ مولوی شمس الدین صاحب جن کو پہلے سید صاحب سے بداعتقادی اور سوءِ ظن تھا، ایک ہدایتِ غیبی کے ذریعے بیعت سے مشرف اور داخلِ سلسلہ ہوئے اور تمام خلافِ شریعت امور سے توبہ کی۔ بیعت سے پہلے

۱۵ گنڈہ اور عملیات وغیرہ کے جو اعمال کیے تھے، شیخ حفیظ اللہ دیوبندی کو اپنے ساتھ لے کر اہلِ معاملہ کے پاس جا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ کہیں اپنی تقصیر معاف کرائی اور کسی سے توبہ لی۔ شیخ حفیظ اللہ کہتے ہیں کہ آپ کے خاندان میں سلام کے بجائے "آداب" و "بندگی" کے الفاظ کا رواج تھا۔ یہ سب موقوف کرایا اور سلام مسنون کو رواج دیا۔ میں مولوی صاحب ممدوح کا شاگرد تھا۔ مجھ سے بھی تاکید فرمائی کہ جس سے بھی ملاقات ہو، بڑا ہو یا چھوٹا، اس کو سلام علیک کرنا۔ چنانچہ

۲۰ آپ کی تعلیم کے مطابق میں نے اپنے والد صاحب محترم کو سلام علیکم کہا۔ چونکہ یہ بالکل خلافِ عادت بات تھی، بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ: "مجھے معلوم ہے کہ کس نے تم کو سکھایا ہے۔ میں اس

سے سمجھوں گا۔ آخر میں ان کی سیرت بالکل بدل گئی اور سنا گیا ہے کہ اپنے صاحبزادے کے ہاتھ پر جن کو سیّد صاحبؒ سے خلافت تھی، بیعت کر کے داخلِ سلسلہ ہو گئے۔

شیخ رجب علی اور ان کے صاحبزادے منوّر علی اور قصبے کے دوسرے شرفا وغیرہ بھی بیعت سے مشرّف ہوئے۔ ایک روز حافظ عبداللہ، ان کے بھائی نظام الدّین اور کریم الدّین آپ کو موضع املیا لے گئے۔ آپ نے عصر کی نماز وہیں پڑھی۔ یہ تینوں بھائی اور اُن کے والد امام بخش اور وہاں کے بعض دوسرے حضرات کرامت حسین، محمد ماہ، شیخ چاند وغیرہ بیعت ہوئے۔ شام کے کھانے کے بعد موضع کی تمام عورتیں بیعت میں داخل ہو گئیں۔

امام بخش کا نام آپ نے بدل کر امام الدّین رکھ دیا۔ ان کے صاحبزادے حافظ عبداللہ تو آپ کے ساتھ حج و جہاد میں بھی رہے۔ اس دیہات کے اکثر لوگ سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ ہمّت خاں ایک نیک و بابرکت شخص تھے۔ زراعت کرتے تھے اور اپنے کھیت میں نماز پڑھتے تھے۔ جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، تو عرض کیا کہ میں اپنے کھیت میں نماز پڑھا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ تمھارے غلّے کی پیداوار میں برکت ہوگی۔ ان کی کھیتی میں اتنی برکت ہوئی کہ ان کے قریب کے کھیت والے رشک کرتے تھے۔ تہائی رات کو آپ اپنی جائے قیام پر تشریف لائے۔ حافظ عبداللہ ساتھ آئے اور دو نفیس سیاہ کمبل اور کچھ نقد ہدیہ کیا۔

دس دن دیوبند میں قیام رہا۔ دیہات کے مسلمان بکثرت بیعت سے مشرّف ہوئے۔ دوسرے دیہات کے لوگ گاڑیوں اور بہلیوں پر مستورات کو سوار کرا کے لاتے اور بیعت کراتے۔ بیعت کے بعد بکثرت لوگوں نے پیرانِ کلیر کے میلے میں جانے سے توبہ کی۔ آپ نے مولوی فرید الدّین، مولوی بشیر اللہ، قاضی عظیم اللہ، سیّد محمد حسین اور مولوی شمس الدّین صاحب کو خلافت نامہ لکھ کر دیا۔

دیوبند سے روانگی ہوئی۔ کثرت سے لوگ ایک ایک میل تک بعض منزل تک مشایعت کے لیے آئے۔ بہت سے لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔

دیوبند سے آپ قصبہ شیخپور اور وہاں سے موضع سویری تشریف لے گئے اور وہاں ما حضر تناول فرمایا۔ وہاں کے مسلمانوں نے اور گھروں کی مستورات نے بیعت کی اور تمام منہیات سے توبہ کی۔ چند گھنٹے اس موضع میں ٹھیر کر روانہ ہوئے۔ موضع لاکہ نور اور قصبۂ شیخپورہ کے درمیان ایک نہر ہے۔ عصر کی نماز کا وقت وہیں ہو گیا۔ آپ نے نماز پڑھی۔ قصبے کا زمیندار جس کا نام ۵ چودھری امام الدین تھا، دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ آیا اور اپنے مکان لے گیا۔ بہت سے آدمیوں نے بیعت کی۔ رات وہاں گزار کر دوسرے دن دوپہر کو سہارن پور کی طرف روانہ ہوئے۔

سہارن پور سہارن پور سے باہر ایک جم غفیر استقبال کے لیے موجود تھا۔ آپ نے مغرب کی نماز مسجد ابو بنی میں پڑھی۔ اس کے ایک حجرے میں حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی رہتے تھے جو بڑے مشائخ میں سے تھے۔ سیکڑوں آدمی اُن کے مرید تھے۔ انھوں نے اپنے تمام مریدوں کے ساتھ ۱۰ بیعت کی اور اپنے تمام نیاز مندوں کو بلا کر کہہ دیا کہ سب آپ سے بیعت ہو جاؤ، ایسا مرشد کامل پھر ملنا مشکل ہے۔ تنہائی رات تک بیعت کرنے والوں سے آپ کو فرصت نہیں ہوئی۔ دو روز تک اُنھیں کے گھر دعوت رہی۔

سہارنپور میں ولی محمد صاحب نے، جو بڑے متمول رئیس تھے اور بڑا عملہ سپاہی اور منشی اُن کے یہاں ملازم تھے اور متدین اور خدا طلب آدمی تھے، بڑے اعزاز و اہتمام کے ساتھ دعوت ۱۵ کی اور اپنے تمام اعزا و عملے کے ساتھ مرید ہوئے۔ ان کے یہاں کی مستورات بھی بیعت میں داخل ہوئیں۔ ولی محمد صاحب نے دعا کی درخواست کی اور عرض کیا کہ: "اللہ کے فضل و کرم سے دنیا وی مال و دولت کی کمی نہیں۔ صرف یہ دعا چاہتا ہوں کہ اسراف و فضول خرچی سے اللہ محفوظ رکھے اور اللہ کا دیا ہوا اللہ ہی کے راستے میں خرچ ہو۔" آپ نے ان کی خواہش کے موافق ان کے لیے اور ان کی ترقی ایمان کے لیے دعا فرمائی۔ آپ کے آرام کرنے کے وقت تک لوگ گروہ در گروہ بیعت کے ۲۰ لیے حاضر ہوتے اور بیعت سے مشرف ہوتے۔

صبح کے وقت ولی محمد اور شہر کے دوسرے شرفا حاضر خدمت ہوئے۔ مفتی شرف الدین

صاحب نے دعوت کی درخواست کی۔ ایک دُوسرے شخص بھی وہاں بیٹھے ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے بھی دعوت کی درخواست کی۔ جانبین سے کچھ گفتگو بڑھی۔ آپ نے فرمایا کہ: "بحث کا موقع نہیں۔ ہمیں آپ سب کی دعوت منظور ہے، لیکن وقت کا تعیّن آپ کے اختیار میں ہے۔ آپس میں طے کر لیجیے" چنانچہ مُفتی صاحب کو پہلے موقع دیا گیا اور وہ اپنے گھر کی تمام مستورات اور متعلقین کے ساتھ بیعت میں داخل ہُوئے۔ چھ روز تک اسی محلے میں دعوت و بیعت کا سلسلہ جاری رہا اور بیعت کرنے والوں کا اژدحام رہا۔

سہارنپور اور اُس کے نواح میں اصلاح و تبلیغ کی رَو

سہارنپور میں قصابوں کی برادری کے کئی گھر تھے۔ ان میں سے اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرّف ہُوئے۔ ہیئت اُن کی یہ تھی کہ مونچھیں بڑھی ہوئیں، زلفیں دراز، لنگوٹ بندھے ہُوئے، جس سے صرف شرمگاہ چھپی ہوتی۔ آپ نے اُن کو نصیحت فرمائی کہ "تمھاری صُورت بالکل ہندوؤں کی سی ہے۔ مونچھیں ترشاؤ، زُلفیں رکھنا چھوڑ دو، پاجامہ پہنو اور یہ لنگوٹ اُتارو اور پنجوقتہ نماز کی پابندی کرو۔" اُنھوں نے سب باتیں قبول کیں اور فرمائش کی کہ ایک مُعلّم ان کو دیا جائے۔ آپ نے حافظ قطب الدین صاحب کو اس کے لیے مقرر کیا۔ دو تین دن میں تین تین سو آدمیوں نے اپنی مونچھیں اور سر درست کر لیے۔ ان کے ایک چودھری تھے۔ آپ نے پوچھا: "بھائی، تمھارا کیا نام ہے؟" اُنھوں نے کہا: "امام بخش"۔ آپ نے فرمایا: "اچھا، آج سے تمھارا نام امام الدین ہے" اور سب کو تاکید کی کہ اس نام کے سوا اور کسی نام سے چودھری صاحب کو نہ پکارا جائے۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ کو وعظ کا حکم ہُوا۔ مولانا نے تعزیہ داری، قبر پرستی اور شرک و بدعت کی دُوسری باتوں کے خلاف وعظ کہا اور کھول کھول کر ان باتوں کی بُرائی بیان کی اور اُن سے منع کیا۔ لوگوں نے یہ وعظ اور تقریریں سُن کر کہا کہ "ہمیں تو ابھی تک اس بات کی بالکل خبر ہی نہ تھی۔ ہم تو انھیں اُمور کو دین و ایمان سمجھتے تھے۔" اُنھوں نے تمام خلافِ شرع اُمور سے توبہ کر کے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور عرض کیا کہ "آپ ہمارے اس راستے پر ثابت قدم رہنے کے لیے دُعا فرمائیں۔" آپ نے استقامت کی دُعا فرمائی اور وہ اللہ کے

فضل و کرم سے متقی اور متورّع ہو گئے۔ آپ نے ان میں چار چودھریوں کو اپنی طرف سے خلیفہ مقرر کیا۔ اُن کے نام یہ ہیں: محمّد یار، الٰہی بخش، امام الدّین، کریم الدّین۔

ان قصابوں کی مستورات بھی بیعت میں داخل ہوئیں اور اُن کے گھروں میں آپ کی دعوت ہوئی۔ بیس روز سہارن پور میں آپ کا قیام رہا۔ اس عرصے میں قصابوں کی عورتیں خود بھی نماز روزے پر مستعد ہو گئیں اور دوسروں کو بھی راہِ راست پر لائیں۔ جو عورتیں آپ سے بیعت کر چکی تھیں، لیکن اُن کے مرد بیعت سے مشرّف نہیں ہوئے تھے، اُنھوں نے اپنے مردوں سے کہہ دیا کہ: "اگر تم نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، تو ہم تم کو گھر میں گھسنے نہ دیں گے۔" مردوں نے جب تک بیعت کا پکّا اقرار نہیں کیا، اُنھوں نے دروازے نہیں کھولے۔

محمّد یار خاں کے محلّے کے لوگوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ: "ہمارے سرگروہ محمّد یار خاں، جو ابھی تک آپ کی صحبتِ بابرکت سے فیض اندوز نہیں ہوئے، بلکہ دوسروں کو بھی اشارے کنایے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے منع کرتے ہیں، آپ ان کے حق میں دعا فرمائیں۔" آپ نے فرمایا کہ ہدایت تو اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ باقی دعا کرنے سے عذر نہیں۔ اگر ہدایتِ الٰہی ان کی طرف متوجّہ ہوئی، تو خود حاضر ہوں گے۔ آپ نے شیخ صلاح الدّین سے ارشاد فرمایا کہ تہجّد کے وقت ہم کو یاد دلانا۔ شیخ صاحب نے اس وقت یاد دلایا اور آپ نے دعا فرمائی۔ صبح خان صاحب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "مَیں تابعدار ہوں۔ بیعت کا اشتیاق رکھتا ہوں۔ شیطانی وسوسہ تھا کہ اتنے دنوں توقّف کیا۔" بڑی معذرت کی اور داخلِ بیعت ہوئے۔

سہارن پور کے محلّہ دادو سرا میں نور بافوں کی آبادی تھی۔ ان کی بھی یہ تمنّا ہوئی کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ برادری نے مشورہ کر کے اپنے دو چودھریوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور اس تمنّا کا اظہار کیا کہ غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔ آپ نے ان کی دعوت قبول کی۔ اُنھوں نے شہر کے دوسرے معزّزین و شرفا کو بھی مدعو کیا۔ شرفائے شہر نے، جن کو اس برادری کی دعوت میں شریک ہونے اور اُن کے مکان پر جانے سے عار تھا، یہ خبر سن کر

کہ آپ تشریف لے گئے ہیں، بادلِ ناخواستہ دعوت میں شرکت کی اور ان کو آپ کا وہاں تشریف لے جانا ناگوار ہوا۔ اس برادری کے تمام مرد و زن بیعت سے مشرف ہوئے اور ہدیہ پیش کیا۔ ان کے ایک چودھری کا نام امام بخش تھا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر امام الدین رکھا۔

وہیں محرم کا چاند دیکھا گیا۔ بعض تعزیہ دار تعزیہ بنانے میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ سے فرمایا کہ "ان دنوں تعزیہ داری کی مذمت پر وعظ کہا جائے۔" مولانا ۵ کے وعظ کی برکت سے اکثر تائب ہوئے اور کئی آدمیوں نے اپنے بنے بنائے تعزیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور بعضوں نے جلا دیا اور آپ کے ہاتھ پر تعزیہ داری سے توبہ کی۔

موضع چلکانہ کا ایک شیعہ مذہب شریف زادہ سید رستم علی، جس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی، تین چار دن مولانا عبدالحی صاحبؒ کے وعظ میں شریک ہوا۔ ایک روز حافظ برخوردار کو ہمراہ لے کر سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "مجھ پر حق منکشف ۱۰ ہو گیا ہے اور میں توبہ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو اور تمھاری ہستی اللہ کی رضامندی کے راستے میں صرف ہو۔ آپؒ نے بطریق شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اللہ کی عظمت و کبریائی اور اپنے عجز و مسکنت کے مضمون کو بیان کیا۔ آپ نے اس کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے سپرد کر کے فرمایا کہ "مولانا، اس کو نماز کا طریقہ اور دیگر احکامِ شرعی کی تعلیم فرمائیے" اور ۱۵ خود اس کے حق میں ثابت قدمی اور استقامت کی دعا فرمائی۔ اس کے اہلِ خاندان نے اس کی استقامت اور پختگی کو دیکھ کر اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ سے گفتگو میں بند ہو کر کہا کہ: "ہم نے اس بچے کو دے دیا، آپ اپنے ساتھ رکھیے۔" یہ نوجوان حج و سفرِ جہاد میں برابر ساتھ رہا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ اس کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور اپنے تمام کام کا اس کو مختار بنا رکھا تھا۔ سید صاحبؒ نے جیسے کہ دعا فرمائی تھی، مہیار کی جنگ میں شہید ہوا اور اللہ ۲۰ کے راستے میں کام آیا۔

حاجی شیخ احمد کہتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے مولوی شاہ رمضان رڑکی والے کو خلافت عطا فرمائی تھی تاکہ اطراف و جوانب کے دیہات میں تعلیم و نصیحت کے لیے دورہ کریں۔ مولوی صاحب موضع جانکھا میں پہنچے، جو اس خاکسار کا وطن ہے اور وہاں ایک مسجد میں وعظ فرمایا۔ میرا سن اُس وقت نو سال کا تھا اور ہندو تھا۔ میں نے مسجد کے نیچے بیٹھ کر آپ کا وعظ سنا۔ آپ نے
۵ روزہ نماز وغیرہ اور دوسرے نیک اعمال کے فضائل بیان کیے۔ تین روز تک اسی طرح میں آپ کا وعظ سنتا رہا۔ میرے دل میں آیا کہ جب ان کا دین اتنا اچھا ہے، تو میں بھی اگر یہی دین قبول کر دوں، تو بہت اچھا ہے۔ میرا یہ شوق دن بدن بڑھتا رہا۔ تیسرے روز میں نے ہمت کی کہ میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو جاؤں۔ میں مسجد میں پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمان آپ کا وعظ سننے کے لیے بیٹھے ہیں اور بہت سے ہندو علیحدہ علیحدہ مسجد کے
۱۰ نیچے کھڑے ہوئے ہیں۔ میں بھی وہیں جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے دل میں ایک ایسا سرور پیدا ہوا کہ میں اس کے نشے سے سرشار ہو گیا، یہاں تک کہ بے اختیار ہو کر مولوی صاحب کے پاس جا کر عرض کیا کہ "میں مسلمان ہوتا ہوں۔ مجھے آپ مسلمان کر لیجیے۔" مولوی صاحب نے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا، "تم مسلمان ہوتے ہو؟" میں نے کہا، "جی ہاں!" آپ نے مجھے اپنے ایک بھائی کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں سہارنپور بھیج دیا اور میں اسی ذوق و شوق کی حالت میں
۱۵ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔"

محسن خاں و محمد حسین سہارنپوری بیان کرتے ہیں کہ جب یہ بچہ آپ کی خدمت میں سہارنپور پہنچا، آپ نے اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ بار بار اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس ہادیِ مطلق کی شان دیکھو، اس کا نورِ ہدایت جس کے دل میں پڑ جاتا ہے، وہ خود راہِ راست تلاش کرتا ہے۔" پھر مولانا عبدالحی صاحبؒ سے فرمایا کہ: "نامِ خدا اس بچے کو کلمۂ توحید
۲۰ کی تلقین کیجیے اور اس نیک کام میں ذرا دیر نہ کیجیے۔" مولانا ممدوح نے کلمے کی تلقین کی۔ آپ نے فرمایا کہ: "اس کا کوئی نام بھی تجویز کر دیجیے۔" مولانا کی زبان سے نکلا: "کریم الدین۔" اُس وقت

مجلس میں اہلِ شہر کا ہجوم تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ "یہ نام رکھنے سے بعض لوگ ناراض ہوں گے، کیونکہ عمائدِ شہر میں سے کئی آدمیوں کا یہی نام ہے۔" آپ نے فرمایا کہ "اچھا پھر اِس کا نام احمد رکھو، اِس لیے کہ یہ میرا نام ہے۔" آپ نے اِس بچے کو حکیم مغیث الدّین کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ "اِس کو نماز سکھائیے اور قرآن کی تعلیم دیجیے اور دین کے احکام و مسائل سے واقف کیجیے۔ جب ہم آپ کو اپنے سفرِ حج کی اطلاع کریں، تو اس کو بھی اپنے ساتھ لیتے آیئے گا۔ انشآء اللہ یہ حاجی ہوگا۔" پھر آپؒ نے اپنے تمام ہمراہیوں اور اہلِ شہر میں سے جو لوگ حاضر تھے، نیز مولانا عبدالحیؒ و مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کو جمع کیا اور ان دو صاحبوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ "جہالت کی چند باتیں لوگوں کے ذہن میں ایسی بیٹھ گئی ہیں کہ اگر یہ باتیں دل سے نہ نکلیں، تو اندیشہ ہے کہ آخر میں دین و ایمان میں خلل نہ آجائے۔

اوّل یہ کہ جب کسی کا بچہ مر جاتا ہے اور اللہ اس کو دُوسرا بچہ عطا کرتا ہے، تو وُہ اس پہلے بچے کا نام دُوسرے بچے کا نہیں رکھتا اس ڈر سے کہ کہیں وُہ بچہ بھی نہ مر جائے۔

دُوسرے یہ کہ کوئی غریب مُسلمان اپنے بچے کا نام رؤسا میں سے کسی کا نہیں رکھ سکتا۔

تیسرے یہ کہ دولت مند و اُمرا غربا کی دعوت قبُول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ان کو اس میں سبکی اور ذِلت محسُوس ہوتی ہے۔

چوتھے یہ کہ جو کھانا ہم پکاتے ہیں، بیچارے غریب لوگ نہیں پکا سکتے، کیونکہ اس سے ہمسری اور برابری ٹپکتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی بعض ایسی ہی باتیں فرمائیں اور ان مَن گھڑت باتوں کی تردید فرمائی اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کو وعظ کا حکم دیا۔ مولانا نے ایسی روانی و خوش بیانی سے وعظ فرمایا کہ ہر ایک کا دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ہر شخص کی زبان پر آمنّا و صدّقنا تھا۔ وعظ کے ختم ہونے پر آپ نے احکامِ الٰہی کی اطاعت کی دُعا کی۔ جن لوگوں نے کریم الدین نام رکھنے

سے منع کیا تھا، اُنھوں نے از سرِ نو بیعت اور سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر توبہ کی۔

مُسلمانوں کے علاوہ سلیم الطبع ہندو بھی آپ سے حُسنِ ظن اور محبّت کرنے لگے۔ ایک روز تحصیلدار دھوکل سنگھ آئے اور کھڑے کھڑے عرض کیا کہ کل اس غلام کے ہاں جناب کی دعوت ہے۔ آپ نے فرمایا، "تشریف رکھیے۔" اُنھوں نے کہا کہ "جب تک میری دعوت قبوُل نہیں ہوگی، نہیں بیٹھوں گا۔" آپ نے فرمایا: "قبوُل ہے۔" تحصیلدار بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ "کل کس وقت سواری لے کر حاضر ہُوں؟" فرمایا، "دو گھڑی دن نکلے کسی کو بھیج دیا جائے ہم آجائیں گے۔" دُوسرے روز وقتِ مقررہ پر اپنے عملے کے دو سو آدمیوں کے ساتھ، جن میں سے اکثر مُسلمان شُرفا تھے، حاضر ہُوئے۔ آپ سوار ہو کر اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ ان کے تمام مُسلمان ہمراہی شرفِ بیعت سے مشرّف ہُوئے۔ تحصیل دار نے بڑے پُرتکلّف انواع و اقسام کے کھانوں سے ضیافت کی۔ کھانے کے بعد عطریّات اور پان سے تواضع کی۔ شام کے وقت پھر حاضر ہو کر تمام قافلے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت پلاؤ وغیرہ اور اکثر مٹھائیاں تھیں۔ تحصیل دار نے اعزاز و اکرام اور تواضع اور خاطرداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔[1]

سہارنپور اور مظفر نگر کے قصبات دوآبے کے یہ وُہ مقامات ہیں، جہاں سیّد صاحبؒ کے تشریف لے جانے کا ذکر مُحسن خاں کی روایت میں ہے اور مولوی سیّد جعفر علیؒ نے "منظُورۃ السُّعداء" میں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ دوآبے کے معمر بزرگوں اور علماء و مشائخ کے بیانات و روایات سے معلُوم ہوتا ہے کہ آپ انبیٹھ، گنگوہ، نانوتہ (ضلع سہارنپور)، تھانہ بھون اور کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) بھی تشریف لے گئے۔

انبیٹھ "تذکرۃ الرشید" میں ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا کہ "سیّد صاحب رح انبیٹھ میں بھی تشریف لائے۔ میاں صابر بخش سجادہ نشین شاہ ابُوالمعالی کے یہاں دعوت

(۱) منظُورۃ السُّعدا

ہوئی تھی[1]۔" گنگوہ بھی سید صاحبؒ تشریف لائے تھے اور محلے کی سرائے میں قیام ہوا تھا۔ چند شخص یہاں شرفِ بیعت سے مشرف بھی ہوئے تھے، جن میں ایک شخص یہاں کی مسجد میں رہتا تھا۔ بڑا ہی متبع سنت تھا۔ اس کی عادت تھی، جب رمضان شریف گزر چکتا، تو لوگوں سے کہہ دیتا، "بھائیو، ایک برس کی میری زندگی اور نکل آئی۔" لوگ ہنسا کرتے کہ ہر رمضان کے بعد یوں ہی کہہ دیتا ہے، حتیٰ کہ رمضان کی سات تاریخ کو انتقال کیا۔[2]

نانوتہ سید صاحبؒ نانوتہ بھی تشریف لے گئے۔ وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے۔ ایک مرید نے بیان کیا: "میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ سید صاحبؒ مسجدِ جامع کے وسطی دروازے میں کھڑے ہیں۔ نہایت شکیل جمیل تھے۔ آپ نے اپنی پگڑی اُتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے کر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑا دی۔ لوگ برابر دوسرے سرے تک اس کو پکڑے ہوئے تھے اور پگڑی کھنکھجورے کی شکل معلوم ہوتی تھی، کیونکہ دونوں طرف سے اُس کو تھامے ہوئے تھے۔"[3]

کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش صاحبؒ، جو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، کے نامور شاگرد اور مرید تھے، بیعت ہوئے اور اُن کے خاندان اور قصبے کے اکثر اہلِ علم اور شرفا بیعت میں داخل ہوئے۔ ارمغانِ احباب میں ہے:

> جب سید صاحبؒ کاندھلہ تشریف لے گئے، تو اس وقت مولوی ابوالحسن[4] صاحب سن رسیدہ تھے۔ اُن کے صاحبزادے مولوی نورالحسن آٹھ دس برس[5] کے تھے اور زیور پہنے ہوئے تھے۔ جب سید صاحبؒ تشریف لائے، تو صاحبزادہ صاحب آکر بیٹھ گئے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: "مولانا، یہ کون

(۱) "تذکرۃ الرشید" جلد ۲، صفحہ ۲۷۱۔ (۲) صفحہ ۲۷۲۔ (۳) صفحہ ۲۷۲ (۴) مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن متخلص بہ حسن، مصنف "مثنوی گلزارِ ابراہیم" متوفی ۱۲۶۹ھ (۵) مولوی نورالحسن صاحب کی ولادت ۶ ربیع الآخر ۱۲۳۲ھ میں ہوئی (بیاضِ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ) اس حساب سے ربیع الاول ۱۲۳۴ھ میں اُن کی عمر سات سال کی تھی۔

ہیں؟" اُنھوں نے کہا: بندہ زادہ۔" فرمایا: "یہ کیا پہنے ہُوئے ہیں؟ کیا یہ جائز ہے؟" کچھ ایسی تقریر فرمائی کہ وُہ شرمندہ ہُوئے اور اسی وقت اُنھوں نے اُس کو اُتروا ڈالا۔ عورتوں نے بہت دُند مچایا کہ: "یہ نئے مولوی کہاں سے آئے ہیں؟ ہمارے مولویوں نے کبھی نہیں منع کیا! اب نئی کتابیں بنی ہیں؟ جو پہلے تھیں، وُہی اب بھی ہیں"۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ: "واقعی کتابیں تو وُہی ہیں، جو پہلے تھیں، لیکن ہم نہیں جانتے کہ ہم کو کیا ہو گیا تھا۔"[1]

اس دورے میں کم از کم چھ مہینے کی مُدت صرف ہُوئی۔ دورے سے دہلی واپسی ہُوئی۔ کچھ عرصہ قیام فرما کر آپ نے رائے بریلی کے سفر کی تیاری کی۔[2]

سفر کے برکات و اثرات آپ کا یہ پُورا سفر بارانِ رحمت کی طرح تھا کہ جہاں سے گُزرتا ہے، سرسبزی و شادابی بہار و برکت چھوڑ جاتا ہے۔ دیکھنے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ جہاں آپ تھوڑی دیر ٹھیر گئے، وہاں مساجد میں رونق، اللہ رسُول کا چرچا، ایمانوں میں تازگی، اتباعِ سنّت کا شوق، اسلام کا جوش پیدا ہو گیا اور کہیں کہیں شرک و بدعت اور رفض کا بالکل خاتمہ

(۱) ارمغانِ احباب"

(۲) اندازہ ہے کہ سید صاحبؒ کا دوآبے کا دورہ ذی قعد ۱۲۳۳ھ کی کسی تاریخ کو شروع ہُوا۔ آپ راستے میں کہیں پانچ روز، کہیں دس روز، کہیں سترہ روز ٹھیرتے ہُوئے سہارنپور پہنچے۔ سہارنپور ہی میں محرم (۱۲۳۴ھ) کا چاند دیکھا۔ سہارنپور سے گرد و نواح کے دُوسرے مقامات (انبیٹھ، گنگوہ، تھانہ بھون، کاندھلہ وغیرہ) تشریف لے گئے۔ کاندھلہ پہنچنے کی تاریخ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۳۴ھ ہے۔ مراجعتِ دہلی کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے، لیکن کاندھلہ کے بعد دہلی پہنچنے تک زیادہ عرصہ نہیں لگنا چاہیے۔ اس لیے کہ اکثر اہم مقامات پر جانا ہو چکا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ جمادی الاولیٰ کے آخر تک دہلی واپسی ہو گئی ہوگی۔ اس طرح واپسی پر ڈیڑھ دو مہینے دہلی قیام رہا ہوگا، دہلی سے رائے بریلی کو روانگی آخرِ رجب تک ضرور ہو گئی ہوگی، اس لیے کہ واپسی کے سفر میں آپ کا قیام کہیں ایک روز، کہیں دو روز، اور کہیں اس سے زیادہ روز ہُوا ہے۔ قاضی آباد میں، جو سفر کی پہلی منزل تھی، آپ سے جب زیادہ قیام کی درخواست کی گئی، تو آپ نے فرمایا کہ: "مہینہ رمضان شریف کا قریب آیا ہے، ہمارا رہنا یہاں دو چار دن نہیں ہو سکتا ہے" (وقائع صفحہ ۱۵۸)۔ وقائع میں تصریح ہے کہ: "ماہِ رمضان المبارک کی چاند رات کو حضرت مع الخیر..... اپنے شہر رائے بریلی میں داخل ہُوئے۔ فجر کو سب نے روزہ رکھا۔" (وقائع صفحہ ۱۸۲)۔

ہوگیا اور جو بستیاں اور مقامات آپ کے قدم سے محروم رہے، وہ ان نعمتوں سے محروم رہے سالہا سال تک یہ اثر اور فرق رہا۔ راقم سطور کے والد مرحوم مولانا سید عبد الحی صاحبؒ اپنے سفرنامہ "ارمغانِ احباب" میں مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ[1] کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:-

"مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ فرماتے تھے کہ سید صاحبؒ اس نواح (دیو بند و سہارنپور) کے اکثر قصبہ جات میں تشریف لے گئے۔ وہاں اب تک خیر و برکت ہے اور دو ایک گاؤں اور قصبے ایسے ہیں، جہاں نہیں گئے۔ وہاں اب تک وہی نحوست اور شامت باقی ہے۔ چنانچہ منگلور نہیں گئے۔ وہاں کے لوگوں میں وہی جہالت و قساوت ہے اور ایک مختصر گاؤں ہے، جہاں مسلمانوں کے دو چار گھر ہیں۔ اتفاقاً سید صاحبؒ کسی ضرورت سے وہاں بھی گئے ہیں۔ وہاں بھی خیر و برکت پائی جاتی ہے۔ گویا کہ ایک نورِ مستطیل ہے کہ جدھر جدھر وہ گئے، اُدھر اُدھر وہ پھیل گیا ہے۔"

میاں محمد حسین نواحِ سہارنپور کے ایک بزرگ اور سید صاحبؒ کے مرید نے والدِ مرحوم سے فرمایا:

"جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے، وہاں وہاں برکت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ تشریف لے گئے۔ اس قصبے میں نومسلموں کا محلہ پہلے ملتا تھا، انھوں نے حضرت کو روک لیا۔ قاضی کے محلے تک نہ جانے دیا۔ اب خدا کی قدرت دیکھیے، نومسلموں کا محلہ نہایت سرسبز ہے اور وہ لوگ بہت خوشحال ہیں اور قاضیوں کا محلہ ویران پڑا ہوا ہے۔"

سب سے زیادہ سید صاحبؒ کا اثر دہلی اور سہارنپور کے نواح میں ہوا اور حقیقت میں یہی آپ کے مرکز رہے۔ چنانچہ دینداری میں بھی یہ اطراف سارے ہندوستان میں ممتاز ہیں۔ والدِ مرحوم

(۱) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بڑے عالم، ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہند کے لقب سے معروف خاص و عام ہیں۔

نے ۱۳۱۲ھ میں سفر کیا۔ اپنے سفرنامے میں سہارنپور کا ذکر اِس طرح فرماتے ہیں:۔

"اس وقت تک سہارنپور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، وہاں کے ہر فردِ بشر کو سید صاحبؒ کا دم بھرتے پایا۔ جو ہے، اُن کی محبت میں چُور ہے اور سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ ہم کو ایمان و اسلام کی سیدھی راہ انھیں سے ملی ہے۔ ہمارے نام ہم مسلمان تھے۔ جتنے مشائخ ہیں، وُہ سب اسی سلسلے کو مقدم جانتے ہیں۔ میں نے فی عمری سید صاحبؒ کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا۔ اس طرف کی مساجد عموماً آباد ہیں۔ ہر مسجد میں حمّام گرم ہو رہے ہیں۔ ہر مسلمان کم سے کم نماز و تلاوت کا ضرور شائق ہے۔ میرے گمان میں ضلع سہارنپور کے اشرار ہماری طرف کے اخیار سے اچھے ہیں، اور اخیار کا کیا پوچھنا ہے؟ اُن کی تو نظیر اس طرف نہیں ملتی۔ کسی رنگ میں ہیں، مگر خدا کی لَو لگی ہوئی ہے۔ بے تکلف اور سچے دیندار مسلمان ہیں۔ مجلسِ وعظ معمور رہتی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک نہایت شوق اور رغبت کے ساتھ سنتے ہیں۔ ہماری طرف کے (اودھ کے) مسلمانوں کی طرح نہیں ہیں کہ سو میں ایک مجلسِ وعظ میں بیٹھتا ہے اور دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ اب اُٹھوں، تب اُٹھوں۔"

اِس تمام سفر میں مولانا محمد اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ ہم رکاب تھے۔ اُن کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہُوا۔ اس ایک سفر نے وُہ کام کیا، جو بڑے بڑے مشائخ کا تزکیۂ باطن اور بڑے بڑے علما و مصلحین کی برسوں کی تربیت ظاہر کرتی ہے۔ ہر ہر جگہ سیکڑوں آدمی متقی، متورّع، عابد، متبعِ سنّت اور ربّانی بن گئے۔ ہزاروں فاسق، صالح اور اولیاءُ اللّٰہ ہو گئے۔ بیسیوں آدمی قتل کے ارادے سے آئے اور جاں نثار بن کر گئے اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں شہید ہو گئے۔ جس نے ایک مرتبہ زیارت کر لی، وُہ آپ کے رنگ میں رنگ گیا اور مرتے مرتے مر گیا، مگر شریعت سے ایک قدم نہ ہٹا۔ عورتوں اور بچّوں کی بھی یہی حالت تھی۔ جُوق جُوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی آنکھیں روشن کرتے، ایمان تازہ کرتے،

دعوت دیتے اور اپنے گھر، مال اور اولاد میں برکت حاصل کرتے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے دعوت کی ہے اور دس پانچ آدمیوں کے اندازے سے کھانا پکوایا، لیکن وقت پر سو ڈیڑھ سو آدمی سید صاحبؒ کے خادم اور معتقد آ گئے۔ صاحبِ خانہ نہایت پریشان ہوئے۔ سید صاحبؒ نے اپنی چادر دے دی۔ وہ کھانے پر ڈال دی گئی اور کھانا نکالا گیا اور سب کے لیے کافی ہوا، بلکہ بچ گیا۔

مولانا عبدالحیؒ، مولانا اسمٰعیلؒ کا یہ حال تھا کہ سواری کے ساتھ پیدل چلتے، لگام تھامتے، جوتیاں اٹھاتے، آپ سوتے، تو وہ ساری رات جاگتے۔

چھٹا باب

رائے بریلی کو واپسی اور مشرقی اضلاع کا دورہ

سفرِ رائے بریلی دہلی سے آپ نے رائے بریلی کے سفر کا قصد فرمایا اور شنبے کا روز سفر کے لیے معیّن ہُوا۔ جمعے کے روز مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ نے دعوت کی۔ آپ نے مولانا کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔ مولانا عبد الحیؒ نے مسجدِ اکبر آبادی میں عصر تک وعظ فرمایا۔ دُوسرے روز آپ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے رخصت ہُوئے[1] اور سفر پر روانہ ہُوئے۔ آپ کے ساتھ پچاس سے زائد ہمراہی تھے۔

دہلی سے شاہدرے ہوتے ہُوئے غازی آباد قیام فرمایا۔ غازی آباد کے ایک حافظ صاحب نے درخواست کی کہ "تین چار روز یہاں قیام فرمایا جائے۔ لوگ بہت مشتاق ہیں، وُہ سب فیضیاب ہوں گے۔" آپ نے فرمایا کہ "ماہِ مُبارک قریب ہے۔ آج تو قیام رہے گا۔ کل، اِن شاء اللہ، وطن کو روانگی ہو جائے گی۔" اس روز کثرت سے لوگوں نے بیعت کی۔

غازی آباد میں آپ کو برادرِ معظم مولانا سیّد محمد اسحٰق صاحب کی خبرِ وفات معلوم ہُوئی[2]۔ آپ نے قاصد سے خط لے کر، جو رائے بریلی سے بھیجا گیا تھا، پڑھا۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، لیکن خاموش رہے اور خط ایک رفیق مبارک علی کے حوالے کیا، جو ناخواندہ تھے تاکہ ہمراہیوں کو اطلاع نہ ہو ورنہ وُہ رنجیدہ ہوں گے اور کوئی کھانا نہ کھائے گا۔ آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ سے فرمایا کہ ہمارے

(۱) یہ آپ کی آخری مُلاقات تھی۔ اس کے بعد نہ آپ کا دہلی آنا ہُوا، نہ شاہ صاحبؒ سے ملنا۔ آپ حج سے ۱۲۳۹ھ میں واپس ہُوئے۔ اسی سال آپ کی واپسی کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے انتقال فرمایا اور آپ نے وطن میں اُس کی خبر سُنی۔

(۲) تاریخِ انتقال ۱۷، جُمادی الآخرہ ۱۲۳۴ھ۔

بھائی صاحب مولانا سید محمد اسحٰق نے انتقال کیا۔ محسن خاں، جن کو سید اسحٰق سید صاحبؒ کی ہمراہی کے لیے چھوڑ گئے تھے، یہ سُن کر زار قطار روئے۔ آپ نے فرمایا: "محسن خاں، صبر کرو۔ اللّٰہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے"۔ لوگوں نے کھانا کھایا۔ آپ نے بھی آدھی رات کو کچھ تناول فرمایا۔[1]

وقائع میں ہے: "سب نے نمازِ (مغرب) پڑھی۔ بعد اس کے حضرت سید المجاہدینؒ بیٹھے تھے۔ قصبہ رائے بریلی سے ایک بھاٹ آپ کے یہاں سے خط لایا۔ آپ نے چراغ نزدیک منگوا کر وہ خط پڑھنا شروع کیا۔ پھر تھوڑا سا پڑھ کر خط لپیٹ ڈالا اور آپ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ: "حضرت کیا خبر ہے؟" آپ نے کچھ نہ بتایا۔ اس عرصے میں صاحبِ دعوت نے کہا کہ: "حضرت کھانا تیار ہے"۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ: "تم سب صاحبو، کھانا کھالو۔ میں اس وقت نہ کھاؤں گا"۔ مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ نے کہا کہ: "حضرت، کچھ سبب تو معلوم ہو۔ ویسے تو ہم کھا لیتے، مگر اب ہم بھی نہیں کھا سکتے"۔ آپ نے وہ خط مولانا کے حوالے کیا اور فرمایا کہ: "ہمارے بھائی صاحب مولوی سید محمد اسحٰق کا انتقال ہوگیا"۔ یہ بات سُن کر سب کو بہت رنج ہُوا۔ پھر مولانا صاحب نے کہا کہ: "حضرت، اب تو جو ہونا تھا، ہُوا۔ سوائے صبر کے کچھ چارہ نہیں، مگر دو چار لقمے کھانا کھائیے کہ آپ کے سبب سے سب کھائیں گے اور بغیر آپ کے کوئی نہ کھائے گا"۔ اُن کے کہنے سے حضرت نے دو چار لقمے کھائے اور سب لوگوں نے کھانا کھایا۔ پھر نمازِ عشا پڑھ کر سب لوگ سو رہے۔[2]

صبح غازی آباد سے کوچ ہُوا اور قصبہ ہاپوڑ قیام ہُوا۔ وہاں کے بہت سے شرفا اور غربا بیعت سے مشرّف ہوئے۔[3] وہاں سے کوچ فرما کر قصبہ گڑھ مکتیسر قیام فرمایا۔ وہاں بھی لوگ بیعت و توجّہ سے فائز ہوئے۔ وہاں سے چل کر امروہہ ٹھیرنا ہُوا۔ امروہے میں قصبے کی سرائے میں (ایک روز) قیام رہا۔ امروہے سے چل کر مراد آباد منزل ہُوئی اور وہاں کی سرائے میں قیام ہُوا۔ قاضیِ شہر ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے اور کھانے کی دعوت دی۔ کھانا تناول

(۱) "منظورۃ السعداء"۔　(۲) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۱۵۸-۱۵۹۔　(۳) "وقائع" صفحہ ۱۵۹۔

فرمانے کے بعد قاضی صاحب مع اپنے اہل و عیال کے بیعت ہو گئے۔ آپ نے قاضی صاحب کو خلافت عطا فرما کر وعظ و نصیحت کی اجازت دی۔ اسی شب نواب علی محمد خاں ایک اشارۂ غیبی سے متوجہ ہو کر ایک بڑی جماعت کے ساتھ سرائے میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "ہمارا آپس میں کچھ نزاع و اختلاف ہے۔ جنابِ والا ایک ہفتہ مراد آباد میں قیام فرمائیں اور ہمارا آپس میں اتفاق کرا دیں" انھوں نے شام کے کھانے کی دعوت بھی دی۔ آپ نے فرمایا کہ "دعوت تو قبول ہے، لیکن ایک ہفتے کے قیام میں ہمارا حرج ہوگا۔ رمضان شریف قریب ہے"۔ انھوں نے عرض کیا کہ: "کچھ تو قیام ضروری ہے، اس لیے کہ یہ بھی خدا کا کام ہے"۔ شام کو قاضی صاحب آئے اور آپ اُن کی ہمراہی میں نواب صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد نواب مع خاندان کے مُرید ہو گئے۔(۱)

دُوسرے روز شام کو مراد آباد کے دُوسرے رئیس محمد میاں کے یہاں دعوت ہوئی۔ اُن کے یہاں بھی بہت مردوں اور عورتوں نے بیعت کی۔(۲)

مراد آباد میں دو چار روز قیام فرما کر آپ رام پور تشریف لائے اور حاجی زین العابدین خاں کے یہاں فروکش ہوئے۔(۳)

رام پور سے بریلی منزل ہوئی۔ نواب بریلی آپ کی زیارت کے لیے جامع مسجد آئے اور آپ کو سوار کرا کے اپنے مکان لے گئے۔ نواب صاحب کے دیوان خانے کے سامنے چند قبریں تھیں حضرت نے پُوچھا کہ: "یہ قبریں کس کی ہیں؟" نواب صاحب نے کہا کہ: "ہمارے گھرانے کے لوگ اسی جگہ مدفون ہیں۔ آپ وہاں چل کر اُن کے واسطے دُعا کریں"۔ حضرت نے فرمایا: "بہت خُوب، مگر آج نہیں، کل کسی وقت ہمارے پاس آیئے گا، تو پہلے شہر کے گورستان میں جا کر وہاں کے غُربا کے واسطے دُعا کریں گے، پھر یہاں آ کر اِن کے واسطے بھی دُعا کریں گے"۔ نواب صاحب سُن کر اس بات پر راضی ہو گئے۔ رات کو کھانا تناول فرمانے کے بعد نواب صاحب کے تمام اہل و عیال نے آپ

(۱) "منظورہ" (۲) "وقائع" صفحہ ۱۶۹ (۳) "منظورہ"

کے دستِ مُبارک پر بَیعت کی۔ دُوسرے دن آپ گاڑی پر سوار ہو کر شہر کے مقابر میں تشریف لے گئے اور دیر تک وہاں دُعا میں مشغول رہے۔ اس کے بعد وہاں سے نواب صاحب کے گھرانے کے مقبرے میں تشریف فرما ہُوئے۔ وہاں دیر تک دُعا کی پھر جامع مسجد میں آئے۔[1]

کئی روز کے بعد بانس بریلی سے اپنے وطن رائے بریلی کو روانہ ہُوئے۔ میاں دین محمد کہتے ہیں کہ: "راہ میں کئی جگہ کچھ کچھ حالات گزرے، مگر وہ تمام و کمال یاد نہیں"۔

"ماہ رمضان کی چاند رات (۲۹ر شعبان ۱۲۳۴ھ) کو حضرت مع الخیر تمام رُفقا کے ساتھ شہر رائے بریلی میں داخل ہُوئے۔ فجر کو سب نے روزہ رکھا۔"[2]

رائے بریلی کا قیام جب آپ رائے بریلی پہنچے، تو ستر سے اُوپر آدمی آپ کے ساتھ تھے۔ قحط کا زمانہ تھا۔ تقریباً سو آدمیوں کی خُور و نوش کا بار آپ پر تھا۔ بڑی تنگی تھی، جس کی وجہ سے مسجد اور گھر میں چراغ نہیں جل سکتا تھا۔ بڑی ابتلا کا زمانہ تھا، لیکن سکینتِ الٰہی کی وجہ سے غم غلط تھا اور جماعت مطمئن تھی۔ کبھی اگر کسی عزیز نے بہت شکایت کی اور دُعا کی درخواست کی، تو اللہ تعالیٰ نے فوراً غیب سے انتظام فرما دیا۔

اس موقع پر مولوی محمد علی صاحب "مخزنِ احمدی" نے اپنا چشم دید واقعہ لکھا ہے، جس سے اس قیام کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:-

"مجھے خُوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ متواتر دو روز سے ایک دانہ میرے حلق سے نہ اُترا تھا۔ اِدھر یہ کڑاکے کا فاقہ، اُدھر بارش کا یہ حال کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب برس کر پھر نہ برسے گی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے دہانے کھل گئے ہیں۔ ہر طرف سے سیلاب اُمنڈتا چلا آتا تھا۔ تمام دنیا جل تھل ہو رہی تھی۔ میں دو روز کے فاقے کا مارا بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ نیند اِس حالت میں کیا آتی؟ آخر پریشان ہو کر اُٹھا اور مسجد میں آیا۔ وہاں چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا گھُپ تھا۔ حضرت چند آدمیوں کے ساتھ مسجد میں تشریف

(۱) "وقائع" صفحہ ۱۷۷ - ۱۷۸　　(۲) "وقائع" صفحہ ۱۸۲

رکھتے تھے۔ میں جب مجلس کے قریب پہنچا، تو میں نے کہا: "دوستو! تمھارا کیا حال ہے؟"
مولانا محمد اسمٰعیل نے فرمایا کہ: "آؤ، تم بھی یہاں کی تجلیِ بے رنگی کا تماشہ دیکھو۔" حضرت
نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ میں نے مجلس کا عجیب حال پایا۔ سُرور و شادمانی
کے دروازے کھلے ہُوئے تھے۔ غم و فکر اُن سے کوسوں دُور تھا۔ میں نے روتے روتے
حضرت کا دامن پکڑا اور عرض کیا کہ: "گھر کے تمام مرد، عورتیں اور بچے ایسی بھوک میں
مبتلا ہیں، جس کا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا۔ آپ تو صبر و توکل اور وقار و تحمل کا
پہاڑ ہیں، لیکن ہم تو اس درجے کے صابر و متوکل نہیں۔ اپنی قرابت اور رشتے کا واسطہ،
دُعا کا تیر کمان سے نکالیے اور قوتِ مالایموت کے لیے بارگاہِ خداوندی میں درخواست
کیجیے۔" آپ نے ہنستے ہُوئے اہلِ مجلس سے فرمایا کہ: "محمد علی بھوک کی تکلیف سے بہت
از خود رفتہ ہو گئے ہیں۔ مجیب الدعوات کی بارگاہ میں دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کچھ
انتظام فرمائے۔" اس کے بعد آپ نے نہایت تضرع و زاری و انکسار و خاکساری
کے ساتھ دُعا فرمائی۔ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں گزری تھی کہ بادل چھٹ گیا اور چاند
نکل آیا۔ حضرت تمام اہلِ مجلس کے ساتھ روتے ہُوئے سجدۂ شکر میں گر گئے۔ ابھی
آپ نے سجدے سے سر نہیں اُٹھایا تھا کہ سئی ندی، جو تکیے کی مسجد کے نیچے ہی بہتی
ہے اور اس وقت بڑی طغیانی پر تھی، اُس کے دُوسرے کنارے سے مسافروں کی آواز
آئی کہ "ملاح، کشتی لاؤ اور ہم کو پار اُتارو۔" حضرت نے مسجد سے نکل کر پُوچھا کہ "کہاں
سے آتے ہو اور کون ہو؟" اُنھوں نے جواب دیا کہ: "ہم لوگ حضرت کے مریدِ خاص سید
محمد یٰسین، داروغہ توپ خانۂ انگریزی کے بھیجے ہُوئے آئے ہیں اور ارادت کی غرض
سے حاضر ہُوئے ہیں۔" سیلاب کی وجہ سے دریا بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ آپ
نے ایک ماہر کشتی ران کو بھیجا۔ وہ اُن کو اُتار کر لایا۔ اُنھوں نے کپڑے بدلے اور
سید محمد یٰسین صاحب کی بھیجی ہُوئی چند اشرفیاں اور کچھ روپے اپنی طرف سے خدمت

میں نذر کیے۔ آپ نے ان اشرفیوں سے کھانے کا انتظام کیا۔ دوسرے وقت محبت سے میرے کان پکڑ کر کہا: "کہو، کچھ کھانے کی اشتہا باقی ہے؟" میں نے عرض کیا کہ: "ایک ہفتے کا تو سامان ہو گیا ہے اب میں بے فکر ہوں!" فرمایا: "ایک ہفتہ کیا چیز ہے؟ ہمیں رزاقِ مطلق کی رزاقی پر اعتماد ہے کہ اگر سندھ کے ریگستانوں میں یا عرب کے بادیے میں ہوں اور آب و دانہ ناپید ہو اور ہفت اقلیم کے باشندے ہمارے ساتھ ہوں، تو ہم کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے سامان کرے گا۔"(۱)　　۵

رائے بریلی کا یہ قیام مجاہدہ، تربیت اور جسمانی و روحانی مشغولیت و خدمت کا خاص دور تھا۔ سید صاحبؒ بھی عام لوگوں کے ساتھ مشقت کے کاموں میں شریک ہوتے، لکڑیاں چیرتے، بوجھ اٹھاتے۔ یہ زمانہ بڑے روحانی و علمی فیوض و برکات کا زمانہ تھا۔ سید صاحبؒ کا وجود، علماء و مشائخِ ہندوستان کا اجتماع، یکسوئی، یہ سب نعمتیں جمع تھیں، جو کم جمع ہوتی ہیں۔ ایک غیر معروف چھوٹا سا گاؤں کہکشاں بن گیا تھا جس کی زمین پر چاند کے ساتھ سارے روشن ستارے اتر آئے تھے۔ ہندوستان کے منتخب اور نامور علماء و مشائخ، مولانا محمد اسمٰعیل، مولانا عبدالحی، مولانا محمد یوسف پھلتی، حاجی عبدالرحیم ولایتی، شاہ ابوسعید مجددی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ) ایک وقت میں جمع تھے۔　　۱۰　　۱۵

یہ قیام عجیب ذوق و شوق، لذت و حلاوت اور جفاکشی کا تھا اور مہاجرین کے قیامِ مدینۂ منورہ سے بہت مشابہ تھا۔ سید صاحبؒ اور رفقاء، جن میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور صاحبِ سلسلہ مشائخ تھے، بڑے ذوق سے اپنے ہاتھوں سے مشقت کے کام کرتے، لکڑیاں چیرتے، گھاس چھیلتے، اینٹیں تھاپتے، مسجدیں تعمیر کرتے، فاقے اور ہر حال میں خوش رہتے۔ ایک سوز و گداز، ایک محویت و جذب کا عالم تھا۔ کسی کو نہ شکایت تھی، نہ افسوس۔ ان میں اچھے اچھے عالی　　۲۰

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۴۰-۴۲، "وقائعِ احمدی" اور "منظورۃ السعداء" میں اس طرح کے متعدد واقعات درج ہیں۔

خاندان، خوش حال، رئیس، امیر زادے تھے، بہت سے نازک طبع اور ناز پروردہ نوجوان تھے۔ اُن کے گھر میں کسی بات کی کمی نہ تھی۔ بعضوں کے سیکڑوں، ہزاروں معتقد و مُرید تھے، مگر گھر بار، عیش و آرام، مشیخت و مخدومیت چھوڑ کر اس در پر پڑے ہوئے تھے اور ہزار درجے خوش تھے۔

ایک تبلیغی دورہ اسی زمانۂ قیام میں آپ نے ایک تبلیغی دورہ فرمایا[1]۔ یہ دورہ رائے بریلی سے مشرق کی جانب سلون، اہلادگنج، الٰہ آباد، بنارس وغیرہ کی طرف تھا۔

رائے بریلی سے چل کر غالباً پہلی منزل سلون ہوئی[2]۔ سلون میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی ایک مشہور خانقاہ ہے۔ یہاں گیارھویں صدی ہجری میں شاہ پیر محمد صاحب (متوفی ۱۰۹۹ھ) نے جو شاہ عبدالکریم صاحب مانکپوری کے ممتاز خلیفہ اور حضرت شاہ علم اللہ کے معاصر تھے، قیام اختیار کیا۔ اُن کی اولاد میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ سلسلہ بزرگ گزرے ہیں، جن میں شاہ محمد اشرف خاص طور پر نامور اور ممتاز تھے۔ سید صاحب جب سلون تشریف لے گئے، تو شاہ کریم عطا صاحب[3] سجادہ نشین تھے اور

(۱) اس زمانے کے حالات و واقعات اور دورہ و سیر کے سلسلے میں ہم نے "وقائع احمدی" اور "منظورۃ السعداء" کی ترتیب کی پیروی کی ہے۔ دونوں کی ترتیب واقعات حسب ذیل ہے: مراجعتِ وطن از دہلی، تنگیٔ معیشت و فاقہ و دعا، تعمیرِ مساجد، سفرِ اصلاح و تبلیغ (سلون، اہلادگنج، الٰہ آباد، بنارس وغیرہ)، سفرِ لکھنؤ۔ اس کے بعد دونوں میں یہ اختلاف ہوتا ہے کہ "وقائع احمدی" میں سفرِ لکھنؤ کے بعد سفرِ نصیر آباد ہے، اس کے بعد خواب و نکاحِ ثانی کا واقعہ۔ "منظورہ" میں سفرِ لکھنؤ کے بعد خواب و نکاحِ ثانی کا واقعہ ہے، پھر نصیر آباد کا سفر اور محرم کا واقعہ۔

"مخزنِ احمدی" میں واقعات کی ترتیب اس سے بہت مختلف ہے۔ اس کی ترتیب حسبِ ذیل ہے: مراجعت رائے بریلی، تنگی و عسرت و دعا، رؤیائے صادقہ و نکاحِ ثانی، واقعۂ نصیر آباد، دورۂ لکھنؤ، مراجعت، تعمیرِ مساجد نو، دورۂ تبلیغی۔ اس ترتیب میں دورۂ تبلیغی بہت آخر میں سفرِ لکھنؤ کے بھی بعد ہے۔ بہت سے وجوہ و اسباب کی بنا پر "وقائع" اور "منظورہ" کو ترتیبِ واقعات، تعیینِ سنین، واقعہ کی جزئیات و تفصیلات میں "مخزنِ احمدی" پر ترجیح حاصل ہے، خاص طور پر جب دونوں مقدم الذکر کتابیں باہم متفق ہوں تو یقیناً "مخزن" کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہیں۔ البتہ ان تینوں کتابوں میں تعمیرِ مساجد کو حج سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ "وقائع" اور "منظورہ" میں تو دہلی سے واپسی (۱۲۳۳ھ) کے بعد بالکل شروع کے واقعات میں درج کیا گیا ہے، لیکن خود مسجد کی تعمیر کے حسابات کے قدیم کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مسجدیں ۱۲۴۰ھ میں (حج کے بعد) تعمیر ہوئی ہیں۔ اس لیے اس کو ۱۲۴۰ھ کے واقعات میں درج کیا جائے گا۔

(۲) سلون شہر رائے بریلی سے بیس میل پر ایک قدیم قصبہ ہے۔ آج کل ضلع رائے بریلی کی ایک تحصیل ہے۔

(۳) شاہ کریم عطا سجادہ نشینِ سلون شاہ محمد پناہ کے صاحبزادے اور شاہ محمد اشرف کے پوتے، اپنے پردادا شاہ پیر محمد کے سجادے کی زینت تھے۔ ۱۵ ربیع الآخر ۱۱۷۶ھ میں پیدا ہوئے، قراءاتِ سبعہ کے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد سے علم و طریقت میں کسبِ فیض کیا۔ سخاوت و ایثار، تواضع و حُسنِ اخلاق میں اپنے آبائے کرام کی یادگار تھے۔ ۱۲۴۵ھ میں وفات پائی۔

اتفاق سے عُرس کا زمانہ تھا۔[1] اس خاندان میں عُرس کے موقع پر علاوہ دُوسرے رُسوم کے گاگر اُٹھانے کی رسم مدت سے چلی آرہی تھی۔[2] مانکپور اور سلون دونوں جگہ دستور تھا کہ سجادہ نشین گاگر (گھڑا) سر پر اُٹھا کر لاتے اور اُن کی تبعیت میں دُوسرے مُرید و خُدّام بھی کورے گھڑے اُٹھائے ہُوئے چلتے اور قوالی ہوتی۔ سیّد صاحبؒ اور اُن کے رفقا نے یہ تمام رُسوم اور مناظر دیکھے۔ شاہ پیر محمّد صاحبؒ سلونی اور شاہ علم اللہ صاحبؒ کے خاندانوں میں باہم احترام و اعتراف کا مُعاملہ رہا تھا اور دونوں ایک دُوسرے سے خُوب واقف تھے۔ سیّد ۵ صاحبؒ نے شاہ کریم عطا صاحبؒ سے خُود گفتگو فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ "آپ لوگ درویش و ہادیِ دین ہیں آپ کے اقوال و افعال عوام النّاس کے نزدیک حجّت اور دستاویز ہوتے ہیں۔ یہ جو ہر سال آپ عُرس کرتے ہیں اور اُس کے اندر جو منہیاتِ شرعیّہ ہوتے ہیں، از راہِ انصاف فرمایا جائے کہ یہ طریقہ سُنّتِ سنیّہ کے موافق ہے یا مخالف۔ اگر موافق ہے، فہوالمراد، ورنہ اس کو ترک کر دینا چاہیے۔"[3]

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا جواب پھر کسی وقت ملاقات کے موقع پر دیا جائے گا۔ دُوسرے ۱۰ روز آپ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کو آپ کے پاس بھیجا۔ مولانا آپ کے پاس گئے اور اس مسئلے میں گفتگو کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مزید گفتگو دُوسرے موقع پر ہوگی اور سیّد صاحبؒ کو پیغام بھیجا کہ آپ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ سیّد صاحبؒ یہ پیغام پاتے ہی خُود تشریف لے گئے۔ اس گفتگو میں شاہ صاحبؒ نے اعتراف فرمایا کہ ان اعمال و بدعات کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ ان کا درجہ صرف رسوم کا ہے، جو مشائخ کے زمانے سے سلسلہ بہ سلسلہ چلی آرہی ہیں۔ آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے ترک کرنے کی توفیق عطا ۱۵

---

(۱) یہ شاہ محمد اشرف کا عرس تھا، جن کی وفات ۱۱۹۶ھ میں ہُوئی۔ (۲) گاگر کی رسم حضرت شاہ حسام الحق مانکپوریؒ کے شیخ حضرت شاہ نور الحق (نور الدین احمد بن عمر) پنڈوی (م ۸۱۸ھ) کی یادگار ہے۔ روایت ہے کہ ایک بار حضرت شاہ نور الحق محفلِ سماع میں شریک تھے۔ خادم نے اطلاع دی کہ پانی ختم ہوگیا ہے۔ اس وقت آپ پانی کی تلاش میں بذاتِ خود اُٹھے۔ آپ کے ساتھ ساری محفل اُٹھی اور قریب کے تالاب یا دریا سے گاگروں میں پانی بھر کر واپس آئے۔ حضرت شاہ حسام الحق نے اس واقعہ کی یادگار میں یہ رسم جاری کی۔ چنانچہ سلون و مانکپور کی خانقاہوں میں یہ رسم اب تک جاری ہے۔ گاگر اُٹھاتے وقت قوالی ہوتی ہے۔ سلون کی خانقاہ سے چند فرلانگ پر ایک تالاب ہے۔ اس سے پانی بھرا جاتا ہے۔ تعظیماً گاگر کو سر پر رکھتے ہیں، وسط میں سجادہ نشین ہوتے ہیں، جن کے اردگرد معتقدین گاگر اُٹھائے ہُوئے ساتھ ہوتے ہیں۔

(۳) "وقائع"، صفحہ ۲۶۳

فرمائے۔"[1]

سلون میں شاہ صاحبؒ کے اہلِ تعلق میں سے کچھ لوگوں نے بیعت کی اور عرض کیا کہ: "آپ کل بھی یہاں قیام فرمائیں۔" اس قصبے کے اکثر لوگ مولانا عبدالحی صاحبؒ کے وعظ کے مشتاق ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ "کل ہم کو جانا ضرور ہے۔ اگر خیر سے اللہ تعالیٰ ہم کو پھر لائے گا تب مولانا صاحب کا وعظ سن لینا۔ آج کی رات جس کو جو کچھ مسئلہ پوچھنا ہو، مولانا صاحب سے پوچھ کر اپنی تسلی کرلے۔" چنانچہ جس کو جو مسئلہ پوچھنا منظور تھا، اس نے اس رات آکر پوچھ لیا اور مولانا نے اس کی دلجمعی کر دی۔" اسی رات کو وہاں کے اکثر لوگوں نے آکر بیعت کی اور صبح کو آپ نے وہاں سے کوچ فرمایا۔"[2]

سلون سے روانہ ہو کر آپ نے اہلاد گنج[3] میں قیام فرمایا۔ وہاں والیِ لکھنؤ کی طرف سے ایک عامل (حاکم) کاظم بیگ نام تھا۔ اس نے بھی آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اس کے رفقا اور ہمراہیوں نے بھی شرفِ بیعت حاصل کیا۔ دو یا تین روز آپ نے وہاں قیام بھی فرمایا۔

اہلاد گنج سے روانہ ہو کر الٰہ آباد قیام ہوا۔ الٰہ آباد میں بارہ دائرے مشہور تھے۔ "وقائعِ احمدی" میں ہے: "آپ نے لوگوں سے صلاحاً پوچھا کہ کہاں اتریں۔ انھوں نے کہا کہ اب تو کسی سرائے میں اتر جائیں، پھر کوئی مکان تلاش کر لیں گے۔ اس عرصے میں بارھوں دائروں کے پیرزادوں کو حضرت کے قدومِ میمنت لزوم کی خبر معلوم ہوئی۔ انھوں نے اپنے اپنے دائروں میں اتارنے کا ارادہ کیا۔ آخرالامر ایک بزرگ شاہ رحمٰن نام ان پیرزادوں میں سرگروہ تھے۔ انھوں نے حضرت کو مع تمام رفقا کے اپنے دائرے میں اتارا۔"[4] "منظورہ" میں ہے کہ آپ نے دائرہ شاہ اجمل میں قیام فرمایا۔[5]

---

(۱) "وقائع" صفحہ ۲۶۵ (۲) "وقائع" صفحہ ۲۶۶ (۳) اہلاد گنج پرتاب گڈھ سے جانب جنوب مغرب تقریباً ۳۲ میل کو واقع ہے۔ (۴) "وقائع" صفحہ ۲۶۶ (۵) شاہ اجمل الٰہ آبادی تیرھویں صدی میں شمالی مغربی ہند کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ شاہ محمد طاہر کے صاحبزادے اور مشہور محدث صوفی مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کے بھتیجے۔ ۱۲ شوال ۱۱۶۰ھ میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی کتابیں مولانا محمد فصیح جونپوری سے، منطق مولانا محمد اسلم سے، نیز قاضی مستعد خاں اور شاہ یسین سے علومِ آلیہ کی تعلیم حاصل کی۔ حدیث اپنے عمِ نامدار کے شاگرد مفتی محمد ناصح مفتیِ لشکر سے پڑھی۔ طریقت کی تعلیم اپنے چچا زاد بھائی شاہ قطب الدین ناخر سے حاصل کی اور ان کے سفرِ حرمین کے بعد اپنے آبائی سجادے کو رونق بخشی۔ حسنِ اخلاق، تواضع و انکسار اور علمیت و درویشی میں شہرۂ آفاق تھے۔ یکم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ میں انتقال کیا (نزہۃ الخواطر ج ۷)۔

الٰہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب، جو راجہ اودت نرائن کے عامل تھے، ملاقات کو آئے اور شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے بیعت ہوتے ہی منہیاتِ شرعیہ سے توبہ کی اور تمام ممنوعات، سونے چاندی کے ظروف اور آلاتِ لہو و لعب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور ان آلاتِ لہو و لعب کو دریا میں پھنکوا دیا اور ان کے بیچنے کو بھی پسند نہ کیا۔ سید صاحبؒ کا ایسا معتقدِ صادق، مخلص بے ریا اور محبّ با وفا دیکھنے میں نہیں آیا۔[1]

شیخ صاحب کے علاوہ صدہا شرفا اور غربا نے بیعت کی اور شرک و بدعات سے تائب ہوئے یہ حال دیکھ کر ایک شیعہ رئیس دھومن خاں نے دو آدمی آپ کی خدمت میں بھیجے کہ وہ آپ سے گفتگو کریں۔ خیال یہ تھا کہ اگر بات بڑھی اور جھگڑے کی صورت پیدا ہوئی تو الزام قائم کر کے حکومت کے ذریعے شہر سے اخراج کا حکم حاصل کر لیا جائے گا۔ یہ دونوں آدمی سید صاحبؒ سے بیعت ہو گئے۔[2] شاہ اجمل صاحب نے سید صاحبؒ کے آبائے کرام کے فضائل و کمالات بیان کیے اور فرمایا کہ "بزرگوں کی اولاد بزرگ ہی ہوتی ہے"۔ سید صاحبؒ نے الٰہ آباد میں زیادہ قیام مناسب نہیں سمجھا کہ "مبادا ہمارے رہنے سے مفسد لوگ کچھ شہر میں بلوہ کر بیٹھیں"[3] اور بنارس کی طرف کوچ فرمایا۔

"وقائعِ احمدی" میں ہے: "جاڑے کا موسم تھا۔ قطرہ افشانی ہو رہی تھی۔ جب شہر بنارس کچھ دور رہا، تب حضرت نے فرمایا: "اس شہر میں تاریکی بہت معلوم ہوتی ہے"۔ لوگوں نے کہا: "کس چیز کی تاریکی ہے؟" آپ نے فرمایا: "کفر و شرک کی تاریکی!"[4]

بنارس میں گندی گدن کے محلے میں بھسر کی مسجد کے قریب ایک بادشاہی مسجد مدتوں سے ویران پڑی تھی۔ بہت کوڑا اور گوبر جمع تھا۔ آپ نے اس کو صاف کروایا اور خوب دھلوایا اور اسی میں اترے۔[5] اس محلے کے چند مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس شہر میں ایک گشائیں بڑا نامی تھا اور اس کے بہت سے چیلے بھی تھے۔ وہ تمام ہندوؤں کا گرو تھا۔ حضرت کے وہاں اترنے سے اس کے ذکر و فکر اور دھیان گیان میں خلل واقع ہوا۔ اس نے

---

(۱) "وقائع"　(۲) "وقائع" صفحہ ۲۶۷-۲۶۸　(۳) "وقائع" صفحہ ۲۶۸　(۴) "وقائع" صفحہ ۲۶۸　(۵) "وقائع" صفحہ ۲۶۹

اس بات کا تذکرہ اپنے چیلوں سے کیا اور کہا کہ: "اس شہر میں کئی روز سے ایک سید اُترے ہیں۔ اُن کی نسبت کے پرتو سے ہمارا کاروبار درہم برہم ہو گیا۔"(۱) حضرت نے بھی اپنے لوگوں سے فرمایا کہ: "اس شہر میں ہمارے آنے کے سبب گسائیوں کے سحر اور استدراج کے کاروبار معطل اور بیکار ہو گئے"(۲)

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کئی روز اس مسجد میں وعظ فرمایا۔ بہت سے شہر کے مسلمان خصوصًا اس محلے کے مسلمان گندی گر اور دھوبی وعظ سننے کو آئے۔ ان مسلمانوں کے وہاں ایک پیر تھے۔ اُنھوں نے سید صاحبؒ کے آنے اور لوگوں کے رجوع ہونے کا حال سُنا، تو ایک رنگین رومال اور کچھ مٹھائی کے لانے والے اپنے خادم کے ہاتھ سید صاحبؒ کو بھیجی۔ اس خادم نے سید صاحبؒ سے آکر کہا کہ: "ہمارے فلانے پیر و مرشد نے یہ تبرک آپ کو بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ: یہ جو آپ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں، مفید نہ ہوگا۔ یہ تمام لوگ ہمارے مرید ہیں اور یہاں کا دستور آپ کو معلوم نہیں۔ اگر آپ کچھ فتوحات حاصل کرنے کو آئے ہیں، تو ہم سے آکر ملاقات کریں۔ پھر جو ہم اس کی تدابیر بتائیں، وہ آپ عمل میں لائیں۔ تب تو کچھ حاصل ہوگا، ورنہ آپ مختار ہیں۔"

یہ سن کر مولوی وحید الدین صاحب نے سید صاحبؒ سے اجازت لی کہ وہ پیر صاحب کے پاس جائیں۔ سید صاحبؒ نے اجازت دے دی۔ مولوی وحید الدین صاحب سادہ غریبوں کا لباس پہن کر اور کئی آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر اُن کے مکان پر گئے اور اُن سے ملاقات کی۔ اُنھوں نے پوچھا: "آپ ہی اس شہر میں تشریف لائے ہیں اور لوگوں سے بیعت لیتے ہیں؟" مولوی صاحب نے کہا کہ: "وہ ہمارے پیر و مرشد ہیں۔ ہم تو اُن کے ادنیٰ مریدوں میں ہیں۔ لوگوں سے آپ کے اخلاقِ حمیدہ سن کر آپ کی ملاقات کو آئے ہیں۔" مولوی وحید الدین کا کمالِ باطنی دیکھ کر اور اُن کی باتیں سن کر پیر صاحب کو سید صاحبؒ کی ملاقات کا اشتیاق ہوا اور اگلے روز صبح وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لائے۔ سید صاحبؒ نے اُن کو بہت عزت و احترام سے بٹھایا اور عافیت مزاج پوچھی۔ اُنھوں نے کہا: "آپ کو اور آپ کے آدمیوں کو دیکھا اور اُن کی گفتگو سنی، تو سمجھے کہ یہ لوگ تو اور ہی

---

(۱) "وقائع"، صفحہ ۲۶۹ (۲) ایضًا

قسم کے ہیں۔" انھوں نے سید صاحبؒ سے کہا کہ "حضرت سلامت، ہماری تو وجہِ معاش یہ ہے کہ تمام مریدوں کے یہاں ششماہی مقرر ہے۔ کوئی ایک روپیہ، کوئی دو روپیہ، کوئی کم زیادہ دیتا ہے اور یہ لوگ پیشہ ور ہیں۔ ان سے پنجوقتی نماز کہاں ہو سکتی ہے؟ اسی کی معافی میں یہ ہم کو چھٹے مہینے مقدور کے موافق کچھ زرِ نقد نذر کرتے ہیں۔ مگر رمضان کے روزوں کی ہم اِن کو بہت تاکید کرتے ہیں۔ اس میں جو کوئی عذر کرتا ہے کہ "ہم حقہ پیتے ہیں یا کوئی نشہ کھاتے ہیں، ہم سے روزہ نہیں رہا جاتا"، تو ہم اُن سے اُس ششماہی کے سوا کچھ اور نقدی یا دو چار دعوتیں وغیرہ ٹھیرا کر کے اُن کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی گزران کی صورت ہے۔ اگر آپ کو کچھ فتوحات منظور ہو، تو اس کی یہ راہ ہے، جو ہم نے بیان کی اور آگے آپ کو اختیار ہے!"

سید صاحبؒ نے یہ تمام داستان سُن کر فرمایا کہ: "جو کچھ آپ فرماتے ہیں، فی الحقیقت اس وقت کے پیروں کا یہی دستور ہے اور اسی آمدنی پر اُن کی گزران ہے، مگر یہ طور قرآن و حدیث کے مخالف ہے۔ آپ بھی بغور اس کو دریافت کریں اور ہم مسلمانوں کا طریق تو خدا اور رسُول کے فرمانے کے موافق ہونا چاہیے۔ جو قرآن و حدیث کے موافق ہو، اس کو ہم بھی عمل میں لاویں اور آپ بھی، اور جو کچھ خدا و رسُول کا طریق آپ کو معلُوم ہو، وہ آپ ہم کو تعلیم فرماویں، ہم سیکھیں اور جو ہم کو آتا ہے، وہ ہم آپ کو بتاویں، وہ آپ مانیں۔ ہمارا تو صرف مقصد یہ ہے اور روزی اور رزق تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

اُنھوں نے کہا: "بیشک یہی حق ہے، جو آپ نے فرمایا۔ اس عرصے میں اُنھوں نے سید صاحبؒ کی جماعت کے لوگوں کے باطنی کمالات اور رُوحانی ترقیات دیکھیں۔ اس سے اُن کو بڑی حیرت ہُوئی اور اُنھوں نے کہا کہ ان میں سے گویا ہر ایک صاحبِ کمال ہے۔ پھر اُنھوں نے سید صاحبؒ سے رُخصت چاہی کہ پھر میں کسی وقت آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مکان کو گئے اور رات ہی کو اس شہر سے مع اہل و عیال کہیں کو چلے گئے اور کسی مُرید سے مِل کر بھی نہیں گئے۔ مریدوں کو اس قصے کی اطلاع ہُوئی، تو وہ سب اُن سے بے اعتقاد ہو گئے اور سب نے سید صاحبؒ سے بیعت کی اور کہا کہ: "ہم تو آج تک اسی کو دینِ اسلام اور خدا کی راہ

جانتے تھے، جس پر وہ ہم کو چلاتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم لوگ غلطی پر تھے، دینِ حق اور خدا کا طریق یہ ہے، جو آپ تعلیم فرماتے ہیں۔ اب ہم نے ان سب اگلی باتوں سے توبہ کی۔"[1]

نور بافوں نے خصوصیت کے ساتھ بیعت کی۔ مرزا کریم اللہ بیگ رئیسِ شہر اور شاہ عبداللہ، جن کا لباس شنگرفی ہوا کرتا تھا، جو میاں صابر بخش دہلوی سے بیعت تھے، ارادت و بیعت ۵ میں داخل ہوئے۔ اہلِ شہر نے مولانا عبدالحی صاحبؒ سے مسائل دریافت کر کے بہت فائدہ اٹھایا اور ہدایت پائی۔[2]

بنارس سے کوچ فرما کر آپ نواحِ سلطانپور وغیرہ میں رونق افروز ہوئے۔ غلام حسین خاں کے لشکر میں، جو حاکمِ لکھنؤ کی طرف سے وہاں کا ناظم تھا، دو ہفتے کے قریب رہے اور بہت لوگوں کو ہدایت ہوئی۔[3]

۱۰ مولوی سید محمد علی صاحبِ "مخزن"، جو اس سفر میں غالباً ساتھ تھے، بعض تفصیلات و واقعات کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قصبۂ گنتی، مہردرہ، اہلادن گنج اور شہر الٰہ آباد وغیرہ اور اطراف و نواح سے متعدد دعوت نامے اور تشریف آوری کے پیام آئے۔ چنانچہ آپ ایک سو ستر کے قافلے کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ چونکہ ایک روز پہلے سے لوگوں کو اس سفر کا علم تھا، آپ ایک میل بھی طے نہیں کرنے پائے تھے کہ چپ و راست سے معتقدین و مخلصین کا مجمعِ کثیر اکٹھا ہو ۱۵ گیا اور لوگ اپنے قصبات و مواضعات میں، جو راستے سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھے، تشریف لے چلنے کے لیے منت سماجت کرنے لگے۔ آپ اُن کی خاطر تشریف لے گئے اور اُن کے متعلقین نے بیعت کی سعادت حاصل کی۔ اُنھوں نے دعوت قبول کرنے کے لیے بھی درخواست کی اور ایک دو شب اصرار کر کے ٹھیرایا۔ قصہ کوتاہ رائے بریلی سے الٰہ آباد پہنچنے میں جو دو چار منزل سے زائد نہیں ہے، ایک مہینے سے اُوپر کی مدت صرف ہو گئی۔

۲۰ اسی سفر میں ایک روز مغرب و عشا کے درمیان ایک ایسے گاؤں میں پڑاؤ ہوا، جو

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۲۷۶ - ۲۸۲ باختصار (۲) "منظورہ" (۳) "وقائع" و "منظورہ"

ویران و بے چراغ تھا۔ بڑی تلاش و جستجو سے بعض کاشتکاروں کے یہاں سے دو من دال چاول ملے۔ دیگ وغیرہ وہاں کیا ملتی، کسی کسگر کے یہاں بمشکل دس بارہ پیالے مل سکے۔ مجبوراً انھیں میں کھچڑی پکی قابیں اور پلیٹیں کہاں ملتیں؟ ایک کنوئیں کی گچ کو دھو اور صاف کر کے اسی پر کھچڑی انڈیل لی گئی اور آپ نے اور قافلے نے خدا کا شکر کر کے کھالیا۔"[1]

دس پندرہ روز الٰہ آباد میں قیام رہا۔ فقرا و امرا میں سے ایک خلقت نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران میں بنارس سے بہت سے خطوط اور درخواستیں تشریف آوری کے لیے آئیں۔ آپ نے بنارس کا عزم فرمایا اور مسجدِ بسہسر میں قیام فرمایا۔ ایک مہینہ بنارس میں قیام رہا۔ تقریباً دس پندرہ ہزار مرد عورت نے بیعت کی۔ اس زمانۂ قیام میں آپ تمام رُفقا کو ذکرِ سرّی و جہری کی برابر تاکید فرماتے رہتے کہ یہ شہر کفر و شرک کی ظُلمت سے بھرا ہُوا ہے۔ اس کو اپنے ذکر کے انوار سے منوّر کر دو۔ ایک ہفتہ نہیں گزرا ہو گا کہ بہت سے گرو اور جوگی حاضرِ خدمت ہُوئے اور عرض کیا کہ آپ جلد اس شہر سے تشریف لے جائیں، کیونکہ ہمارے دھیان گیان میں بڑا فتور اور خلل واقع ہو رہا ہے۔ آپ نے بڑی نرمی اور ملائمت سے اُن کو نصیحت فرمائی اور اُن کو دعوتِ اسلام دی، لیکن انھوں نے اس کا اثر نہیں لیا۔

بنارس سے روانہ ہو کر سلطانپور اور دسولی وغیرہ میں غلام حسین خاں کے لشکر میں، جو والیِ لکھنؤ کی طرف سے اس علاقے کا ناظم تھا، قیام فرمایا۔ اکثر سپاہ پیشہ لوگوں اور محرّروں نے، جو قدیم زمانے سے معتقد تھے، بیعت کی اور آپ نے دو ہفتے اس لشکر میں قیام فرمایا۔ وہاں سے آپ رائے بریلی اپنے وطن واپس تشریف لائے۔[2]

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۵۶		(۲) "مخزن"، صفحہ ۵۷

ساتواں باب

سفرِ لکھنؤ

لکھنؤ کا سفر ایک سو ستر آدمیوں کے قافلے کے ساتھ آپ نے لکھنؤ کا سفر فرمایا۔ یہ لکھنؤ کا پہلا سفر تھا، جو آپ نے اِصلاح و تبلیغ کی نیّت سے فرمایا۔(۱)

لکھنؤ کا نوابی عہد یہ نواب غازی الدّین حیدر (سنِ جلوس ۱۲۲۹ھ) کی بادشاہی اور معتمد الدولہ آغا میر کی وزارت کا آغاز تھا۔ لکھنؤ میں دولت ستانی، بدنظمی، حق تلفی اور تعیّش کا دَور دَورہ تھا۔

غازی الدّین حیدر نے قسم کھائی تھی کہ وُہ مُسکرات کے قریب نہیں جائیں گے۔ چند روز ہوش گوش سے کام کرتے رہے۔ آغا میر کو جو بڑے جوڑ توڑ سے منصبِ معتمدی پر فائز ہُوے تھے، یہ کیوں کر گوارا ہوسکتا تھا؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ "پیر و مُرشد نے حضرت عبّاس کی قسم کھائی ہے اور غلام بنی فاطمہ ہے۔ اس کا مظلمہ غلام کے ذِمّے ہے ؏

تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

پھر تو ایسے بدمست ہُوے کہ جس بدنصیب کو نوّاب نے داخلِ اموات کردیا، اس کو اگر بادشاہ نے کہیں راہ میں دیکھ کر پہچانا اور نواب سے کہا کہ یہ تو جیتا ہے، عرض کرتے کہ "اس کو غلام چشمِ بشری سے نہیں دیکھ سکتا۔ پیر و مُرشد کی چشمِ مبارک البتّہ عالمِ ارواح کو دیکھ سکتی ہے۔" حاضرین بھی نواب کے خَوف سے یہی عرض کرتے۔ ہر شخص کی عافیت تنگ تھی۔ جعل فریب کا بازار گرم تھا۔ ملازمین و

(۱) "وقائعِ احمدی" اور "منظورۃ السّعدا" دونوں کی ترتیب میں لکھنؤ کا سفر تبلیغی دَورے کے بعد ہی متّصل پیش آیا۔ "وقائع" میں یہاں تک تصریح ہے کہ "جب سفرِ بنارس سے حضرت امیر المومنین رحمۃ اللہ علیہ مع الخیر تکیے پر تشریف لائے، پھر بعد چند روز کے ارادہ سفرِ لکھنؤ کا کیا۔" وقائع، صفحہ ۲۸۳

متوسلین کی تنخواہیں کئی کئی سال کی چڑھی ہوئی، جس طرح بن پڑتا، وہ لوٹ مار کر کے پیٹ پالتے تھے۔ سوداگروں سے مال و اسباب خرید کیا جاتا تھا اور برسوں قیمت نہیں ملتی تھی۔ ریذیڈنٹ تک کوئی پہنچ گیا، تو قیمت ملی ورنہ جان کی بھی خیر نہیں۔ اپنے لیے محلسرائیں بنوائیں، تو سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہو گئی۔ ایک کروڑ سے کم عمارتوں پر خرچ نہیں ہوا۔"(۱)

معتمد الدولہ کی نیابت اور وزارت کے زمانے میں ایک کوڑی خزانے میں داخل نہیں ہوئی۔ ملک کی تمام آمدنی معتمد الدولہ کی فرمائشوں میں آتی تھی۔ عاملوں کی طرف سے خزانۂ شاہی میں روپے کی ارسال آنا بند ہو گئی۔ عامل سے لے کر ایک ادنیٰ محرر تک کسی کو اس بات کی پروا نہ تھی کہ کوئی شخص ہمارا گریباں گیر ہوگا۔ سب علاقوں کی آمدنی کے گلچھرے اڑانے میں مصروف تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں گیہوں ایک روپیہ کے بیس سیر سے کم نہیں بکے اور اس عہدِ دولت میں ابتدائے جلوس سے آخر تک آٹھ دس سیر سے زیادہ فروخت نہیں ہوئے۔(۲) شہر میں جعل، فریب، جوڑ بندی کی کثرت اور کھلم کھلا نفاق کی صورت تھی۔ ہر چھوٹی سرکاروں میں بھی یہ صورت ہونے لگی۔ بادشاہ کے بھائیوں کی جب کئی برس تک تنخواہ نہ ملی، بعض نے مفلسی کی مجبوری سے جلاوطنی اختیار کیا۔ نواب کے بعض بھائیوں نے مظلومانِ شہر پر ظلم و تعدی پر کمر باندھی تھی۔ جس کا چاہا، مال لے لیا۔"(۳)

عیش و عشرت، لہو و لعب اور ہنسی مذاق کا تمام گلزار لکھنؤ میں بہار پر تھا۔ اہلِ لکھنؤ کی طبیعتیں عوام سے لے کر خواص تک عیش پر مائل تھیں۔ سید انشا (م ۱۲۳۳ھ) کی "دریائے لطافت" کی تالیف میں مرزا قتیل بھی شریک ہیں۔ اس کے مطالعے سے اس زمانے کے ادب کی بے ادبی، پست مذاقی، ادبی نسوانیت اور دماغی شہوانیت کا پورا پتہ چلتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے روزمرہ اور بیگمات کی زبان، حتیٰ کہ قواعد صرف و نحو، منطق اور بیان و بدیع اور علم عروض کی تشریح کے لیے جو مثالیں اور عبارتیں پیش کی

(۱) حاشیہ "گل رعنا" تذکرۂ شیخ امام بخش ناسخ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "قیصر التواریخ" جلد اول از سید کمال الدین حیدر مشہدی معروف بہ سید محمد میر زا، صفحہ ۲۴۶ - ۲۵۷ (۲) "تاریخ اودھ" از مولوی نجم الغنی رامپوری صفحہ ۱۶۲، ج ۴ (۳) "قیصر التواریخ" صفحہ ۲۵۰ جلد اول

گئی ہیں، ان سے اس زمانے کے اخلاقی انحطاط اور بے اعتدالیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے[1]۔ سعادت یار خاں رنگین کے حوالے سے بیگمات کی زبان کے جو نمونے اور محاورات و اصطلاحات نقل کیے گئے ہیں ان سے اس وقت کی معاشرت کی پستی اور اخلاقی آلودگی کی تصویر سامنے آجاتی ہے[2]۔ فنِ عروض کی اصطلاحات کا ترجمہ بھی اسی زبان میں کیا گیا ہے۔ "زحاف" کا نام "سنگار" رکھا ہے، "رکنِ سالم" کا "صاحبِ طائفہ"، "رقاص" "دوگانگی"، "فرع" کا "نوچہ"، "صاحبِ طائفہ" یا "کنیزانِ خانگی" نام مقرر کیا ہے۔ "مَفاعیلُن" کو ہمیشہ "پری خانم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سلطنت کا مرکز ہونے کی وجہ سے لکھنؤ اودھ کے شرفا، اہلِ حرفہ اور ملازمت پیشہ لوگوں کا مرجع اور امیدواروں کا قبلۂ حاجات ہو رہا تھا۔ قصبات کے صدہا شرفا اودھ کی سرکار کے متوسل اور صدہا امیدوار قسمت آزمائی کے لیے پڑے ہوئے تھے، جو لکھنؤ کے اثرات سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ قصبات اور شریف خاندانوں کا جوہر بھی لکھنؤ آرہا تھا۔ انسانوں کے اس ذخیرے میں صدہا کام کے موتی تھے، جو گویا ایک نظرِ کیمیا اثر کے منتظر تھے۔ مولوی امام الدین لکھنوی، شاہ یقین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبدالوہاب، امان اللہ خاں اور سبحان اللہ خاں، غلام حیدر خاں، مرزا ہمایوں بیگ وغیرہ یہیں سے ہاتھ آئے، جو بعد میں عجیب و غریب سیرت و اخلاق کے انسان ثابت ہوئے۔ ان اخلاقی کمزوریوں کے باوجود، جو پرعشرت زندگی اور ایرانی تہذیب کا نتیجہ تھیں، اہلِ لکھنؤ میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ اثر پذیری کی صلاحیت تھی، دین کی عظمت و وقعت تھی، شرافت اور عالی حوصلگی تھی، جوانمردی اور سپہ گری تھی اور قدیم مشرقی سیرت و اخلاق کی بہت سی ایسی خصوصیات پائی جاتی تھیں، جو اس دور میں مفقود ہیں۔

لکھنؤ کے لیے سید صاحبؒ اجنبی اور نامانوس نہیں تھے۔ آپ کے خاندان کی عالی نسبی، آپ کے بزرگوں کا تقدس و تقویٰ، استقامت اور اتباعِ شریعت دور دور مشہور اور ہر جگہ مسلّم تھا اور ہر جگہ ان کا عقیدت و عزت کے ساتھ نام لیا جاتا تھا۔ شاہ علم اللہؒ کے زہد و ورع اور بدعات سے نفرت اور

(۱) ملاحظہ ہو "دریائے لطافت" صفحہ ۴۸، ۵۰، ۵۴، ۵۵، ۵۷ (۲) "دریائے لطافت" صفحہ ۱۶۰، ۱۶۲۔

شریعت پر استقامت کے قصے ابھی لوگوں کو یاد تھے اور اُن کے پوتے حضرت شاہ لعل صاحبؒ کو تو ابھی کُچھ زیادہ زمانہ نہیں ہُوا تھا۔ اودھ کے بہت سے قصبات میں اور خُود لکھنؤ میں بہت سے لوگ اُن سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ فرنگی محل کے مولانا انوار الحق صاحب (ملک العلما مولانا عبد العلی بحر العلُوم کے داماد) اُن سے بیعت تھے اور اسی سلسلے میں ملک العلما مولانا عبد العلی بحر العلوم بوہار جاتے ہُوئے شاہ لعل صاحب کی خانقاہ میں ٹھیرتے ہُوئے گئے تھے۔ ۵

قندھاریوں کی چھاونی میں اور دُوسرے رسالے داروں کی چھاونی میں بہُت سے لوگ پہلے سے آپ کے خاندان کے بزرگوں کے مُرید اور آپ کے خاندانی مُعتقد تھے۔ عبد الباقی خاں قندھاری اور فقیر محمد خاں (۱) بہادر ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ کو روانگی آپ رائے بریلی سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہُوئے۔ آپ کی سواری میں یکہ تھا۔ اس پر آپ اور سید محمد صاحب سوار تھے۔ سید عبد الرحمٰن گھوڑے پر تھے۔ اس روز تکیے سے چل کر حسن گنج میں ۱۰ رہے۔ دُوسرے روز شب کو بعد نمازِ عشا سید عبد الرحمٰن سے فرمایا کہ "کچھ رات رہتے تم آگے چل کر قندھاریوں کی چھاونی میں اپنے مکان کو صاف کروا کر فرش بچھوا رکھو اور بھنے ہُوئے چنے اور نمک مرچ پِسا ہُوا اور کچھ گُڑ بھی تیار رکھنا۔ ہم فجر کی نماز پڑھ کر یہاں سے سوار ہوں گے۔"

(۱) فقیر محمد خاں، جن کا نام لکھنؤ کے سفر کے حالات میں بار بار آئے گا، بخشی محمود خاں آفریدی کے خاندان سے تھے، جو نواب قائم خاں بنگش والیٔ فرخ آباد کے معتمد اور مدار المہام تھے اور نواب صاحب موصُوف کے ساتھ سنہ ۱۱۶۲ھ میں حافظ رحمت خاں کے مقابلے میں مقتول ہُوئے۔

فقیر محمد خاں نواب میر خاں کے لشکر سے سید صاحبؒ سے ارادت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے اور فقیر محمد خاں نے نواب صاحب مُمدوح کے لشکر میں ساتھ زمانہ گزارا تھا۔ جب وہ کارخانہ درہم برہم ہُوا، تو فقیر محمد خاں لکھنؤ آ گئے۔ معتمد الدولہ نے تین سو روپیے کی اسامی میر علی پناہ بنارسی کی دے کر رسالدار کیا۔ جب غازی الدین حیدر بادشاہ ہُوئے اور میر نذر علی داماد معتمد الدولہ کو جرنیلی کا عہدہ ہُوا، تو فقیر محمد خاں نیابت پر مقرر ہوئے۔ سید صاحبؒ کی لکھنؤ سے واپسی پر فقیر محمد خاں کو معتمد الدولہ کے یہاں سے خلعت ہُوا، دس ہزار روپے نقد ملے اور ہاتھی، پالکی، شملہ، مندیل، دو شالہ، سپر، تلوار اور اس کے علاوہ بہت سامان، علاوہ ہزار روپے مشاہرہ ہُوا اور پندرہ سو سوار اور دو ہزار پیادے رکھنے کا حکم اور محمدی کا پرگنہ علاقہ ہُوا۔ فقیر محمد خاں شجاع اور دلیر آدمی تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ گویا تخلص تھا۔ صاحب دیوان ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ سے مشورہ تھا۔ (۲) سید محمد صاحب سید صاحبؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی آپ کے ماموں سید ابو اللیث بن شاہ ابو سعید کے فرزند تھے۔

سیّد عبد الرحمٰن کچھ لات لیے سوار ہوئے۔ سیّد صاحبؒ نمازِ فجر کے بعد روانہ ہوئے اور پہر دن چڑھے سیّد عبد الرحمٰن کے مکان پر پہنچے۔ سب سامان تیار تھا۔ انھوں نے گڑ اور چنے حاضر کیے سب نے تھوڑے تھوڑے چابے اور کچھ دیر سو رہے۔ ظہر کے وقت سب نے وضو کر کے نماز پڑھی۔[1]

پہلے ملاقاتی اس عرصے میں عبد الباقی خاں قندھاری ملاقات کے لیے آئے۔ پھر تمام چھاؤنی کے لوگ آنے لگے۔ عصر کے وقت محمد حسن خاں اور خلیل اللّٰہ خاں (عبد الرحمٰن خاں قندھاری کے بیٹے)[2] اور مصطفےٰ خاں محمد حسن خاں کے بیٹے اور عبد الرحیم اور عبد المعبود خاں، یہ سب حضرت ملنے کو آئے۔ اور ہر ایک نے کچھ کچھ اشرفیاں نذر دیں اور کھانا عبد الباقی خاں کے یہاں سے آیا۔

دوسرے وقت مرزا اسد علی بیگ کمیدان اور مرزا اشرف بیگ رسالدار کے بیٹے چند لوگوں کے ساتھ آپ کی ملاقات کو آئے اور عرض کی کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ انشاء اللّٰہ، کل شہر میں چلیں گے۔[3]

لکھنؤ میں آپ کی قیام گاہ مرزا صاحب ممدوح بہت خوش ہوئے۔ آپ سے رخصت ہو کر اپنے مکان کو گئے۔ اکبری دروازے کے ایک سیّد، میر مسکین مشہور تھے۔ ان کی حویلی خالی کروائی۔ پھر اگلی صبح کو آ کر سیّد صاحبؒ کو اور تمام ہمراہیوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس حویلی میں اُتارا۔

پہلے روز ملک العلما مولانا عبد العلی بحر العلوم کے صاحبزادے مولوی عبد الرّب[4] صاحب نے دعوت

(۱) "مخازنِ" صفحہ ۲۸۵-۲۸۶ (۲) "تاریخ اودھ" سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل اللّٰہ خاں عبد الرحمٰن خاں کے پوتے اور خان مصطفےٰ خاں عبد الرحمٰن خاں کے نواسے تھے۔ عبد الرحمٰن خاں یوسف خاں قندھاری کے بیٹے تھے، جو شجاع الدولہ کے عہد میں رسالے دار تھے۔ نواب شجاع الدولہ اُن کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ باپ کے بعد عبد الرحمٰن خاں قائم مقام ہوئے۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ دونوں بڑی خاطر کرتے تھے۔ جب انھوں نے مرہٹوں کی لڑائی میں کارِ نمایاں کیے تو رسالے نے ترقی پائی اور عبد الرحمٰن خاں سولہ سترہ سو سواروں کے رسالے دار ہو گئے۔ عبد الرحمٰن خاں عالی ہمتی اور وفاداری میں بے نظیر تھے۔

(۳) "مخازن" صفحہ ۲۸۶-۲۸۷ (۴) مولانا عبد الرب ملک العلما مولانا عبد العلی بحر العلوم کے صاحبزادے تھے۔ والدِ نامدار سے درسی کتابیں ختم کیں اور عرصے تک لکھنؤ میں درس دیا۔ دو بار مدراس کا سفر کیا۔ نواب عظیم الدولہ نے سلطان العلما کا خطاب دیا اور اُن کے والد کا مدرسہ لائق بیٹے کے سپرد کیا۔ مولانا عبد الرب مدراس اپنے بھتیجے مولوی عبد الواجد بن مولوی عبد الاعلیٰ صاحب کے سپرد کر کے لکھنؤ واپس آ گئے۔ دہلی میں شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی ملاقات و ضیافت سے محظوظ ہوئے۔ ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی۔

(نزہتہ ج ۷)

کی۔ قیام گاہ کے قریب جو مسجد تھی، اس میں سب آدمیوں کی گنجائش نہ تھی۔ آپ نے مرزا اسد علی بیگ سے فرمایا کہ "یہاں جماعت کو تکلیف ہے، قیام کے لیے کوئی دوسری جگہ تجویز کرنی چاہیے، جہاں پڑھی وسیع مسجد ہو۔" مرزا صاحب شیخ امام بخش سوداگر کے پاس گئے۔ سوداگر صاحب نے دریائے گومتی کے کنارے ٹیلے والی عالمگیری مسجد (شاہ پیر محمد صاحبؒ کی مسجد) کے قریب ایک نفیس حویلی تعمیر کی تھی۔ اس حویلی میں قافلے کا قیام ہوا۔ اس روز سے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کی مسجد میں نماز فراغت سے ہونے لگی۔ (۱)

شہر میں شہرت اور مقبولیت دوسرے سہ شنبہ کو نمازِ ظہر کے بعد مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کچھ تھوڑی دیر وعظ فرمایا۔ شہر کے چند آدمی موجود تھے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے اور شہر میں اپنے احباب سے تذکرہ کیا کہ آج تھوڑی دیر وعظ ہوا، یقین ہے کہ جمعے کے روز خوب وعظ ہوگا۔

سید صاحبؒ کے لکھنؤ تشریف لاتے ہی لوگوں کا رجوع اور ہجوم شروع ہو گیا تھا۔ شیخ امام بخش سوداگر کی کوٹھی میں بیعت کے لیے صبح سے پہر رات گئے تک لوگ جمع رہتے تھے۔ آپ کو اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ کوئی گھڑی، دو گھڑی تنہا بیٹھ کر اپنا حال عرض کرے۔

چوتھے روز جمعے کے دن لوگ نماز پڑھنے اور وعظ سننے کے لیے بکثرت آئے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے سورۂ انبیا کا وعظ شروع کیا، یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا۔ حاضرینِ مجلس، کیا عامی، کیا عالم، سب فریفتہ ہو گئے اور کہتے تھے کہ ہم نے اپنی تمام عمر میں اس خوش تقریری کا وعظ نہیں سنا۔ اہلِ سنّت اور شیعہ علما سب مولانا ممدوحؒ کے علم و فضل، تبحر اور ذہانت کے معترف تھے۔ ہزاروں شخصوں نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

سہ شنبہ کو پھر مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کچھ دیر وعظ فرمایا۔ اہلِ شہر بہت معتقد اور متاثر ہوئے (۲)

مزید قیام آپ کا جلد واپسی کا قصد تھا، لیکن لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کے تشریف لانے سے نو دس ہزار آدمی راہِ راست پر آ گئے ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ کو بھی اس کا صدمہ تھا کہ اتنے بڑے شہر لو

---

(۱) "وقائع" صفحہ ۲۸۷ - ۲۸۹　(۲) "وقائع" صفحہ ۲۸۹ - ۲۹۰

مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی میں جو تغیر و اصلاح ہونی چاہیے تھی، اس کی نسبت سے ابھی کچھ نہیں ہوا لیکن شہر بہت بڑا ہے، زیادہ قیام سے توقع ہے کہ لاکھوں آدمی ہدایت پائیں۔ آپ نے یہ سُن کر مولانا عبدالحی صاحبؒ سے فرمایا کہ: "مولانا، کمر کس لیجیے۔ آپ کو محنت بہت کرنی ہوگی، نہ دن کو چین ملے گا، نہ رات کو۔ آج سے کئی دن جُمعے کے باقی ہیں۔ اگر خدا نے چاہا، تو دیکھیے گا کہ لوگوں کو کیسی ہدایت ۵ ہوتی ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ روز بروز وُہ ہدایت بڑھتی جائے گی۔ اب ہم نے بھی نیت قیام کی کرلی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا، تب مکان کو چلیں گے۔"(۱)

اگلے جُمعے کو چار ہزار آدمیوں کے قریب مجمع تھا۔ نماز کے بعد مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کچھ دیر وعظ فرمایا۔ پھر لوگ مسائل پُوچھنے لگے۔ آپ نے ہر ایک کو جواب دیا۔ سیّد صاحبؒ کے کمرہ اس وقت بیعت کرنے والوں کا ہجُوم بکثرت تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا عبدالحی صاحبؒ مسجد کے صحن میں ۱۰ لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ عشا تک لوگ آپ کو گھیرے رہے اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔(۲)

شہر کی دعوتیں ہفتے کی صبح کو شہر کے ایک معزز بزرگ مرزا حسن علی بیگ کی طرف سے مولانا عبدالحی صاحبؒ اور اُن کے بیس رفقا کی دعوت تھی۔ صبح کو صاحبِ دعوت کا آدمی سواری لے کر حاضر ہُوا اور باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ آج وہاں فلاں فلاں عالم اپنی اپنی کتابیں لیے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ مرزا حسن ۱۵ علی صاحب بھی وہیں ہیں۔ مُجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب آپ سے مناظرہ کریں گے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے کہا: "ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ عجب نہیں کہ آج وہاں کچھ مناظرہ و مباحثہ ہو۔" مولانا نے سیّد صاحبؒ سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ: "صاحبِ دعوت کے آدمی کی زبانی معلوم ہُوا کہ وہاں کچھ علما مناظرے کے واسطے جمع ہیں۔ دُعا فرمائیں کہ وہاں کوئی شر و فساد نہ ہو۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا بھی وہاں جانا کچھ ضرور نہیں۔ وہ طبیعت کے تیز اور صاف گو ہیں۔ کسی کا پاس نہ کریں گے۔ جو ۲۰ بات ہوگی، صاف صاف کہہ دیں گے۔"

(۱) "وقائع"، صفحہ ۳۰۴-۳۰۶ (۲) "وقائع"، صفحہ ۳۰۹

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ: "انشاء اللہ سب طرح خیر ہوگی۔ شر و فساد کچھ نہ ہوگا۔ کوئی کچھ سوال کرے، تو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے موافق جواب دیجیے گا۔ مناظرے اور مباحثے سے کچھ غرض نہ رکھیے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے یہ اُمید ہے کہ وہ صاحب کچھ دُور آپ کا استقبال کریں گے اور جیسی علما کی تعظیم و توقیر ہوتی ہے، اسی طرح کریں گے۔"

مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ اور مولوی وحید الدین صاحبؒ اور بیس آدمی اور مرزا صاحب کے یہاں تشریف لے گئے۔ اُنھوں نے جو ان صاحبوں کے آنے کو سُنا، تو چند قدم مکان سے نکل کر بڑی تعظیم و توقیر سے لے گئے اور بہت عزّت و حُرمت کے ساتھ بٹھایا اور کُچھ مسائل بطورِ استفادے کے پُوچھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے ہر مسئلے کا معقول جواب دیا۔ پھر اُنھوں نے ہاتھ دُھلائے اور کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد کُچھ دیر اور بیٹھ کر یہ حضرات چلے آئے۔

دُوسرے روز اس محلّے کے کئی آدمی آئے اور سید صاحبؒ سے بیان کیا کہ وہاں کے لوگوں نے آپ کے بُلانے کا ارادہ کیا ہے اور اُن کی نیت یہ ہے کہ ہم کو جو کچھ گفتگو کرنی ہے، سید صاحبؒ سے کریں گے، اس واسطے کہ اُن کو زیادہ علم نہیں ہے۔ اگر ہم نے اُن کو مغلوب کر دیا، تو اُن کے سب مُتبع اور مرید مغلُوب اور لاجواب ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہم حاضر ہیں۔ وُہ جب چاہیں، ہم کو بُلائیں۔"

ایک روز اُن کا آدمی سید صاحبؒ کے پاس آیا اور کہا: "صبح کو فلاں محلّے میں فلاں صاحب کے یہاں آپ کی اور آپ کے تمام لوگوں کی دعوت ہے۔" آپ نے فرمایا: "بہتر۔" صبح کو صاحب دعوت نے سواریاں بھیجیں۔ آپ نے چلنے کی تیاری کی۔ شہر والوں کو خبر ہُوئی کہ آج وہاں مناظرہ ہوگا۔ لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہوئے اور سید صاحبؒ کے رفقا اور وہ ملا کر قریب چار سو آدمیوں کے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ: "وہاں فقط ہمارے لوگوں کی دعوت ہے، اَوروں کو صاحب دعوت کی اجازت کے بغیر جانا مناسب نہیں۔" یہ سُن کر لوگ متفرق ہو کر اپنی اپنی طرف چلے گئے، لیکن جب آپ اپنے لوگوں کو لے کر وہاں پہنچے، تو وُہ بھی وہاں آ موجُود ہوئے۔ صاحب دعوت نے سب کو فرش پر بٹھایا۔ سب آدمی چار سَو

کے قریب تھے۔ صاحبِ دعوت نے کھانے کا جو انتظام کیا تھا، اس کا خیال کر کے فکر مند ہوئے کہ کھانا کم ہے اور کھانے والے بہت ہیں۔ سیّد صاحبؒ مرزا صاحب کو متردّد دیکھ کر سمجھ گئے۔ کہا: "مرزا صاحب! ذرا یہاں تشریف لائیے۔" وہ اس وقت اپنے لوگوں سے کھانے کی کمی کی شکایت کر رہے تھے۔ جواب دیا: "حاضر ہوتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "ابھی تشریف لائیے۔" وہ آئے۔ آپ نے فرمایا: ۵ "آپ کیوں متردّد ہیں؟" مرزا صاحب نے بے تکلّف کہا کہ: "حضرت سلامت، کھانا تھوڑا ہے اور آدمی بہت ہیں۔ اس وقت مجھ کو یہی تردّد ہے۔" آپ نے پوچھا: "آپ نے کھانا کس قدر پکوایا؟" کہا: "تین سو آدمیوں کا، سو آدمی میری طرف کے کھانے والے ہیں اور دو سو آدمیوں کا کھانا آپ کے ہمراہیوں کے خیال سے پکوایا، مگر اس وقت جانبین کے آدمی کم و بیش چھ سو معلوم ہوتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "جو کھانا ہمارے لوگوں کے لیے ہے، اس کو جدا کر کے ہمارے آدمیوں کے حوالے کر دیجیے۔ ہم جانیں اور ہمارے آدمی۔ باقی اپنے لوگوں کا کھانا علیحدہ کر لیجیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے جو رکابیاں ۱۰ منگائی ہیں، ان کو رہنے دیجیے۔ ہمارے آدمیوں کے واسطے لگنیں اور کونڈے منگا دیجیے اور اپنے آدمیوں کو ہمارے کھانے کے پاس سے بلا لیجیے۔ ہمارے لوگ اپنے کھانے کا انتظام آپ کر لیں گے۔"

مرزا صاحب نے ایسا ہی کیا۔ دو حصّے کھانا تو سیّد صاحبؒ کے لوگوں کے لیے جدا کر دیا، ایک حصّہ اپنے لوگوں کے لیے الگ رکھ لیا۔ سیّد صاحبؒ نے مولوی محمد یوسف صاحب، میاں عبداللہؒ، میاں دین محمد اور ایک اور شخص کو کھلانے کے واسطے مقرّر کیا اور میاں عبداللہ صاحب سے ۱۵ کہا کہ تھوڑا سا کھانا کفگیر میں لاؤ۔ دیکھیں، کیا کھانا مرزا صاحب نے پکوایا ہے۔ انھوں نے کہا: "پلاؤ ہے" اور کفگیر میں تھوڑے سے چاول لے کر آئے۔ آپ نے دو چار چاول کفگیر سے اٹھا کر کھائے اور کہا کہ باقی چاول جا کر دیگ میں ڈال دو اور چاولوں کی تعریف کرنے لگے کہ "واہ! سبحان اللہ! مرزا صاحب نے خوب ہی باریک اور عمدہ چاول پکوائے ہیں۔ ہم لوگ تو موٹے چاول اور کھچڑی کے کھانے والے ہیں۔ خدا ان کے کھانے میں برکت کرے!" اور اپنے لوگوں سے فرمایا کہ کھلانا شروع ۲۰ کرو۔ وہ لوگ انھیں لگنوں اور کونڈوں میں نکال کر کھانے لگے۔ فضلِ الٰہی سے سب آسودہ اور

سیر ہوگئے اور لگن اور کونڈے میں تھوڑا تھوڑا بچ رہا اور کچھ دیگ میں بچ رہا، جو اُن چاروں کھلانے والوں نے کھایا۔

یہ عجیب و غریب حال دیکھ کر مرزا صاحب اور اُن کی طرف کے تمام لوگ متحیر ہوگئے کہ یہ کیا معاملہ ہوا۔ پھر مرزا صاحب اپنے لوگوں کے کھلانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہاں بھی قریب دو سو آدمیوں کے جمع ہوگئے۔ وجہ یہ تھی کہ سب کو خبر تھی کہ آج سید صاحبؒ سے اور یہاں کے علما سے مناظرہ و مباحثہ ہوگا۔ اکثر آدمی تماشہ دیکھنے آئے تھے اور کھانا وہاں سو آدمیوں کا تھا۔ مرزا صاحب کو بڑا تردد تھا۔ پھر سید صاحبؒ سے انھوں نے آکر تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "جن لگنوں اور کونڈوں میں ہمارے لوگوں نے کھایا ہے اور کچھ کھانا ان برتنوں میں بچا ہے، وہ اٹھیں اپنے برتنوں میں بھیج دو اور اس دیگ میں سے نکال نکال کر کھلانا شروع کرو، اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے گا۔" مرزا صاحب نے ایسا ہی کیا۔ سب لوگوں نے کھا لیا اور وہ چار سیر پلاؤ بچ رہا۔ جو حضرات مناظرے اور مباحثے کی نیت سے جمع تھے، عالمِ حیرت میں رہ گئے۔ ہر شخص سید صاحبؒ اور آپ کے بزرگوں کی تعریف کرنے لگا کہ آپ ایسے ہیں اور آپ کے بزرگوار اس عالی مرتبہ کے تھے۔ مرزا حسن علی صاحب محدث(1) نے، جو شریکِ محفل تھے، دو تھان مشروع کے اور دو تھان چکن کے اور ایک چھوٹا سا پاندان سفید الائچیوں سے بھرا ہوا، اس میں ایک عطر کی شیشی رکھی ہوئی، سید صاحبؒ کو ہدیہ کیا۔ آپ نے رفقا میں سے ایک شخص سے کہا کہ یہ سامان لے لو۔ یہ مرزا صاحب کا تبرک ہے۔ یہ الائچیاں ہم کھائیں گے۔

اس کے بعد لوگوں نے بیعت کرنی شروع کی۔ عورت اور مرد ملا کر کوئی تین سو آدمیوں نے

---

(1) مرزا حسن علی محدث لکھنؤ کے ان فضلا میں سے تھے، جنھوں نے تیرھویں صدی میں اپنے علم و فضل اور شافعیت کی نسبت سے شہرت حاصل کی۔ والد کا نام عبد العلی تھا۔ خاندانی تعلق خاندانِ بنی ہاشم سے بتلاتے ہیں۔ بعض لوگ مغل کہتے ہیں۔ کتابیں مولانا حمد اللہ سندیلوی مشہور معقولی استاد کے شاگردِ رشید و فرزند مولانا حیدر علی سے پڑھیں۔ پھر دہلی جا کر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہما سے استفادہ کیا اور شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ سے سندِ حدیث حاصل کی اور اپنی تحقیق سے مذہبِ شافعی اختیار کیا۔ حدیث و علومِ حدیث سے اشتغال تھا اور ان علوم میں ان کا تبحر مسلّم تھا۔ صاحبِ تصنیفات ہیں۔ ۲۶ صفر ۱۲۵۵ھ کو وفات پائی (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

بیعت کی۔ پہلے مردوں نے بیعت کی۔ پھر لوگ آپ کو اپنے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں عورتوں نے بیعت کی۔ وہاں سے آپ تشریف لائے اور عصر کی نماز شاہ پیر محمد صاحبؒ کی مسجد میں پڑھی۔[1]

اگلے روز ہفتے کو شہر کے بے شمار لوگوں نے آکر بیعت کی۔ ان میں اہلِ سنّت تو تھے ہی شیعہ اصحاب بھی بہت تھے۔ پہلے بھی بہت سے شیعہ اصحاب بیعت کر چکے تھے۔[2]

عمائدِ شہر کی آمد ایک روز شہر کے ایک شیعہ رئیس تاج الدین خاں صاحب کا چوبدار آیا اور سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ خاں صاحب تاج الدین خاں نے آپ کو سلام اور آداب عرض کیا ہے اور کہا ہے کہ ہم آپ کی ملاقات کو صبح حاضر ہوں گے۔

دوسرے دن صبح کو آپ نے مسجد کی چھت پر ستر نگی بچھوائی اور فرمایا کہ وہ جب آئیں، تو اسی پر بٹھانا۔ دوسرے دن تاج الدین حسین خاں، سُبحان علی خاں[3] اور مرزا نھو آئے۔ لوگوں نے وہیں چھت پر انھیں بٹھایا۔ سیّد صاحبؒ وہیں تشریف لے گئے اور کئی گھنٹے وہاں اُن سے باتیں ہوتی رہیں پھر وہ تینوں آپ سے رخصت ہوئے۔[4]

جمعے میں نمازیوں کا اژدحام جمعے کے روز نماز سے پہلے ہی اس کثرت سے آدمی مسجد میں جمع ہو گئے کہ نماز پڑھنے کے لیے جگہ مشکل سے ہوئی۔ بعض بعض لوگوں نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ "آج نمازیوں کی اتنی کثرت ہے کہ مسجد میں اُن کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا تدبیر کی جائے؟" آپ نے فرمایا

(۱) "وقائع" صفحہ ۳۱۳ - ۳۲۱ (۲) ایضاً صفحہ ۳۲۱ (۳) تاج الدین حسین خاں و سُبحان علی خاں کنبوہ اوّل سرکارِ انگریزی میں تحصیلدار تھے۔ اُن کی لیاقت کی وجہ سے نواب سعادت علی خاں نے اُن کی قدر سوانی اور سرفرازی کی اور اس عہد سے اُن کی ثروت و دولتمندی کی بنیاد پڑی۔ جب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور معتمد الدولہ آغا میر وزیرِ اعظم، تو ان کی نیابت کا خلعت سبحان علی خاں کو ملا۔ سُبحان علی خاں علامۂ عصر ہمہ صفت موصوف، ثنا بے نظیر، عالی فکر، خوش تدبیر تھے۔ معتمد الدولہ اُن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں جو شعر تھا، وہ بھی سبحان علی خاں کا موزوں کیا ہوا تھا۔

تاج الدین حسین خاں ذی عقل اور سلوک سے عمدہ تھے۔ کنبوہوں کی قوم میں ایسا آدمی کم گزرا ہے۔ علاقہ سلطانپور کہ جو بیس لاکھ روپے کا تھا، تاج الدین خاں کے پاس تھا (تاریخ اودھ)۔ سبحان علی خاں صاحب تصنیف بھی ہیں۔ "الباقیات الصالحات" اور "شمس الضحیٰ" ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔

(۴) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۳۳۰ - ۳۳۱

کہ نماز کے وقت دیکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم ہے کہ مسجد میں اتنے لوگوں کی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ انتظام کرنا ہو، ابھی سے آپ فرما دیں۔ آپ نے کہا کہ دو چار صفیں قریب قریب کھڑی ہوں۔ اس میں گنجائش ہو جائے گی اور پیچھے والے لوگ آگے والے لوگوں کی پیٹھ پر سجدہ کریں۔ ضرورت کے وقت یہ درست ہے، مگر مولانا عبدالحی صاحب سے بھی اس کو پوچھ لو۔ مولانا سے پوچھا۔ آپ نے کہا "ہاں یہی مسئلہ ہے۔ خطبے سے پہلے دو تین آدمی سب لوگوں سے پکار کر کہیں کہ صفیں قریب قریب کھڑی ہوں اور پیچھے والے آگے کے لوگوں کی پشت پر سجدہ کریں۔ تنگی کے وقت یہ درست ہے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سبھوں نے اگلوں کی پشت پر سجدہ کیا۔ کئی صفوں میں یہی حال تھا۔

مولانا عبدالحی کا وعظ دلپذیر

نماز کے بعد مولانا عبدالحی صاحب نے سورۂ اَلْاَنْبِیَآء کے اس رکوع سے وعظ کہنا شروع کیا:-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (۲۱: ۵۱، ۵۲)

اور ہم نے پہلے ہی سے ابراہیم کو نیک راہ دی تھی اور ہمیں اُن کی خبر تھی، جب اُنھوں نے اپنے والد اور اپنی قوم سے کہا کہ "یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟"

اس کے ضمن میں تعزیہ داری، عُرس، محفلِ سرود، قبر پرستی اور پیر پرستی وغیرہ کو کھول کھول کر بیان کیا اور اس کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہزاروں سُنّی اور شیعہ سُنتے تھے اور سیکڑوں آدمی زار و قطار روتے تھے اور آپس میں کہتے تھے: "سُبحان اللہ! اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج ہی قرآنِ مجید نازل ہوا ہے۔ افسوس کہ ہم لوگ آج تک گمراہی میں مبتلا رہے۔ کسی عالم و فاضل نے ہم کو متنبہ نہ کیا۔" بیان کرتے ہوئے اس رکوع میں جب اس آیت پر پہنچے:-

وَلُوطًا آتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۱ : ۷۴)	اور لوطؑ کو ہم نے حکم دیا اور سمجھ، اور اُسے اُس بستی سے بچا نکالا، جو گندے کام کرتے تھے۔ وہ لوگ بڑے نافرمان تھے۔

تو پوری قوم لوطؑ کے اخلاق و عادات اور اُن کے افعالِ شنیعہ کی پوری تفصیل و تطبیق کی اور اس سلسلے میں اُن کے خصائل و عادات میں سے خلافِ فطرت فعل، گالی دے کر پکارنے، مرد و عورت کو کنکری مار کر منہ پھیر لینے، تالی پیٹنے، سیٹی بجانے، محفل میں خلافِ تہذیب فعل کرنے، راستے میں گندگی ڈالنے اور اُن کے مشاغل اور دلچسپیوں میں سے کبوتر اڑانے، مرغ لڑانے، پتنگ اُڑانے کا ذکر کیا۔ وضع و عادات و لباس میں ڈاڑھی منڈانے، مونچھیں بڑھانے، پٹے رکھنے، مسی لگانے، ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے، زعفرانی یا کسومی لباس پہننے کا تذکرہ کیا۔ تمام حاضرینِ محفل سکتے کے عالم میں تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب نے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ: "صاحبو، تم سب سے ایک عرض کرتا ہوں، دل کر متوجہ ہو کر سنو اور اس کا جواب دو۔ وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان، رضی اللہ عنہ، کی ڈاڑھی اتنی بڑی تھی کہ تمام سینہ چھپا لیا تھا اور حضرت علی، کرم اللہ وجہہ، کی ڈاڑھی بھی ایسی ہی تھی۔ اہلِ سنت و جماعت محبتِ چار یار کا دعویٰ رکھتے ہیں اور حضرات شیعہ کو حضرتِ علیِ مرتضیٰ کی محبت کا دعویٰ ہے۔ محبت کے معنے ہیں اس چیز کی طرف میل اور رغبت کرنا، جو مرضیِ محبوب کے موافق ہو، نہ یہ کہ اپنے محبوب کی رضا کے خلاف چلے۔ بڑا تعجب ہے کہ دونوں فریق ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں اور منہ سے صحابہؓ اور اہلِ بیتؓ کی محبت کا دعویٰ کیے جاتے ہیں۔"

یہ سن کر جن صاحبوں کی ڈاڑھیاں منڈی تھیں، انھوں نے منہ پر رومال باندھ لیے اور جن صاحبوں کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تھے، انھوں نے اسی دم پھاڑ ڈالے۔ کبوتر اڑانے والوں، مرغ لڑانے والوں اور پتنگ بازوں نے توبہ کی اور اسی روز سے لوگوں کو ہدایت ہونا شروع ہو گئی۔

اس وعظ میں علمائے فرنگی محل اور مولوی دلدار[1] علی صاحب مجتہدِ لکھنؤ کے اکثر شاگرد، نیز مفتی غلام حضرت صاحب، جو بڑے صاحبِ اخلاق، متقی و پرہیزگار عالم تھے، تشریف رکھتے تھے[2]۔

چھ سات ہندو مہاجن بھی بلباس فاخرہ پہنے وعظ سن رہے تھے۔ اس عرصے میں عصر کی اذان ہوئی۔ مولانا نے وعظ بند کیا۔ ان ہندوؤں نے مولانا سے کہا: "آپ نے جو کچھ فرمایا، سب حق ہے اور آپ کا دین سچا ہے۔" ۵

نمازِ عصر کے بعد سید صاحبؒ کے گرد کئی ہزار آدمی سنّی اور شیعہ جمع ہو گئے اور لوگوں نے بیعت کرنی شروع کی۔ آپ نے اپنا دوپٹہ پھیلا دیا اور فرمایا کہ "جو کوئی اس کو پکڑے، وہ ہمارا مرید ہے۔"

کھانے کا طور میاں دین محمد کہتے ہیں کہ جس روز ہم لوگوں کی کہیں دعوت نہیں ہوتی تھی، ایک دیگ چاول پکا لیتے اور دال دوسرے برتن میں اور پیمانے کے طور پر ایک چوبیں پیالہ تھا، اس میں چاول ۱۰

---

(۱) مولوی دلدار علی صاحب مجتہد، سید نجم الدین سبزواری کی اولاد میں سے تھے۔ سنہ ۱۱۶۶ھ کے قریب نصیر آباد میں ولادت ہوئی۔ الٰہ آباد و سندیلہ میں مختلف علما سے درسیات کی تحصیل کی۔ سنہ ۱۱۹۳ھ میں عراق کا سفر کیا اور وہاں کے علمائے کبار سے علوم کی تکمیل کی۔ لکھنؤ میں حسن رضا خاں آصف الدولہ کے وزیر تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا۔ اس وقت تک اہلِ تشیع میں جمعہ و جماعت کا کوئی نظام نہ تھا اور شیعہ ملک میں متفرق و منتشر تھے۔ مولوی محمد علی کشمیری نے فیض آباد میں اس بات کی تحریک کی کہ شیعہ بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کریں۔ حضرت شاہ علی اکبر مودودی فیض آبادی نے بھی حکام کو اس طرف متوجہ کیا اور نواب آصف الدولہ نے اس کو پسند کیا اور مولانا سید دلدار علی کی امامت میں ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ میں پہلی جماعت ہوئی۔

مولوی سید دلدار علی صاحب نے مذہبِ تشیع کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا اور ان کے عہد میں اس مذہب کی بڑی ترویج ہوئی۔ وہ اودھ میں شیعوں کے پہلے مجتہد تھے اور آج تک غفراں مآب کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تصنیفات میں عماد الاسلام، منتہی الافکار، مواعظ حسینیہ اور "تحفۂ اثنا عشریہ" کی تردید میں متعدد رسائل ہیں۔

۱۹ رجب سنہ ۱۲۳۵ھ کو انتقال کیا اور امام باڑے میں دفن ہوئے۔

(۲) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۲۲۱-۲۲۵۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کا سفرِ لکھنؤ سنہ ۱۲۳۳ھ میں ہوا، حالانکہ مفتی غلام حضرت کا انتقال سنہ ۱۲۳۴ھ میں ہوا ہے۔ ناسخ نے آپ کی تاریخِ وفات کہی ہے:-

مردہ مفتی غلام حضرت افسوس　　کہ بُد بشہرِ لکھنؤ حاکمِ شرع

سالِ تاریخِ رحلتِ آں مرحوم　　فرمود خرد کہ بود خادمِ شرع

۱۲۳۴ھ

"کلیاتِ ناسخ"، صفحہ ۳۹۳

بھر بھر کر ہم نکالتے تھے۔ ہر آدمی کو دو پیالے بھر چاول تقسیم کرتے تھے اور وہی ابالی دال بے گھی بلا بے مصالحہ کی، مگر ان چاولوں اور اس دال کا مزہ ایسا ہوتا تھا کہ امیروں کے کھانے میں ہرگز نہ تھا، اس بات میں ذرا مبالغہ نہیں۔ جو لوگ موجود تھے، وہ سب اس کے گواہ ہیں۔

اسی ایک دیگ چاولوں میں کوئی پونے دو سو آدمی ہمارے اور بیس پچیس آدمی شہر کے ہر روز کھاتے تھے۔ لوگوں نے جو سنا کہ سید صاحبؒ کے یہاں دال چاول اس مزے کے پکتے ہیں کہ امیروں کے زردے، سفیدے میں ایسا مزہ نہیں ہوتا، تو ایک روز سو آدمی ادھر ادھر سے کھانے کے وقت آگئے۔ ان کو دیکھ کر سید صاحبؒ نے مولوی محمد یوسف صاحب سے کہا کہ: "ان بھائیوں کو بھی کھانے میں شریک کر لو۔" مولوی صاحب نے اُن کو بھی دو دو کرچی چاول اور اسی کے موافق دال دی۔ وہی ایک دیگ چاول تھے کہ کچھ اوپر تین سو آدمیوں نے کھا لیا اور کوئی بھوکا نہ رہا۔[1]

علماء و مشائخ لکھنؤ کی بیعت ایک جمعے کو مجلسِ وعظ میں مولانا محمد اشرف صاحب[2]، مولانا مخدوم صاحب، مولوی امام الدین صاحب بنگالی، مولوی امام الدین صاحب لکھنوی[3] (برادر مولوی نصیر الدین بانسار خانم)، مولوی عبد الباسط شاگرد مولوی محمد اشرف صاحب، مولوی ابو الحسن صاحب نصیر آبادی، فرنگی محل کے مولوی عبد اللہ و مولوی رحیم اللہ، مولوی نجیب اللہ بنگالی، شاہ یقین اللہ صاحب اور اُن کے صاحبزادے مولوی عبد الوہاب[4] اور میر امید علی، جو لکھنؤ میں صاحبِ خدمت مشہور تھے، یہ سب حضرات موجود تھے۔ وعظ کے بعد سب بیعت سے مشرف ہوئے۔ اکثر نے تو وہیں مسجد میں بیعت کی اور مولوی محمد اشرف صاحب و مولوی مخدوم صاحب اور مولوی ابو الحسن صاحب وغیرہ نے اسی روز مکان پر لے جا کر بیعت کی۔[5]

---

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۳۳۸ (۲) مولانا محمد اشرف صاحب اساتذۂ لکھنؤ میں سے تھے۔ والد کا نام نعمت اللہ تھا، خاندانا صدیقی اور آبائی وطن کشمیر تھا۔ عرصے سے خاندان لکھنؤ میں منتقل ہوگیا تھا۔ درسی کتابیں کچھ مولانا مخدوم حسینی لکھنوی سے پڑھیں اور زیادہ علامہ نور الحق فرنگی محلی سے پڑھیں، پھر مسندِ درس آباد کی۔ بہت سے علما ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں۔
تصنیفات میں "الاصول الراسخہ" اور اس کی شرح "الدوحۃ الشامخہ"، "قسطاس المصرف"، "تفسیر القرآن" اور "علماء ہند" کا ایک ناتمام عربی تذکرہ یادگار ہے۔ ۱۶ صفر ۱۲۴۳ھ کو وفات پائی (نزہۃ الخواطر جلد ۷)۔
(۳، ۴) دونوں صاحبوں کا مفصل حال خلفا و مریدین کے تذکرے میں ملاحظہ ہو۔ (۵) "وقائع احمدی" صفحہ ۳۴۴

دو نومسلم بھائی دو بھائی جوہری ہندو لکھنؤ کے رہنے والے، ایک سولہ سترہ برس کا، اور دوسرا تئیس چوبیس برس کا ہر جمعے کو درس میں آتے تھے اور وعظ سن کر سب مسلمانوں کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ ان کا ارادہ مُسلمان ہونے کا تھا۔ کسی جمعے کو شیخ صلاح الدین سے انھوں نے بیان کیا کہ ہماری نیت یوں ہے۔ کئی بار شیخ صاحب اُن کے مکان پر بھی گئے۔ ایک روز شیخ صاحب نے یہ حال سیّد صاحبؒ سے بھی بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہاں، ہم اُن کو جانتے ہیں۔ وہ درس میں آیا کرتے ہیں۔ تم اُن کو ہمارے پاس لاؤ۔ ہم اُن کو اپنا بھائی بنائیں۔" شیخ صاحب اُن کے یہاں گئے اور کہا: "چلو، حضرت تُم کو بُلاتے ہیں۔" اُنھوں نے کہا: "آج ہی چلیں یا جُمعے کو؟ جو مناسب ہو، بتاؤ۔" شیخ صاحب نے آکر کہا۔ آپ نے فرمایا: "جمعے پر موقوف نہیں۔ جب ایمان لائیں، تب ہی بہتر ہے۔ تم اُن کو لاؤ۔" شیخ صاحب دُوسرے دن رات کو اُن کے پاس لے گئے۔ آپ نے دیر تک نظرِ ہدایت اثر سے اُن کی طرف دیکھا اور پوچھا کیا ارادہ ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ: "آپ اپنے دینِ حق میں داخل کر لیں۔" آپ نے فرمایا کہ: "تم کو اپنے گھر کا کچھ اور کام ہو، تو اُس سے فراغت کر آؤ، تاکہ پھر وہاں سے کوئی غرض نہ رہے۔" اُنھوں نے کہا: "ہم وہاں سے فارغ البال ہو کر آئے ہیں۔ اب ہم کو وہاں جانے کی کچھ حاجت نہیں۔" آپ نے اپنے لوگوں سے فرمایا کہ: "ہمارے یہاں سے دو جوڑے کپڑے لے جاؤ اور ان کو گومتی میں نہلا کر کپڑے پہنا کر ہمارے پاس لاؤ۔" اسی وقت اُن کو نہلا کر پوشاک پہنا کر لائے۔ آپ نے اُن کو مُسلمان کیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ: "حضرت، ہم اپنی رضا و رغبت سے مُسلمان ہُوئے ہیں۔ کسی کے جبر و اکراہ سے نہیں۔ مگر پھر بھی ہمارے عزیزوں کو اطلاع نہ ہو، تو بہتر ہے، مبادا کچھ شر و فساد برپا کر دیں۔ چند روز آپ ہم کو پوشیدہ رکھیں۔" آپ نے فرمایا: "کیا مضائقہ ہے؟ تم ہمارے لوگوں میں رہو۔ چند روز کہیں اِدھر اُدھر نہ جاؤ۔ انشاء اللہ کچھ شر و فساد اس امر میں نہ ہوگا۔" بڑے کا نام آپ نے عبدالہادی رکھا اور چھوٹے کا عبدالرحمٰن۔ یہ بھی فرمایا کہ: "یہ دو صاحب آگئے۔ ابھی تین اور باقی ہیں۔ جب وہ بھی آجائیں، تب یکبارگی سب کا ختنہ کرا دیں۔"

کئی روز کے بعد ایک ہندو آیا اور حضرت سے کہا کہ "میں مسلمان ہوں گا۔" آپ نے کہا:
"بہتر۔" اس کو غسل دلوا، پوشاک بدلوا، کلمۂ طیبہ پڑھوایا اور احمد اللہ نام رکھا۔ پھر کئی روز
کے بعد دوسرا آیا اور مسلمان ہوا۔ پھر ایک روز تیسرا آیا اور وہ بھی مسلمان ہوا۔ آپ نے فرمایا:
"ان کا ختنہ کرا دینا ضروری ہے، مگر اب آٹھ دس دن میں ہمارا بریلی کا ارادہ ہے۔ وہیں ان کا
ختنہ کرایا جائے گا۔" اور یہ اپنے لوگوں سے فرمایا کہ "ان تینوں کی امانت داری میں مجھ کو شک
ہے۔ اپنا اپنا اسباب ان سے بچائے رہنا۔"[1]

دعا کی شرط

بینڈو خاں[2] رسالے دار کے سواروں کی وردی باناتی ٹوپی، باناتی کرتی اور پاجامہ تھا اور
وہ لوٹو کے سوار کہلاتے تھے اور اس لقب سے ان کو کمال عار معلوم ہوتا تھا۔ زبانِ خلق کو کون بند کرے؟
مولوی نور احمد صاحب نگرامی (مصنفِ "نورِ احمد") ان دونوں رسالے دار صاحب کے پاس نوکر تھے۔
وہاں رسالے کے اکثر سواروں نے یہ مشورہ کیا کہ اگر کسی روز حضرت سید صاحبؒ ہماری پلٹن میں
تشریف لاتے تو بہت لوگوں کو ہدایت ہوتی۔ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر یہ سب لوگ جا نہیں
سکتے۔ کئی افسروں نے کہا کہ "بات تو بہت خوب ہے۔ اگر سید صاحبؒ یہاں آجائیں تو ہم ان
کی دعوت بھی کریں۔ مگر کسی کو بھیجنا چاہیے، جو آپ کو لائے۔" پھر مولوی نور احمد کو اور ایک دفعدار
تھے، ان کو بھیجا۔ ان دونوں صاحبوں نے یہ تمام کیفیت آ کر سب حضرت سے عرض کی۔ آپ نے
فرمایا: "بہت خوب، ہم ضرور چلیں گے، مگر جس دن بلانا منظور ہو، اس دن کوئی اپنا آدمی بھیج
دیں اور کھانا ہماری اطلاع کے بغیر ہرگز نہ پکوانا۔" انھوں نے قبول کیا اور یہ کہا کہ "وہاں بیعت

---

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۳۴۸-۳۵۱- چنانچہ رائے بریلی پہنچ کر ایسا ہی پیش آیا۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے تین چیزوں کی ایسی شناخت عطا فرمائی ہے کہ بہت کم مجھ سے ان کے بارے میں خطا ہوتی ہے: ایک گھوڑا، دوسرے آدمی، تیسرے تلوار۔"

(۲) بینڈو خاں، بدل خاں رئیسِ دہلی کے خاندان سے تھے۔ قوم کے مغل تھے اور قبیلہ ترک جیک سے نسبی تعلق تھا۔ مستاجری کی بدولت انھوں نے بڑی دولت پیدا کی تھی۔ اول رسالے داری، پھر خیرآباد اور بہرائچ کی علاقہ داری ملی۔

کرنے کے علاوہ بعض صاحب اور بھی کسی مطلب کے لیے عرض کریں گے۔" آپ نے فرمایا: "کیا مضائقہ ہے؟"

دونوں صاحب رخصت ہو کر اپنی لائن میں آئے۔ تین دن کے بعد وہی دونوں صاحب کئی آدمیوں سے آپ کو لینے آئے۔ آپ کوئی دو سو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں نے بڑی تعظیم و تکریم سے آپ کو فرش پر بٹھایا اور تین چار سو سواروں نے بیعت کی۔

اس عرصے میں مینڈو خاں کے بھائی عبداللہ خاں آپ کی ملاقات کو آئے اور عرض کیا کہ: "آپ یہاں سے فارغ ہو کر میرے غریب خانے پر بھی قدم رنجہ فرمائیں۔" آپ نے فرمایا: "بہتر، ہم آئیں گے۔" عبداللہ خاں اپنے مکان کو گئے۔ مولوی نور احمد نے حضرت سے کہا کہ: "میں نے ٹیلے پر عرض کیا تھا کہ بیعت کے علاوہ وہاں کچھ اور بھی درخواست کی جائے گی۔ سو رسالے دار صاحب کا مکان پر لے جانے سے یہی مطلب ہے۔ اُن کی ایک عرض یہ ہے کہ تمام شہر میں ہم لوگوں کا لقب "لولو کے سوار" ہے۔ اس لقب سے رسالے دار صاحب کو بہت عار اور ندامت معلوم ہوتی ہے۔ اس لقب کے چھوٹنے کے لیے وہ آپ سے دعا کرائیں گے۔ دوسرے، یہ عرض کریں گے کہ حضور سے رسالے داروں کی لاکھوں روپے کی بڑی بڑی علاقے داریاں ہیں، لیکن ہم جس دن سے اس سرکارِ دولتمدار میں نوکر ہوئے ہیں، اس نوکری کے سوا آج تک ہمارے واسطے کسی نوع کی ترقی کی صورت نہیں ہوئی۔ اس کے لیے بھی وہ آپ سے دعا کی درخواست کریں گے اور ایک ہماری آپ سے گزارش ہے کہ اکثر اوقات ہماری اس لائن میں مہمان اور مسافر اترتے ہیں۔ ہم لوگوں میں اتنی وسعت نہیں کہ کھانا کھلانے سے اُن کی خبر لیں۔ وہ بیچارے بھوکے سو رہتے ہیں۔ رسالے دار کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہاں کے مہمان مسافر کچھ کھاتے ہیں یا نہیں۔ آپ اگر اس بات کا انتظام اُن کے ذمے کر دیں، تو یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔"

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے یہ بات بڑے کام کی کہی۔ انشاء اللہ، ہم اس کی تدبیر ضرور کریں گے۔

پھر آپ مینڈو خاں کے مکان پر گئے۔ وہاں مینڈو خاں اور عبداللہ خاں نے بیعت کی اور انھیں دونوں باتوں کے متعلق عرض کیا، جن کی اطلاع آپ کو مولوی نور احمد سے پہلے مل چکی تھی۔ آپ نے فرمایا "ہم اس معاملے میں دعا کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے امیدِ قوی ہے کہ تمھاری دونوں حاجتیں روا فرمائے گا، مگر اس کے ساتھ للّٰہ فی اللہ ایک اور بھی کام ہے کہ جس قدر اس کا التزام اپنے اوپر مضبوط رکھو گے، اسی قدر تمھاری ترقی انشاء اللہ تعالیٰ روز بروز زیادہ ہوگی اور جتنا اس میں قصور کروگے، اتنا اس میں فتور واقع ہوگا۔"

انھوں نے عرض کیا کہ وہ کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہم نے سنا ہے کہ تمھاری لائن میں جو مہمان اور مسافر اترا کرتے ہیں، فاقے سے سو رہتے ہیں۔ ان کا خبر گیر کوئی نہیں ہوتا۔ یہ ایک صورت غضبِ الٰہی کے نزول کی ہے۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے رئیس نامدار بنایا ہے۔ تم اپنے مقدور کے موافق اُن کی خبر لینا۔ جب تک اس کا التزام اپنے ذمے رکھو گے تمھارے اقبال و دولت و جاہ و ثروت کی ترقی رہے گی اور جس قدر اس میں قصور واقع ہوگا، اسی قدر اس میں فتور پڑے گا۔"

انھوں نے کہا کہ: "جو کچھ مجھ کو میسر ہوگا اور میں کھاؤں گا، اُن کو بھی کھلاؤں گا، یہاں تک کہ اگر میں پلاؤ کھاؤں گا، تو انھیں بھی پلاؤ کھلاؤں گا اور جو میں چنے چباؤں گا، انھیں بھی چبواؤں گا۔" آپ نے فرمایا: "واہ! پٹھان بھائی، اگر یہ نیت تمھاری ہے، تو انشاء اللہ تعالیٰ تمھارا سب مطلب بخوبی پورا ہوگا اور ہم تمھارے واسطے ضرور دعا کریں گے۔" پھر حضرت وہاں سے ٹیلے پر تشریف لائے اور چند روز میں بریلی روانہ ہوگئے۔ وہاں عبداللہ خاں نے اپنے رسالے کو حکم سنا دیا کہ جو مہمان، مسافر، بیکس و محتاج ہماری لائن میں اترا کرے، ہم کو اطلاع کیا کرو اور مولوی نور احمد کو اس کام کا داروغہ مقرر کیا کہ جو مہمان و مسافر یہاں آترے اُس کو نقد پیسے یا جنس ہماری طرف سے دلوایا کرو۔

دو ڈھائی مہینے کے بعد مینڈو خاں نے اپنی ترقی اور بہبودی کا حال سید صاحب کو

کو لکھ کر بھیجا کہ جب آپ لکھنؤ سے بریلی تشریف لے گئے، حضورِ بادشاہ غازی الدین حیدر نے ہمارے رسالے کا جائزہ لیا۔ نواب فتح علی خاں کپتان حاضر تھے۔ جنابِ عالی نے اپنے پستول کی جوڑی دکھائی کہ ایسی ایک ہزار جوڑی پستول ہوتے، تو ان سواروں کو دیتے۔ کپتان صاحب نے عرض کیا کہ جنابِ عالی کے اسلحہ خانے میں اس قسم کی کئی ہزار جوڑیاں ہیں۔ فرمایا: "حاضر کرو۔"

۵　دُوسرے دن کپتان صاحب موصُوف نے ہزار جوڑی پستول حاضر کیے۔ جنابِ عالی نے ہمارے رسالے کے سواروں کو عنایت فرمائے اور وردی بھی بدلوا دی اور لولو کا لقب بھی موقُوف کروایا اور خیرآباد کا علاقہ بھی ہم کو ہُوا اور بہرائچ کا علاقہ ہونے کی اُمید ہے۔

کُچھ دنوں میں جب اُن کو بہرائچ کا علاقہ ہُوا، تب تو مسکینوں اور مُسافروں کی اطلاع کو صُبح و شام کھانے کے وقت ترم بجوانا شروع کیا کہ جو مسکین و مُسافر لائن میں اُترا ہو آئے اور

۱۰　ہمارے دسترخوان پر ہمارے ساتھ کھائے۔ اکثر کھانے کے وقت سرِ محفل کہتے کہ: "بھائیو، یہ سب جناب سید صاحبؒ کی دُعا کا نتیجہ ہے۔"

جب تک بلنڈو خاں جیے، مُسافر پروری کا یہی حال رہا۔ ان کے انتقال کے بعد چند روز اُن کے بیٹوں نے بھی یہ کارخانہ جاری رکھا۔ پھر اس کا التزام نہ ہو سکا۔ عبداللہ خاں نے بارہا اپنے بھتیجوں سے تاکیداً کہا کہ: "دیکھو، مُسافروں کا دسترخوان موقُوف نہ ہونے پائے۔

۱۵　تمھارے والد کا یہ جاہ و جلال سید احمد صاحبؒ کی دُعا سے اسی شرط کے ساتھ تھا کہ جس قدر محتاج پروری میں کوشش کرو گے، اُسی قدر اللہ تعالیٰ دولت و اقبال میں ترقّی رکھے گا اور جو اس میں قصُور کرو گے، تو اس میں فتُور واقع ہوگا۔" مگر منظُورِ الٰہی نہ تھا۔ اُنھوں نے اس نصیحت پر کُچھ خیال نہ کیا۔ چند سال میں وہ کارخانہ جاتا رہا۔[1]

جہاد کی نیت　لکھنؤ میں ایک مرتبہ کُچھ لوگ بیعت ہُوئے اور آپ سے تبرّک کی درخواست

۲۰　کی۔ آپ نے اُن کو کچھ روپے برکت کے لیے عطا فرمائے اور نصیحت فرمائی کہ: "اپنے اپنے

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۳۸۱ - ۳۸۰

گھر کی عورتوں کو ہمیشہ تاکید کرتے رہو کہ کسی طور کا شرک نہ کریں اور جو اللہ تعالیٰ تم کو روزی کی فراغت دے، تو نیتِ خالص جہاد فی سبیل اللہ کی رکھنا، خواہ جان سے، خواہ مال سے اور جو نیت خالص نہ ہوگی، تو تمھارے حق میں نقصان ہوگا۔ اس بات کو خوب سمجھ لو۔"

اُنھوں نے عذر کیا کہ: "اگر ہم اپنی جان سے جہاد کی نیت کریں اور جائیں، تو یہاں ہمارے اہل و عیال کی کون خبر لے گا اور کون کھانا کپڑا دے گا؟ اور جو جہادِ مالی کی نیت کریں، تو ہمارے پاس مال کہاں؟" فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ تمھیں مال و دولت دے، تب تم پر یہ حکم ہے اس کے بغیر نہیں۔" سب نے اس کا عہد کیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ، ایسا ہی کریں گے۔ آپ نے میر اُمید علی کو تاکیدِ مزید فرمائی کہ تم ان عورتوں کو نماز روزے کی تعلیم کیا کرنا۔(۱)

نشاناتِ شرک کا ابطال گومتی کے راج گھاٹ پر خدا بخش نام ایک شخص لکڑی کی دوکان کرتے تھے اکثر اُنھیں کی دوکان سے لکڑی جاتی تھی۔ اُنھوں نے بھی سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور چند دنوں میں اُن کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اُن کی دوکان کے آس پاس بانس والوں کی کئی دوکانیں تھیں۔ اُنھوں نے جو میاں خدا بخش کا یہ حال و قال دیکھا سنا کہ یہ تو بڑے عابد و زاہد، صالح و متقی ہو گئے، اُن کو بھی اشتیاق ہوا اور سات آٹھ شخص بیعت ہوئے۔ دُوسرے روز اپنے اور آٹھ دس بھائی بندلے کر آئے۔ اُنھوں نے بھی بیعت کی اور توبہ کی اور حضرت سے عرض کیا کہ: "ہمارے لوگوں کے کوئی تیس چالیس گھر ہوں گے۔ سب کو اشتیاق ہے کہ بیعت کریں۔ اگر کسی روز آپ اُدھر قدم رنجہ فرمائیں، تو عین سرفرازی ہو۔" آپ نے قبول کیا۔ پھر ایک دن معین کر کے دو سو آدمیوں سے حضرت کی دعوت کر گئے۔ آپ نے کتنا ہی عذر کیا کہ تم غریب لوگ ہو، دعوت کی تکلیف نہ کرو۔ اُنھوں نے کہا کہ: "ایک دن آپ کی دعوت کرنی ہم پر ہرگز ہرگز گراں نہ ہوگی۔" اُس روز آپ اُن کے یہاں گئے۔ کھانے کے بعد سب نے بیعت کی اور مقدور کے موافق اُن میں سے اکثر نے نذر دی۔ پھر اپنے اپنے گھر لے گئے۔

(۱) "وقائع"، صفحہ ۳۹۳، ۳۹۴

عورتوں، لڑکوں بالوں کو مرید کرایا۔

ایک صاحب کے یہاں طاق میں مٹی کے کئی کھلونے رکھے تھے۔ آپ کی نظر پڑ گئی۔ فرمایا: "یہ بت ہیں، ان کو مشرک رکھتے ہیں۔ ان کو توڑ ڈالو۔ گھر سے دور کرو۔ خبردار، پھر کبھی نہ لینا۔" پھر دیر تک شرک کی طرح طرح کی برائی اور توحید کی خوبی بیان فرماتے رہے۔ صاحب خانہ نے اسی وقت وہ کھلونے توڑ کر گھر سے باہر پھینک دیے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر جس جس ۵ کے یہاں مٹی کی مورتیں اور کھلونے تھے، سب نے توڑ کر پھینک دیے۔ ٹوٹے ہوئے صدہا کھلونے اس وقت دروازوں پر پڑے تھے۔

آپ نے ان میں سے دو شخصوں کو اپنا خلیفہ کیا اور ایک ایک ٹوپی اور کرتا ان کو دیا۔ آپ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے کہا کہ: "ان کا خلیفہ کسی پڑھے لکھے قابل آدمی کو کیا ہوتا، جو ان کو وعظ و نصیحت کیا کرتا۔ یہ بیچارے آپ ہی کچھ نہیں جانتے، اور کو کیا تعلیم کریں گے؟" ۱۰ آپ نے فرمایا: "ہاں، تم بھی اچھا کہتے ہو[1]، مگر یہ ان کی برادری کے چودھری ہیں۔ جو کچھ ان کا کہنا ان پر اثر کرے گا، اگرچہ ناخواندہ ہیں، ایسا دوسرے کا کارگر نہ ہوگا۔ اگر ان کا کہنا کوئی نہ مانے، تو یہ اس کو اپنی برادری سے باہر نکال سکتے ہیں۔ دوسرے غیر برادری کے عالم سے یہ بات نہ ہوگی اور ان شاء اللہ، ان کو چند روز کے بعد دیکھنا کہ خدا کی عنایت سے کس طرح کے ہوں گے۔[2]" ۱۵

اصلاحِ رسوم آپ نے ان چودھری صاحبان کو تعلیم کی کہ بیاہ برات، شادی غمی میں خدا و رسول کے خلاف شرک و بدعت کے رسوم کوئی نہ کرنے پائے۔ ہر امر میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم، کے طریقے پر نگاہ رہے۔ اس میں کوئی خوش ہو یا ناخوش، اللہ تعالیٰ تمھارے یہاں برکت کرے گا اور تم کو خوش اور محفوظ رکھے گا۔ پھر آپ ٹیلے پر تشریف لائے۔

---

(۱) سید صاحبؒ کی عادت تھی کہ کسی کی بات کی برملا تردید نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ خلافِ شرع نہ ہو۔ البتہ اپنی بات کی کوئی معقول توجیہ یا وجہِ ترجیح بیان فرما دیتے تھے، جس سے عقلمند آدمی سمجھ جاتا تھا۔ (۲) "وقائع"، صفحہ ۲۹۴-۹۷

میاں دین محمد صاحب کہتے ہیں کہ جب سید صاحبؒ جہاد کو تشریف لے گئے، تو میرا ہندوستان آنا ہوا اور لکھنؤ بھی جانا ہوا، تو ان بانس والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی دینداری اور پرہیزگاری کا حال معلوم ہوا اور ان کا کاروبار پہلے کے مقابلے میں چار گنا، بلکہ بعضوں کا زیادہ دیکھنے میں آیا۔ وہ کہتے تھے کہ حضرت کی دعا سے ہمارا یہ حال ہے کہ ۵ جس مالِ تجارت میں ہم ہاتھ لگاتے ہیں، اگر وہ مال مٹی کا ہو، تو سونا ہو جاتا ہے۔

یہ بھی کہتے تھے کہ: "شادی بیاہ میں ہم نے اپنے یہاں یہ دستور رکھا ہے کہ دھلے ہوئے کپڑوں کے سوا دولھا دلھن کے لیے نیا کپڑا بھی نہیں بنواتے، اگرچہ بنانا درست ہے اور ولیمے اور عقیقے کے کھانے کے سوا نہ کھاتے ہیں، نہ کھلاتے ہیں اور جو جو خرافات اور رسوم بدعات لوگ اپنے یہاں شادی بیاہ میں کرتے ہیں، جیسے سہرا، کنگنا باندھنا، رت جگا کرنا، ۱۰ رگیت گوانا، طوائف کا ناچ کرانا اور اسی طرح کی کوئی بات ہم نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں، اُن کے بیاہ شادی میں ہم لوگ شریک نہیں ہوتے۔

اور پہلے ہم لوگ جب لڑکوں کے چیچک نکلتی تھی، تو کیا کیا شرک و بدعات کی خرافات کرتے تھے اور کسی کو اس کے پاس نہیں جانے دیتے تھے اور اکثر لڑکے مرجاتے تھے اب ہم خدا پر لڑکے کو چھوڑ دیتے ہیں، کسی بات کا پرہیز نہیں کرتے اور خدا کے سوا کسی کی ۱۵ نذر و نیاز بھی نہیں مانتے۔ اوّل کے بہ نسبت اب لڑکے کم مرتے ہیں۔"

جب میں ہندوستان سے سرحد گیا، میں نے حضرت سے ان بانس والوں کی دینداری، پرہیزگاری کا سب حال بیان کیا۔ آپ نے خوش ہو کر اُن کے واسطے دعا کی۔[1]

جرائم پیشہ فساق کی توبہ و اصلاح میاں دین محمد کہتے ہیں کہ امان اللہ خاں، اُن کے بھائی سبحان خاں اور کئی شخص جن کے نام یاد نہیں، چوری اور جرائم پیشگی میں طاق اور شہرۂ ۲۰ آفاق تھے۔ ایک روز لکھنؤ میں سید صاحبؒ کی ملاقات کو شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۷۰۱ - ۷۰۳

آئے۔ لوگوں نے اُن کو آتے دیکھ کر حضرت سے اطلاعاً کہا کہ یہ لوگ بڑے بدمعاش، چور اور حرام کار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ: "خبردار، اُن کے سامنے اس کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ بُرے کام چھڑا کر اُن کو نیک کاموں کی توفیق دے اور موت بھی اُن کی اچھی ہو۔"

اُنھوں نے آکر آپ سے مصافحہ و معانقہ کیا۔ آپ نے اُن کو بڑے اخلاق و احترام کے ساتھ بٹھایا اور دیر تک متوجّہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ فرمایا: "بہتر، مگر تم کیا پیشہ کرتے ہو؟" اُنھوں نے بہت عذر کیا کہ آپ اس بات کو نہ پوچھیں، اسی طرح رہنے دیں۔ اُن کے واقف کاروں میں سے کسی نے کہا کہ: "بتا دو، کیا مضائقہ ہے؟ بلکہ تمھارے لیے بہتر ہے۔" آپ نے بھی فرمایا کہ بیان کرو۔ انھوں نے اپنی چوری اور حرام کاری کا تمام حال صاف صاف بیان کیا کہ: "اب تک ہمارا پیشہ یہ تھا، مگر اب سے آپ کے دستِ مبارک پر توبہ کرتے ہیں۔ ہم کل جب آپ کے پاس آئے تھے، اس وقت ہمارا کچھ خیال نہ تھا۔ صرف سیر تماشے کی غرض سے آئے تھے، مُرید ہونے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔ مگر جب ہم آپ کے پاس بیٹھے اور آپ کا اخلاق دیکھا، تو ہمارے دل کا عجیب حال ہو گیا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے۔ یکایک یہی دل میں سمایا کہ سب گھر بار، بیوی بچے چھوڑ کر آپ ہی کے پاس رہیں۔ اسی واسطے آج ہم آئے ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ آج موقوف رکھو، جمعے کو، اِن شاءاللہ، تم کو مرید کریں گے۔ یہ سُن کر وہ چلے گئے۔

جُمعے کو کچھ دن چڑھے وہ آئے۔ آپ نے فرمایا کہ جُمعے کی نماز کے بعد بیعت کرنا۔ نماز کے بعد وہ بیعت ہوئے اور کچھ زرِ نقد آپ کے نذر کیا۔ آپ نے لے کر پھر اُن کے حوالے کیا اور فرمایا کہ ہماری طرف سے اپنے لڑکوں بالوں کو دینا۔ اُنھوں نے کہا کہ اپنے اہل و عیال کو کیوں کر آپ سے بیعت کرا دیں۔ فرمایا: "کسی روز اس طرف جانا ہوگا، تو مرید کر لیں گے۔"

ایک روز آپ گولہ گنج کی چڑھائی پر جاتے تھے۔ امان اللہ خاں نے عرض کیا کہ میرا غریب خانہ قریب ہے۔ اگر حضرت وہاں قدم رنجہ فرمائیں، تو عین عنایت ہو۔ ہم اہی وہیں

کھڑے رہے۔ آپ اُن کے یہاں تشریف لے گئے اور اُن کے گھر والوں نے آپ کے دستِ مُبارک پر بیعت کی۔"(۱)

امان اللہ خاں، سبحان خاں اور مرزا ہمایوں بیگ تو سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اُن کے زمرے کے تین آدمی غلام رسُول خاں، غلام حیدر خاں اور صدر خاں اور تھے۔ اُن کو یہ حال معلُوم نہ تھا۔ ایک روز یہ تینوں صاحب امان اللہ خاں کے پاس آئے اور کہا ۵
کہ: "اِن دنوں خرچ کی تنگی ہے۔ اِس کی تدبیر کرنی چاہیے، یعنی، کہیں چل کر چوری کریں۔" اُنھوں نے جواب دیا کہ: "اب ہم سے کچھ نہ ہوگا۔" کہا: "کیا سبب ہے؟ آج کل نہ چلو گے یا کبھی نہیں؟ قصّہ کیا ہے؟"

مرزا ہمایوں بیگ نے کہا کہ: "بات یُوں ہے کہ ہم اور یہ اس بات سے توبہ کر چکے ہیں۔ اب، انشاء اللہ، ہم سے یہ کام نہ ہوگا۔" اُنھوں نے کہا: "کب تم نے توبہ کی؟" کہا: "شاہ پیر محمد ۱۰
صاحب کے ٹیلے پر بریلی کے جو سید صاحبؒ اُترے ہیں، اُن کے ہم اور یہ مُرید ہو گئے ہیں۔" اور کچھ آپ کے فضائل و کمالات بیان کیے کہ ایک روز ہم پانچ چار آدمی بطور سیر و تماشہ اُن کے پاس گئے کہ دیکھیں، تو کیا حال ہے۔ ملاقات ہُوئی، تو جیسا سُنا تھا، ویسا ہی پایا اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اُنھوں نے ہم کو توجّہ دلائی۔ اس سے ہم کو بہت فائدہ ہُوا۔

یہ حقیقت سُن کر ان تینوں ساتھیوں نے کہا کہ اگر یہی حال ہمارا بھی ہو، تو ہم بھی چل کر ۱۵
بیعت کریں۔ اُنھوں نے کہا کہ اِس سے کیا بہتر، مگر ہم پہلے اُن سے یہ حال بیان کریں۔ جو وُہ فرمائیں، تو پھر ہم تم سے کہیں۔

اُنھوں نے سید صاحبؒ سے یہ حال آ کر عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ: "تُمھارے گروہ کے جو جو لوگ ہیں، اُن سب کو ہمارے پاس لاؤ۔ اِن شاء اللہ، اُن کو تم سے زیادہ فائدہ ہوگا۔"

دُوسرے روز غلام رسُول خاں، غلام حیدر خاں اور صدر خاں کو وُہ لے کر آپ کے ۲۰

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۴۰۳-۴۰۵

پاس آئے۔ آپ نے اُن کو بڑے اخلاق اور بڑی خاطرداری سے بٹھایا اور مزاج کی عافیت پوچھی پھر عصر کی نماز کے بعد اُن کو مُرید بنالیا اور امان اللہ خاں سے کہا کہ تم اُن کو توجہ دو۔ وُہ عذر کرنے لگے کہ: "مجھ کو اس کا کیا سلیقہ؟" آپ نے فرمایا کہ: "یہ کیا بات ہے؟ تم جاکر اُن کو توجہ دو۔ اب کی جو کوئی مُرید ہوگا، تو ہم اسی طرح ان سے توجہ دلائیں گے۔" امان اللہ خاں نے اُن کو توجہ دی۔ غلام رسُول خاں بیہوش ہوکر لوٹنے لگے اور غلام حیدر خاں اور صدر خاں کا ایک سکتے کا سا حال ہوگیا کہ لوگ مونڈھا پکڑ کر ہلاتے تھے اور وُہ ہوش میں نہیں آتے تھے۔ پھر کچھ دیر میں قدرے افاقہ ہُوا۔ آپ کے پاس لائے گئے۔ آپ نے حال پوچھا۔ حواس بجا نہ تھے۔ ان سے بات نہ کی گئی۔ آپ نے امان اللہ خاں سے کہا کہ ان کو گھر لے جاؤ۔ کل پھر لانا۔

امان اللہ خاں نے کہا کہ: "حضرت، مَیں نے ان کو توجہ دی، ان کا یہ حال ہُوا اور مجھ کو آپ کے لوگوں نے توجہ دی، میرا یہ حال نہ ہُوا۔ اس کا کیا سبب؟" آپ نے فرمایا کہ: "تم کو ان سے زیادہ فائدہ ہوگا اور ہم تمھارے لیے دُعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا خاتمہ بخیر کرے اور تم سے اللہ تعالیٰ بہت کام لے گا۔" انھوں نے کہا کہ: "بس میں یہی چاہتا ہوں۔"

امان اللہ خاں تینوں صاحبوں کو مکان پر لے گئے۔ دُوسرے دن جب اُن کو بخوبی ہوش آگیا، امان اللہ خاں اُن کو پھر لائے۔ اس دن سے وُہ خود ہی سید صاحبؒ کے پاس آنے لگے۔

جب سید صاحبؒ نے رائے بریلی واپسی کا ارادہ فرمایا، امان اللہ خاں اور مرزا ہمایوں بیگ آپ کے ہم رکاب ہُوئے۔ غلام رسُول خاں، غلام حیدر خاں اور صدر خاں بھی چلنے کے لیے تیار ہُوئے۔ آپ نے فرمایا کہ: "تم ابھی مکان پر رہو۔ جب ہم ہجرت کریں گے، تب تم کو ضرور ساتھ لیں گے۔"(۱)

مالِ حرام سے تائبوں کی نفرت غلام رسُول خاں نے عرض کیا کہ ہمارا دل تو آپ کے ساتھ ہی چلنے کو چاہتا ہے، مگر آپ کا فرمانا ہم کو منظور ہے۔ لیکن ہم اپنے گھر میں تو نہ رہیں گے، اس لیے کہ

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۰۹ - ۴۱۱

ہمارے یہاں مال حرام ہے۔ اگر رہیں گے، تو کھانا پڑے گا۔

آپ نے فرمایا کہ: "یہ بات تو تم نے بڑے کام کی کہی۔ فی الحقیقت یہی بات ہے کہ تم اگر کچھ مال حرام کھاؤ گے، تو تمھارا یہ حال نہ رہے گا۔ خیر تمھاری تو یہ نیت ہے، بھائی غلام حیدر خاں، تم اپنا حال کہو۔"

5 غلام حیدر خاں نے کہا کہ میرے گھر کا بھی یہی حال ہے، مگر آم کا باغ بھائیوں کی شرکت میں ہے، فی الحال اس کا تقسیم ہونا دشوار ہے۔

پھر آپ نے صدر خاں سے کہا کہ تم اپنا حال بیان کرو۔ کہا: "میرا بھی بعینہٖ ایسا ہی حال ہے کہ گھر میں اسی قسم کا مال ہے، لیکن ایک باغ آم کا سو سوا سو روپے کی آمدنی کا ہے۔ اس میں شرکت بھی نہیں ہے۔ میرا گزر اس میں اللہ کے فضل سے بخوبی ہو جائے گا۔"

10 آپ نے حافظ نجو خاں سے فرمایا کہ غلام رسول خاں اور غلام حیدر خاں کو اپنے ساتھ فقیر محمد خاں کے پاس لے جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ ان صاحبوں کے کھانے کپڑے کے لیے للہ فی اللہ گزر کے موافق مشاہرہ مقرر کر دیجیے اس شرط سے کہ اگر یہ چاہیں، تمھارے پاس رہیں، چاہیں اپنے گھر۔ حافظ صاحب اُن کو فقیر محمد خاں صاحب کے پاس لے گئے اور سید صاحب کا پیغام پہنچایا۔ خاں صاحب نے پوچھا کہ حضرت نے اپنی زبانِ مبارک سے ان کے واسطے کچھ مشاہرہ فرمایا

15 ہے۔ کہا: "یہ تو مجھے کچھ نہیں کہا۔ خاں صاحب نے حافظ صاحب کے ذریعے سید صاحب سے کہلوایا کہ میری طرف سے عرض کرنا کہ یا تو دس روپے ماہوار نقد لیں یا پانچ روپے اور دونوں وقت کھانا۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ آپ دس روپے ہر ایک کو دیں۔ چاہیں، وہ اپنے گھر میں رہیں، چاہیں آپ کی سرکار میں حاضر رہیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔[1]

زنانوں کی توبہ و اصلاح ایک روز ایک نیک مرد ایک زنانے کو لے کر شاہ پیر محمد صاحب کے

20 ٹیلے پر آئے اور آپ سے عرض کیا کہ: "میرے اور ان کے درمیان للہ فی اللہ دوستی ہے۔ میں یہ

---

(۱) وقائع، صفحہ ۱۱۴ - ۱۱۳

چاہتا ہوں کہ یہ آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کریں اور ان کو ہدایت نصیب ہو۔ آپ نے فرمایا: "بہت خوب بات ہے۔" اس سے پوچھا: "تمھارا کیا ارادہ ہے؟" اُس نے عرض کیا کہ "میرا ارادہ یہی ہے، جو یہ کہتے ہیں، مگر میرے یہاں دس بارہ آدمی ہیں۔ ان میں سے کئی آدمی ایسے ہیں، جن کو اطلاع کرنی ضروری ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی ہدایت نصیب کرے اور ان کو بھی۔" آپ نے فرمایا: "تم اس امر میں کوشش کرو۔ ہم بھی دعا کریں گے۔ خدا چاہے گا تو وہ تمھارے ساتھ آئیں گے۔"　۵

تیسرے روز تین زنانے، چوتھا وہ خود، پانچویں وہ صاحب جن کے ساتھ وہ پہلے دن آیا تھا، آئے۔ ان تینوں میں ان کا ایک سردار تھا۔ آپ نے دیر تک ان کی طرف نگاہِ توجہ سے دیکھا اور پوچھا کہ تمھاری کیا نیت ہے؟ انھوں نے کہا: "نیت تو یہی ہے کہ آپ کے ہاتھ پر توبہ کریں، مگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ باقی لوگ کچھ فساد برپا کریں اور ہم کو پکڑ لے جائیں۔" آپ نے فرمایا کہ: "تم خالص دل سے توبہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے گا۔ کوئی تمھارا مزاحم نہ ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ: "ہم حاضر ہیں۔" آپ نے فرمایا: "ان کو نہلا دھلا کر کپڑے پہناؤ۔" لوگ گومتی سے نہلا لائے۔ کسی نے ہم لوگوں میں سے چادر دی، کسی نے پاجامہ، کسی نے انگرکھا، کسی نے ٹوپی۔ سب کو مردانے کپڑے پہنائے۔ پھر آپ نے اُن سے بیعت لی اور دعا کی اور فرمایا کہ: "جو ان میں سردار ہے، اُس کو اللہ تعالےٰ نے اس حال میں بھی سردار رکھا ہے، یعنی ان تینوں سے خدا کے نزدیک مرتبہ میں زیادہ ہے۔" پھر اُن کو توجہ دلائی اور مولوی محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ: "ان کو اپنے پاس رکھیے۔ کسی بات کی تکلیف نہ پائیں۔ اپنے ساتھ نماز میں لے جایا کیجیے اور اپنے ساتھ لایا کیجیے اور نماز روزے کے مسائل ان کو سکھایئے۔"　۱۵

دو تین روز میں اُن کے باقی لوگوں کو خبر ہوئی کہ چار شخص تم میں سے جا کر سید صاحبؒ کے مرید ہوئے ہیں۔ لوگوں سے اس کا مشورہ کیا کہ وہاں سے اُن کو کیونکر لائیں۔ انھوں نے کہا: "وہاں کا تو یہ حال ہے کہ جو کوئی اُن کے پاس جاتا ہے، خدا جانے اُن کے پاس کیا سحر ہے کہ وہ انھیں میں مل جاتا ہے اور انھیں کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر تم جاؤ گے، تو کچھ عجب نہیں کہ تمھارا بھی　۲۰

حائل ہو۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ ان سے صبر کرو اور باز آجاؤ، مگر یہ بات ہے کہ جب سیّد صاحبؒ اپنے مکان بریلی کو جائیں، تب تم اس بات کی خبر دیدار بخش کو کرو۔ اگر موقع ملے، تو وہ اُن کو سمجھا کر بلالیں۔" اس مشورے کا حال اس شخص سے معلوم ہوا، جو اُن کو لے کر آیا تھا۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت آپ نے ان چاروں کو فقیر محمد خاں رسالے دار صاحب کے پاس بھیج دیا اور کہلوایا کہ ان چاروں نے اپنے پیشے سے توبہ کی ہے۔ آپ کھانے کپڑے سے ان کی خبر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں گے۔ ان کا مفصل حال ہم ملاقات کے وقت بیان کریں گے۔[1]

اہلِ حکومت کو تشویش مولانا عبدالحی صاحب کے ہر درس میں دو چار اہلِ تشیّع ضرور توبہ کر کے اہلِ سنت و الجماعت میں داخل ہو جاتے۔ اس اطلاع سے تاج الدین حسین خاں، اور سبحان علی خاں کمبوہ کو بڑی فکر پیدا ہوئی۔ اُنھوں نے نواب معتمد الدولہ سے اس کی شکایت کی۔ نواب صاحب نے چوبدار بھیج کر سیّد صاحبؒ سے کہلوایا کہ وعظ و نصیحت میں کوئی حرج نہیں۔ یہاں حکومت اہلِ تشیّع کی ہے تبدیلیِ مذہب سے فساد کا اندیشہ ہے۔ سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ ہم کلمۂ حق بیان کرتے ہیں۔ جو طالبِ حق آئے گا اور متاثر ہوگا، ہم اُس کو ہرگز نہ روکیں گے۔ ہم آپ کے حکم کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ نواب معتمد الدولہ نے دوبارہ پیغام بھیجا اور کہا کہ ایسی صورتِ حال میں اگر کوئی نقصان پہنچا، تو ہم پر ذمے داری نہیں۔ سیّد صاحبؒ نے اس کا بھی کوئی اثر نہیں لیا۔ آخر میں نواب صاحب نے فقیر محمد خاں رسالے دار سے کہا کہ "سیّد صاحبؒ تمھارے پیر و مرشد بھی ہیں اور آشنا بھی۔ ہماری طرف سے تم جا کر سمجھاؤ کہ حاکمِ وقت کا مقابلہ اچھا نہیں۔ اگر شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے کے گرد دو چار توپیں لگا کر اُڑا دے، تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟" فقیر محمد خاں صاحب نے یہ پیغام پہنچا دیا۔ آپ نے فرمایا: "فقیر محمد خاں، تم مجھ سے مدت سے واقف ہو اور میرے حالات کو خوب جانتے ہو۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا کہ کلمۃ الخیر کہنے سے باز رہوں۔ معتمد الدولہ دو چار توپوں سے کیا ڈراتے ہیں؟"

---

(۱) "وقائع"، صفحہ ۳۰۵-۳۰۸

سو توپیں لگادیں گے، تو کیا پروا؟ خدا میرا مددگار ہے۔ ان کے نقصان پہنچانے سے کچھ نہ ہوگا۔"

فقیر محمد خاں کے واسطے سے آپ کے اور معتمد الدولہ کے درمیان کئی روز تک گفتگو رہی۔ لشکر میں جو لوگ آپ کے مُرید تھے، اُنھوں نے سنا اور سب نے خُفیہ کہلا بھیجا کہ "حضرت، ہم لوگ تیار ہیں۔ جو ارشاد ہو، بجالائیں۔ آپ کسی بات کا اندیشہ نہ فرمائیں۔" آپ نے کہلا بھیجا: "تم خاطر جمع رکھو۔ اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ کچھ فتنہ و فساد نہ ہوگا۔"

آخر میں فقیر محمد خاں نے سید صاحبؒ کا پیغام معتمد الدولہ کو پہنچا دیا اور یہ کہا کہ سید صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ منع کرنے کا طریقہ اور تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ تم ہماری رعیت ہو۔ ہمارے شہر سے چلے جاؤ۔ اس میں ہمیں کچھ عذر، حیلہ نہ تھا۔ لیکن کلمۃ الخیر لوگوں کو تعلیم نہ کرو، یہ بات اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔ خدا کا طالب سُنّی ہو یا شیعہ، جو ہمارے یہاں آئے گا، ہم اُس کو سکھائیں گے۔ یہ بھی فرمایا کہ تم نواب معتمد الدولہ کے نوکر ہو اور میرے مُرید۔ تم کو میری طرف سے اجازت ہے کہ فساد کے وقت تم میرے ساتھ نہ ہو، اُنھیں کی طرف ہو یا کسی کی طرف نہ ہو، الگ رہو۔

یہ تمام گفتگو سُن کر نواب معتمد الدولہ نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے سید صاحبؒ اور اُن کے ساتھ کے علما بڑے حقانی اور خاندانی لوگ ہیں۔ فقیر محمد خاں نے اُس وقت سید صاحبؒ کے آبا و اجداد کے فضائل و کمالات بیان کیے اور مولانا عبدالحی صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ کے بزرگوں کے اوصاف و اخلاق کا تذکرہ کیا۔ نواب معتمد الدولہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کہا کہ اگر وہ قبول کریں تو اُن کی دعوت کرنی چاہیے، لیکن اُن کے لوگ ہمارے یہاں ہتھیار باندھ کر نہ آئیں۔ خاں صاحب نے کہا: "کیا مضائقہ ہے؟ کوئی ہتھیار لے کر نہ آئے گا۔ اگر لائیں گے تو باہر ڈیوڑھی پر رکھوا دیں گے۔"

فقیر محمد خاں سید صاحبؒ کے پاس آئے۔ دعوت کا پیام لائے۔ آپ نے یہ سن کر تبسّم کیا اور فرمایا کہ "دعوت کا تکلف کرنا کیا ضرور؟" اُنھوں نے کہا کہ "اب تو آپ قبول کرلیں۔" فرمایا: "بہتر، چلیں گے۔"(۱)

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۱۳ - ۴۱۷ باختصار۔

نواب معتمد الدّولہ کی دعوت | دُوسرے دن نوّاب صاحب نے سواریاں بھیجیں، ہاتھی بھی اور گھوڑے اور پالکیاں بھی۔ سیّد صاحبؒ اپنے لوگوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ڈیوڑھی پر پہرے والوں کے پاس ہتھیار رکھ دیے۔ اندر چبُوترے پر ایک فرش بچھا تھا۔ وہاں جاکر سب بیٹھے۔ نوّاب معتمد الدولہ کے پاس تاج الدّین حُسین خاں، سُبحان علی خاں، فقیر محمّد خاں رسالے دار، بینڈو خاں رسالے دار وغیرہ حاضر تھے اور مہمان داری اور خدمت گزاری میں مستعد تھے۔[1]

مولانا عبدالحی صاحبؒ کا وعظ اور مکالمہ | مولانا عبدالحی صاحب نے نواب معتمد الدّولہ کی مجلس میں وعظ فرمایا۔ مولانا محمّد اسمٰعیل صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسا وعظ ہم نے نہیں سُنا۔ وعظ اس طرح شروع کیا کہ اے مومنو! معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کا نشان کیا ہے اور کفر کا نشان کیا۔ پھر اس دعوے پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیے۔ ایک گروہ کے نشانِ ایمان اور دُوسرے گروہ کے نشانِ کُفر کو بڑی خوش بیانی سے واضح کیا اور بڑی خوبی سے اُن کو ہر گروہ پر منطبق کیا۔

معتمد الدولہ نے بڑی تحسین و آفرین کی اور کہا کہ آپ کے اوصافِ حمیدہ جیسے سُنے تھے، اُس سے زیادہ پایا۔[2]

سبحان علی خاں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باب میں کچھ سوال کیا۔ مولانا دیر تک سکوت میں رہے۔ اکثر لوگوں کو گمان ہُوا کہ شاید مولانا کو جواب نہ آیا۔ اس کے بعد سر اُٹھا کر فرمایا کہ "سُبحان علی خاں صاحب! آپ کیا دریافت فرماتے ہیں؟" اُنھوں نے پھر وُہی سوال کیا: اس پر مولانا نے ایک عالمانہ تقریر کی۔ لوگوں کی زبان پر آمنّا و سلّمنا تھا۔ معتمد الدّولہ نے کہا کہ: "اب گفتگو موقوف کیجیے اور ہاتھ دُھلایئے۔"[3]

جماعت کی تربیت اور بلند حوصلگی | مہمان ہاتھ دھو کر بیٹھے تو مختلف اقسام کے نفیس و لذیذ کھانے اُن کے سامنے چُنے گئے۔ کھانا بڑی مقدار میں ایک ایک کے سامنے رکھا گیا اور کہہ دیا گیا کہ جس کے سامنے جو کھانا ہے، وُہ اس کی مِلک ہے۔ چاہے یہاں کھالے؛ چاہے اپنے ساتھ لے جائے۔

(۱) "وقائع" صفحہ ۱۸ام (۲) "منظورۃ السُّعدا" روایتِ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (۳) "وقائع" صفحہ ۱۸ام، ۱۹ام

لیکن سید صاحبؒ کے ہمراہیوں میں سے، جن میں بہت سے عام لوگ اور غریب آدمی تھے، ہر ایک آسودہ ہو کر اُٹھ گیا اور کسی نے کھانا اپنے ساتھ نہیں باندھا۔ کھلانے والوں میں کسی نے بعض کھانے والوں سے کہا کہ یہ تمھارا حصّہ ہے، ساتھ لیتے جاؤ۔ اِس طرف سے کسی نے جواب دیا کہ یہ ہمارا دستور نہیں۔ جس نے ہم کو شام کا کھانا عطا فرمایا ہے، وہ صُبح کو بھی ہم کو رزق پہنچائے گا۔

٥　مجلس برخاست ہُوئی، تو نواب معتمد الدولہ نے پانچ ہزار روپے پیش کیے۔ آپ نے ہر چند عُذر کیا، لیکن معتمد الدولہ نے قبول نہیں کیا۔

رخصت ہونے کے بعد معتمد الدولہ نے فقیر محمد خاں سے کہا کہ یہ عجیب غریب لوگ ہیں میں نے آج سے پہلے ایسے آدمی نہیں دیکھے تھے۔ اُنھوں نے خواہش کی کہ میں تنہائی میں ملنا چاہتا ہُوں۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: "اس وقت بڑی دیر ہو گئی ہے۔ یہاں سے جاتے وقت ملاقات کر کے جاؤں گا۔"(١)

١٠

روانگی اور معتمد الدولہ سے ملاقات جب سید صاحبؒ نے لکھنؤ سے رائے بریلی کُوچ فرمایا، آپ نے اکثر لوگوں کو روانہ کر دیا کہ قندھاریوں کی چھاؤنی میں چل کر ٹھیریں۔ آپ چند لوگوں کے ساتھ نواب معتمد الدولہ کی ملاقات کو گئے۔ لوگوں کو ڈیوڑھی پر چھوڑ کر آپ فقیر محمد خاں رسالے دار کے ساتھ اندر گئے۔ نواب ممدوح سے ملاقات ہُوئی۔ دو گھنٹے گفتگو رہی۔ نواب معتمد الدولہ نے کہا

١٥　کہ: "حضرت میں آپ کے سامنے بُرے کاموں سے توبہ کرتا ہُوں۔" آپ نے فرمایا کہ: "توبہ سب بُرے کاموں سے بہتر ہے، مگر جو آپ بیچارے غریبوں، محتاجوں کے گھر زبردستی کھدوا ڈالتے ہیں، سب سے پہلے اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ یہ مردم آزاری سب سے بُرا کام ہے۔" نواب نے اقرار کیا کہ اِن شاء اللہ، کسی کا مکان اس کو راضی کیے بغیر اور واجبی قیمت دیے بغیر نہ کھدے گا۔" بلکہ چند مکانوں کی پیمائش ہو چکی تھی، اُن کو موقوف رکھا۔(٢)

٢٠　**نواب صاحب کو تحفہ** رُخصت کے وقت سید صاحبؒ نے ایک عُمدہ گھوڑی، جو بہت بلند

(١) "وقائع"، صفحہ ٤١٩　(٢) "وقائع"، صفحہ ٤٢٤ - ٤٢٥

اور قد آور تھی، جس پر آپ اس وقت سوار تھے، بچے سمیت نواب صاحب موصوف کو تحفے کے طور پر دی۔ نواب صاحب نے بہت عذر کیا اور کہا کہ: "تین چار گھوڑے خود ہمارے اصطبل میں سے پسند فرما کر ہماری طرف سے قبول کیجیے۔" آپ نے فرمایا کہ "نہیں، یہ گھوڑی تو آپ کو قبول کرنی ہوگی۔"(۱)

لکھنؤ کے قیام کے دوران میں فقیر محمد خاں نے بڑی رفاقت اور محبت کا ثبوت دیا ۵ اور بڑی دعائیں لیں۔

فقیر محمد خاں کی ترقی لکھنؤ سے واپسی میں مولوی سید محمد صاحب نصیر آبادی لکھنؤ سے فقیر محمد خاں کا خط لائے، جس میں لکھا تھا کہ کل رات، جب آپ قندھاریوں کی چھاونی میں تھے، نواب معتمد الدولہ کے یہاں سے اس فقیر کو خلعت ہوا، دس ہزار روپے نقد ملے اور ہاتھی، پالکی، شملہ، مندیل، دوشالہ، سپر، تلوار اور اس کے علاوہ بہت سامان ملا۔ پہلے تین سو روپے ۱۰ کا مشاہرہ تھا، اب ہزار روپے کا ہوا اور پندرہ سو سوار اور دو ہزار پیادے کا حکم دیا کہ نوکر رکھ لو اور محمدی کا پرگنہ علاقہ ہوا۔

سید صاحبؒ یہ حال سن کر بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ: "ابھی تو ابتدا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ، آگے دیکھنا کہ اُن کے واسطے کیسی ترقی ہوگی۔"(۲)

بادشاہ کی آرزوئے ملاقات رائے بریلی تشریف لے آنے کے کچھ دن بعد ایک روز آپ رفقا ۱۵ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نواب معتمد الدولہ کا ایک قاصد آیا اور نواب ممدوح اور فقیر محمد خاں بہادر کا خط لایا۔ خط پڑھے گئے۔ دونوں کا مضمون یہ تھا کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد بادشاہ غازی الدین حیدر نے فرمایا کہ ہمارے شہر میں ایسے صاحبِ کمال بزرگ اتنے دن رہے، ہزاروں آدمی اُن کے مرید اور اُن کی ذات سے مستفید ہوئے۔ افسوس کی بات ہے کہ تم نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ اب جو صورت ممکن ہو، اُن کو بلاؤ اور ہم سے ملاؤ۔

---

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۲۵۔ سید صاحبؒ کی عادت تھی کہ ان کے ساتھ اگر کوئی سلوک کرتا، تو وہ شایانِ شان سلوک کرتے اور اپنا ہاتھ اونچا رکھنے کی کوشش کرتے۔ (۲) "وقائع" صفحہ ۴۳۰۔

آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ "میرے تو جانے کی کوئی صورت نہیں۔ وہاں جانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ باقی جیسا آپ لوگوں کا مشورہ ہو۔" لوگوں نے کہا کہ: "اگر آپ نہ تشریف لے جائیں، تو مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل کو بھیج دیں۔ وہ حاکمِ وقت ہیں۔ اُن کے جانے سے شاید اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت نصیب کرے۔ نہیں تو کوئی حرج نہیں۔ چند روز رہ کر تشریف لے آئیں گے۔" فرمایا: "خیر، یُوں ہی سہی، مگر وہاں کچھ ہونا نہیں۔" ۵

چنانچہ یہی جواب دیا گیا کہ: "بالفعل ہمارا آنا تو ممکن نہیں، مگر انشاءاللہ، دس پندرہ روز میں مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل کو بھیجیں گے۔"

چند دنوں کے بعد مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل پچیس آدمیوں کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہُوئے۔ نواب معتمد الدولہ کو خبر ہُوئی۔ ایک مکان میں اُتارا۔ پھر بادشاہ کو اطلاع کی کہ جہاں پناہ نے جو بریلی کے سید صاحب کو یاد فرمایا تھا، وہ تو کسی عُذر سے تشریف نہیں لا سکے، مگر ۱۰ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل کو اپنی طرف سے بھیجا ہے۔ وُہ شہر میں اُترے ہیں۔ بادشاہ نے پچیس روپے روز کا کھانا مقرر کر دیا۔ دونوں وقت پکا ہُوا کھانا خوانوں میں لگا ہُوا آنے لگا۔ بعض شخصوں نے مولوی عبدالحی صاحب سے کہا کہ: "اس کھانے سے تو آپ نقد کر لیں، تو بہتر ہے۔" مولانا نے فرمایا کہ: "ہم کو اس بات سے کچھ غرض نہیں۔ چاہیں، کھانا بھیجیں؛ چاہیں، نقد۔" ۱۵

پندرہ سولہ روز ان حضرات کا لکھنؤ میں قیام رہا، مگر والیِ لکھنؤ سے ملاقات نہ ہُوئی۔ اہلِ دربار نے اس کا اہتمام رکھا کہ اس عرصے میں بادشاہ کسی وقت ہوش میں نہ آنے پائیں۔ فقیر محمد خاں بہادر اور مینڈھو خاں نے دونوں صاحبوں سے یہ حال بیان کیا اور کہا کہ آپ کو رہنے جانے کا اختیار ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ: "ہمارا رہنا بے کار ہے۔" صُبح کو معتمد الدولہ سے بے ملے اور بے خبر کیے بریلی روانہ ہو گئے۔[۱] ۲۰

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۳۱-۴۳۶

آٹھواں باب

رائے بریلی کا قیام اور بعض اہم اصلاحی کام

رائے بریلی کا قیام اور اُس کے اہم واقعات

لکھنؤ سے واپسی پر سیّد صاحبؒ کا تقریباً ایک سال رائے بریلی میں قیام رہا۔ مولوی سیّد جعفر علی صاحب "منظورۃ السُّعدا" میں لکھتے ہیں:۔

بعد تشریف آوری از لکھنؤ حضرت امیر المؤمنین قریب یک سال بر دولت خانہ رونق افروز بودند۔

لکھنؤ سے تشریف آوری کے بعد حضرت امیر المومنین تقریباً ایک سال دولت خانے پر رونق افروز رہے۔

"وقائعِ احمدی" میں ہے کہ حضرت امیر المومنین امام المجاہدین علیہ الرحمہ سفرِ باظفرِ لکھنؤ سے مراجعت فرما کر تکیے پر تشریف لائے اور کچھ یا زیادہ ایک سال وہاں رونق افروز رہے۔(۱)

اس قیام کے اہم واقعات میں سے جہاد کے لیے مشق و تربیت کا اہتمام، نکاحِ بیوگان کی سُنّت کا احیا اور نصیر آباد کی مہم ہے۔(۲)

جہاد کا شوق اور اُس کی تیاری

یُوں تو عبادت و سلوک کے ساتھ جہاد کی تیاری آپ ہمیشہ کرتے رہتے تھے، لیکن اس قیام میں اس طرف سب سے زیادہ توجّہ تھی۔ جہاد کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور یہ کانٹا تھا جو آپ کو برابر بے چین رکھتا تھا۔ دن رات اُسی کا خیال رہتا تھا۔ زیادہ تر یہی مشاغل بھی رہتے۔ آپ اکثر اسلحہ لگاتے تاکہ دُوسروں کو اس کی اہمیت

(۱) "وقائع" صفحہ ۴۶۴ (۲) "منظورۃ السعدا" اور "وقائعِ احمدی" دونوں میں واقعات کی ترتیب یہی ہے۔

معلوم ہو اور شوق ہو۔ دُوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ لکھنؤ میں آپ نے ایک مُرید کو ایک تفنگچہ دیا اور کہا کہ: "جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہتھیار رکھو اور شکم سیر ہو کر کھاؤ۔ انشاء اللہ، کُفّار کے ساتھ جہاد کریں گے۔ تم بھی مشق میں مشغول رہو۔ اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں۔"(۱)

بد قسمتی سے بہت مُسلمان ان چیزوں کو تقدّس و مشیخت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ جب آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جا رہے تھے، آپ بھی ہتھیار باندھے ہوئے تھے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ تھے۔ عبدالباقی خاں صاحب نے یہ دیکھ کر کہا کہ: "حضرت، آپ کی سب باتیں بہتر ہیں، مگر ایک بات مجھ کو ناپسند ہے اور وہ آپ کے خاندانِ والا شان کے خلاف ہے۔ آج تک یہ طریقہ کسی نے اختیار نہیں کیا۔ آپ کو وہی کام زیبا ہے، جو آپ کے حضرات آباو اجداد کرتے آئے۔" آپ نے فرمایا کہ: "وہ کون سی بات ہے؟" کہا: "یہ سپر، تلوار، بندوق وغیرہ کا باندھنا، یہ سب اسباب جہالت ہیں۔ آپ کو نہ کرنا چاہیے۔" یہ سُنتے ہی حضرت کا چہرہ غصّے کے مارے سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ: "خاں صاحب، اس بات کا آپ کو کیا جواب دُوں؟ اگر سمجھیے، تو یہی کافی ہے کہ یہ وہ اسبابِ خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا، علیہم السّلام، کو عنایت فرمائے تھے تاکہ کُفّار و مشرکین سے جہاد کریں اور حضوصاً ہمارے حضرت، صلّی اللہ علیہ وسلّم، نے اسی سامان سے تمام کُفّار و اشرار کو زیر کر کے جہان میں دینِ حق کو روشنی بخشی۔ اگر یہ سامان نہ ہوتا، تو تم نہ ہوتے اور اگر ہوتے، تو خدا جانے کس دین و ملّت میں ہوتے۔"(۲)

آپ کو سب سے زیادہ خیال جہاد کا رہتا تھا۔ جس کو مضبوط و توانا دیکھتے، فرماتے کہ یہ ہمارے کام کا ہے۔ موراواں (ضلع اناؤ) کے شمشیر خاں، الٰہ بخش، شیخ رمضان اور مہربان خاں ملاقات کے واسطے آئے۔ چاروں بڑے لمبے لمبے جوان تھے۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا:

(۱) "منظورۃ السُّعدا"　(۲) "وقائع احمدی"، صفحہ ۴۰۰-۴۰۱

"ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں، پیرزادے لوگ ہمارے کام کے نہیں"۔ اور بہت تعریف کی۔ وہ آپ کا اخلاق دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ہم غریب آدمی، چار روپے کے سپاہی، آپ ہماری اس طرح تعریف کرتے ہیں! بعد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جہاد میں اپنا کام تم سے بہت لے گا۔ پھر مہربان خاں سے کہا کہ: "اللہ تعالیٰ تم سے اور کام لے گا"، ان تینوں سے اور کام لے گا اور وہ دونوں کام خدا کی مرضی کے ہوں گے"[1]

رفقا کی سید صاحبؒ سے گفتگو۔ جہاد کی ضرورت پر آپ کی تقریر جب فنونِ حرب کی مشق و تعلیم میں زیادہ انہماک ہوا اور زیادہ تر وقت اسی میں صرف ہونے لگا، یہاں تک کہ سلوک کے کاموں میں کمی ہونے لگی، تو رفقا نے آپس میں گفتگو کرنی شروع کی اور مشورہ کیا کہ مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی اس بارے میں سید صاحبؒ سے گفتگو کریں اور جماعت کے ان خیالات کی اطلاع دیں۔ مولانا نے سید صاحبؒ سے عرض کیا۔ سید صاحبؒ نے آپ کو جواب دیا کہ: "ان دنوں اس سے افضل کام ہم کو درپیش ہے۔ اسی میں ہمارا دل مشغول رہے۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیاری ہے۔ اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ کام، یعنی، تحصیلِ علمِ سلوک اس کام کے تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزہ رکھے، تمام رات عبادت و ریاضت میں گزارے اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں میں ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی بھی بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلے میں بندوق لگاتے آنکھ نہ جھپکے، تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور وہ کام (سلوک و تصوف) اس وقت کا ہے، جب اس کام (تیاریِ جہاد) سے فارغ البال ہو۔ اب جو پندرہ سولہ روز سے نماز یا مراقبے میں دوسرے انوار کی ترقی معلوم ہوتی ہے، وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے۔ کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے، کوئی بندوق لگاتا ہے، کوئی پھری گدکا کھیلتا ہے، کوئی ڈنڑ پیلتا ہے۔ اگر ہم اس کام کی اس وقت تعلیم کریں، تو ہمارے یہ بھائی اس کام سے جاتے رہیں۔ یوسف جی، تم خود اپنا حال دیکھو کہ گردن ڈالے ہوئے ایک عالمِ سکوت میں رہتے ہو۔ اسی طرح اور لوگ بھی کوئی کمل اوڑھے مسجد کے کونے میں بیٹھا ہے، کوئی چادر لپیٹے حجرے میں بیٹھا ہے، کوئی جنگل جا کر مراقبہ کرتا ہے، کوئی ندی کنارے

(۱) "وقائع"، صفحہ ۴۴۰-۴۴۱۔ چنانچہ مہربان خاں حضرت کے متعلقین کی خدمت کے لیے سندھ میں رہے، پھر وہاں سے ان کے ساتھ ٹونک گئے اور باقی اکوڑہ کے پہلے ہی چھاپے میں شہید ہو گئے۔

گڑھا کھود کر بیٹھا رہتا ہے۔ ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا مشکل ہے۔ تم ہمارے بھائیوں کو سمجھاؤ کہ اب اسی کام میں دل لگائیں۔ یہی بہتر ہے۔ حاجی عبدالرحیم صاحب سے مشورہ کر کے جواب دو۔"

ایک عارف کی زبان سے سید صاحبؒ کی عظمت کا اعتراف

حاجی عبدالرحیم صاحب نے جب یہ سُنا، تو پہلے اپنا حال بیان کیا کہ جب مجھ کو حضرت سے بیعت نہ تھی، اپنے مشائخ کے طور و طریق پر تھا۔ چلّہ کشی کرتا تھا، جَو کی روٹی کھاتا تھا، موٹے کپڑے پہنتا تھا، صدہا میرے مُرید تھے اور جو درویشی کا طالب میرے پاس آتا، اس کو تعلیم کرتا تھا اور کسی سے کچھ غرض نہیں رکھتا تھا۔ جو کوئی مطلب کے لیے دو چار کوس یا ایک دو منزل لے جانے کی درخواست کرتا، فی اللہ چلا جاتا تھا اور میری نسبت کا یہ طور تھا کہ آدھ کوس یا کوس بھر سے کسی پر توجّہ کی نظر ڈالتا، تو اسی جگہ اُس کو حال آجاتا تھا اور بعض بعض باتیں مجھ میں اُن سے بڑھ کر تھیں اور میں اس حال میں بہت خوش تھا اور میرے مُریدوں میں بعض بعض صاحبِ تاثیر تھے باوجود ان سب باتوں کے جب اللہ تعالیٰ نے اِن سید صاحبؒ کو سہارنپور پہنچایا اور مجھ سے ملایا اور مجھ کو توفیق دی کہ میں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور آپ کا طریقہ دیکھا، اس وقت اپنے نزدیک مجھ کو یہ خیال ہوا کہ اگر میں اس حالت میں مرجاتا، تو میری بُری موت ہوتی۔ میں نے اپنے سب مُریدوں سے کہا کہ اگر تم اپنی عاقبت بخیر چاہتے ہو، تو ان سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت یا اس عقیدت سے میری ہی بیعت کرو اور جو نہ کرے گا، وہ جانے۔ میں نے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کا مواخذہ قیامت کے روز مجھ سے نہیں۔ پھر سب نے دوبارہ بیعت کی۔ سو میں نے تمام عیش و آرام اور ناموس و نام چھوڑ کر سید صاحبؒ کے یہاں کی محنت و مشقّت اور تنگی و کُلفت اختیار کی۔ اینٹیں بھی بناتا ہوں، ڈلیا بھی اُٹھاتا ہوں، گھاس بھی چھیلتا ہوں، لکڑی بھی چیرتا ہوں اور ہر طرح کے کام کرتا ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کاروبار کی بدولت جو نعمت دی اور خیر و برکت عطا کی، اس کے دسویں حصّے کے برابر اوّل معاملات کی تمام خیر و برکت کو نہیں پاتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو اُس راحت کو چھوڑ کر یہ محنت کیوں اختیار کی؟ سو میری صلاح اس بارے میں یہی ہے کہ تم اپنا سارا کاروبار

حضرت پر چھوڑ دو۔ وہی جو کچھ بہتر جان کر تم کو فرمائیں، اسی کو مانو اور اپنی بہتری اسی میں سمجھو اور اپنی ناقص رائے کو اس میں دخل نہ دو۔

حاجی صاحب چونکہ فنِ سلوک اور قوّتِ نسبت میں مسلّم تھے اور مشہور شیخ اور عارف تھے، اس لیے اُن کی تقریر سُن کر سب لوگ خاموش ہو گئے اور مقدّماتِ جہاد میں دل و جان سے مشغول ہو گئے۔ دن رات یہی مشغلہ تھا۔ بھر ماری، تیر اندازی کرتے، چو رنگ لگاتے اور فنونِ سپہ گری کی پوری مشق کرتے تھے۔(۱)

بیوہ کا نکاح بیوہ کا نکاحِ ثانی مسلمانوں کے اس دینی اور اخلاقی انحطاط کے دَور میں، جس میں مسلمان شرفا ہندوانہ رسم و رواج سے پورے طور پر متاثر ہو چکے تھے اور بہت جگہ شریعت کے بجائے نفس اور عرف و عادات کا دَور دورہ تھا، بڑے ننگ و عار کی بات اور خلافِ دأبِ شرفا سمجھا جاتا تھا۔ خافی خاں نے اپنے زمانۂ عہدِ محمد شاہی کے متعلق شہادت دی ہے کہ "در ہندوستان میانِ شرفاے اسلام کہ مراد از اصلِ مشائخ عرب است، ایں عمل (عقدِ بیوگان) در ہندوستان قبیح و عیب دانستہ ترک روّیۂ آباء و اجداد را کہ موافقِ حکمِ خدا و مطابقِ شرعِ محمّدی است نمودہ اند"۔ تیرھویں صدی کی ابتدا تک یہ کراہت و حقارت قلوب میں اس طرح جاگزیں ہو چکی تھی کہ یہ مسلمانانِ ہند کا ایک عرف اور رواج بن چکا تھا۔

اس کا اندازہ کرنے کے لیے کہ اس مسئلے نے کتنی اہمیت اختیار کر لی تھی اور اس کی مخالفت کتنی دشوار تھی اور یہ کہ بعض علما اس رواج کی حمایت میں تھے اور اس کے ثبوت میں فقہی دلائل اور نظائر پیش کرتے تھے، یہاں نکاحِ بیوگان کے سلسلے میں ایک استفتا اور تیرھویں صدی کے ایک عالم کے قلم سے اس کا جواب نقل کیا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۴۴۸ - ۴۵۴ (۲) یہ استفتا اور اس کا جواب "فتاویٰ عزیزی" میں درج ہے (ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزیؒ فارسی، جلدِ دوم از صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۱)۔ افسوس ہے کہ ان مفتی صاحب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ بعض اُمور ہندوستان میں اس دیار کے شرفائے اہلِ اسلام میں ابتدا سے آج تک برابر مروّج ہیں اور ظاہرًا شرع کے خلاف ہیں، مگر رسم و رواج کے موافق کہ ہر شہر کے لوگوں میں وہ امُور بطورِ رسم و رواج قرار پاگئے ہیں۔ لوگ اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں اور رسم و رواج کو شرع پر مقدم جانتے ہیں۔ چنانچہ منجملہ ان امُور کے ایک امر یہ ہے کہ بیوہ عورت کا نکاحِ ثانی کرنا قبیح جانتے ہیں، اس کا نکاحِ ثانی کرنے سے پرہیز رکھتے ہیں، حتّٰی کہ اگر بیوہ عورت نکاحِ ثانی پر راضی ہوجائے تو اس کے ولی شرافت کی غیرت سے ہرگز اس امر کو جائز نہ رکھیں گے، أَجِيبُوا، رَحِمَكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

اس استفتا کا جواب خاصا طویل ہے۔ یہاں اس کا اختصار اور انتخاب پیش کیا جاتا ہے:۔

جواب: "اَلْاَشْبَاهُ وَالنَّظَائِر" میں لکھا ہے کہ چھٹا قاعدہ یہ ہے کہ عادت حکم ہے یعنی، اس کے اعتبار پر شرعًا حکم کیا جاتا ہے، یعنی، عادت کا اعتبار کرنا احکامِ شرعیہ میں شرعًا ثابت ہے اور یہ قاعدہ اس اصل سے ثابت ہُوا ہے کہ آنحضرت، صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم، نے فرمایا ہے کہ مَارَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ، یعنی، جس امر کو اہلِ اسلام بہتر جانیں، اللّٰہ تعالیٰ کے نزدیک بھی وہ امر بہتر ہوگا اور ہندی نے "شرحِ مُغنی" میں لکھا ہے کہ عادت سے مراد وہ امر ہے کہ اس کا استقرار نفُوس میں ہوجائے اور وہ ان اموُر سے ہو کہ ان کا اعتبار چند مرتبہ سلیم طبائع کے نزدیک کیا گیا ہو۔[1]

جب اس مقدمے کی تمہید بیان کی گئی اور عرف اور عادت کے معنی ظاہر ہوئے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ اکثر مسائل اس بنا پر استخراج کیے گئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ عُرف شرع پر مقدّم ہے بشرطیکہ عُرف نص کی تصریح کے خلاف نہ ہو، تو جاننا چاہیے کہ پہلی صُورت کے بارے میں جواب یہ ہے کہ بیوہ عورتیں ایمان کی قُوّت سے اس قدر صابر اور اپنے نفس پر جابر ہوجائیں کہ

[1] اس موقع پر مفتی صاحب نے ان جزئیات کا تذکرہ کیا ہے، جن میں فقہا نے عرف کو معیار قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

غیرت کی وجہ سے نکاحِ ثانی سے پرہیز کریں اور اپنے لیے نکاحِ ثانی کو روا نہ رکھیں اس واسطے کہ
کفار اس بارے میں طعن کرتے ہیں کہ دُوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کیا جائے اور اس امر کو رذیل
اور خسیس قوم کی خصوصیت جانتے ہیں اور شرافت کے خلاف سمجھتے ہیں، تو ایسی حالت میں
ان بیوہ عورتوں کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ درجہ اور بلند مرتبہ ہوگا اور فی الجملہ ایسی
بیوہ عورتوں کو حضرت سرورِ کائنات ؐ کی ازواجِ مطہرات رضؓ کے حال کے ساتھ بہت مشابہت
اور اُن کی پیروی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ امتناع کی علت میں فرق ہے۔

اور بالفرض اگر وُہ نکاحِ ثانی پر راضی بھی ہو جائیں اور اُن کے ولی کی جانب سے
ممانعت ظہور میں آئے، تو اس میں بھی شرع کی مخالفت لازم نہیں آتی ہے، اس
واسطے کہ بعضے مقام اور بعضے امور میں اس لحاظ سے کہ اس میں کسی امر کے کرنے یا نہ
کرنے میں غیرت ہوتی ہو اور شرافت میں خلل آتا ہو اور اپنی طرف ایسی صفت
کی نسبت ہونے کا خوف ہو کہ باعتبارِ عُرف نہایت مذموم ہو، تو ایسی صُورت میں شرع
سے تجاوز کرنے کو علما نے مستحسن جانا ہے۔ چنانچہ یہ امر اس صحیح حدیث سے کہ مسلم میں
ہے مستنبط اور مستفاد ہوتا ہے اور وُہ حدیث یہ ہے:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ: وَلَوْ وَجَدْتُ
مَعَ أَهْلِي رَجُلًا، لَمْ أَمَسَّهُ حَتَّى آتِيَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، صَلَّى
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، نَعَمْ قَالَ: كَلَّا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ إِنْ كُنْتُ لَأُعَاجِلُهُ
بِالسَّيْفِ قَبْلَ ذٰلِكَ - قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اسْمَعُوْا إِلٰى
مَا يَقُوْلُ سَيِّدُكُمْ - إِنَّهُ لَغَيُوْرٌ وَأَنَا أَغْيَرُ مِنْهُ وَاللّٰهُ أَغْيَرُ مِنِّي يعنی
ابُوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ رضؓ نے کہا کہ اگر میں اپنے اہل کے ساتھ کسی مرد
کو پاؤں، تو کیا اس مرد سے تعرّض نہ کروں حتّٰی کہ چار گواہ لے آؤں؟ رسُول اللہ صلّی
اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "ہاں"۔ سعد بن عبادہ رضؓ نے کہا کہ "ہرگز نہیں، قسم ہے اُس

ذات کی کہ اُس نے آپ کو حق پر مبعوث فرمایا ہے کہ میں اس سے قبل اس کا علاج
تلوار سے کر دوں گا" یعنی اُس کو قتل کر ڈالوں گا۔" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم،
نے فرمایا کہ "سُنو وہ بات، جو تمھارے سردار کہتے ہیں۔ یہ نہایت صاحبِ غیرت
ہیں اور میں اُن سے بھی زیادہ صاحبِ غیرت ہُوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ صاحبِ
غیرت ہے"۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث کچھ کم تفاوت کے ساتھ وارد ہے۔ تو　۵
اس مقام میں سعد بن عبادہؓ نے غیرت کی نہایت زیادتی کی وجہ سے قتل کرنے کو اختیار
کیا اور اس مقام میں قتل کرنے کو اختیار کرنا شرع کی حد سے تجاوز کرنا ہے، مگر جناب
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعریف فرمائی اور فرمایا کہ سعد ایک صاحب
غیرت شخص ہیں اور میں اُن سے بھی زیادہ صاحبِ غیرت ہُوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے
بھی زیادہ صاحبِ غیرت ہے۔ اور دُوسری حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ　۱۰
علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "وَمِنْ غَيْرَتِهِ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَمَا بَطَنَ"، یعنی، اللہ تعالیٰ کی غیرت سے ہے کہ اس نے ظاہر و باطن
ہر طرح کے فواحش امُور کو حرام فرمایا۔ تو جس صُورت میں کہ بیوہ عورت کا نکاح صرف
مباح ہو، کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہوں، ایسا نہ ہو کہ اس کی خواہش کے لحاظ یا
زمانے کی حالت کے اعتبار سے ضروری ہو، تو ایسی صُورت میں اگر ولی کی طرف سے　۱۵
ممانعت وقوع میں آئے، تو حدِ شرعی سے تجاوز کرنے میں یہ اس قتل کرنے سے
زیادہ نہ ہوگا کہ سعد بن عبادہؓ نے اختیار کیا تھا۔[1]

علمائے مصلحین نے اس ذہنیت اور اس جاہلی حمیت کے خلاف اپنی زبان اور قلم
سے تبلیغ کی۔ خود حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے مذکورۂ بالا فتویٰ کا مدلل جواب لکھا اور اس
کی عالمانہ تردید کی۔[2] آپ نے فارسی میں نکاح بیوگان کے ثبوت و فضیلت اور اُس کو　۲۰

(۱) ترجمہ ماخوذ از "سرورِ عزیزی" مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۳۲ھ، صفحہ ۳۰۲ - ۳۰۴ (۲) ملاحظہ ہو "فتاویٰ عزیزی"
(فارسی)، صفحہ ۱۳۴ - ۱۳۸

فعل قبیح سمجھنے والوں کی مذمت و تردید میں ایک مؤثر رسالہ فارسی میں لکھا ہے(۱) خود حضرت سید صاحبؒ نے "صراطِ مستقیم" میں اس مُردہ سُنّت کو زندہ کرنے اور اس کی ترویج پر زور دیا ہے اور بیوہ کے نکاحِ ثانی کو قبیح سمجھنے کو ہندوؤں کی صحبت و اختلاط کا نتیجہ قرار دیا ہے(۲) لیکن مدّتوں کی اس متروک سنّت کے احیاء و ترویج اور صدیوں کے اس جاہلی خیال کے استیصال کے لیے یہ تحریریں، اصلاحی رسالے اور تقریریں کافی نہ تھیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ کوئی عظیم شخصیت اور مقتدائے زمانہ اپنے عمل سے اس سنّت کے اِحیا اور اِس جاہلی خیال کا اِبطال کرتا اور اس کی ایسی پُرزور دعوت دیتا کہ اس کی قباحت دلوں سے بالکل نکل جاتی اور اُس کا عمومی رواج ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اور دُوسرے عظیم الشان اصلاحی و تجدیدی کاموں کے ساتھ یہ عظیم الشان اصلاحی خدمت بھی، جس کا اثر سیکڑوں خاندانوں اور ہزاروں زندہ درگور عورتوں کی زندگی پر پڑتا ہے، سید صاحبؒ سے لی اور غیب سے اس کا سامان پیدا ہُوا۔

مولانا عبدالحی صاحب کا وعظ ایک مرتبہ مولانا عبدالحی صاحب نے شاہ علم اللہ صاحبؒ کی مسجد میں اس آیت پر وعظ فرمایا لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ(۳) (۲۲:۵۸)

یہ وعظ اس خطابت و فصاحت سے فرمایا کہ لوگ دنگ تھے۔ آپ نے ہندوستان کے تمام علما و مشائخ کے اعمال اس میزانِ عدل میں تولے اور سب کی کمزوریاں صاف صاف ظاہر کر دیں، یہاں تک کہ خاندانِ عزیزی تک نوبت پہنچی اور جو کمزوریاں اس خاندان میں

---

(۱) مجموعۂ رسائل قلمی، کتبخانۂ ندوۃ العلماء (۲) ملاحظہ ہو "صراطِ مستقیم" مجتبائی، صفحہ ۶۵ (۳) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، آپ اُن کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں، جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں، گو وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔

تھیں، آپ نے وُہ ظاہر کیں، یہاں تک کہ نوبت خاندانِ شاہ علم اللہؒ (سیّد صاحبؒ کے خاندان) تک پہنچی اور آپ نے اس خاندان کے جو اعمال آیت کے خلاف تھے، بیان کیے اور حضرت سیّد صاحبؒ نے اس کی تصدیق کی۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ: "حضرت، اگر آپ اپنے خاندان سے ایک بات دُور فرما دیں، تو اس آیت پر پُورا عمل ہو جائے"۔ سیّد صاحبؒ یہ بات سُنتے ہی بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور آپ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور کہا کہ: "مَیں خدا کا بندہ ہُوں، اُس کا اور اُس کے رسُولؐ کا تابع ہُوں۔ اس سے پہلے سہارنپور وغیرہ میں مَیں نے مولانا سے کہا تھا کہ اللہ اور اُس کے رسُولؐ کی اطاعت میں عزیزوں، رشتے داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہیں، اس کا حُکم بے کم و کاست ادا کروں گا اور کسی کی خوشی اور ناخوشی کا خیال نہیں کروں گا۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب (برادرزادہ) عزیز ہیں۔ دُنیا کی چیزوں میں سے جو چاہیں، لے لیں، لیکن اللہ کی اطاعت میں اُن کی رعایت نہیں کروں گا۔ میرے تمام رشتے دار صاف صاف سُن لیں کہ جو اللہ و رسُولؐ کی اطاعت میں میرے شریکِ حال ہوں، ادائے اوامر و اجتنابِ نواہی میں کسی کی طعن و ملامت کا خیال نہ کریں، وُہ میرے عزیز اور مجھے محبوب ہیں اور جو اس کے لیے تیار نہ ہوں، اُن کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔ صاف کہتا ہُوں کہ جو اللہ کے راستے میں مُستعد ہو، میرا شریک ہو اور جو چاہے، مجھ سے جُدا ہو جائے"۔ مولانا عبدالحی صاحب نے فرمایا کہ: "حضرت سے اسی کی اُمید تھی اور اسی لیے تمام مشائخ کو چھوڑ کر حضرت کا دامن پکڑا ہے"۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اور شاہ ابُوسعید صاحب خلیفۂ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم بھی حضرت کے ساتھ ہیں۔ یہ سُن کر مسجد میں غُلغُلہ بلند ہُوا اور لوگوں پر ایسی رِقّت طاری ہُوئی کہ زبان سے بات نہیں نکلتی تھی۔[1]

سیّد صاحبؒ کا خواب اس عرصے میں سیّد صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بڑا بھاری گٹھا ہے۔ بہت سے آدمی مل کر اُسے اُٹھانا چاہتے ہیں، مگر کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ آپ کی بھاوج (سیّد

(۱) "منظورۃ السُّعدا"

محمد اسحٰق صاحب مرحوم کی بیوہ) بھی موجود ہیں۔ سیّد صاحبؒ بعجز و انکسار اُن سے کہتے ہیں کہ اگر آپ بھی ہاتھ لگائیے، تو اُس کو گھر پہنچا دیں۔ اوّل تو بوجھل ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے عذر کیا، مگر آپ کے اصرار سے اُنھوں نے منظور کیا اور دونوں نے مل کر اُسے گھر پہنچا دیا۔

آپ کا معمول تھا کہ روزانہ نمازِ فجر کے بعد حلقے میں توجہ دیتے تھے۔ اس روز آپ نے اس کو ملتوی رکھا اور مولانا عبدالحیٔ اور مولانا اسمٰعیل سے فرمایا کہ آج مراقبہ نہیں ہوگا۔ آج مَیں نے عجیب خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر دیجیے۔

اُن حضرات نے خواب سُن کر فرمایا کہ آپ ہی تعبیر بھی دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کی تعبیر یہ ڈالی ہے کہ ایندھن جو کھانا پکنے کا ذریعہ ہے، انسان کی زندگی کا سبب ہے۔ زندگی دو طرح کی ہے: دُنیوی زندگی اور اُخروی زندگی۔ اتباعِ سُنّت ایسا طعامِ روحانی ہے جس سے حیاتِ اُخروی وابستہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بعض احکامِ شریعت، جو قرآن میں منصوص اور دیارِ عرب اور مرکزِ اسلام میں رائج ہیں، ہمارے ملک میں خصوصاً شرفا اور خاندانی لوگوں میں بالکل متروک، بلکہ سخت معیوب ہیں اور لوگ اُن کے منافع و برکات کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے اور ہندوستانی رسم و رواج کے پابند ہیں۔ اُنھیں شرعی احکام میں سے ایک اہم حکم بیوہ کا نکاحِ ثانی ہے، جس کے متعلق قرآن شریف میں صاف صاف موجود ہے وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ[1] (۲۴: ۳۲) انشاءاللہ اس سنّت کا اجرا اوّل اپنی ذات سے اور اپنے خاندان سے کروں گا۔ جب اپنے یہاں سے اس کی ابتدا ہو جائے گی تو پھر اپنے دوستوں اور اہلِ تعلّق سے اس کا مطالبہ کروں گا۔ قرآن شریف میں آتا ہے أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ[2] (۲: ۴۴)

یہ فرما کر آپ گھر تشریف لے گئے اور ان سب عزیز عورتوں اور مستورات کو جمع کرایا جن

---

(۱) اور تم میں جو بے نکاحے ہوں، تم اُن کا نکاح کر دیا کرو اور تمھارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس لائق ہو اُس کا بھی (۲) کیا غضب ہے کہ اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔

کا آپ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا اور صبح سے زوال تک اُن کے سامنے تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

"اسلام یہ نہیں ہے کہ زبان سے کہے کہ مَیں مسلمان ہُوں یا گائے کا گوشت کھائے یا ختنہ کرائے یا مسلمانوں کے مراسم میں شریک ہو اور اُن کی مجلسوں میں بیٹھے اسلام یہ ہے کہ اس کے تمام احکام کی تعمیل کرے یہاں تک کہ وُہ اپنے محبوب بچے کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح خوشی خوشی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے لیے تیار ہوجائے اور منہیات سے لے کر مکروہات تک اس طرح اجتناب و احتراز کرے کہ اگر اُن کا خیال بھی دل میں پیدا ہو، تو چالیس روز تک استغفار کرے۔ انھیں چیزوں میں سے بیواؤں کا دُوسرا نکاح نہ کرنا ہے، خصُوصًا وُہ بیوہ کہ جوان ہو۔ اُس کا نکاحِ ثانی کرنا ایسا بڑا گناہ سمجھنا، جیسا خدا کے یہاں کُفر و شرک ہے اور جو بیوہ اپنا نکاح کرلے، اُس کو بازاری عورت اور بے حیا سمجھنا اور قحبہ کا خطاب دینا اور اُس کو مطعون و بدنام کرنا اور ساری عمر بیوہ کو زندہ درگور کر دینا اسی قبیل سے ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ حضرت صدیقہؓ کے سوا تمام اُمہات المؤمنین بیوہ تھیں۔"

آپ نے یہ وعظ ایسے جوش و اثر سے کہا کہ اہلِ مجلس میں سے اکثر مدہوش ہوگئے اور زار و قطار روئے اور ایک دن اور آپ نے اسی طرح تقریر کی۔ اپنی خالہ صاحبہ سے (جو مولانا سید محمد اسحٰق صاحب کی بیوہ کی پھوپھی تھیں) خاص طور پر بڑی منت و سماجت سے کہا کہ: آپ کسی طرح والدۂ اسمٰعیل کو اس سُنت کے احیا اور نکاحِ ثانی کے لیے آمادہ فرمائیں۔ آپ کو خُوب معلوم ہے کہ یہ رشتہ مَیں حظِ نفس کے لیے نہیں کرتا، محض سنت کے جاری کرنے اور ہندوستان کی ایک رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لیے کرنا چاہتا ہُوں"۔ غرض، دو تین مہینے اسی کوشش میں صرف ہوگئے۔ آخر کار اعزا اور خُود مخدُومہ راضی ہوگئیں اور ایک مدت دراز

کے بعد ہندوستان میں شرفا کے خاندان میں یہ مبارک تقریب ہوئی۔[1]

سید صاحبؒ نے اس پر اکتفا نہیں کی، بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور اپنے خلفا کے نام شاہ اسمٰعیل صاحب سے خط لکھوائے، جس میں اس واقعے کی اطلاع اور سنّت کی ترغیب دی۔ چنانچہ جواب میں خطوط آئے کہ اس پر عمل کیا گیا اور یہ سنّت جاری ہو گئی۔[2]

نصیر آباد کا ہنگامہ قصبۂ نصیر آباد رائے بریلی سے دس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سید صاحبؒ کے اجداد کا وطن اور آپ کے خاندان کا ایک مسکن ہے۔ مولوی دلدار علی صاحب پہلے شیعہ مجتہد یہیں کے رہنے والے تھے۔ ۶ محرّم کو نصیر آباد کا ایک آدمی خط لے کر آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس سال نصیر آباد کے اکثر سُنّی سادات و شرفا اپنی ملازمتوں اور ضروری کاموں پر گئے ہوئے ہیں۔ قصبے میں بہت کم اہلِ سُنّت رہ گئے ہیں۔ قصبے میں شیعہ حضرات کی بڑی آبادی ہے اور خاص طور پر محرّم میں جو لوگ باہر ہوتے ہیں، وہ بھی گھر آ کر محرّم کرتے ہیں۔ مجتہد صاحب کے وطنی تعلق اور سلطنت کی سرپرستی اور حمایت کی وجہ سے یوں بھی اُن کو قوّت حاصل تھی۔ اس سال سب نے اتّفاق کیا کہ تبرّا علانیہ کہا جائے۔ سُنّیوں سے اُنھوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر آپ کی دل آزاری ہو، تو ایک روز کے لیے اہل وعیال کو لے کر قصبے سے باہر چلے جائیں۔ یہ اطلاع پا کر مشورہ کیا گیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ نصیر آباد کے بھائیوں نے بڑی منّت کے ساتھ استدعا کی تھی کہ آپ اس موقع پر تشریف لے آئیں تا کہ یہ قصّہ دفع ہو۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ اپنے بھائیوں کی ضرور مدد کرنی چاہیے۔ بعض کہتے تھے کہ یہ سلطنت سے براہِ راست ٹکر ہے۔ اس موقع پر خاموش ہی رہنا چاہیے۔ لیکن سید صاحبؒ نے چلنے کا فیصلہ فرمایا اور اہلِ قصبہ کو اطلاع بھیج دی کہ آپ سب مطمئن رہیے، ہم سب آتے ہیں۔

نصیر آباد کو روانگی میاں دین محمد کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے بُلا کر فرمایا کہ ہم نمازِ عصر راستے میں پڑھیں گے، تم جلد اپنے لوگوں کو گولی بارود تقسیم کر دو اور کچھ گولیاں اور بھی بنا لو اور بریلی اور

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۴۴ (۲) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۴۵

جہان آباد والوں کو کہلا بھیجو کہ کمر کس کر نصیر آباد چلنے کی تیاری کریں اور ایک مزدور کے سر پر دیگ رکھوا کر آگے روانہ کر دو۔ عصر کے قبل حضرت گھوڑے پر سوار ہو کر اور لوگوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ کوئی چند قدم چل کر ٹھیر گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے کہ "کچھ خرچ تمھارے پاس ہے؟" میں نے عرض کیا کہ کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خیر، کچھ مضائقہ نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، مگر بنیے سے کہتے چلو کہ دو روپے کے چاول ہمارے یہاں پہنچا دے۔ یہ کہہ کر آپ روانہ ہوئے۔ اس عرصے میں آپ کے دولت خانے سے مجھ کو ایک ملازمہ نے آواز دی کہ ذرا یہاں کھڑکی کے پاس آؤ۔ اس وقت بی بی سارہ کی والدہ صاحبہ نے پیروں کے دو نقرئی کڑے مجھ کو دیے کہ ان کو بیچ کر خرچ کرنا۔ میں نے تھیلے میں ڈال لیے۔ اس عرصے میں سید محمد اسمٰعیل صاحب کی والدہ آکر فرمانے لگیں کہ کڑوں کی وہ جوڑی اُن کو پھیر دو۔ میں روپے لائی ہوں، وہ لے جاؤ۔" میں نے وہ کڑے اُن کے حوالے کر دیے۔ انھوں نے مجھے پچیس روپے دیے۔

عصر کی نماز پڑھ کر آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ آگے چل کر مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر وہاں سے آگے عشا کے وقت ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے اُترے۔ نماز عشا ادا کی اور فرمایا کہ "اب اس وقت رات کو ستر پچھتر آدمی ہیں۔ چلنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ یہیں لیٹ بیٹھ رہو۔ فجر کی نماز پڑھ کر چلیں گے۔" پھر سب رات کو وہیں رہے۔ اوّل فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوئے۔ کوئی دو تین گھڑی دن چڑھا ہو گا کہ بآواز بلند تکبیر کہتے ہوئے نصیر آباد میں داخل ہوئے۔ دیوان جی کی مسجد میں چبوترے پر سید محمد مستقیم صاحب سپر تلوار باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ حضرت کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور لوگوں کو پکار کر کہنے لگے: "سید صاحبؒ بریلی سے آ پہنچے۔" یہ خبر سن کر سب سُنّی، جو اپنے دلوں میں مایوس اور پژمردہ تھے، گویا زندہ ہو گئے اور اپنے گھروں سے نکل کر آپ کے پاس حاضر ہوئے۔[1]

---

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۴۸۴ - ۴۹۰

نصیر آباد میں سید صاحبؒ اسی دیوان جی[1] کی مسجد میں اُترے اور اپنے لوگوں سے بتاکیدِ مزید فرما دیا کہ خبردار، کوئی یہاں سے نہ جائے اور فرقۂ ثانی میں سے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ اُدھر شیعوں سے کہلا بھیجا کہ ہمارے آدمی آپ کی طرف نہ آئیں گے اور آپ کی طرف کے جو آدمی ہماری طرف آئیں گے، ہمارے آدمی اُن کے مزاحم نہ ہوں گے۔ محرّم کی تعزیہ داری اور گریہ و زاری وغیرہ جس طرح آپ کرتے آئے ہیں، کریں۔ ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ مگر سابق دستور سے کوئی نئی بات نہ کریں۔

اس کے جواب میں انھوں نے کہلا بھیجا کہ اب کی سال ہم تمھارے سبب سے تعزیہ داری "موقوف" کریں گے اور آج اپنے عَلَم و نشان نہ نکالیں گے۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ اس کا آپ کو اختیار ہے۔ چاہے کریں؛ چاہے نہ کریں۔ اس میں ہماری طرف سے کچھ نہیں ہے۔

ادھر اطراف و جوانب سے اہلِ سنّت کی آمد جاری تھی۔ دو چار دن میں بہت بڑی تعداد میں اطراف کے مسلمان جمع ہو گئے۔ حضراتِ شیعہ حاکمِ نصیر آباد کے پاس وفد لے کر گئے اور کہا کہ "رائے بریلی کے سید صاحبؒ نے آکر ہمارے تمام علم اور مراسمِ محرّم کو زبردستی روک دیا ہے اور ہمارے مذہبی فرائض میں مداخلت کرتے ہیں"۔ حاکم اس بیان سے بہت متاثر ہوا، لیکن قصبے کے دوسرے سادات و شرفا نے اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ ہرگز مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتے اور ماتم و عَلَم دسینہ کوبی سے مانع نہیں۔ اس لیے یہ استغاثہ صحیح نہیں۔ دستورِ قدیم سے زائد کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہم سب کا بھی متفقہ مطالبہ ہے۔ ہم سید صاحب کے بھائی اور مُرید اور اُن کے جان و مال سے شریک ہیں۔ اُن سے علیحدہ نہیں۔ عامل کے لشکر میں جتنے اہلِ سنّت تھے، اُن سب نے بھی اس کی تائید و حمایت کی۔ حاکم نے حالات کی نزاکت کو محسوس کیا اور حکم دیا کہ دستور کے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

---

(۱) دیوان سید خواجہ احمد صاحبؒ جو شاہ علم اللہ صاحبؒ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور اُستاد تھے۔ اپنے زمانے کے نامور علما و صلحا میں سے تھے۔ حضرت سید آدم بنوریؒ سے بیعت کا تعلق تھا۔ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی اور اپنی مسجد کے دروازے کے قریب مدفون ہوئے۔

اہلِ تشیّع نے اس روز احتجاجاً اپنے علَم نہیں اُٹھائے اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ قصبے میں امن و سکون رہا اور محرّم کی وُہ تاریخیں گزر گئیں، جن میں فساد کا اندیشہ تھا۔

اس عرصے میں ایک روز اہلِ قصبہ نے سیّد صاحبؒ کے رفقا اور باہر کے آنے والوں کی ضیافت کی۔ دُوسرے روز سیّد صاحبؒ ہی کی طرف سے سب کے کھانے کا اہتمام رہا۔ دو روز میں سوار اور پیادے سب ملا کر دو سو آدمی کے قریب ہو گئے تھے۔ سب آسُودہ ہو کر کھاتے رہے　۵

۱۳ محرّم کو سیّد صاحبؒ اپنے رفقا کے ساتھ رائے بریلی واپس تشریف لے آئے۔[1]

نصرت و برکت میاں دین محمّد کہتے ہیں، آپ کوئی دو ڈھائی کوس آئے ہوں گے۔ وہاں میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے کہ کہو، کیا حال ہے؟ میں نے کہا: "الحمدللّٰہ، اللّٰہ تعالیٰ نے بڑا احسان فرمایا کہ خیر کے ساتھ لے چلا اور مُفسدوں کے فساد سے محفوظ رکھا۔" فرمایا: "بے شک　۱۰ اس کا احسان ہے۔ ہر شور و شر سے مامُون رکھا۔" تھوڑی دیر چل کر پھر فرمانے لگے کہ: "کہو کیا حال ہے؟" میں نے کہا: "جو آپ فرمائیں، عرض کروں۔" فرمایا: "تم پر قرض کس قدر ہُوا ہو گا؟" میں نے کہا کہ: "اس حال کی مُجھ کو خبر نہیں۔ اللّٰہ کو معلُوم ہے یا آپ جانیں۔" فرمایا: "سچ ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ ہی خُوب جانتا ہے۔ ہم نہ کہیں کے حاکم، نہ ہمارے پاس کوئی مُلک، نہ کہیں خزانہ۔ ایک عاجز فقیر ہیں۔ وُہ محض اپنے فضل و احسان سے ہماری پرورش کرتا ہے۔"[2]　۱۵

تکیے واپس آ کر کھانا پکنے اور کھانے والوں کا وُہی طور رہا کہ دونوں میں کوئی نسبت نہ تھی۔ جو لوگ ہمراہ تھے اور جو مبارکباد اور ملاقات کے لیے آتے تھے، وُہ آسُودہ ہو کر کھاتے۔ ایک روز آپ نے فرمایا: "الحمدللّٰہ، یہ اللّٰہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کھانا کھانے سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا، صرف اللّٰہ تعالیٰ کی قدرت سے بھرتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ کی خیر و برکت ہمارے شاملِ حال ہے، نہ ہمارے پاس مُلک، نہ خزانہ، ہم غریبوں محتاجوں کی وہی اپنے فضل و کرم سے　۲۰

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۴۸۶ - ۴۹۷ باختصار　　(۲) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۴۹۹

پرورش کرتا ہے۔"[1]

دوبارہ نصیر آباد کو

چہلم (۲۰ صفر) کے قریب پھر نصیر آباد کے اہلِ سنّت نے آپ کو اطلاع بھیجی کہ پھر بلوے کا اندیشہ ہے۔[2] اہلِ تشیّع نے طے کیا ہے کہ اس چہلم میں ضرور تبرّا کہتے ہوئے تعزیہ اور علَم لے کر سُنّیوں کے محلّے سے گزریں گے اور جو سُنّی اس میں مزاحم ہوگا، اس کو زد و کوب کریں گے۔ اگرچہ اس مرتبہ سُنّی بھی یہ خبر سُن کر اپنی اپنی نوکری سے رخصت لے کر آئے ہیں، مگر اہلِ سُنّت کی نسبت اہلِ تشیّع کی جماعت بہت ہے اور آپ سے درخواست کی کہ اس موقعے پر نصیر آباد ضرور تشریف لائیں۔ آپ نے اُن کو جواب دیا کہ پریشان نہ ہوں، ہم اِن شاء اللہ تعالیٰ ضرور آئیں گے۔

نصیر آباد پہنچ کر آپ نے اپنے ہمراہیوں سے تاکید فرمائی کہ خبردار، کوئی شیعوں کے محلّے میں سیر اور تماشے کے لیے بھی نہ جائے، نہیں تو ہم اس کو سزا دے کر اپنے یہاں سے نکال دیں گے اور اُن کے یہاں سے جو لوگ ہماری طرف آئیں، اُن سے کوئی مزاحم نہ ہو، بلکہ محبت اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے اور جس کو یہ بات منظور نہ ہو، وہ اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہے۔

اِسی طرح قصبے کے سُنّیوں سے کہہ دیا تھا کہ تمہارا کوئی آدمی ہماری اجازت کے بغیر کہیں چھیڑ چھاڑ اور جھگڑا نہ کرے، بلکہ اُن میں سے اگر کوئی سخت سُست کہے، تو سُن کر خاموش رہے اور کوئی لایعنی بات زبان سے نہ نکالے۔ آپ لوگوں نے جب ہم کو بلایا ہے، تو ہماری رائے سے کام ہونا چاہیے۔

اُدھر آپ نے شیعہ معززین اور قصبے کے سربرآوردہ اہلِ تشیّع کے پاس ایک معمّر اور معقول شخص کی زبانی پیغام بھیجا کہ میں مہمان ہوں اور آپ کا بھائی۔ ہر محلّے کے بڑے آدمیوں

(۱) "وقائع" صفحہ ۵۰۲ (۲) "وقائع" میں صراحۃً مذکور ہے کہ محرّم کے بعد چہلم کے موقع پر اہلِ نصیر آباد نے پھر سیّد صاحبؒ کو زحمت دی۔ "منظورہ" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اودھ میں چہلم عاشورۂ محرّم سے کم اہم نہیں اور اسی اہتمام اور دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

میں سے ایک ایک صاحب یہاں آنے کی زحمت گوارا فرمائیں یا مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے رشتے داروں سے مل بھی لوں۔ چنانچہ بعض بعض معزّزین ایک ایک، دو دو کر کے آپ کے پاس آنے لگے۔ آپ ہمیشہ کی طرح ہر ایک سے خوشِ اخلاقی اور محبت سے پیش آئے اور اُن سے اچھی اچھی صلاحیت کی باتیں کیں۔

اہلِ تشیّع کے جو بااثر اور سربرآوردہ اصحاب آپ کے پاس آئے تھے، آپ اُن کو سمجھاتے تھے کہ ہماری آپ کی قدیم زمانے سے ایک بستی میں بود و باش ہے۔ ایسے شر و فساد سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے خُونریزی کی نوبت آئے۔ جس طرح آپ ہمیشہ محرّم اور تعزیہ داری کرتے آئے ہیں، اُسی طرح کرتے رہیں، زیادتی نہ کریں۔ وُہ کہتے تھے: "آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح کا فساد نہ ہو۔ ہماری طرف چند مُفسد ہیں۔ وُہی شرارت کرتے ہیں"۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ بات صرف سیّد صاحبؒ سے کہتے تھے، ورنہ تمام اہلِ تشیّع کے جذبات مشتعل تھے اور اُن کا رویّہ اس موقع پر بالکل غیر مصالحانہ تھا اور وُہ اس بات پر مُصر تھے کہ اس چہلم میں وُہ آزادی کے ساتھ کارروائی کر سکیں۔(۱)

تائیدِ غیبی شیعہ اہلِ قصبہ نے مقامی حاکم کے یہاں کامیابی نہ دیکھ کر ایک سوگوار اور عزادار وفد ماتمی لباس میں لکھنؤ روانہ کیا اور اس سال محرّم کی سب رُسومات موقوف کر دی گئیں۔ اس وقت نصیر آباد سلون کے علاقے میں تھا اور یہ علاقہ بادشاہ بیگم کی جاگیر میں تھا۔ وفد نے بادشاہ بیگم کی سرکار میں استغاثہ دائر کیا۔ وہاں سے حاکمِ نصیر آباد کے نام سُنّیوں کی سرزنش اور اُن کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا فرمان صادر ہو گیا۔ یہ اطّلاع پاکر فقیر محمد خاں(۱) رسالے دار اپنے چند دُوسرے دوستوں کے ساتھ معتمد الدولہ کی سرکار میں پہنچے اور ان تمام حالات کی اطّلاع دی۔ نوّاب اس وقت بادشاہ کی خدمت میں جا رہے تھے۔ اُن کے اور بیگم صاحبہ کے درمیان پہلے سے سخت اختلاف اور رنجش تھی اور وُہ عرصے سے اس بات کے متمنّی تھے کہ کوئی

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۵۰۵-۵۱۳

تقریب پیدا ہو، تو یہ عظیم الشّان جاگیر ضبط ہو جائے۔"(۱) اُنھوں نے بادشاہ سے جاکر عرض کیا کہ سیّد صاحبؒ جو اس شہر میں قیام فرما چکے ہیں اور چھاؤنی اور شہر کے ہزاروں ہزار مسلمان اُن کے مرید ہوئے ہیں اور جن کے وعظ و نصیحت کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے، یہاں تک کہ حضورِ پُرنور نے بھی اُن سے ملاقات کا شوق ظاہر فرمایا تھا،(۲) معلوم نہیں، بیگم صاحبہ نے کیا سمجھ کر اپنے عامل کو اُن کے اور اُن کی پوری برادری کے قلع قمع کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ میں تو بیگمات کے معاملے میں کچھ نہ بولتا، مگر کیا کروں کہ خاموش رہنا بھی مصلحت نہیں۔ ایک بڑا ہنگامہ اور ایک زبردست فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ تمام لشکر سیّد صاحبؒ کا حلقہ بگوش اور فدائی ہے۔ سرکار کی سُنّی رعایا بھی اُن کی معتقد ہے۔ عامل غریب کو اتنی طاقت کہاں کہ وُہ اتنی بڑی قوت اور جمعیّت کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔ اس کو تو اپنی جان بچانا ہی مشکل ہے اور خدا کرے کہ یہ فتنہ محض مقامی حکّام وغیرہ پر ختم ہو جائے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس آگ کے شعلے کہیں لکھنؤ تک نہ پہنچیں۔ اس وقت اس آگ کا بجھانا ہم خدام کے بس کی بات نہیں۔ یُوں حضور سلطنت کے مالک ہیں۔ جو مناسب سمجھیں، حکم فرمائیں۔ بادشاہ نے سب سُن کر فرمایا کہ جو کارروائی تم مناسب سمجھو، وُہ بلا تاخیر کرو اور کسی نہ کسی طرح اس فتنے کو فرو کر دو۔

نواب معتمد الدولہ نے مکان پہنچتے ہی فقیر محمد خاں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اخونزادے

(۱) بادشاہ بیگم اور خود غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے تعلقات حد درجہ کشیدہ تھے۔ اس کشیدگی اور بادشاہ بیگم اور معتمد الدولہ کی باہمی مخالفت اور آویزش کی پوری تفصیل اور بادشاہ بیگم کے مفصّل حالات منشی عبد الاحد سبط ابن مولوی محمد فائق نے، جو عہدِ غازی الدین حیدر میں ریذیڈنسی سے متعلق تھے، اپنی فارسی تاریخ "وقائع دلپذیر" (قلمی مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور) میں قلمبند کیے ہیں۔ اس نایاب کتاب کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر تقی احمد کاکوروی نے "تاریخ بادشاہ بیگم" کے نام سے کیا ہے۔ (۲) اس گفتگو سے اور بعض دوسری عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نصیر آباد کی مہم یقیناً سفرِ لکھنؤ کے بعد پیش آئی۔ "وقائع" میں بھی ایسے اشارے موجود ہیں۔

کو پانچ سو سوار اور پیادہ فوج کے ساتھ نصیر آباد روانہ کرو کہ بیگم صاحبہ کا عامل کوئی احمقانہ کارروائی اور اہلِ سنّت کے خلاف کوئی اشتعال انگیز بات نہ کرنے پائے۔ روانگی کے وقت نوّاب صاحب نے دس ہزار روپے اور فقیر محمد خاں نے دو ہزار روپے اخونزادے کو دیے کہ سیّد صاحبؒ کی خدمت میں ضروری فوجی مصارف کے لیے پیش کیے جائیں۔(۱)

اس واقعے کی تمام لکھنؤ میں شہرت ہو گئی۔ مجتہد صاحب نے خُفیہ پیغام بھیجا کہ اس وقت سیّد صاحبؒ سے مقابلہ اور مخالفت بالکل خلافِ مصلحت ہے۔ حالات نہایت دگرگوں ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ اس وقت کسی نہ کسی طرح مصالحت کر لی جائے۔ چنانچہ حضراتِ شیعہ نے صلح کی پیش کش کی۔ سیّد صاحبؒ نے اسے منظور کیا اور تجویز کیا کہ وہ اس اقرار اور وعدے کا ایک محضر لکھ دیں کہ آئندہ وہ احتیاط کریں گے اور اشتعال انگیز باتوں سے مجتنب رہیں گے۔ چنانچہ اس مضمون کے دو محضر تیار کیے گئے۔ قاضیِ شہر اور مُفتی نے اس پر دستخط کیے۔ ایک محضر لکھنؤ روانہ کر دیا گیا اور ایک سیّد صاحبؒ کے پاس محفوظ رہا۔(۲)

اخونزادہ نصیر آباد کے قریب پہنچا، تو سیّد صاحبؒ نے باہر نکل کر اُن کا استقبال کیا۔ اخونزادہ گو یا شمشیرِ برہنہ تھا۔ عرض کیا کہ "ہمیں معتمد الدولہ نے آپ کی خدمت میں اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کے حکم کے مطابق فتنہ انگیزوں کا قلع قمع کیا جائے۔ ہمیں آپ کے حکم کا انتظار ہے۔" سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ خُونریزی و فساد کا اندیشہ نہیں رہا اور فریقین میں مصالحت ہو گئی ہے۔ اخونزادے نے چند روز قیام کیا، جس میں اُس کو اور اہلِ لشکر کو دینی و باطنی استفادے کا موقع ملا۔(۳)

اخونزادے اور اُس کے لشکر کی آمد کی خبر سُن کر سیّد صاحبؒ کے پاس شیعہ معززین آئے اور کہا کہ قصبے کے باہر ہمارے موٹھ، جوار وغیرہ کے کھیت ہیں۔ ہم کو اندیشہ ہے کہ وہ سارے کھیت اُن کے گھوڑوں سے پامال ہو جائیں گے اور سارا غلّہ اُن کے گھوڑے

(۱) "منظورۃ السعدا" (۲) "منظورۃ السعدا" (۳) "منظورۃ السعدا" و "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۵۲۰ - ۵۲۳

کھا کر اور پیروں سے روند کر برباد کر دیں گے اور ہمارا سخت مالی نقصان ہوگا۔ آپ نے اُن کو اطمینان دلایا اور اخوند زادے کو کہلا بھیجا کہ ہمارے اور شیعوں کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ ان کے جوار اور موٹھ وغیرہ کے کھیت میں تم میں سے کسی کا گھوڑا ٹٹو نہ جانے پائے۔"(۱)

لشکرِ لکھنؤ کی آمد کی اطلاع سُن کر قرب وجوار کے مسلمانوں اور مختلف فوجی عہدہ داروں نے پیغامات بھیجے کہ ہم بھی سامانِ جنگ اور توپ خانے کے ساتھ پہنچ کر آپ کی امداد کریں گے۔ آپ نے اُن کو بتاکید کہلا بھیجا کہ آپ کے زحمت فرمانے کی بالکل ضرورت نہیں، ہماری خوشی اسی میں ہے کہ آپ اپنی جگہ رہیں۔(۲)

اس عرصے میں تمام ہمراہیوں اور وارد و صادر کی ضیافت سید صاحبؒ ہی کی طرف سے ہوتی رہی۔ "وقائع" میں ہے کہ کسی روز چھ سو آدمی کھاتے تھے۔ ایک روز نو سو آدمیوں نے کھانا کھایا۔(۳)

کھانے کی جو مقدار پکتی تھی، اُس کو کھانے والوں کی تعداد سے کوئی مُناسبت نہ تھی، لیکن لوگ شکم سیر ہو جاتے اور کھانا بچ جاتا۔ اخوند زادہ آیا، تو وُہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ ان فقرا کا مہمان ہُوا۔ اخوند زادے نے اس منظر کو دیکھ کر تعجب کیا، تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ: "ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے محتاج بندے ہیں، نہ کہیں کے حاکم، نہ مالک۔ اتنا کھانا کہاں سے لاتے جو اتنے لوگوں کو کھلاتے؟ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کے کھانے میں اپنے فضل وکرم سے اسی طرح برکت کرتا ہے۔"(۴)

اخوند زادے نے اور اُس کے لشکر کے سو سواروں نے سید صاحبؒ سے بیعت کی اور لکھنؤ واپس گیا۔ معتمد الدولہ اور فقیر محمد خاں کی رقمیں آپ نے واپس کر دیں۔ فرمایا: "ہم اُن کے حق میں دُعا کریں گے۔ ان رقموں کی ضرورت نہیں۔"(۵)

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۵۱۸ (۲) "منظورہ" (۳) "وقائع"، صفحہ ۵۵۲

(۴) "وقائع"، صفحہ ۵۲۷ (۵) "وقائع"، صفحہ ۵۲۳

اس موقع پر لوگوں نے سید صاحبؒ کے حزم، تدبر، معاملہ فہمی، ضبط و اعتدال اور فوجی تنظیم اور قابلیت کا نمونہ دیکھا اور اس طرح لوگوں کو سید صاحبؒ کے حلقۂ اثر کی وسعت اور اُن کے رسوخ اور اعزاز کا اندازہ ہوا۔ نصیر آباد پہنچ کر آپ نے قصبے میں مورچال قائم کردی اور پورے شہر پر ایسا فوجی ضبط و نظام قائم رکھا، جو آزمودہ کار فوجی تربیت یافتہ اشخاص ہی کر سکتے ہیں۔ پھر اپنی طرف سے اشتعال انگیز اور بیجا کارروائی نہیں ہونے دی۔ ۵

مولانا اسمٰعیل شہید فرماتے تھے کہ نصیر آباد کا واقعہ جہاد کا مقدمہ تھا، جس میں لوگوں نے سید صاحبؒ کی قیادت اور انتظامی صلاحیت کے سب سے پہلے جوہر دیکھے، تائید غیبی اور سید صاحبؒ کی مقبولیت کے کھلے واقعات بھی اس قیام کے زمانے میں بکثرت پیش آئے، جن سے لوگوں کو سید صاحبؒ کی وجاہت و قبولیت کا پورا اندازہ ہوا۔[1]

---

(۱) "منظورۃ السعدا"

نواں باب

حج کا عزم اور اُس کی تبلیغ

حج کا شوق و ولولہ محبّت و شوق و جذبِ الٰہی کا، جس کی تربیت چوبیس گھنٹے ہوتی تھی، اب شدید تقاضا تھا کہ حج کو چلیے۔ صبر کی طاقت نہیں۔ کانوں میں حضرت ابراہیم، علیہ السّلام کی دعوت و اعلان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "بر درِ در" بھی اتنا کیا جا رہا تھا کہ "درونِ در" آنے کی اجازت ہو سکتی تھی۔[1]

حج کی عدمِ فرضیت کا فتنہ حج علما کی تاویلوں اور اُس فقہی عذر کی وجہ سے کہ راستے میں امن نہیں ہے اور سمندر بھی مانعِ شرعی اور مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا کے منافی ہے، اس لیے فرض نہیں ہے اور اس حالت میں حج کرنا فرمانِ خداوندی وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کی مخالفت ہے، کچھ مدت سے بالکل متروک یا بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی دینی تحریف اور ایک بڑا فتنہ تھا، جس کا اگر بروقت استیصال نہ کیا جاتا، تو اس کا استیصال مشکل تھا اور اسلام کے اِس عظیم الشّان فریضے اور دین کے اِس رُکن کو دوبارہ زندہ کرنے میں مستقل تجدید و جہاد کی ضرورت پیش آتی۔

بعض علمانے جن کو علومِ عقلیہ میں زیادہ غلو اور انہماک تھا، حج کی عدمِ فرضیت اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ذمّے سے اس کے ساقط ہو جانے کا باضابطہ فتویٰ دے دیا تھا۔ لکھنؤ کے ایک دیندار مسلمان منشی خیر الدین صاحب (سرائے معالی خاں) نے اس بارے میں ایک

---

(۱) بطوافِ کعبہ رفتم، بحرم رہم ندادند کہ بروںِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی؟

استفتا مرتب کیا۔ چند علما نے حج کی عدم فرضیت کا فتویٰ دیا۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب نے مدلّل اور پُر زور طریقے پر اس فتوے کی مخالفت کی اور حج کی فرضیت کا فتویٰ لکھا۔ منشی صاحب نے یہ فتوے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دہلی بھیجے شاہ صاحبؒ نے اس کا جو جواب دیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فتنے نے کتنی قوت حاصل کرلی تھی۔(۱)

شاہ صاحبؒ نے منشی صاحب کو لکھا کہ جن لوگوں نے حج کی عدم فرضیت کا فتویٰ دیا ہے، اُن کی نظر دینیات و فقہ و اصُول پر نہیں ہے۔ ان کو صرف معقولات میں غلو ہے۔ چند مشہور اور غیر معتبر فتاویٰ پر اُن کے علم کی بنیاد ہے۔ اگر اُن کے افتا پر اعتماد کیا اور عمل شروع کر دیا جائے، تو گمراہی کا دروازہ کھل جائے اور احکام و فرائضِ دین اور ارکانِ اسلام معطّل ہو جائیں۔ آج حج ساقط ہوتا ہے، کل روزہ، پرسوں نماز کی باری ہے اور زکوٰۃ تو اس سے زیادہ خطرے میں ہے۔

اس کے بالمقابل آپ نے مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل کے جوابات کی بڑی قوّت سے تائید فرمائی اور اُن کی مدح و توصیف کی اور فرمایا کہ اُن کے دستخط اور فتوے کی صُورت میں مجھ سے رجُوع کرنا کچھ ضرور نہ تھا۔ اُن کے دستخط گویا اس فقیر کے دستخط ہیں۔ عُلُومِ دینیہ و عقلیہ میں ان دونوں کا پایہ فقیر سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر اس سے اپنی تعریف نکلتی ہے، لیکن امرِ حق کا اظہار واقفِ حال کے لیے ضروری ہے۔

---

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی کے آخر تک بعض علما کو اس مسئلے میں شبہہ رہا۔ مولانا خرم علی صاحب بلہوری غایۃ الاوطار، اردو ترجمۂ "دُرِّمختار"، جلد اوّل (تصنیف ۱۲۶۱ھ) میں شرائطِ حج کے باب میں لکھتے ہیں:۔

"اور جس مُلک سے جہاز کی سواری کے بغیر حج نہ ہو سکتا ہو، مثلاً ہندوستان سے، تو ایسے مُلک کے سقُوطِ حج میں اختلاف ہے۔ کرمانی نے کہا کہ اگر سمندر میں سلامتی غالب ہو اور اس کثرت سے جہاز کی سواری مروّج ہو، تو حج واجب ہے اور اگر سلامتی کا غلبہ نہیں، تو حج بھی واجب نہیں اور یہی قول اصح ہے کذا فی منح الغفار۔

بالفعل ہندوستان میں خشکی اور تری میں امنِ راہ بخُوبی حاصل ہے اور جہاز رانی کی مشق نصاریٰ کے اختلاط کے باعث جو اب حاصل ہے کبھی نہ تھی۔ اب اہلِ ہند پر وجُوبِ حج میں ہرگز تردد نہیں ہے ہزار ہا شخص ہر سال ہند سے جاتے ہیں اور حج کر کے باسلامت پھر آتے ہیں۔" صفحہ ۵۵۰

شاہ عبدالعزیزؒ کی تصریح و اعلان

شاہ صاحبؒ اس خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

مشفقِ من، از فحوائے مضامینِ جوابِ
اوّل چناں مستنبط شود کہ بزرگانِ مذکور بجز
دو چار فتاوائے معروفہ کہ سندِ آنہا پیشِ
۵ واقفانِ ایں فن ظاہر و باہر است، از ادراکِ
کتبِ دینیہ معتبرہ کہ مدارِ دینِ متین بر آن
ست، بہرۂ وافی نمی دارند و از تحصیلِ علومِ فقہ
و اصول ذخیرۂ وافی نیندوختہ اند، محض صرفِ
اوقات در تحصیلِ منطق نمودہ، درستیِ ایں ہمہ
۱۰ در مواجہۂ ناقدانِ فنِ مذکور محال و اشکال
است۔ دریں صورت سندِ احوالِ مبینۂ
ایشاں ساقط از پایۂ اعتبار تصور توان کرد
و بر احکامِ آنہا عمل نمودن سراسر راہِ ضلالت
و بطالت پیمودن است۔ از ایں عقائدِ
۱۵ شنیعہ حق سبحانہ و تعالیٰ جمیع مومنین را مامون
و محفوظ دارد و توفیقِ طاعتِ نجیح روزی
کند۔

مشفقِ من، جوابِ اوّل کے مضامین سے
ایسا پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات دو چار مشہور فتاویٰ
کی کتابوں کے سوا، جن کی سند اور پایۂ اعتبار
فنِ فقہ کے واقفوں کے نزدیک کچھ بلند نہیں،
معتبر کتبِ دینیہ کے علم سے، جن پر دین کا دار
ومدار ہے، بہرۂ وافر نہیں رکھتے اور علمِ فقہ و
اصولِ فقہ کی انھوں نے کافی تحصیل نہیں کی ہے
صرف منطق کی تحصیل میں اوقات گزاری کی ہے۔
ان چیزوں کی توثیق ناقدانِ فن کے نزدیک
محال اور نہایت دشوار ہے۔ اس صورت میں ان
کے بیان کردہ حالات کی سند درجۂ اعتبار سے
گری ہوئی سمجھنی چاہیے اور ان کے احکام پر عمل کرنا
سراسر گمراہی اور بے عملی ہے۔ حق تعالیٰ ایسے بُرے
عقائد و خیالات سے تمام مسلمانوں کو مامون و
محفوظ رکھے اور اپنی طاعت کی توفیق
عطا فرمائے۔

و مضمونِ جوابِ ثانی تاج المفسرین فخر
۲۰ المحدثین سرآمدِ علمائے محققین مولویین معصومین
مطابق و موافقِ احادیثِ قویہ و کتبِ اصولِ

دوسرے جواب کا مضمون تاج المفسرین فخر المحدثین سرآمدِ
علمائے محققین مولوی عبدالحی صاحب و مولوی اسمٰعیل صاحب
کا لکھا ہوا ہے اور احادیثِ قویہ اور اصول و

رفقۂ معتبرہ چنانچہ مقابلِ دستخطِ ایشاں
تصحیح و مہرِ خود ثبت نمودہ شد، ملاحظہ
فرمایند تاکہ اطمینانِ کلی خواہد گردید۔
و فرستادنِ استفتاے مذکور نزدِ فقیر
در صورتِ بودنِ مہر و دستخطِ برخوردارانِ
ممدوحین احتیاجے نداشت، چراکہ ایشاں
در علمِ تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و
منطق وغیرہ از فقیر کمتر نیستند۔ مہر و
دستخطِ ایشاں گویا دستخطِ فقیر است و عنایت
جنابِ باری عزّ اسمہٗ کہ شاملِ حالِ
مولویینِ موصوفین است، شکرِ ایں نعمتِ
عظمیٰ ادا کردن نمی توانم۔ حق جلّ و علیٰ
زیادہ ازیں بمراتبِ عالی فائز گرداند
و برائے اشخاصِ مبینِ اصلِ شریعت
جمیع مومنین در جنابِ الٰہی بایں دعا
خواستن موجبِ نجاتِ اُخروی است۔
مخلصِ من، مولویینِ ممدوحین را یکے از
علمائے ربانی تصور دیدہ اشکالے کہ افتتاح
آں محال باشد، روبروے ایشاں پیش خواہند
کرد۔ عنایت فرمائے من، اگرچہ ایں کلمات
را بظاہر تعریف و توصیفِ خود تصور تواں

فقہ کی معتبر کتابوں کے موافق ہے۔ چنانچہ اُن کی
مُہر اور دستخط کے مقابل میں نے بھی اپنی مُہرِ تصدیق ثبت
کردی ہے ملاحظہ فرمالیں تاکہ اطمینانِ کُلی ہو جائے۔
ایسی صورت میں کہ عزیزانِ موصوف کی مُہر اور دستخط
موجود تھے، اس استفتا کے میرے پاس بھیجنے کی ۵
ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ یہ دونوں علمِ تفسیر و
حدیث و فقہ و اصول و منطق میں مجھ سے کم نہیں۔
اُن کی مُہر اور دستخط گویا میرے مُہر اور دستخط ہیں۔
اللہ تبارک و تعالیٰ کی جو عنایت ان دونوں عزیز
فاضلوں کے شاملِ حال ہے، اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ۱۰
مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ ان کو اس سے
بھی بلند مراتب پر فائز فرمائے۔ ان لوگوں کے
حق میں، جو اصل شریعت کے واضح کرنے والے
ہیں، تمام مومنین کا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا
کرنا خود اُن کے لیے نجاتِ اُخروی کا باعث ۱۵
ہے۔ میرے دوست، مولوی عبدالحی اور
مولوی اسمٰعیل کو علمائے ربانی میں شمار
کرنا چاہیے۔ میرے کرم فرما، اگرچہ
ان کلمات سے بظاہر اپنی تعریف
نکلتی ہے، لیکن امرِ حق کا اظہار واقفوں ۲۰
پر واجب و لازم ہے۔

کرد، لیکن اظہارِ امرِ حق ہم بر واقفان ُلجب ولازم است۔ لہٰذا چشم پوشی در حق مناسب ندانستیم و ہر دو استفتا بخطِ رقیمۂ ہذا می رسید، از ورسیدش مطلع باید نمود۔ ایں وقت بسببِ ضُعفِ طبیعت بر ہمیں قدر اکتفا گردید۔

لہٰذا حق کے معاملے میں چشم پوشی مناسب معلوم نہ ہوئی۔ دونوں استفتا اس خط کے ساتھ پہنچیں گے۔ اُن کی رسید سے مطلع فرمایا جائے۔ اس وقت ضعف کی وجہ سے اتنے ہی پر اکتفا کی گئی۔

وَالْإِجْمَالُ عِنْدَهُمْ مُغْنٍ عَنِ التَّفْصِيْلِ وَاللهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَبَارَكَ اللهُ فِي مَعَاشِكُمْ وَمَعَادِكُمْ۔

اور دونوں کے مجمل کلام کی موجودگی میں میری تفصیل کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کے معاش و معاد میں برکت عطا فرمائے۔

(مکرر) آنکہ انتظار باید کشید کہ اشخاصِ معلوم در عرصۂ قریب فتوائے معافیِ صوم و صلٰوۃ برائے ہندوستانیاں خواہند نوشت بدلیل ایں کہ پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم، در ہند تشریف فرما نہ شدہ اند و برائے زکوٰۃ بدرجۂ اَولیٰ۔

(مزید) منتظر رہنا چاہیے کہ یہ حضرات جنھوں نے آج حج کی عدمِ فرضیت کا فتوٰی دیا ہے، کل ہندوستانیوں کے لیے نماز روزے کی معافی کا فتوٰی لکھ دیں گے اس دلیل سے کہ پیغمبرِ خدا، صلّی اللہ علیہ وسلّم، کی ہندوستان میں بعثت نہیں ہوئی اور زکوٰۃ کو بدرجۂ اولیٰ ساقط کر دیں گے۔

فریضۂ حج کی ہندوستان میں تجدید ان حالات میں سید صاحبؒ کا علما و مشاہیر کی ایک بہت بڑی جماعت اور صدہا مسلمانوں کے ساتھ حج کرنا ادائے فرض کے علاوہ حج کی فرضیت کا بہت بڑا اعلان اور اس کی زبردست اشاعت و تبلیغ تھی، جن کی ان حالات میں سخت ضرورت تھی۔ یہ ضرورت آپ کے سفر سے پوری ہوئی۔ ہندوستان کی ہزار بارہ سو برس کی تاریخ میں اس کی قطعاً نظیر نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت نے اس ذوق و شوق اور جوش و

خروش اور اس باہمی اُلفت و محبّت اور اس متحرک اسلامی ماحول کے ساتھ، جو اس قافلے کے ساتھ چلتا تھا، حج کا سفر کیا ہو۔ ہندوستان میں صدہا مسلمان سلاطین گزرے ہیں، جن پر حج فرض تھا اور جو ہزاروں مسلمانوں کو اپنے ساتھ حج میں لے جانے کی مقدرت رکھتے تھے اور ہزارہا مشائخ، جن کے دامن سے لاکھوں مسلمان وابستہ تھے، لیکن اس شان کا حج نہ سلاطین کے تزک و وقائع میں ملتا ہے، نہ مشائخ کے سِیَر و تراجم میں۔ جب تک یہ قافلہ سفر میں ۵
تھا، ہندوستان کا وُہ خطّہ، جو اس کی گزرگاہ تھا، پیہم جنبش میں تھا۔ پھر اس کے جلو میں دینی اصلاح و تبلیغ کا ایک عظیم سیلاب تھا، جس میں شرک و بدعت، فسق و فجُور اور جاہلیت کے رسُوم و شعائر خس و خاشاک کی طرح بہے جاتے تھے۔ ہندوستان کا پُورا شمالی مشرقی علاقہ، جو تین وسیع صُوبوں (صُوبۂ متحدہ، بہار، بنگال) پر پھیلا ہُوا ہے، اس کے فیض سے گلزار بن گیا۔

حج کی ترغیب و تبلیغ سیّد صاحبؒ نے حج کا قصد فرمایا اور اہلِ تعلق کو اس کی اطلاع دی اور ۱۰
دہلی اور پھلت اور سہارنپور اور جہاں جہاں حضرت کے متعلقین تھے، خطُوط لکھوائے کہ:

”ہماری نیت پہلے سفرِ ہجرت کی تھی، مگر اب مرضیِ الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کو جائیں۔ سو جن بھائیوں کا ارادہ ادائے حج کے واسطے ہمارے ساتھ چلنے کا ہو، یہاں آکر حاضر ہوں“[1]۔

یہ خطُوط بڑی تعداد میں سیّد احمد علی کے نوعمر صاحبزادے سیّد زین العابدین نے لکھے۔ اِن خطوں کا مضمُون یہ تھا: ۱۵

> ”ہم ادائے حج کے واسطے بیت اللہ شریف کو جاتے ہیں۔ جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو، اُن کو اپنے ہمراہ لائیے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے، نہ خزانہ۔ محض اللہ تعالیٰ پر توکّل کر کے جاتے ہیں اور ہم کو اس کی ذاتِ پاک سے اُمیدِ قوی ہے کہ وُہ اپنے کرم و فضل سے ہماری مراد پُوری کرے گا اور جہاں کہیں رستے میں حاجتِ ضرُوری کے واسطے خرچ نہ ہوگا، وہاں ٹھیر کر ۲۰

(۱) ”وقائعِ احمدی“: صفحہ ۵۶۱

ہم لوگ محنت مزدوری کریں گے۔ جب بخوبی خرچ جمع ہو گا، تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے۔ اور جو ضعیف عورتیں اور مرد مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، وہ اپنے ڈیروں کی نگہبانی پر رہیں گے اور اس خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں میں رہنے والے سب شریک ہوں گے۔"(۱)

اسی مضمون کے خطوط مولانا عبدالحی صاحب کو قصبۂ بڑھانہ میں، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو دہلی، اور پھلت میں مولوی وحید الدین، اُن کے بھائی حافظ قطب الدین، اُن کے والد حافظ معین الدین، مولوی وجیہ الدین، حکیم مغیث الدین اور اُن کے بھانجے شہاب الدین وغیرہ کو لکھے۔

اس عرصے میں خاندان والوں کو آپ برابر ترغیب دیتے رہے کہ وُہ بھی ہمراہ ہوں۔ وُہ چونکہ اس قافلے کی بے سروسامانی اور ظاہری تہی دستی سے زیادہ واقف تھے، ان کو اس اولوالعزمی پر اور زیادہ حیرت اور اس عظیم الشان سفر کے بارے میں زیادہ اشکال تھا۔ آپ نے ان کو اس سفر پر آمادہ کیا، تو وہ کہنے لگے:۔

"جو لوگ ہندوستان میں مال دار اور صاحبِ مقدور ہیں اور حج کا ادا کرنا ان پر فرض ہے، بعض علما انھیں پر حج فرض ہونے میں اختلاف کرتے ہیں کہ جیسے ادائے حج کے واسطے زادِ راحلہ شرط ہے، ایسے ہی امنِ راہ بھی شرط ہے۔ سو امن کا یہ حال ہے کہ جہاز کی سواری کے بغیر وہاں جانا محال ہے اور دریا میں تلفِ جان و مال دونوں کا خوف متصور ہے۔ اس لیے اہلِ ہند پر ادائے حج فرض نہیں ہے، اگرچہ کیسا ہی زردار ہو۔ اور آپ کے پاس تو ایک روز کا بھی خرچ موجود نہیں ہے۔ اس بے سروسامانی کے باوجود، جو آپ خطوط بھیج بھیج کر دُور دُور سے لوگوں کو سفرِ حج کے واسطے بلاتے ہیں اور ہم سے بھی فرماتے ہیں، شاید کہ اپنے ساتھ اُن کو بھی خراب اور حیران کریں گے۔"(۲)

آپ اُن سے کہتے تھے کہ: "انشاء اللہ تعالیٰ ہم اور آپ ساتھ ہی ہوں گے۔ رستے میں

(۱) "وقائع"، صفحہ ۵۶۲ (۲) "وقائع"، صفحہ ۵۸۷، ۵۸۸

چل کر دیکھیے گا کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو کس طرح اپنی قدرت اور عنایت سے کھانا پینا پہنچاتا ہے اور اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے پرورش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے یہ یقین کامل ہے کہ ہم سب اپنے عاجز و محتاج بندوں کو یہاں سے حرمین شریفین کو بآرامِ تمام پہنچادے گا اور پھر وہاں سے خیر و عافیت کے ساتھ یہاں لائے گا۔"(۱)

خاندان میں سے آپ کے بھتیجے سید محمد یعقوب، اُن کی والدۂ ماجدہ، آپ کے چاروں ۵ بھانجے، مولوی سید محمد علی، سید احمد علی، سید حمید الدین، سید عبدالرحمٰن اپنی والدہ اور اہل و عیال کے ساتھ، آپ کے ماموں زاد بھائی حافظ سید محمد، مولوی سید محمد ظاہر، سید عمر نصیر آبادی، میاں محمد قائم جائسی اوّل روز سے آپ کی ہمراہی کے لیے مستعد اور تیار تھے۔(۲)

آپ کے بھانجے مولوی سید محمد علی ابتدا میں تنِ تنہا سفر کے لیے تیار تھے۔ اہل و عیال کو لے جانے کا ارادہ نہ تھا۔ سید صاحبؒ نے اُن سے فرمایا کہ جب تمھارے تینوں بھائی اپنے ۱۰ بچوں اور اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ عازمِ سفر ہیں تو تم تنہا اپنے بچوں اور متعلقین کو کیوں چھوڑے جاتے ہو؟ مولوی محمد علی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ برسات کا موسم اور سمندر کے طوفان کا زمانہ ہے۔ اس سے اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا: "بھائی، اگر موت کا اندیشہ ہے تو تم نے یہ مثل نہیں سُنی کہ "مرگِ انبوہ جشنے دارد"؟ اگر بالفرض اس سفر میں موت آبھی گئی تو ہر سال حج و عمرہ کا ثواب تمھارے اعمال نامے میں لکھا جائے گا اور شہادت کی وہ دولت، جس ۱۵ کا ہر مسلمان متمنی رہتا ہے، نصیب ہوگی۔" اس مکالمے کے بعد سید محمد علی صاحب نے بھی اپنے متعلقین کو ہمراہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔(۳)

اِس دعوت و تبلیغ اور خط و کتابت سے سارے ہندوستان میں شہرت عام ہوگئی کہ سید صاحبؒ حج کو جاتے ہیں اور سب کو دعوت دیتے ہیں۔

اِس تحریک و ترغیب سے محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں اُبھریں اور بجھی ہوئی آتشِ ۲۰

(۱) "وقائع"، صفحہ ۵۸۸　(۲) "وقائع"، صفحہ ۵۸۸، ۵۸۹　(۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۶۱

شوق بھڑکی۔ سید صاحبؒ کی طویل معیت، صلحا و اولیا کی رفاقت، حج مقبول، اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہے؟ برسوں کے ارمان نکلنے کا وقت آگیا۔ لوگوں نے اپنی اپنی زمین اور جائداد بیچ کر تیاری کی۔ عازمینِ حج کے خطوط اور وفود آنے شروع ہو گئے۔

حج سے پہلے ایک تبلیغی دورہ اسی اثنا میں کانپور، کوڑہ جہان آباد، کھجوہ، فتحپور اور قصبہ ڈلمو کے باشندوں نے تشریف آوری کی درخواست کی۔ حضرت رائے بریلی سے روانہ ہو کر قصبہ مورانواں (ضلع اُناؤ) ٹھہرتے ہوئے، جہاں ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی، رنجیت پوروا، بھڑاہا ہوتے ہوئے کانپور تشریف لائے۔ سید محمد یٰسین صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ یہاں ہزاروں اشخاص بیعت سے مشرف ہوئے۔ منجملہ اُن کے منڈرو فرنگی کی بیوی بھی بیعت سے مشرف ہوئی۔ ایک روز اُس نے چار ہزار روپے کے قریب پیش کیے اور کہا کہ "یہ آپ کی نذر ہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ "ابھی ہم کو روپے کی کچھ ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ حج سے آکر جب جہاد کو جائیں گے، اس وقت دیکھا جائے گا"۔ اس نے کہا کہ "یہ مکان، جو میری ملکیت ہے، آپ کی نذر کیا"۔ مکان بڑا وسیع، عالی شان، تیس چالیس ہزار کی مالیت کا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ "ہم مکان لے کر کیا کریں گے؟ ہم تو حج کو جاتے ہیں۔ اپنے ہی مکان چھوڑ جائیں گے"۔ اس نے کہا کہ "اب تو میں آپ کے نذر کر چکی ہوں۔ جو چاہیں آپ کریں"۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر یہی بات ہے، تو یہ مکان ہماری طرف سے اپنے داماد مرزا عبدالقدوس کو دے دو"۔(۱)

کانپور میں جن جن مسجدوں میں گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے، ان میں بکثرت بڑی بڑی جماعتیں ہونے لگیں اور کتنی نئی مسجدیں بن گئیں۔ صدہا آدمیوں نے تعزیہ داری چھوڑ دی اور پکے مسلمان موحد بن گئے۔(۲)

کانپور سے آپ کوڑہ جہان آباد تشریف لے گئے اور ہزاروں آدمی بیعت میں

---

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۵۷۸ (۲) "وقائع"، صفحہ ۵۷۸

داخل ہوئے۔ وہاں قصبہ مجھاون کے قاضی صاحب چند شرفا و معززین سمیت آئے، بیعت کی اور حضرت سے قصبے میں چلنے کی بڑی منت سماجت سے درخواست کی۔ آپ نے قبول فرمائی۔ مجھاون میں آپ نے قاضی کی مسجد میں قیام فرمایا اور اُس قصبے کے تمام مسلمان باشندے بیعت سے مشرف ہوئے۔ مجھاون سے آپ کھجوہ تشریف لائے۔ ایک شب وہاں قیام فرمایا۔ بستی کے شرفا اور مہتر یکساں آپ سے فیضیاب ہوئے۔ صبح فتحپور تشریف لائے۔ ۵ دو تین روز قیام فرمایا۔ اس عرصے میں اکثر اہلِ شہر بیعت سے مشرف ہوئے۔ فتحپور سے رائے بریلی کی طرف واپسی ہوئی۔(۱)

عازمین حج کی آمد مولانا عبدالحی صاحب ایک قافلے کے ساتھ فتحپور اور ڈلمئو کے درمیان سفرِ کانپور ہی میں شامل ہو گئے تھے۔ اسی عرصے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا خط آیا کہ یہاں ہمارے ہمراہ سہارنپور کے حکیم مغیث الدین صاحب، مولوی وجیہ الدین صاحب وغیرہ اور قصبہ پھلت کے ۱۰ مولوی وحید الدین اور حافظ قطب الدین وغیرہ اور ان میں سے اکثر صاحب مع اپنے اہل و عیال، مرد اور عورتیں ملا کر قریب ڈھائی سو آدمیوں کے ہیں اور ہم سب گڈھ مکتیسر کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو چکے ہیں۔(۲)

نواح رائے بریلی، ڈلمئو، نصیر آباد، جائس وغیرہ کے سو آدمی سفرِ حج کے ارادے سے مجتمع ہو گئے تھے اور تقریباً چالیس آدمی آپ کے اعزا و اقربا میں سے (بعض بذاتِ خود، ۱۵ بعض متعلقین کے ساتھ) آمادۂ سفر تھے۔(۳)

آپ اہلِ خاندان سے فرماتے تھے کہ "جب تک میں اس بریلی کے علاقے میں ہوں، تب ہی تک ان سب پر تنگی و افلاس ہے۔ جس وقت میں اُن کو ساتھ لے کر اس علاقے سے باہر ہوا، تب اُن کا حال دیکھنے والے دیکھیں گے کہ پروردگارِ عالم بے سان و گمان اپنے بندوں کے

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۵۹، ۶۰ (۲) "وقائع"، صفحہ ۵۸۹۔ قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ ۱۴ صفر کو کلکتے میں سید صاحبؒ کے قافلے میں شامل ہوا۔ (۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۶۱

ہاتھوں کیونکر پہنچاتا ہے اور خدمت کراتا ہے۔[1]"

روانگی سے پہلے اور روانگی کے وقت جو بزرگانِ خاندان بیعت سے مشرف نہیں ہوئے تھے اور بعض بعض اس متوکلانہ سفر پر معترض تھے، حاضر ہو کر اپنی تقصیر کے معترف اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ ان آنے والوں میں مولانا سید محمد واضح کے تینوں صاحبزادے سید محمد جامع صاحب، سید غلام جیلانی اور سید صاحب کے بہنوئی سید معصوم احمد صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں سید صاحب بہت مسرور ہوئے اور بڑے الحاح و زاری سے ان حضرات کے لیے دعا کی۔

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۵۹۱

دسواں باب

رائے بریلی سے مرزا پور تک

روانگی — شوال کی آخری تاریخ دوشنبہ ۱۲۳۶ھ کو چار سو آدمیوں کے ساتھ آپ تکیے سے روانہ ہوئے۔ سارے قافلے کا کل خرچ آپ کے ذمے تھا۔ سئی ندی کو پار کر کے دوسرے کنارے پر اُن لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے جو جمع ہو گئے تھے اور اُن سے بیعت لینے کے لیے کچھ دیر توقف فرمایا۔ مولوی محمد یوسف صاحب کی تحویل میں، جو آپ کے خازن تھے، اس وقت کچھ اُوپر سو روپے تھے۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے وہ سب روپے رائے بریلی کے غربا بھنگی، دھوبی، حجام اور شاگرد پیشہ لوگوں کو تقسیم کر دیے اور ڈلمئو کی طرف روانہ ہوئے۔[1]

ایک میل چل کر ایک باغ میں آرام فرمایا تاکہ پیچھے سے آنے والے لوگ آملیں۔ اس وقت حاضرینِ مجلس میں سے ایک بزرگ نے کہا کہ: "اگر رفقائے سفر کو شمار کر لیا جائے، تو بہت اچھا ہے۔" آپ نے فرمایا: "مضائقہ نہیں۔ جس کا جی چاہے شمار کر لے۔" چنانچہ اہلِ قافلہ کو شمار کیا گیا اور چار سو پانچ یا چار سو سات آدمی شمار میں نکلے۔ ان کے علاوہ اسّی کہار تھے۔ آپ نے مولوی محمد یوسف صاحب سے دریافت فرمایا کہ: "اس وقت آپ کی تحویل میں کیا ہے؟" مولوی صاحب نے فرمایا کہ: "سات روپوں کے علاوہ ایک پیسہ نہیں ہے۔" آپ نے مسرور ہو کر فرمایا کہ: "اس سات روپے میں تو قافلے کا ایک دن کا بھی خرچ نہیں نکل سکتا۔ رائے بریلی کے غربا میں سے جو موجود ہیں اور جن کو پہلی تقسیم میں کچھ نہیں ملا، اُن کو دے دیجیے کہ اکیس

---

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۶۲

میں بانٹ لیں۔" مولوی محمد یوسف صاحب نے اس کی تعمیل کی۔ اس وقت آپ نے برہنہ سر ہو کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور کہا کہ: "اے کریم کارساز، تُو نے اپنی اتنی مخلوق کو اپنے اس ذلیل بندے کے سپرد کر رکھا ہے۔ آپ ہی چارہ سازی فرمائیے اور اپنی مہربانی سے بخیر و خُوبی اس پُورے قافلے کو منزلِ مقصُود پہ پُہنچائیے۔"

۵ **اہلِ قافلہ کی کیفیت** راستے میں ایک ہمراہی دُوسرے سے اپنی بے مائگی اور بے سر و سامانی کا تذکرہ کرتا، تو معلوم ہوتا کہ اس کا ساتھی اس سے بھی زیادہ بے سر و سامانی کے ساتھ سفر کے لیے نکلا ہے۔ اس وقت ایک دُوسرے کو تسکین ہوتی۔ بعض لوگ، جن کو سیّد صاحبؒ کی صُحبت کا شرف حاصل تھا، اس فکر و تردّد پر ملامت کرتے اور توکّل کی تلقین کرتے۔

قافلے کے ہمراہی راستے کے سرد و گرم برداشت کرنے کے لیے تیار اور تنگی تُرشی میں ۱۰ خُدا کے ذکرُ و شکر کے ساتھ رطب اللسان رہتے تھے۔ کبھی سخت بارش ہوتی، کبھی کڑاکے کی دُھوپ، دلدل اور کیچڑ، ندی نالے راستے میں ملتے۔ اگر کسی کا پاؤں پھسلتا، تو وُہ ہنس ہنس کر خدا کا شکر ادا کرتا اور کہتا کہ: "تیرے احسان کے قربان کہ تیرے راستے میں گرا ہُوں پچھلی تمام لغزشوں اور ہرزہ گردی کی تلافی یہی ہے۔" کوئی خواجہ حافظ کا یہ شعر اپنے حسبِ حال پڑھتا:[2]

۱۵
در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں، غم مخور

دو بھائیوں کا جھگڑا جب ڈلمئو دو میل رہ گیا، تو آپ راستے کے قریب ایک باغ میں آرام کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ دو سوار تقریباً پچاس آدمیوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ انھوں نے پہنچ کر پہلے بیعت کی، پھر عرض کیا کہ: "ہمارے جھگڑے کا فیصلہ ۲۰ فرمائیے۔ ہم دونوں حقیقی چھوٹے بڑے بھائی ہیں۔ میں بڑا ہُوں۔ جب سے جناب کی آمد

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۶۲-۶۳ (۲) "مخزن"، صفحہ ۶۳

کی اطلاع ہوئی ہے، دعوت کی تیاری میں مشغول ہوگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کھانا تیار کرکے اس مبارک سفر کی پہلی منزل میں پیش کروں گا۔ آج میں نے اس کی تیاری شروع کی، تو یہ میرے چھوٹے بھائی میرے پاس آئے اور مانع ہوئے اور کہا کہ: "میں تو تم سے پہلے سے سامان دعوت تیار کر چکا ہوں۔ آج میں حضرت کی ضیافت کروں گا۔ کل تمھاری باری ہے، تم ضیافت کرلینا۔ میرے اور ان کے درمیان اس پر سوال وجواب ہوا اور بات کچھ بڑھی۔ قصبے کے معززین جمع ہوگئے ۵ اور اُنھوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ خود سید صاحبؒ کی رائے پر چھوڑ دو، تم دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤ اور اپنا معاملہ پیش کردو۔ آپ جو فیصلہ کریں، اس پر عمل کرو۔ اب ہم آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔"

آپ نے اُن کو ایک دوسرے کے حق میں ایثار کرنے اور دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینے کی ترغیب دی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ، کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، ۱۰ کے ایثار کی ایک روایت سُنائی، جس سے وہ متاثر ہوئے اور واپس چلے گئے۔

ٹھنڈے وقت آپ قصبے میں تشریف لے گئے۔ مغرب اور عشا کی نماز پڑھی۔ بڑی خلقت نے بیعت کی۔

رات کو بڑے بھائی نے تمام اہلِ قافلہ کی ضیافت کی۔ دوسرے روز چھوٹے بھائی کی طرف سے تمام اہلِ قافلہ کی دعوت ہوئی۔ جب تک اس قصبے میں قیام رہا، برابر قافلے کی ۱۵ دعوت رہی۔ کسی کو کسی وقت کھانا پکانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس دوران میں ہزاروں اشخاص نے اطراف وجوانب سے آکر بیعت کی اور بہت سے سفر میں ساتھ ہوگئے۔[1]

سید صاحبؒ کا وعظ چار روز مولانا عبدالحی صاحب نے وعظ فرمایا اور اس میں شرک و بدعت کی بُرائی اور توحید و سنّت کی خوبی اور حج و عمرہ کے فضائل بیان کیے۔

رات کو بعد نمازِ عشا سید صاحبؒ نے فرمایا: "بھائیو، تم نے کئی روز مولانا کا وعظ سُنا۔ ۲۰

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۶۴، ۶۵

اب چند باتیں ہماری بھی انشاء اللہ تعالیٰ نمازِ صبح کے بعد سُن لینا۔"

سب لوگ نماز پڑھ کر آپ کے پاس حاضر رہے۔ آپ نے فرمایا :۔

حقیقی بھائیوں کے اخلاق بھائیو، اگر تم سب اپنے گھر بار چھوڑ کر حج و عمرہ ادا کرنے اس نیّت سے جاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو، تو تم کو لازم ہے کہ آپس میں سب مل کر ایسا اتفاق اور خُلق رکھو، جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی راحت کو اپنی راحت اور ہر کسی کے رنج کو اپنا رنج سمجھو اور ہر ایک کے کاروبار میں بلا انکار حامی و مددگار ہو اور ایک دُوسرے کی خدمت کو ننگ و عار نہ جانو، بلکہ عزّت و افتخار سمجھو۔ یہی کام اللہ کی رضامندی کے ہیں۔ جب ایسے اخلاق تم میں ہوں گے، تو اور غیر لوگوں کو شوق ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شریک ہونا چاہیے۔

خدا کی پرورش پر بھروسہ اللہ پہ کامل توکّل کرو۔ کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو ہرگز نہ رکھو۔ رزقِ مُطلق اور حاجت روائے برحق وُہی پروردگارِ عالم ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ دیکھو تو جس وقت بچّہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون اُسے روزی پہنچاتا ہے۔ پھر وُہی بچّے کو آسانی سے باہر لاتا ہے اور باہر لانے سے پہلے ماں کے پستان میں روزی تیار رکھتا ہے۔ پھر وُہ لڑکا اُسی کی تعلیم سے دُودھ پیتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، اُتنا ہی پی لیتا ہے۔ باقی مکّھی، بال، گرد و غبار سے محفوظ، تازہ بہ تازہ ماں کے پستان میں رہتا ہے۔ پھر دُوسرے وقت پیتا ہے۔ یہ اُسی پروردگار کی روزی رسانی ہے۔ پھر چند مدّت میں دُودھ چھڑا کر اور غذا کھانے کی تعلیم فرماتا ہے۔ اسی طور سے پرورش کر کے جوان اور جوان سے بوڑھا کرتا ہے اور روزی اُس نے جس کی تقدیر میں جو کچھ لکھی ہے، وُہ بہر صورت اُس کو بلا شک و بلا شبہہ پہنچے گی۔

خدا کا وعدہ برحق ہے یہاں ایک دنی آدمی جو ہم لوگوں کی دعوت کر جاتا ہے، چاہے جھوٹ ہی کر جائے، ہم لوگ اس کے اعتماد پر اپنے گھر میں منع کر دیتے ہیں کہ ہمارے واسطے کھانا

نہ پکانا، فلاں کے یہاں ہماری دعوت ہے'، یا مثلاً غازی الدّین حیدر والیِ لکھنؤ اگر اس بات کا وعدہ کرے کہ میرے فلاں امیر کے ہمراہ کہ بیت اللہ شریف کو جاتا ہے' جو کوئی جائے، زاد وراحلہ میں دوں گا، تو ہزاروں آدمی خوشی خوشی جانے پر مستعد ہو جائیں۔ کچھ بھی اس کی وعدہ خلافی کا شک وشبہہ دل میں نہ لائیں ۔ مجھ سے تو اس شاہنشاہِ دو عالم پناہ، قادرِ برحق' رزاقِ مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ تیرے ساتھ اس سفر میں ہیں، اُن کے ۵ کھانے کپڑے کا کچھ اندیشہ نہ کر، وہ سب میرے مہمان ہیں اور وہ اپنے وعدے کا سچّا ہے کہ جس میں وعدہ خلافی کا احتمال کسی صورت بھی نہیں ہے۔ پھر میں کیونکر سچ نہ جانوں اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ تم سب بھائیوں کی پرورش کرے گا۔

مذبذبین کے لیے اب بھی واپسی کا موقع ہے

سو کلام کا حاصل یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہیں اور میرے کہنے کو سچ جانتے ہیں، وہ تو میرے ساتھ چلیں، میں اُن کے ۱۰ رنج وراحت کا شریک ہوں اور میری یہی باتیں اپنی عورتوں کو سمجھا کر کہہ دیں، وإلّا اب بھی مکان نزدیک ہے۔ سفر کی تکلیف اُٹھانے کو موقوف کریں۔ سفر میں ہر طرح کی تکلیف و مصیبت ہوتی ہے اور راحت بھی ہوتی ہے۔ پھر کوئی بھائی کسی بات کا گلہ شکوہ زبان پر نہ لائیں۔

ہدایتِ عام

مجھ کو عنایتِ الٰہی سے قوی اُمید ہے کہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں ۱۵ سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا اور ہزاروں ایسے لوگ کہ دریائے شرک و بدعت میں اور فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعائرِ اسلام سے مطلق ناواقف ہیں، وہ پکّے موحّد اور متّقی ہوں گے۔

حج کے اجرا کی پیش گوئی

اور جنابِ الٰہی میں مَیں نے اہلِ ہند کے لیے بہت دُعا کی کہ الٰہی! ہندوستان سے تیرے کعبے کی راہ مسدود ہے، ہزاروں مالدار صاحبِ زکوٰۃ مر ۲۰ گئے اور نفس وشیطان کے بہکانے سے کہ راستے میں امن نہیں ہے، حج سے محروم رہے

اور ہزاروں صاحب ثروت اب جیتے ہیں اور اسی وسوسے سے نہیں جاتے۔ سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے، بے دغدغہ چلا جائے اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ حج سے آنے کے بعد یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے۔ سو انشاء اللہ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے، وہ یہ حال بچشم خود دیکھیں گے۔"[1]

ڈلمئو میں قلعے کے اندر لب دریا بارہ دری میں قیام تھا۔ بکثرت مردوں اور عورتوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ بہت سے شرفا کی مستورات بارہ دری میں قافلے کی مستورات سے ملنے آئیں اور بعض مستورات کی بیعت کے لیے بعض بعض لوگوں کے مکان پر اُن کی درخواست پر خود بھی تشریف لے گئے۔[2]

سفر کا آغاز پنجشنبہ ۳ ذی قعدہ کو سامان و اسباب کشتیوں پر بار کیا گیا۔ جمعے کے دن صبح کے وقت سید صاحبؒ نے قافلے کے تمام ہمراہیوں کو جمع کر کے ہر چند آدمیوں پر ایک شخص کو امیر اور ذمے دار اور نگران مقرر کر دیا اور پورے سفر کے لیے امارت اور جماعت کا نظام قائم کر دیا۔

دوپہر کے وقت گلی کوچوں میں مردوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی اور پردہ نشین عورتیں بارہ دری سے دریا کے کنارے تک پیدل گئیں۔ پہلی کشتی میں تکیہ و نصیر آباد کی مستورات سوار ہوئیں، دوسری کشتی میں پھلت کی مستورات اور تیسری میں لکھنؤ وغیرہ کی بی بیاں سوار ہوئیں۔ چوتھی کشتی میں قافلے کے ضعیف و معذور اشخاص سوار ہوئے۔[3] پانچ سو روپے پر کشتیاں کرائے پر لی گئیں۔[4]

جمعے کی نماز ایک جماعت کثیر کے ساتھ قلعے کے اندر والی مسجد میں پڑھی گئی

---

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۵۹۹-۶۰۲ (۲) مکتوب سید حمید الدین بنام سید احمد علی از بنارس مندرج منظورۃ السعداء۔ (۳) مکتوب سید حمید الدین (۴) "مخزن احمدی"، صفحہ ۶۵

اور انتہائے تضرع و زاری کے ساتھ حرمین کی بخیریت آمد و رفت کی اور استقامت اور خاطر جمعی اور قبولیتِ حج وغیرہ کی دعا کرکے لوگوں سے رخصت ہو کر کشتی پر سوار ہوئے۔ اتنے میں مولوی محمد جعفر صاحب[۱] مرحوم کی صاحبزادی جو پہلے پر سوار ہو کر دریا کے کنارے پہنچیں اور شرفِ بیعت حاصل کیا۔[۲]

کشتی میں آپ نے تمام قافلے کو جمع کرکے وعظ فرمایا۔ مضمون یہ تھا کہ "تمام بھائی کان کھول کر سن لیں اور یاد رکھیں کہ ہم فقرا اپنے گھروں سے محض اللہ کے بھروسے پر ادائے حج کے لیے نکلے ہیں۔ حج بڑی عظیم الشان عبادت ہے۔ ہر شخص کو تقویٰ کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ کوئی شخص کسی شخص سے چھوٹی سی چھوٹی چیز کا سائل نہ ہو۔ ہم کسی سے زادِ راہ کا ہرگز سوال نہیں کریں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو مزدوری کریں گے۔ آدھا کھائیں گے اور آدھا جہاز کے کرائے کے لیے رکھیں گے۔ میں اپنے حج کو بھی اپنے ساتھیوں کے حج پر مقدم نہیں رکھوں گا۔ اگر زادِ راہ کم ہو جائے گا، تو ہم تھوڑے تھوڑے آدمیوں کو کلکتے سے بھیج کر حج کرائیں گے۔ اس کے بعد خود جائیں گے۔ لیکن اللہ کی ذات سے مجھے یہی امید ہے کہ وہ ساز و سامان درست فرمائے گا۔" اس کے بعد سید زین العابدین صاحب سے فرمایا کہ "جو کچھ باقی ہو لے آؤ۔" وہ پانچ

(۱) مولوی محمد جعفر صاحب کا شمار وقت کے صلحا و اتقیا میں تھا۔ ڈلمئو ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ اکثر درسی کتابیں مولانا سید واضحؒ سے دائرہ شاہ علم اللہؒ میں پڑھیں۔ معقولات و حکمت کی تعلیم مولانا فضل امام خیر آبادی سے حاصل کی۔ ڈلمئو میں افادۂ خلق اور عبادتِ حق میں عمر بسر کرکے ۱۲۳۲ھ میں وفات پائی۔

مولوی محمد جعفر صاحب نے زندگی بڑے زہد و قناعت میں گزاری۔ تقویٰ اور احتیاط مزاج میں غالب تھی۔ نواب سعادت علی خاں والی اودھ نے عہدۂ قضا پیش کیا، لیکن قبول نہیں فرمایا۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر راوی ہیں کہ مولانا فضل امام خیر آبادی اور ان کے بھانجے کے درمیان کچھ نزاع تھی۔ مولانا فضل امام نے سواری بھیج کر مولوی محمد جعفر صاحب کو بلایا۔ وہ اس پر سوار نہیں ہوئے اور بڑی مشقت کے ساتھ خیرآباد پہنچے۔ نوربافوں کی ایک مسجد میں قیام فرمایا اور مقدمے کا فیصلہ اپنے استادِ محترم کے خلاف کیا اور کسی فریق کی ضیافت قبول کیے بغیر وطن تشریف لے آئے (نزہۃ ج ۷)۔

(۲) مکتوب سید حمید الدینؒ

روپے لائے کہ بس یہی باقی ہیں۔ آپ نے وہ بھی محتاجوں کو دے دیے اور سوار ہونے کے وقت آپ کے خزانے میں ایک پیسہ بھی باقی نہیں رہا۔ فرمایا: "پروردگار کا خزانہ بھرا ہُوا ہے۔"(۱)

کشتیوں پر سوار ہوتے وقت موضع دھئی کے کچھ لوگوں نے اور شیخ مظہر علی صاحب نے آکر عرض کیا کہ دُور دُور سے لوگ آکر بیعت کے لیے ہمارے مکان پر جمع ہیں اور ہم نے دعوت کا سامان بھی کر لیا ہے۔ اسی راستے سے تشریف لے چلیں۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ "جن لوگوں کے متعلقین نہیں ہیں، اُن کو اپنے ساتھ دریا کے کنارے کنارے لے چلیں اور اس موضع میں پہنچ کر وعظ و نصائح کا سلسلہ شروع فرمائیں، ہم کشتی سے آتے ہیں۔"(۲) اس کے بعد بھی کشتیوں پر سب کی جگہ نہ تھی۔ اس لیے ستر آدمیوں کو حکم ہُوا کہ مولوی محمد یوسف صاحب کے ساتھ خشکی کے راستے سے روانہ ہو جائیں۔ باقی تمام مرد چاروں کشتیوں کی چھتوں پر سوار ہُوئے۔ خُود حضرت اپنے متعلقین کی کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہُوئے۔(۳)

شام کو مغرب کی نماز آپ نے کشتی پر پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے سورۂ فاتحہ پر وعظ فرمایا۔ کشتیاں جب دھئی کے سامنے پہنچیں، تو دریا کا اِتنا زور تھا کہ وہ ٹھیر نہ سکیں اور آگے بڑھ گئیں۔ جو لوگ منتظر کھڑے تھے، اُنھوں نے آواز دی اور ملاحوں نے رسّوں سے کھینچ کر تہائی شب گزر جانے کے بعد موضع کے سامنے ٹھیرایا۔ شیخ مظہر علی صاحب پُر تکلف کھانا پکوا کر پالکیوں پر رکھ کر لائے تھے، جو قافلے کو تقسیم ہُوا۔ ہر ایک نے سیر ہو کر کھایا اور باقی ناشتے کے لیے رکھ لیا گیا۔ مولوی محمد یوسف صاحب بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خشکی کے راستے سے آکر قافلے سے مل گئے۔ اہلِ قصبہ صبح کے وقت سواری لے کر آئے اور حضرت کو اپنے مقام پر لے گئے اور وہاں کی کل مسلمان آبادی سلسلۂ بیعت میں داخل ہو گئی۔ مردوں اور عورتوں میں سے کوئی باقی نہیں بچا۔(۴)

مشرکانہ رسوم و نشانات کا عملی ابطال بہت سے لوگوں نے رات ہی کو حضرت کے دستِ

(۱) "منظورۃ السعدا" (۲) "منظورہ" (۳) مکتوبِ سید حمید الدین (۴) مکتوبِ سید حمید الدین

مبارک پر بیعت کی تھی۔ پھر اگلے دن صبح ڈیڑھ پہر دن چڑھے تک بیعت کی دھوم رہی۔ شیخ مظہر علی صاحب کے دو تین سو آدمی جمع تھے۔ سب نے بیعت کی۔ آپ نے تمام بیعت کرنے والوں سے فرمایا کہ "بھائیو! بیعت کرنے کا حاصل یہ ہے کہ تم جو کچھ شرک و بدعت کرتے ہو، تعزیہ بناتے ہو، نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں اور شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذر و نیاز مانتے ہو، ان سب کاموں کو چھوڑ دو اور سوائے خدا کے کسی کو اپنے نفع و ضرر کا ۵ مالک نہ جانو اور اپنا حاجت روا نہ مانو۔ اگر یہ شرک و بدعت کرو گے، تو فقط بیعت کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

یہ سن کر بہت لوگوں نے اسی وقت اپنے اپنے تعزیوں کے چبوترے کھود ڈالے اور نشانوں اور پنجوں کی جو کچھ چاندی تھی، لا کر آپ کے نذر کی کہ آپ اُسے اپنے مصرف میں لائیں۔[1] ۱۰

آپ نے مولانا عبدالحی صاحب کو درسِ قرآن و حدیث اور وعظ و ارشاد کے لیے ایک شب کے لیے وہاں اور ٹھیرنے کے لیے فرمایا اور آپ مع مولانا محمد یوسف صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کے کشتیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔[2]

موضع ڈگڈگی کے متصل شیخ محمد پناہ مع اپنے فرزند محمد کفاہ کنارے پر کھڑے ملّاحوں کو آواز دے رہے تھے کہ کشتیوں کو کنارے لاؤ۔ حضرت کی اجازت سے ملّاحوں نے کشتیاں ۱۵ کنارے لگائیں۔ باپ بیٹے کشتی پر آئے اور مصافحہ و معانقہ کے بعد عرض کیا کہ "بڑی تمنّا اور آرزو سے مدّتوں سے سامانِ ضیافت تیار کر رکھا ہے اور دو سو آدمیوں کے قریب موضع کے اطراف و جوانب سے آ کر بیعت کے ارادے سے غریب خانے پر جمع ہیں اور دو تین روز سے انتظار کر رہے ہیں اور میرے مہمان ہیں۔"

حضرت نے کشتیوں کے باندھنے کا حکم دیا۔ سب مرد خشکی پر اُتر آئے اور عورتیں ۲۰

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۰۴، ۶۰۵ (۲) مکتوب سید حمید الدین" (۳) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۶۶

کشتی پر رہیں۔ چار گھڑی دن رہے سے ایک گھڑی رات تک لوگ بیعت کرتے رہے۔[1]

موضع ڈگڈگی میں بھی تعزیوں کے چبوترے بہت تھے۔ یہاں کے لوگوں نے رات کے اندھیرے ہی میں پھاوڑے اور کدالیں لے کہ تمام چبوترے کھود ڈالے اور پنجوں اور نشانوں کی چاندی، جو دو سو روپے کے وزن کی تھی، لاکر آپ کے نذر کی کہ آپ اس کو خرچ میں لائیں۔[2]

۵ ایک شخص، جو بہت پرانا تعزیہ دار تھا، تائب ہوا اور اس نے اپنے تعزیے کے چبوترے کو، جس پر اُس نے ساٹھ روپے خرچ کر کے بڑا پختہ اور سنگین بنایا تھا، منہدم کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت نے اپنے دستِ مبارک سے اُس پر پھاوڑا چلایا اور حاضرین نے اس کارِ خیر میں شرکت کی۔ اس کی بنیاد بالکل گرا کر اس کو زمین کے برابر کر دیا اور اس پر مسجد کی بنیاد رکھی۔ دو روپے آپ نے اپنے پاس سے اس مسجد کی تعمیر کے لیے

۱۰ دیے اور تمام اہلِ قصبہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے مستعد ہوئے۔ آپ نے دو رکعت نمازِ اس نئی مسجد کی بنیاد پر پڑھی اور بڑی طویل دُعا فرمائی۔ حاضرین آمین کہہ رہے تھے اور عجیب غریب اثر اور دُعا کی قبولیت کے آثار نظر آ رہے تھے۔[3]

دوپہر کو مولانا عبدالحی صاحب بھی قصبہ دھئی سے تشریف لاکر قافلے سے مل گئے اور کشتیاں روانہ ہوئیں۔

۱۵ **غیبی انتظام** ایک شام کو کشتیاں ایسے مقام پر پہنچیں، جہاں آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ آپ نے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ ملازمین نے عذر کیا کہ دریا کے کنارے سے پاؤ کوس تک سخت کیچڑ اور دلدل ہے اور قطرہ افشانی بھی ہو رہی ہے۔ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہیں۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے خود ہی کچھ کھانے کا انتظام کر لیں۔ لوگوں نے کہا: "اندھیرا ہو رہا ہے، ابر محیط ہے، ہوا بھی تیز ہے۔ اس وقت کھانا پکانے کا انتظام بہت دشوار

۲۰ ہے۔ اس وقت سب کو یقین ہوا کہ آج فاقہ ہے۔

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۲۶ (۲) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۶۶ (۳) "مکتوب سید حمید الدین"

ناگہاں دُور سے کچھ مشعلیں نظر آئیں۔ لوگوں نے قیاس آرائیاں شروع کیں۔ کسی نے کہا: "شاید اس نواح کے لوگ بیعت کے ارادے سے آتے ہیں"۔ دُوسرے نے کہا: "یہ عورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ برسات میں ان کا دستور ہے کہ حضرت خضرؑ کی نیاز دریا پر لاکر کرتی ہیں"۔ کسی نے کہا: "کسی کی شادی ہوگی، بارات جارہی ہوگی۔ ابھی یہ روشنی بند ہوئی جاتی ہے"۔ کچھ دیر کے بعد دیدبانوں نے عرض کیا کہ: "مشعلیں قریب آگئیں"۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار چند پالکیوں پر کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پُوچھا کہ: "پادری صاحب کہاں ہیں؟" حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ "میں یہاں ہُوں"۔ انگریز گھوڑے سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں لیے کشتی پر پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ: "تین روز سے مَیں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کر دیے تھے کہ آپ کی آمد کی اطلاع کریں۔ آج اُنھوں نے اطلاع کی کہ اغلب یہ ہے کہ حضرت قافلے کے ساتھ آج تمھارے مکان کے سامنے پہنچیں۔ یہ اطلاع پاکر غروبِ آفتاب تک مَیں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد لایا ہوں"۔

سید صاحبؒ نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے۔ کھانا لے کر قافلے میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹے ٹھہر کر چلا گیا۔

تحقیق سے معلوم ہُوا کہ یہ انگریز کمپنی کے ملازمین میں سے نہیں تھا، بلکہ نیل کا ایک تاجر تھا۔[1]

شام کو موضع پیر نگر میں کشتیوں نے لنگر ڈالا اور آپ کی طرف سے تمام قافلے کے لیے کھانا تیار ہُوا۔ صبح کو شاہ کریم عطا صاحب سجادہ نشینِ خانقاہِ سلون کے خدام میں سے ایک شخص نے شیرینی پیش کی۔

دوپہر کے وقت کشتیاں قصبہ گکنی کے سامنے لنگر انداز ہُوئیں۔ اُس روز اور دُوسرے روز وہاں کے پٹھانوں کی طرف سے ضیافت رہی۔ زنانی سواریاں شاہ زمان صاحب کے مکان

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۶۶، ۶۷

میں گئیں اور تمام دن رہ کر لبِ دریا خیموں میں واپس آئیں۔ پٹھان شرفا کی مستورات رات کو پیادہ چل کر ملاقات و بیعت کے لیے خیمے میں آئیں اور بیعت سے مشرف ہوئیں۔(۱)

ایک عالِم کی مخالفتِ حج قصبۂ گنگنی میں سُنا گیا کہ گڈھ کے رہنے والے مولوی یاد علی صاحب کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے لیے سفرِ حج حرام ہے، اس لیے کہ درمیان میں سمندر حائل ہے۔ اگر جہاز ٹوٹ گیا، تو نجات مشکل ہے۔ حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ چالیس آدمیوں کے ساتھ قصبۂ گڈھ تشریف لے جائیں اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کر کے ہندوستان اور تمام اسلامی ملکوں کے مسلمانوں پر قرآن و حدیث کے رُو سے حج کی فرضیت اور فضیلت بیان کریں اور وہاں کے لوگوں کو وعظ وارشاد کر کے واپس تشریف لائیں۔ چنانچہ دونوں حضرات چالیس آدمیوں کے ساتھ گنگا پار کر کے قصبے میں تشریف لے گئے اور شاہ ابراہیم علی کی مسجد میں وہاں کے تمام رؤسا اور باشندوں کے سامنے قرآن و حدیث کے قوی اور واضح دلائل کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے حج کی فرضیت اور فضیلت ثابت کی۔ وہاں سے اُٹھ کر شاہ مظہر علی کے مکان پر آ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر واپس آ ہی رہے تھے کہ مولوی یاد علی کا بھیجا ہُوا آدمی ہندوستانیوں کے لیے سفرِ حج کی حُرمت کے بارے میں چند ضعیف ضعیف روایتیں، جو بعض فتاویٰ کی کتابوں سے نقل کی گئی تھیں، لے کر آیا۔ اس پر فریقین کے درمیان کچھ بحث و مباحثہ ہُوا اور بات بڑھی۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر نزاع کو رفع دفع کیا۔ دونوں حضرات نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں سے چل کر دریا کے کنارے عصر کی نماز پڑھی اور دریا پار کر کے قافلے سے جا ملے۔(۲)

دُوسرے روز وہاں سے کُوچ ہُوا۔ دوپہر کے وقت موضع جہان آباد کے نیچے، جو اَوَدھ کی نوابی کی مشرقی سرحد ہے، موضع کیمہ کے متّصل رام چورہ کے گھاٹ پر کشتیاں لگیں۔ شیخ حسن علی صاحب، جو سفرِ حج سے ایک سال پہلے اپنے بھائیوں اور متعلقین کے ساتھ بیعت سے

(۱) مکتوب سیّد حمیدالدین۔ (۲) ایضاً

مشرف ہو چکے تھے، اپنے موضع کیمہ سے چل کر گھاٹ پر منتظر کھڑے تھے۔ انھوں نے پورے تین روز قافلے کی ضیافت کی اور اپنے چاروں بھائیوں اور اپنے گھر کی تمام مستورات کے ساتھ اپنے گھر کا سب سامان لے کر قافلے میں شریک ہو گئے۔[1]

اہلِ قافلہ کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ سب کا دریا کے راستے سے سفر کرنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ مولانا عبدالحی صاحب کو ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ خشکی کے راستے الٰہ آباد روانہ ۵ کر دیا گیا۔ حضرت خود باقی قافلے کے ساتھ کشتی پر روانہ ہوئے۔[2]

ہندوانہ وضع و معاشرت کی اصلاح اور دینی تعلیم و تربیت اُوجھنی میں شیخ لعل محمد صاحب، جو حضرت کے بہت قدیمی مخلص مرید تھے، تشریف آوری کے منتظر کھڑے تھے۔ کشتیاں موضع اوجھنی کے نیچے لنگر انداز ہوئیں۔ شیخ لعل محمد صاحب نے عرض کیا کہ "ہمارے مکان پر دو دو چار چار کوس کی بستیوں کے ڈھائی تین سو مسلمان آپ کی آمد کی خبر سُن کر بیعت کرنے کے واسطے جمع ہیں اور ۱۰ ہمارے مہمان ہیں۔"

شیخ لعل محمد صاحب آپ کو لے گئے اور جو مسلمان وہاں جمع تھے، اُن کو مرید کرایا اور حضرت سے اُن کا حال بیان کیا کہ "ان لوگوں کی چوراسی بستیاں ہیں۔ نام کو تو مسلمان ہیں، مگر سب کام ہندوؤں کے کرتے ہیں۔ بُت بھی پُوجتے ہیں۔ ہولی، دیوالی بھی کرتے ہیں، قلعی کے پھول کے، پیتل کے برتن میں کھانا پکاتے ہیں اور طریقۂ اسلام سے محض بے خبر ہیں۔ آپ نے ۱۵ مرید تو کیا ہے، مگر کچھ دینِ اسلام کی تعلیم بھی ان کو کریں۔"

آپ نے اُن سے فرمایا کہ "بھائیو، مُرید تو ہم نے تم کو کیا، مگر دس پانچ روز یہاں رہنے کی فرصت ہم کو نہیں، جو ہم تم کو دینی تعلیم کریں۔ سو اس کے لیے شیخ لعل محمد کو ہم اپنا خلیفہ کرتے ہیں۔ جو کچھ نصیحت یہ تم کو کریں، اس پر تم عمل کرنا۔ تم ہمارے مرید ہو، ہم تمھارے پیر ہیں اور جو نہ مانو گے، تو نہ ہم تمھارے پیر، نہ تم ہمارے مُرید۔ اس بات کو خُوب یاد رکھنا۔" انھوں ۲۰

(۱) "مکتوبِ سید حمید الدین" (۲) ایضاً

نے کہا: "آپ کا فرمانا ہم کو قبول ہے"۔ پھر مولانا عبدالحی صاحب نے وعظ فرمایا۔[1]

اُو جھنی میں اور کشتیاں روانہ کر دی گئیں۔ آپ کی کشتی اور ایک اور کشتی باقی رہی۔

ایک انگریز کی طرف سے دعوت حضرت کے پاس ایک انگریز کی ہندوستانی بی بی آئی اور کہا کہ:

"آج میرے یہاں آپ کی دعوت ہے"۔ آپ نے کہا: "ہماری کشتیاں آگے جاتی ہیں"۔ اُس نے

5 کہا کہ: "دعوت قبول کرنا تو سُنّت ہے"۔ آپ نے فرمایا: "تمھاری دعوت قبول کرنا سُنّت نہیں۔"[2]

اُس نے کہا کہ "میری دعوت تو بڑے بڑے درویش اور مشائخ پیرزادے قبول کرتے ہیں اور

اپنی عزت و بزرگی سمجھ کر کھاتے ہیں اور اس بات کی تمنا رکھتے ہیں اور جو کچھ نقد رُپے دیتی ہوں

وُہ لیتے ہیں"۔ آپ نے کہا: "تمھارے یہاں کا کھانا اور نقد سب حرام اور ناروا ہے"۔ اس نے

کہا کہ: "پھر وُہ لوگ کیوں کھاتے اور لیتے ہیں؟" آپ نے فرمایا: "یہ مسئلہ اُن کو معلوم نہ ہوگا"۔

10 وُہ عورت اپنے گھر چلی گئی اور انگریز سے یہ حال کہا۔ وُہ اس مسئلے سے واقف تھا۔ کہا: "وُہ پادری

صاحب سچ کہتے ہیں"۔ پھر وُہ فرنگی آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ: "ہماری بی بی صاحب آپ

کی دعوت کرنے آئی تھی، آپ نے قبول نہ فرمائی۔ جو کچھ آپ نے اس امر میں اُس سے کہا، ہم نے

اُس کی زبانی سُنا۔ آپ نے بجا فرمایا۔ لیکن اگر ہم دعوت کریں، وُہ تو آپ قبول کریں گے؟" آپ

نے فرمایا: "کیوں نہ قبول کریں گے؟ مگر ہماری کئی کشتیاں جا چکیں اور ہم بھی تیار ہیں۔ دعوت

15 نہ کھانے کا یہ عذر ہے"۔ اُس نے کہا: "ابھی آندھی چلتی ہے، دیکھا چاہیے، کب تک موقوف ہو،

میں آپ کی ضیافت ضرور کردوں گا"۔

آپ نے اس کا کہنا قبول فرمایا۔ اس دن اس کی دعوت کھائی۔ صبح کو بستی والوں میں

سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت کے بعد دوپہر کے قریب آپ سوار ہوئے۔ کشتیاں کھلیں۔[3]

دہاں سے کوئی چار کوس موضع اسرولی ہوگا۔ وہاں کا زمیندار شیخ وزیر نام آپ کو لینے وہاں آیا تھا۔

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۰۹ (۲) اس لیے کہ وُہ انگریز کے پاس تھی۔ یہ تعلق ناجائز تھا اور اس سلسلے کا سب مال حرام اور ناجائز تھا۔ (۳) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۱۴، ۶۱۵

عرض کی کہ "حکم ہو، تو میں آگے چل کر آپ کی دعوت کی تیاری کروں۔" آپ نے فرمایا: "جب تک ہماری کشتیاں وہاں نہ پہنچیں، کھانا نہ پکانا۔" اُن کو اُدھر رخصت کیا، اِدھر آپ روانہ ہوئے۔ آگے چل کر کئی کوس پر وُہ تینوں کشتیاں بھی مل گئیں۔

جس گھاٹ پر شیخ وزیر نے کشتیاں ٹھیرانے کو کہا تھا، دریا کی طغیانی کے سبب سے اس گھاٹ سے کشتیاں کوس سوا کوس آگے نکل گئیں۔ شیخ وزیر لوگوں کو پکارتے رہے۔ ملاحوں نے نہ سُنا۔ شیخ وزیر سواری لے کر وہیں پہنچے۔ کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ آپ اُن کے مکان پر گئے۔ بہت لوگ بیعت ہوئے۔ رات بھر آپ وہیں رہے۔[1]

اصلاح و تبلیغ موضع اسر دلی میں سب لوگ ہندوؤں کی سی پوشاک پہنتے تھے اور ویسے ہی اُن کے تمام برتن تھے۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ ان بھائیوں کو کچھ وعظ و نصیحت کرو کہ شرک و بدعت کے جو کام کرتے ہیں، اُن کو چھوڑ دیں، نماز روزے پر مستعد ہوں۔

اس نواح کی بستیوں سے ہزار آدمیوں کے قریب اور بھی آئے تھے۔ اُن کو بھی آپ نے مُرید کیا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ بھائیوں کو توجہ دو اور اللہ تعالیٰ کا نام بتاؤ۔ پھر کسی نے پندرہ پندرہ بیس بیس آدمیوں کو بٹھا کر توجہ دی اور ایک ہی توجہ میں اسی وقت ان لوگوں کے لطائف ستہ جاری ہو گئے اور بعضوں کا سلطان الاذکار جاری ہو گیا۔

مولانا عبدالحی صاحب نے وعظ کہا اور شرک و بدعت کی قباحت، تعزیہ داری، قبر پرستی اور پیروں اور بزرگوں کی نذر و منت کی برائی کا بیان کیا۔ یہ سُن کر اُس بستی والوں نے اسی وقت تعزیوں کے چبوترے کھود کر برابر کر دیے اور علَم اور پنجے توڑ تاڑ کر بانس تو جلا دیے اور اُن کے کپڑے اور چاندی لا کر حضرت کے نذر کی کہ اپنے قافلے کے صَرف میں لائیے اور اطراف کی بستی والوں نے کہا کہ ہم بھی مکان پر جا کر یہی کام کریں گے۔[2]

گنگا کے دُوسرے کنارے موضع چھپری ہے۔ اس نواح کی بستیوں کے کوئی تین ہزار

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۱۵ تا ۶۱۶ (۲) "وقائع"، صفحہ ۶۱۶ تا ۶۱۷

آدمی بیعت کے لیے جمع تھے۔ اُنھوں نے بیعت کی اور وہ تمام لوگ محض عامی اور شعائرِ اسلام سے مُطلق بے خبر تھے۔ ہندوؤں میں اور اُن میں بظاہر اصلاً امتیاز نہ تھا۔ تعزیہ داری، گور پرستی اور بُت پرستی کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔ حضرت نے ان کو ان سب باتوں کی بُرائی سمجھائی، نماز روزے وغیرہ کی تاکید فرمائی۔ وہاں بھی تعزیے کے چبوترے اور امام باڑے تھے۔ اسی روز سب نے کھود کر برابر کر دیے اور شدوں اور نشانوں کو توڑ کر بانس تو جلا دیے اور اُن کا کپڑا اور چاندی سونا لاکر آپ کے آگے رکھ دیا۔ پھر مولانا عبدالحی صاحب نے کچھ دیر وعظ فرمایا۔"[1]

شام کے وقت قصبۂ موہریاں کے نیچے، جہاں شرفا کی بہت بڑی آبادی ہے اور لبِ دریا بڑی خوش قطع مسجد بنی ہوئی ہے، یہاں سے الٰہ آباد خشکی کے راستے سے ڈیڑھ کوس اور دریا کے راستے سے ڈھائی کوس ہے، کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ قافلے کے بہت سے لوگ خشکی کے راستے سے شہر کو روانہ ہوئے۔ آپ کشتی پر روانہ ہوئے۔ شہر الٰہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب کی تجویز کے مطابق بلوہ گھاٹ پر کشتیاں رُکیں۔ لبِ دریا راجہ اودت نرائن سنگھ کی سنگین بارہ دری میں سارے قافلے کا قیام ہوا۔ کشتیاں بارہ دری کے پائیں باندھ دی گئیں۔ اُوپر کی منزل میں آپ کا اور مستورات کا قیام تھا اور نیچے کی منزل پر تمام اہلِ قافلہ کا۔ مولانا عبدالحی صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تین روز پیشتر پہنچ کر اسی بارہ دری میں مقیم اور شیخ غلام علی صاحب کے مہمان تھے۔[2]

شیخ غلام علی صاحب شیخ غلام علی صاحب الٰہ آباد کے رئیسِ اعظم تھے۔ شاہانہ کارخانہ اور امیرانہ ٹھاٹ تھے۔ سو تو فقط خدمت گار تھے، جو اپنی نوکری پر حاضر رہتے۔ وہ دونوں وقت شیخ صاحب کے دسترخوان پر کھانا بھی کھاتے۔ کئی طبیب ملازم تھے اور الگ دواخانہ تھا۔ یہ اذنِ عام تھا کہ غریب محتاج جس دوا کے لیے آئے، لے جائے۔ شیخ صاحب کے مطبخ کا یہ بندوبست تھا کہ جب یہ قافلہ ٹھہرا ہے تو سب ملا کر دونوں وقت ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا کھانا پکتا تھا۔[3]

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۱۸ (۲) "مکتوب سید حمید الدین"

(۳) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۳۶، ۶۳۷

شیخ غلام علی کی عاشقانہ کیفیت اور شاہانہ ضیافتیں | شیخ صاحب نے کمال مسرت اور کشادہ پیشانی کے ساتھ پورے بارہ روز تک قافلے کی ضیافت کی۔ دونوں وقت روزانہ قورمہ، پلاؤ، زردہ اور تازی مٹھائی بڑی افراط کے ساتھ دسترخوان پر رہتی۔

چوتھے روز شیخ صاحب بڑی عقیدت مندی کے ساتھ بیعت کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے، اکیس کشتیوں میں کمخواب، مشروع کے تھان اور کئی جوڑ دوشالے، نینوں، ململ اور خا ۵
کے تھان اور سترہ ایسے خوبصورت اور نادر ہتھیار، جو امیروں کے سلاح خانوں کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتے، اور پانچ سو روپے نقد تقریباً تین ہزار مالیت کی نذر پیش کی اور بیٹوں، پوتوں اور مستورات اور اپنے عملے اور ملازمین کے ساتھ بیعت ہو گئے۔

دوسرے روز فی تھان پانچ چھ روپے کی قیمت کے ایک سو بیس تھان حجاج کے جامۂ احرام کے لیے اور دو سو چالیس گاڑھے کے تھان، جن میں سے ہر تھان تین روپے قیمت کا ہو گا، ۱۰
تمام اہلِ قافلہ کی پوشاک کے لیے اور پانچ سو روپے نقد ضروری اخراجات کے لیے اور بہت سے تحائف اور نفیس چیزیں، جن کا ذکر موجب تطویل ہے، پیش کش کیں۔

اس کے علاوہ الہ آباد کے قیام میں روزانہ اپنے گھر کی نفیس، گراں بہا اور نادر الوجود چیزیں اور تحائف نذر کرتے۔ قافلے کی روانگی کے قریب شیخ صاحب نے قافلے کے تمام لوگوں، چھوٹوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کو شمار کرایا اور فی کس ایک روپے کے حساب سے کچھ اوپر ۱۵
چار سو روپے حضرت کی خدمت میں پیش کیے کہ مساوی طور پر قافلے میں تقسیم کر دیے جائیں۔ چنانچہ یہ رقم اسی وقت اہلِ قافلہ کو تقسیم کر دی گئی۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ سرکار سے قافلے کے کھانے پر شیخ صاحب کے روزانہ ایک سو چالیس روپے صرف ہوتے تھے۔ تمام ہدایا و تحائف اور روزانہ مصارف کا تخمینہ اہلِ نظر نے دس ہزار روپے لگایا۔ ۲۰

شاہانہ اُولو العزمی اور دریا دلی کے باوجود شیخ صاحب ہر مرتبہ اپنی بے مائلی اور تہی دستی

کا عُذر کرتے۔

ایک روز شیخ صاحب کے گھر کی بیبیاں حضرت کے زنان خانے میں آئیں اور والدہ صاحبۂ سید محمد اسمٰعیل اور والدہ صاحبۂ بی بی سارہ کی خدمت میں اسی اسی روپیہ پیش کیے۔[1]

قلعے کے علاوہ قرب و جوار کے صدہا ارادت مند اور فقرا اور غربا جمع ہو گئے تھے اور دو وقتہ شیخ صاحب کے یہاں کھانا کھاتے تھے اور بہت سے باندھ کر لے جاتے تھے۔

شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ، جس میں دو خیمے شامل تھے اور دس بارہ چھوٹے خیمے چابک دست خیمہ دوزوں سے تیار کرا کر نذر کیے اور چار ہزار پانچ سو روپے مصارفِ سفر کے لیے پیش کیے۔ بعض لوگوں کا تخمینہ ہے کہ بیس ہزار روپے شیخ صاحب نے مجموعی طور پر صرف کیے ہوں گے۔[2]

شیخ صاحب کا یہ معمول تھا کہ جتنی مرتبہ آپ کی خدمت میں آتے، کوئی عمدہ بیش قیمت ہتھیار ضرور لاتے۔ دن میں ایک بار بھی، دو بار بھی۔ حضرت نے فرمایا کہ: "ابھی تو ہم حج کو جاتے ہیں۔ وہاں ہتھیار لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ آپ ہر وقت اور ہر روز یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں؟ وہاں سے جب اللہ تعالیٰ ہم کو مع الخیر لائے گا، تب ہم آپ سے لے لیں گے۔" شیخ صاحب نے جواب دیا کہ اول تو مجھ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کہاں جہاد کریں گے: اس ملک میں یا کسی اور ملک میں۔ پھر مجھ کو خود اپنی زندگی کا بھروسہ بھی نہیں۔ اگر میں مرگیا، تو میری آرزو باقی رہ جائے گی۔ آپ اس کو لے جائیں۔ پھر آپ کو اختیار ہے، جہاں چاہیں وہاں رکھ دیں۔[3]

الٰہ آباد اور اس کے نواح میں اصلاح و تبلیغ الٰہ آباد میں شہر اور بیرونجات کے ہزارہا ہزار مرد اور عورتوں نے بیعت کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ تھا کہ شاید شہر میں کوئی مسلمان باقی نہیں

(۱) "مکتوب سید حمید الدین" (۲) "مخزن احمدی"، صفحہ ۶۷، ۶۸ (۳) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۳۴، ۶۳۵

رہا، جس نے بیعت نہ کی ہو۔(۱)

شہر اور باہر کے بکثرت زمیندار جمع تھے۔ حضرت نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا: "ان زمیندار بھائیوں کو نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے ضروری مسائل کی تعلیم کر کے ہمارے پاس لاؤ۔ پھر جو ہم کو کہنا ہوگا، ہم کہہ دیں گے۔"

مولانا نے وہیں کوٹھی کے ایک مکان پر بٹھا کر اُن کو ضروری مسائل تعلیم کیے اور آپ ۵ کی خدمتِ بابرکت میں لے گئے۔ آپ نے شیخ لعل محمد اور شیخ وزیر اور اُن کے بیٹوں کو بھیری کے دونوں بھائی زمینداروں کو خلافت نامہ دیا اور اپنا خلیفہ کیا اور جن کو اُنھوں نے اپنے اپنے آدمیوں سے لائق جانا، اُن کے لیے کہا۔ آپ نے اُن کو بھی اپنا خلیفہ کیا اور کسی کو کُرتہ اور کسی کو عمامہ، کسی کو تاج عطا فرمایا اور سب کے لیے دُعا کی۔ شیخ وزیر کو برکت کا ایک روپیہ عطا فرمایا اور سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "کچھ مدّت آپ بھائیو، للہ فی اللہ اپنے نواح و اطراف کی بستیوں میں ۱۰ دورہ کرو اور مسلمانوں کو توحید اور اسلام کا طریق سکھاؤ اور شرک و بدعت سے بچاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔"

یہ سُن کر لوگوں نے عرض کیا کہ: "آپ کا فرمانا بجا و درست، مگر ہم کو عُذر یہ ہے کہ: "اوّل تو ہم اقسامِ شرک و بدعت سے واقف نہیں کہ کن کاموں کو شرک کہتے ہیں اور کن کو بدعت؛ اور دُوسرے یہ کہ تمام لوگ عوام کالانعام شعارِ اسلام سے محض ناواقف ہیں۔ اُن کو یہ باتیں ۱۵ سکھانا اور راہِ راست پر لانا تو ہم لوگوں سے بہت دُشوار ہے۔"

آپ نے فرمایا: "اُن کی ہدایت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نہ میرے اختیار میں ہے، نہ تمھارے۔ تم جو اس امر میں للہ فی اللہ چند مدّت کوشش کرو گے، تو اس کا اجرِ عظیم خُدا سے پاؤ گے اور مفت میں جنّت کماؤ گے۔"

پھر آپ نے شیخ غلام علی صاحب رئیس سے کہا: "شیخ بھائی، تمھارے علاقے کی ۲۰

(۱) "مکتوب سید حمید الدین"

بستیوں میں جو مسلمان بستے ہیں، اُن کی تعلیم و تلقین کے لیے ہم نے تم کو مقرر کیا۔ ان زمیندار لوگوں کا اکثر کاروبار سرکار دربار سے تعلق رکھتا ہے۔ تم اُن کے حامی کار اور مددگار رہو اور وہ تمھارے سرکار کے مالگزار۔ جس قدر تم سے ہو سکے، ہر ایک کی لیاقت کے موافق روپیہ لینے میں تخفیف کرو۔ جب اُن پر تمھارا احسان ہوگا، تب جو کچھ تم اُن سے کہو گے، بے انکار سب مانیں گے۔"

شیخ صاحب نے اُسی وقت اپنے چپراسی سے کہا کہ ہمارے توشے خانے کے مدار و غہ نصرت کو بُلا لاؤ۔ شیخ صاحب نے بتاکید اُن سے کہا کہ جو زمیندار ہماری بستیوں کے یہاں تحصیل کا روپیہ لے کر آئیں، وہ ہم سے بے ملے نہ جانے پائیں۔

پھر آپ نے حافظ اکرام الدین دہلوی کو، جو وہاں جوتوں کی دوکان کرتے تھے، بُلایا اور اُن سے فرمایا کہ "ہم تم کو اپنا خلیفہ بنا دیں گے اور اوجھنی اور اُسر ولی وغیرہ کے جو بھائی یہاں ہیں، اُن کو تمھارے تابع کریں گے۔ تم الٰہ آباد کے اطراف و نواح کی بستیوں میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے دَورہ بھی کرنا اور ہر جمعے کو شیخ صاحب کے اس بنگلے پر وعظ بھی۔" اُن کے لیے آپ نے دُعا کی۔(۱)

الٰہ آباد سے کلکتے تک تمام شہروں اور بستیوں کے لوگوں میں، کیا شرفا اور کیا غربا، علی العموم برسوں سے یہ رسم تھی کہ شادی غمی کی دعوت وغیرہ میں جو لوگوں کو کھانا کھلاتے، تو ہندوؤں کی طرح دیہاتی لوگ پتریوں میں کھلاتے اور اکثر شہر والے مٹی کی رکابیوں میں، اور کھانا کھانے کے بعد جو کچھ بچتا، اس کو پتریوں اور رکابیوں سمیت گھورے پر پھینک دیتے۔ جب آپ نے لوگوں کا یہ حال سُنا اور دیکھا، آپ کو یہ عادت نہایت بُری اور ناپسند معلوم ہوئی۔ اوّل تو اس عادتِ بد سے شیخ غلام علی صاحب کو منع کیا اور فرمایا کہ "یہ کھانا نعمتِ الٰہی ہے اور جنابِ سرورِ دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم، نے فرمایا کہ مسلمانوں کے جھوٹے میں

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۲۶ - ۶۳۱

شفا ہے۔ سو اس کو اس طرح ذلت و خواری کے ساتھ پھینکنا جیسے کوئی گندگی کو پھینکتا ہے کمال بے ادبی اور نہایت بُری رسم ہے۔"

یہ بات سُن کر شیخ صاحب نے تو اس فعل سے توبہ کی اور جن لوگوں نے سُنا، وہ بھی تائب ہوگئے۔ آپ نے حافظ اکرام الدین صاحب سے فرمایا کہ "جہاں کہیں تم وعظ کہنا اور شرک و بدعت کی بُرائی بیان کرنا، وہاں اس رسمِ بد کی بھی بُرائی ضرور بیان کرنا اور یہ ۵ بُری عادت لوگوں سے چھڑانا۔"(۱)

قلعے کے مسلمان سپاہیوں کی عقیدت قلعۂ الٰہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے، انھوں نے انگریز قلعے دار کی اجازت سے حضرت کو قلعے میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہ نشین پر جو سلاطینِ سابق کی تخت گاہ تھی، آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی اور قدیمی مریدین کی توجہاتِ باطنی سے ۱۰ بڑے بڑے فیوض اور برکات حاصل کیے۔ چالیس روپے نقد، ایک پستول، ایک انگریزی گرج اور ایک فرڈ ناٹ پیش کیا۔ دوسرے روز پورے قافلے کی پر تکلف ضیافت کی۔(۲)

الٰہ آباد کے دوسرے مخلصین الٰہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب کے علاوہ، جو سید صاحبؒ اور قافلے کے مستقل میزبان تھے، جن لوگوں کو خدمت کی سعادت حاصل ہوئی، ان میں شیخ محمد تقی، بسئی میاں، نجیب خاں میواتی، رنجیت خاں جوتے کے سوداگر، حافظ نجابت علی، ۱۵ محمد حسین، عبدالستار قابلِ ذکر ہیں۔(۳)

دوسرے الٰہ آباد میں سے مولوی کرامت علی صاحب نے بھی بیعت کی۔ سفید سے اور پشمینے کے تھان، جن کی قیمت کا اندازہ دو سو روپیہ لگایا جاتا ہے، نذر کیے۔ ایک روز پورے قافلے کی پر تکلف دعوت کی اور چالیس روپے نقد پیش کیے۔(۴)

دو روز آپ کا قیام شاہ اجمل صاحب کے مکان پر رہا۔ شاہ صاحب ۲۰

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۹۴۴　(۲) مکتوب سید حمید الدین　(۳) "وقائع"، صفحہ ۹۶۱
(۴) مکتوب سید حمید الدین

بستیوں میں جو مسلمان بستے ہیں، اُن کی تعلیم و تلقین کے لیے ہم نے تم کو مقرر کیا۔ ان زمیندار لوگوں کا اکثر کاروبار سرکار دربار سے تعلق رکھتا ہے۔ تم اُن کے حامی کار اور مددگار رہو اور وہ تمھارے سرکار کے مالگزار۔ جس قدر تم سے ہوسکے، ہر ایک کی لیاقت کے موافق روپیہ لینے میں تخفیف کرو۔ جب اُن پر تمھارا احسان ہوگا، تب جو کچھ تم اُن سے کہو گے، بے انکار سب مانیں گے"۔

شیخ صاحب نے اُسی وقت اپنے چپراسی سے کہا کہ ہمارے توشے خانے کے مدار و غیرہ نصرت کو بُلا لاؤ۔ شیخ صاحب نے بتاکید اُن سے کہا کہ جو زمیندار ہماری بستیوں کے یہاں تحصیل کا روپیہ لے کر آئیں، وہ ہم سے بے ملے نہ جانے پائیں۔

پھر آپ نے حافظ اکرام الدّین دہلوی کو، جو وہاں جوتوں کی دوکان کرتے تھے، بُلایا اور اُن سے فرمایا کہ "ہم تم کو اپنا خلیفہ بنا دیں گے اور اوجھنی اور اُسر ولی وغیرہ کے جو بھائی یہاں ہیں، اُن کو تمھارے تابع کریں گے۔ تم الٰہ آباد کے اطراف و نواح کی بستیوں میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے دَورہ بھی کرنا اور ہر جُمعے کو شیخ صاحب کے اس بنگلے پر وعظ بھی"۔ اُن کے لیے آپ نے دُعا کی۔[1]

الٰہ آباد سے کلکتے تک تمام شہروں اور بستیوں کے لوگوں میں، کیا شرفا اور کیا غربا، علی العموم برسوں سے یہ رسم تھی کہ شادی غمی کی دعوت وغیرہ میں جو لوگوں کو کھانا کھلاتے، تو ہندوؤں کی طرح دیہاتی لوگ پتریوں میں کھلاتے اور اکثر شہر والے مٹی کی رکابیوں میں؛ اور کھانا کھانے کے بعد جو کچھ بچتا، اس کو پتریوں اور رکابیوں سمیت گھورے پر پھینک دیتے۔ جب آپ نے لوگوں کا یہ حال سُنا اور دیکھا، آپ کو یہ عادت نہایت بُری اور ناپسند معلوم ہُوئی۔ اوّل تو اس عادتِ بد سے شیخ غلام علی صاحب کو منع کیا اور فرمایا کہ "یہ کھانا نعمتِ الٰہی ہے اور جنابِ سرورِ دوعالم، صلّی اللہ علیہ وسلّم، نے فرمایا کہ مسلمانوں کے جھوٹے میں

(۱) "وقایعِ احمدی"، صفحہ ۶۲۶ - ۶۳۱

شفا ہے۔ سو اس کو اس طرح ذلت و خواری کے ساتھ پھینکنا جیسے کوئی گندگی کو پھینکتا ہے کمال بے ادبی اور نہایت بُری رسم ہے۔"

یہ بات سُن کر شیخ صاحب نے تو اس فعل سے توبہ کی اور جن لوگوں نے سُنا، وہ بھی تائب ہو گئے۔ آپ نے حافظ اکرام الدین صاحب سے فرمایا کہ "جہاں کہیں تم وعظ کہنا اور شرک و بدعت کی بُرائی بیان کرنا، وہاں اس رسمِ بد کی بھی بُرائی ضرور بیان کرنا اور یہ ۵ بُری عادت لوگوں سے چھُڑانا۔"(۱)

قلعے کے مسلمان سپاہیوں کی عقیدت قلعۂ الہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے، اُنھوں نے انگریز قلعے دار کی اجازت سے حضرت کو قلعے میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہ نشین پر جو سلاطینِ سابق کی تخت گاہ تھی، آپ ۱۰ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی اور قدیمی مریدین کی توجہاتِ باطنی سے بڑے بڑے فیوض اور برکات حاصل کیے۔ چالیس روپے نقد، ایک پستول، ایک انگریزی گرج اور ایک فرد نارٹ پیش کیا۔ دوسرے روز پورے قافلے کی پر تکلف ضیافت کی۔(۲)

الہ آباد کے دوسرے مخلصین الہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب کے علاوہ، جو سید صاحبؒ اور قافلے کے مستقل میزبان تھے، جن لوگوں کو خدمت کی سعادت حاصل ہوئی، ان میں شیخ ۱۵ محمد تقی، لبسی میاں، نجیب خاں میواتی، رنجیت خاں جوتے کے سوداگر، حافظ نجابت علی، محمد حسین، عبدالستار قابلِ ذکر ہیں۔(۳)

دوسرے الہ آباد میں سے مولوی کرامت علی صاحب نے بھی بیعت کی۔ سفید سے اور پشمینے کے تھان، جن کی قیمت کا اندازہ دو سو روپیہ لگایا جاتا ہے، نذر کیے۔ ایک روز پورے قافلے کی پر تکلف دعوت کی اور چالیس روپے نقد پیش کیے۔(۴)

۲۰ دو روز آپ کا قیام شاہ اجمل صاحب کے مکان پر رہا۔ شاہ صاحب

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۴۴　(۲) مکتوب سید حمید الدین　(۳) "وقائع"، صفحہ ۶۲۱
(۴) "مکتوب سید حمید الدین"

آخری مرض میں مبتلا تھے۔[1] شاہ صاحب نے پچاس روپے بتقریبِ ضیافت اور دو خوشنما رضائیاں ہدیۃً پیش کیں۔[2]

الٰہ آباد سے روانگی سے پہلے آپ نے مولوی وحید الدین صاحب کے حقیقی چچا حافظ احمد الدین صاحب کو اہلِ الٰہ آباد کی تعلیم و تلقین کو اور حافظ صاحب موصوف کے صاحبزادے سعد الدین کو اہلِ قلعہ کی تعلیم کے لیے چند دن ٹھیرنے کا حکم دیا۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو ایک سو پندرہ آدمیوں کے ساتھ خشکی کے راستے سے مرزا پور روانہ فرمایا۔ تیرھویں دن مستورات کو نمازِ صبح سے پہلے بارہ دری سے پیادہ پا کشتی تک پہنچا کر باشندگانِ الٰہ آباد سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے اور الٰہ آباد سے دوسری منزل مرزا پور ہوئی۔[3]

مرزا پور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خشکی کے راستے سے چار گھڑی پیشتر شہر پہنچ چکے تھے اور شیخ شاہ محمد صاحب[4] سوداگر کے مکان پر مقیم تھے۔ سوداگر صاحب قافلے کے منتظر اور کھانے کی تیاری میں مشغول تھے۔ تھوڑی دیر میں دونوں قافلے یکجا ہوئے اور سوداگر صاحب کے مکان پر سب کے لیے کھانا تیار ہو کر آیا۔ دوسرے روز سوداگر صاحب نے ایک بڑا خیمہ لبِ دریا نصب کیا اور قافلے کی تمام ضروریات مہیا کیں اور تمام اہلِ قافلہ کے لیے اپنے یہاں سے کھانے کا انتظام کیا۔ مستورات کے لیے حسبِ دستور قافلہ کا خیمہ لگایا گیا۔ شیخ صاحب کی درخواست پر ایک ہفتہ قیام کا ارادہ کر لیا گیا۔[5]

تیسرے روز شیخ صاحب اپنے تمام بھائیوں، بچوں اور مستورات سمیت بیعت میں داخل ہوئے اور پانچ سو روپے نقد اور ایک جوڑی پستول، تقریباً بیس تھان ململ، نینوں اور مشروع وغیرہ کے اٹھارہ تھان گاڑھے کے، قافلے کی پوشاک کے لیے پیش کیے۔

دوسرے روز مرزا پور کے تمام مسلمان باشندے بیعت میں داخل ہو گئے۔ مرزا پور کے

---

(۱) یکم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ کو شاہ صاحب نے انتقال کیا (نزہۃ الخواطر) (۲) "مکتوب سید حمید الدین" (۳) "مکتوب سید حمید الدین" (۴) شیخ عبد اللطیف سوداگر (وقائع احمدی) (۵) "مکتوب سید حمید الدین"

پٹھان شرفا جو وہاں کے قدیمی زمینداررہیں، اپنے متعلقین کے ساتھ بیعت ہوئے۔ ایک اشرفی نذر گزرانی اور ایک روز اپنی طرف سے قافلے کا کھانا کیا۔ مولوی فرزند علی صاحب نے گاڑھے کے چالیس تھان اہل قافلہ کی پوشاک کے لیے اور اسی روپے مولانا عبدالحی صاحب و مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت سے بیعت کی اور بنارس پہنچ کر شریک قافلہ ہونے کا وعدہ کیا۔ ۵

دوسرے حضرات کی دعوتوں اور ضیافتوں کے علاوہ مرزا پور کے زمانۂ قیام میں روزانہ کھانا سوداگر صاحب کے گھر سے آتا رہا۔[1]

انصاف و ایثار — قافلے کی کشتیوں کے گرد و پیش سوداگروں کے مال و اسباب کی کچھ کشتیاں پہلے سے کھڑی تھیں۔ مرزا پور کے سوداگر جو لینے آئے تھے، ملاحوں سے کہنے لگے کہ ان کشتیوں کو یہاں سے ہٹا کر اور جگہ لے جاؤ۔ حضرت نے فرمایا کہ: "نہیں، یہ کیا بات ہے؟ ہماری کشتیاں رات کو آئی ہیں اور یہ پہلے سے یہاں کھڑی تھیں۔ اُن کو جہاں ہیں، وہیں رہنے دو"۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ: ۱۰ "حضرت، یہاں کا یہی قانون ہے کہ کسی معزز شخص کی ناؤ آتی ہے، تو سوداگروں کے مال کی کشتیاں ہٹا دی جاتی ہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہم کو تمھارے یہاں کا یہ قانون پسند نہیں ہے کہ اپنے کو آرام، دوسرے کو ایذا دیں"۔[2]

خدمتِ عام و نفع رسانی — گھاٹ پر رُوئی سے لدی ہوئی ایک ناؤ کھڑی تھی۔ رُوئی کا مالک مزدوروں کا منتظر تھا کہ اس رُوئی کو لاد کر گودام لے جائیں۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ: ۱۵ "رُوئی کے گٹھے اُتار لو"۔ صدہا آدمی اس کشتی میں لپٹ گئے اور دو گھڑی کے عرصے میں ناؤ خالی کر کے رُوئی گودام کے دروازے پر پہنچا دی۔ لوگ یہ حال دیکھ کر متحیر ہو گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ لوگ تو عجیب طرح کے ہیں کہ رُوئی والے سے نہ جان نہ پہچان، بے مزدوری للّٰہ فی اللّٰہ اس کا اتنا کام کر دیا۔ بے شک، یہ اللّٰہ والے لوگ ہیں۔[3] ۲۰

(۱) مکتوب سید حمید الدین (۲) "وقائع"، صفحہ ۶۴۶ (۳) "وقائع"، صفحہ ۶۴۶

گدھے والوں کی دعوت میں شرکت | مرزاپور میں سات گھر مسلمان خشت پزوں (اینٹ پکانے والوں)

کے تھے۔ وُہ بڑے دولتمند تھے۔ ہر کسی کے یہاں پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ گدھے خچر تھے۔ جو اُن سے اینٹیں مول لیتا اور بار برداری کی مزدوری دیتا، وُہ ان گدھوں، خچروں پر لاد کر بھجوا دیتے۔ شہر میں وہ گدھے والے کر کے مشہور تھے۔ اگرچہ قوم کے وُہ شریف تھے، مگر اس نام اور پیشے کی حقارت و کراہت کے سبب سے مرزاپور کے مُسلمان شرفا و غربا اُن کے گھر کا کھانا پانی کھاتے پیتے نہ تھے۔ اُن لوگوں نے حضرت سے عرض کی کہ غریب خانے پر تشریف لائیں اور بیعت سے مشرف کریں۔ آپ نے منظور فرمایا۔ وہاں کے مُسلمانوں نے عرض کیا کہ: "آپ اُن کے یہاں نہ جائیں۔ یہ لوگ گدھے والے ہیں۔ شہر کا کوئی مُسلمان ان کے گھر کا کھانا پانی نہیں کھاتا پیتا۔" آپ نے فرمایا: "یہ کیا بات ہے؟ یہ بھی تو مُسلمان بھائی ہیں۔ حلال پیشہ کرتے ہیں۔ اس پیشے میں کوئی بُرائی عیب نہیں۔ اس کو معیوب جاننا بہت معیوب ہے، اس لیے کہ گدھے "خچر" پالنا، اُن پر سوار ہونا سنت ہے۔ انبیا اور اولیا نے گدھے "خچر" پالے ہیں اور اُن پر سوار ہوئے ہیں۔ اب تک حرمین شریفین کا یہی دستور ہے۔" آپ نے اُن کو نصیحت اور فہمائش کی اور خشت پزوں کو تسلی دی کہ ہم ضرور تمھارے یہاں آئیں گے اور دعوت کھائیں گے۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور کھانا تناول فرمایا۔

کھانے کے بعد اُن لوگوں نے ایک تھالی میں تین سو یا چار سو روپے پیش کیے اور بہت سے کمخواب، گلبدن، مشروع، جامدانی، محمودی ململ وغیرہ کے تھان حاضر کیے۔ آپ نے کچھ نہ لیا۔ اُنھوں نے بہت اصرار کیا۔ آپ نے کسی طور نہ مانا۔ جب وُہ دلگیر ہوئے، تو آپ نے بعد میں فرمایا کہ: "ہمارے نہ لینے کا سبب یہ ہے کہ اگر ہم لیتے، تو تمھارے شہر کے لوگ یہ جانتے کہ سید صاحب نے فقط روپوں کے لالچ سے اُن کی دعوت کھائی، ورنہ کبھی نہ کھاتے۔ اب اِن شاء اللہ تعالیٰ وُہ بھی تمھارے کھانے پینے کو مکروہ نہ جانیں گے اور کھائیں پئیں گے۔" (۱)

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۵۸، ۶۵۹

مرزاپور میں پہلے دن نماز کا وقت ہوا۔ آپ نے مسجد دریافت فرمائی۔ شیخ عبداللطیف صاحب نے عرض کیا کہ: "ایک مسجد میری تعمیر کی ہوئی ہے اور ایک مسجد شیخ محمد خاں رئیسِ مرزاپور کی ہے۔ اُن کی بہت بڑی برادری ہے، لیکن ابھی تک اُن کو بدعات اور منکرات سے اجتناب نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے دے، تو اُن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہو جائے گی۔" آپ محمد خاں صاحب ہی کی مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ خاں صاحب نے خود مسجد کا اہتمام کیا اور اہلِ برادری کو جمع کیا اور نماز کے بعد اپنی کوتاہی کی معافی چاہی اور متعلقینِ خاندان و برادری سمیت بیعت ہو گئے۔[1]

گرد و نواح کے بھی ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی اور شرک، بدعات وغیرہ سے تائب و مجتنب ہوئے۔

ان دنوں ایک بڑی خراب ہوا چلی۔ شہر کے بہت آدمی بیمار ہوئے اور کئی موتیں ہوئیں۔ شاہ حسن علی کیمہ کے رہنے والے، جو شریکِ سفر تھے، اُن کی ایک ہی بیٹی چودہ برس کی عمر کی تھی، وہ بھی اسی بیماری میں گئی۔ محمد ہاشم باشندۂ لکھنؤ بھی بیمار ہو کر جاں بحق ہوئے اور پٹھانوں کے قبرستان میں دونوں بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کیے گئے۔ شاہ حسن علی کے ایک بھائی بھی بیمار ہوئے اور زندگی کی اُمید نہ رہی۔ اسی اثنا میں قافلے کا کوچ ہو گیا۔ بنارس پہنچ کر اللہ نے اُن کو شفا دی۔[2]

اسلامی معاشرت و مساوات مولانا عبدالحی صاحب کے وعظ سے ایک بازاری عورت تائب ہوئی۔ حضرت نے سید عبدالرحمٰن صاحب سے فرمایا کہ اس کو کشتی پر بٹھا دو۔ وہ عورتوں کی کشتی پر لے گئے، تو عورتیں چیخنے لگیں کہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے، دوسری ناؤ پر بٹھاؤ۔ سید عبدالرحمٰن صاحب نے حضرت سے ذکر کیا۔ آپ نے مولوی وحید الدین صاحب سے فرمایا کہ اس نیک بخت کو کسی جگہ لے جا کر بٹھا دو۔ اُنھوں نے عورتوں سے کہا۔ اُنھوں نے

---

(۱) "منظورۃ السعداء"　　(۲) "مکتوب حمید الدین"

کہا کہ "بازاری عورت ہے، ہم تو اپنی ناؤ پر نہیں بٹھائیں گے۔" سید عبدالرحمٰن صاحب نے سیّد صاحبؒ سے ذکر کیا۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب نے یہ بات سنی اور وہاں سے اٹھ کر کشتی کے قریب ہو گئے اور سب عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تم اس نیک بخت کو اپنی ناؤ پر کیوں نہیں بٹھاتیں؟ آج اس نیک بخت نے سب بُرے کاموں سے توبہ کی ہے۔ اس وقت یہ تم سب سے افضل ہے اور جو کچھ خدا و رسول کا شرعی حکم تم پر ہے، وہی اس پر ہے۔" اُن سب نے کہا: "اگر یہ بات ہے، تو اس کو پردہ کرا کے چھت پر الگ بٹھا دو۔" مولانا نے کہا کہ: "چھت پر کیا تم میں کوئی نہیں بیٹھ سکتی؟ وہی کیوں جا کر بیٹھے؟" اس میں کچھ اور زیادہ گفتگو ہوئی۔ مولانا نے خفا ہو کر فرمایا کہ: "اس میں عبدالحیٔ کی جو بیوی ہو، وہ چادر اوڑھ کر کشتی پر سے اُتر آئے۔" تین بار یہی حکم فرمایا۔ دو بار کہنے سے تو وہ نہیں اُتریں۔ تیسری بار جب مولانا نے فرمایا کہ: "جس طور سے شرعی پردہ تم کو بتایا ہے، اسی طور چادر اوڑھ کر چلی آؤ۔" پھر اسی طرح سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر مولانا صاحب کی بیوی ناؤ سے اُتر کر خشکی میں کھڑی ہو گئیں۔ مولانا کچھ دُور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ: "کیا گھر میں ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس سفر میں تم کو چکی بھی پیسنی پڑے گی، روٹی بھی پکانی پڑے گی، جو ضروری کام ہیں، سب کرنے پڑیں گے، پیروں بھی چلنا ہوگا؟ جب تم نے یہ سب قبول کیا، تب ہم نے تم کو ساتھ لیا۔"

اس عرصے میں دُور سے سیّد صاحبؒ نے یہ معاملہ دیکھا۔ وہیں سے پکار کر کہا: "ہاں، ہاں، مولانا صاحب، یہ تم نے کیا حرکت کی؟ یہاں تشریف لاؤ۔" مولانا نے کہا: "حضرت، آتا ہوں۔" یہ جواب دے کر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر آواز دی کہ دیکھو، عبدالحیٔ کی بیوی کھڑی ہے اور شرعی پردہ خدا اور رسولؐ کے حکم کے موافق اس کو کہتے ہیں اور یہ بات تین بار فرما کر اپنی بی بی سے کہا کہ اب وہیں ناؤ پر جا کر بیٹھو اور آپ سیّد صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے۔

پھر وہاں سے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اسی ناؤ کے پاس آ کر کھڑے ہوئے اور مولوی

وحید الدین صاحب سے کہا: "ہماری بہن بی بی رقیہ سے کہہ دو کہ اس عورت کو اپنے پاس بُلا کر بٹھالیں اور اس کو نیک باتیں نصیحت کریں اور دینِ اسلام کی باتیں سکھائیں"۔ بی بی رُقیہ بھی یہ باتیں سُنتی تھیں۔ مولوی صاحب سے کہا کہ: "بھیّا سے کہہ دو کہ اس کو یہاں بھیج دیں"[1]۔

سفر میں عورتوں کی نماز ایک مقام پر مولانا عبدالحی صاحب نے پردے کا انتظام کر کے اپنی بیوی کو اُتارا اور اُن سے نماز پڑھوائی اور ساتھیوں سے فرمایا کہ "صاحبو، دیکھ لو، عبدالحی کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے"۔ اس پر اور لوگوں نے بھی اپنی اپنی بیویوں سے نماز پڑھوائی[2]۔

بدعات پر برادری کی سزائیں مرزا پور میں محمد خاں نے اپنی برادری میں یہ قانون جاری کیا کہ اگر کوئی شخص کسی کے تعزیے میں شریک ہو اور تحقیق ہو جائے، تو برادری کی دعوت کے واسطے پچیس روپے جرمانہ اور جو عشرۂ محرم کے اندر کھچڑا پکائے یا شربت کرے، اس سے گیارہ روپے جُرمانہ اور جو کسی کا تعزیہ دیکھنے جائے، اس کے جُرمانے میں ایک طالب علم کو ایک مہینہ اپنے گھر کھانا کھلائے اور جس کی ایک وقت نمازِ فرض قضا ہو جائے، اس کے تیس زیر بند لگائے جائیں[3]۔

مرزا پُور سے چلتے وقت آپ نے حافظ قطب الدین اور قادر شاہ کو اہلِ مرزا پور کی تعلیم و تلقین کے لیے چند دن ٹھیر کر آنے کی اجازت دی۔ ڈیڑھ سو آدمیوں کو آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی معیت میں خشکی کے راستے سے بنارس روانہ فرمایا اور خُود مرزا پُور سے روانہ ہو کر ظُہر کی نماز ایک بڑی جماعت کے ساتھ چنار گڈھ کے قلعے کے نیچے پڑھی[4]۔ یہیں شیخ عبداللطیف اپنی والدہ اور ایک دُوسرے شخص کے ہمراہ اور مالِ تجارت کے ساتھ کرائے کی ایک دُوسری کشتی لے کر شریکِ سفر ہُوئے[5]۔

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۴۹ - ۶۵۱ (۲) "امیر الرّوایات"

(۳) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۵۶ (۴) "مکتوبِ سید حمید الدّین"

(۵) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۶۰

چنار گڈھ میں بھی بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوئی۔ آپ نے جس کو خلافت عطا فرمائی، وہ شیخ کامل ہو گیا۔ بہت لوگ اس کے مرید رشید تھے اور ہر ایک کو نسبت باطنی حاصل تھی اور سب موحّد، متبعِ سنّت تھے، شریعت کے موافق اپنی شادی غمی کا کاروبار کرتے تھے اور شرک و بدعت کی کوئی رسم اور چال نہیں ہونے پاتی تھی۔"(۱)

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۶۶۱، ۶۶۲
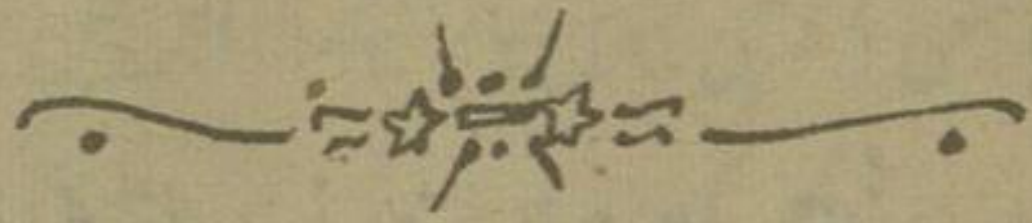
گیارھواں باب

بنارس تا کلکتہ

بنارس میں آپ کی قیامگاہ

۸ ذی الحجہ کو بنارس کے جلسائیں گھاٹ پر کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ حضرت چند آدمیوں کے ساتھ محلہ کندی گراں میں شاہ ابراہیم شرقی کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ رؤسائے شہر نے قافلے کی سکونت کے لیے دوبے کی حویلی تجویز کر رکھی تھی۔ وہ حضرت کو ۵ آ کر جائے قیام پر لے گئے۔ مکانات متعدد اور کشادہ تھے۔ اہلِ قافلہ کو جگہ فراغت سے ملی۔[1]

بارش کا موسم تھا اور یہاں آپ کے صدہا مرید تھے۔ اس لیے ایک مہینہ قیام کا ارادہ فرمالیا اور صاحبِ عیال اشخاص کے لیے کرائے پر اور کچھ مستعار مکانات لیے۔[2]

رؤسائے شہر کا رجوع اور استفادہ

مرزا بلاقی شہزادہ اپنی والدہ، اہلِ خانہ، متعلقین اور ملازمین ۱۰ کے ساتھ بیعت ہوئے اور تین روز تک دعوت کی اور برکاتِ صحبت حاصل کیے۔ حیات النساء بیگم نے، جنھوں نے بیعت کے دن سے اسٹس بروک فرنگی سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، دل کھول کر تواضع و ضیافت کی۔ مولوی عبداللہ، بھولا چابک سوار اور نوربافوں میں سے تقریباً دو ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ میاں اللہ رکھو، یار محمد، دین محمد، وغیرہ کے درمیان، جو اپنی برادری کے سرگروہ تھے، سالہا سال سے تنازع ۱۵ اور اختلاف تھا۔

---

(۱) مکتوب سید حمید الدین　　(۲) مخزنِ احمدی، صفحہ ۶۹

آپ کی کوششوں سے اُن میں ملاپ ہوگیا، اور ان سب نے گورپرستی اور تعزیہ پرستی سے توبہ کی۔[1]

عید الاضحیٰ بنارس ہی میں ہوئی۔ سو جانور آپ نے اپنے ہاتھ سے ذبح کیے۔[2]

بنارس میں مصروفیت بنارس میں پندرہ سولہ روز تک پانی کی جھڑی لگی رہی۔ اس بارش میں وہاں کے لوگ اپنے گھروں میں حضرت کو بیعت کے واسطے لے جاتے۔ بعض دفعہ آدھی رات گئے مکان پر تشریف لاتے۔ کیچڑ اور سیلاب کے باوجود آپ آنے جانے میں کسی سے عذر و حیلہ نہ کرتے۔ میاں دین محمد کہتے ہیں کہ: "بنارس میں جس وقت لوگ آپ کو لینے آتے، اُسی وقت آپ اُن کے ساتھ چلے جاتے۔ اندھیری رات، بجلی چمکتی ہوئی، مینہ برستا ہوا، لالٹین روشن، آپ لوگوں کے ہمراہ گھر گھر پھرتے اور لوگ بیعت ہوتے۔ بعض وقت رات بہت ہو جاتی، تو لوگوں سے فرماتے: "بھائیو! اب ہم کو چھوڑ دو۔ ان شاء اللہ اور وقت آئیں گے۔ کبھی کوئی کہتا کہ: "حضرت، میرا مکان قریب ہے۔ تشریف لے چلیے۔ کسی اور وقت، خدا جانے، آپ کے آنے کا اتفاق ہو یا نہ ہو۔" پھر اس کی خاطر بھی آپ اس کے مکان میں جاتے۔ وہاں سے نکلتے، تو دوسرا چاپلوسی کی یہی تقریر کر کے اپنے گھر لے جاتا۔ وہاں سے نکلتے، تیسرا لے جاتا۔ یہی تار تھا۔ آپ کہتے: "بھائیو، رات بہت گئی۔ ہمارے آدمیوں کو پانی، کیچڑ میں تکلیف ہوتی ہے۔" مگر کون سنتا تھا۔ بعضے وقت لوگوں سے فرماتے کہ بھائیو، یہ پانی، کیچڑ میں تمہارا پھرنا محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اگر وہ پروردگار تمہارے اس پھرنے کو پسند کر کے اپنے غلاموں، تابعداروں میں شامل کر لے، تو کیا عجب ہے۔ یہ بات سن کر ہم لوگ خوش ہو جاتے اور اس وقت کی تکلیف کو عین راحت جانتے اور ہرگز نہ گھبراتے۔"[3]

بعض مرتبہ کسی کسی محلے میں کئی کئی ہزار آدمیوں نے آپ سے بیعت کی۔ ایک موقعہ پر نور بافوں میں سے کوئی دو ہزار شخصوں نے بیعت کی۔ ایک دوسرے موقع پر اس برادری

(۱) "منظورۃ السعدا" (۲) یادداشت قلمی سفر حج (۳) "وقائع احمدی" صفحہ ۶۶۴، ۶۶۵

کے کئی ہزار آدمیوں نے بیعت کی"۔(۱)

بنارس کے راج گھاٹ پر مولوی عبداللہ اور بھولا چابک سوار بڑے ذی عزت اور نامدار اور وہاں کے تمام اہلِ بدعت کے سرگروہ اور سردار تھے۔ ایک بار اُنھوں نے لبیسر کی مسجد میں سید صاحبؒ کو مدعو کیا اور مولانا عبدالحئی صاحب کا وعظ سُنا۔ وعظ کے بعد سید صاحبؒ سے عرض کی کہ "ہم اور ہمارے محلّے والے شرک و بدعت میں گرفتار ہیں۔ اگر آپ ہمارے محلّے میں تشریف ۵ فرما ہوں، تو اُمید ہے کہ بے شمار لوگ پرہیزگار اور دیندار ہو جائیں اور شرک و بدعت چھوڑ کر توحید و سُنّت کے طریقے پر آجائیں"۔ آپ نے فرمایا کہ "ہم کئی بار مرزا بلاقی کے مکان پر گئے۔ وہاں تم نے ہم سے کیوں نہ کہا؟ وہیں سے تمھارے ساتھ چلتے"۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ "یہ تو ہم سے بڑا قصور ہُوا۔ مگر اب ہم کو سرفراز فرمائیں"۔ آپ نے کہا: "بہتر، جب کہو، اِنشاءَ اللہ تعالیٰ ہم چلیں گے"۔ ۱۰

اگلے روز وہ پینس لے کر آئے۔ دو ڈھائی سو آدمیوں کے ساتھ حضرت اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اُنھوں نے سب کی ضیافت کی اور ان دونوں صاحبوں نے اور اس محلّے کے کئی ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ صبح سے عصر تک بیعت کرنے والوں کا ہجوم رہا۔ آپ نے فرمایا کہ "بھائیو، بیعت لیتے لیتے اب ہم تھک گئے ہیں۔ اب ہم کو فرصت دو۔ اِنشاءاللہ تو کسی دن موقع ہوگا، تو پھر آئیں گے۔ جو لوگ باقی ہیں، اُن سے بھی بیعت لے لیں گے"۔(۲) ۱۵

دعوت کا ایندھن دُوسرے یا تیسرے دن پھر اس محلّے کے لوگ آپ کو لے گئے اور کہا کہ "آج دونوں وقت آپ کی ضیافت ہے"۔ اُنھوں نے کئی سو تعزیے توڑ کر ان کے کاغذ اور لکڑیوں کے انبار لگائے تھے۔ آپ کو وہاں لے جا کر دکھایا اور عرض کیا کہ "یہ آپ کی دعوت کھانے پکانے کا ایندھن ہے۔ دونوں وقت یہی لکڑیاں جلائی جائیں گی"۔ پھر دونوں وقت انھیں لکڑیوں سے اُنھوں نے پلاؤ پکایا اور تمام قافلے کو کھلایا اور بے شمار آدمی، جو بیعت ۲۰

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۶۷　　(۲) "وقائع"، صفحہ ۶۶۸ تا ۶۶۹

کرنے سے باقی رہے تھے، اُنھوں نے بَیعت کی۔[1]

ہسپتال میں مریضوں کی بَیعت بنارس میں جو پرانی ٹکسال مشہور تھی، اس میں انگریزوں نے ہسپتال بنایا تھا۔ ہسپتال میں پچاس ساٹھ مسلمان مریض تھے۔ اُنھوں نے حضرت کے پاس اپنا آدمی بھیج کر درخواست کی کہ: "ہم لوگ تو معذور ہیں۔ وہاں تک ہمارا آنا دُشوار ہے۔ مگر آپ للّٰہ فی اللّٰہ یہاں تشریف ارزانی فرمائیں، تو ہم بَیعت کریں۔" آپ ایک روز چند آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان مریضوں سے بیعت لی۔[2]

تلو کا چمار بنارس میں راج گھاٹ پر تلو کا نام ایک چمار رہتا تھا۔ مولوی عبداللّٰہ اور بھولا چابک سوار نے اس سے کہا کہ: "تلو کا، تو ہمارا یار ہے۔ ایک بات ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ یہ جو سیّد صاحب حج کو تشریف لے جاتے ہیں، اس شہر میں ہزاروں شخصوں نے ان کے ہاتھ پر بَیعت کی۔ چنانچہ ہم نے بھی کی ہے۔ اگر تو بھی کرے، تو اچھا ہے۔" اس نے پُوچھا: "بیعت کرنا کس کو کہتے ہیں؟" اُنھوں نے کہا کہ: "بُری باتوں سے تَوبہ کرنا، اس کو بَیعت کہتے ہیں۔" اُس نے کہا کہ: "بری بات سے تَوبہ اگر کہو، تو تمھارے رُوبرُو کر لوں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ: "یُوں نہیں، اُنھیں کے ہاتھ پر کر۔" اُس نے کہا: "کچھ مضائقہ نہیں۔ سیّد صاحب کو میرے غریب خانے پر لاؤ۔ مَیں تو کچھ تمھاری باتیں سمجھتا نہیں ہوں۔ پھر اس وقت جو کہوگے، کر دوں گا۔" اُنھوں نے آکر حضرت سے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: "بہت خوب۔ ہم کو لے چلو۔" پھر وہ دونوں صاحب حضرت کو اُس کے مکان پر لے گئے۔ اس کا وہ مکان چھوٹا سا چبوترہ تھا۔ اس میں وہ دونوں میاں بی بی رہتے تھے۔ حضرت جاکر وہیں بیٹھے اور اس سے بیعت لی۔ اس کے بعد اُس نے مولوی عبداللّٰہ سے پُوچھا کہ: "اب میاں صاحب کو کچھ دینا بھی چاہیے؟" حضرت نے فرمایا کہ: "اس میں دینے کی کچھ حاجت نہیں۔" اس نے عرض کیا کہ: "کچھ تو نذرانہ ضرور چاہیے۔ مَیں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ دیتے ہیں۔" وہ فقط ایک پھٹی ہوئی دھوتی اور ایک

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۷۰ (۲) "وقائع"، صفحہ ۶۹۹

پھٹا کپڑا سر پر باندھے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "تم خود محتاج اور غریب آدمی ہو۔ ہم کو چاہیے کہ کچھ تم کو دیں"۔ اُس نے نہ مانا اور اپنی عورت سے کہا کہ "کچھ مزدوری کے پیسے دھرے ہیں، وہ لاکر میاں صاحب کو دے"۔ اُس نے پانچ یا سات ٹکے لاکر آپ کے سامنے حاضر کیے۔ آپ نے نہایت خوش ہو کر لیے اور اپنے کسی آدمی کو دیے اور فرمایا کہ "یہ پیسے علیحدہ رکھنا"۔ ۵ پھر آپ نے اس کے لیے دعا کی اور مولوی عبد اللہ صاحب سے فرمایا: "ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ دنوں میں تم دیکھو گے کہ اس دعا کی کیسی خیر و برکت ہوگی"۔ اور فرمایا کہ "مولوی، اس کی تعلیم تمہارے ذمے ہے۔ روزے، نماز کے مسائل سکھاؤ اور نماز پڑھاؤ"۔ مولوی صاحب ممدوح نے قبول کیا اور اس سے کہا کہ "نکوکا، اس وقت موقع ہے۔ جو تیری برادری والے لوگ ہیں، اُن کو بھی لاکر مرید کرا۔ وہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو جائیں، تو خوب ہو"۔ یہ سُن کر ۱۰ وہ گیا اور پچیس تیس آدمیوں کو لاکر حاضر کیا۔ حضرت نے اُن سے بھی بیعت لی اور ان سب کے لیے دعا کی اور اُن کو بھی مولوی عبد اللہ کے سپرد کیا کہ ان کو بھی تم ہی نماز پڑھانا اور مسائلِ ضروری سکھانا۔ اس نکوکا کا نام آپ نے بدل کر الٰہی بخش رکھا اور جو اس کی برادری والے تھے، ان میں اکثروں کے نام یوں ہی ہندوؤں کے سے تھے، اُن کے لیے مولوی عبد اللہ کو اجازت دی کہ جو نام مناسب جاننا، بدل دینا۔

۱۵ پھر ان لوگوں نے عرض کی کہ "ہم کو تو دینِ اسلام کی باتوں کی خبر نہیں۔ تمام دن مزدوری کرتے ہیں۔ شام کو جو کچھ اللہ تعالیٰ دیتا ہے، کھانا کھا کر گھر میں سو رہتے ہیں۔ آپ یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی باتوں کی سمجھ دے"۔ حضرت نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ تم کو سمجھ بھی دے گا اور تمہاری مفلسی اور محتاجی بھی دور کر دے گا"۔ پھر آپ وہاں سے اپنی جائے اقامت پر تشریف لائے۔[1]

میاں الٰہی بخش ۲۰ سید صاحبؒ کے خادم میاں دین محمد اس قصے کے راوی ہیں کہ "جب میں

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۷۰ - ۶۷۲

سرحد سے سیّد صاحب کا فرستادہ ہندوستان آیا، تو بنارس بھی میرا جانا ہُوا۔ مولوی عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ: "تم الٰہی بخش سے بھی ملے؟" میں نے کہا: "کون اِلٰہی بخش؟" کہا: "وہی تلو کا چمار، جس کو بھولا اور میں نے سید صاحبؒ سے مُرید کرایا تھا۔" مَیں نے کہا کہ: "مجھ سے تو ابھی تک ملاقات نہیں ہُوئی۔" مولوی صاحب مجھ کو ایک مسجد میں لے گئے۔ وہاں کچھ لڑکے پڑھتے تھے۔ ان سے کہا کہ: "الٰہی بخش کہاں ہیں؟ جاکر بُلا لاؤ۔" اُن میں سے ایک لڑکا جاکر بُلا لایا۔ شرعی اُٹنگا پائجامہ، عُمدہ کرتہ پہنے، سر پر سفید عمامہ باندھے، چہرے پر لمبی سی ڈاڑھی، آئے اور السّلامُ علیکُم کہا۔ میں نے جواب دیا اور جانا کہ کوئی مولوی ہے۔ مجھ سے مولوی عبداللہ نے کہا کہ: "ان سے ملو۔ میاں الٰہی بخش یہی ہیں۔" میں نے اُٹھ کر مصافحہ اور معانقہ کیا۔ کئی آدمی اُن کے ساتھ اور بھی تھے۔ میں نے اُن سے بھی مصافحہ اور معانقہ کیا۔ پھر سب بیٹھے۔ مولوی عبداللہ صاحب نے کہا کہ: "میاں الٰہی بخش، تم نے ان کو پہچانا؟ یہ سیّد صاحب کے پاس سے آئے ہیں۔ ان کا نام دین محمدؔ ہے۔" وہ اور اُن کے ہمراہی کھڑے ہو گئے اور بڑے اشتیاق سے ملے اور حضرت کی خیر و عافیت پُوچھی۔ میں نے بیان کی، وہ حضرت کی مفارقت یاد کر کے آبدیدہ ہُوئے۔

پھر مولوی عبداللہ صاحب اُن کا حال مجھ سے بیان کرنے لگے کہ یہ مسجد میاں الٰہی بخش ہی کی بنوائی ہُوئی ہے اور ایک بہت عمدہ، خوش قطع پختہ محل اس کے قریب تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ مکان بھی انھیں کا بنوایا ہُوا ہے۔ دو حافظِ قرآن پڑھانے کو اِس مسجد میں انھیں کے نوکر ہیں اور ۲۵، ۳۰ طالب علم یہاں پڑھتے ہیں۔ اُن کا بھی کھانا کپڑا اُنھیں کے ذِمّے تھا۔ پھر اُن کے بھائی بندوں نے کہا کہ تمھارے ساتھ ہم نے بھی سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کے طفیل سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت نصیب کی۔ تم نے مسجد بنوائی، مدرسہ جاری کیا۔ اس کارِ خیر میں ہم کو بھی شریک کر لو۔ یہ تو نہیں مانتے تھے، پر ہم نے اور بھولا نے ان کو سمجھا کر مسجد کے بوریے بدھنے، چراغ بتی اور طالب علموں کے کھانے کپڑے کا خرچ اُن کے ذمے کیا اور دونوں حافظوں کو اُن کے ذِمّے اور جو مہمان و مسافر اس مسجد میں آئیں، اُن

کو بھی یہی کھلائیں اور مسجد کے متصل دریا کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ احاطہ بھی میاں الٰہی بخش کی برادری والوں نے کھینچ کر اس میں چند حجرے طالب علموں کے رہنے کو بنوائے۔[1]

مسلمانوں کے درمیان اتفاق و مصالحت

ایک جمعے کو لبِ بیسر کی مسجد میں غربا کے علاوہ بہُت اُمرا بھی نماز کو آئے۔ مرزا ابلاقی، مرزا حاجی شاہزادے اور مرزا کریم اللہ بیگ، مولوی غلام یحییٰ اور حکیم سلامت علی خاں وغیرہ سب تھے۔ نماز کے بعد مولانا عبدالحی صاحب نے وعظ ۵ فرمایا یہاں تک کہ عصر کی اذان ہوئی۔ نمازِ عصر کے بعد وہ سب معزز لوگ سید صاحب کی خدمت میں آئے اور آپس میں مشورہ کر کے عرض کیا کہ "حضرت، ہمارے اس شہر میں ہر قوم کے مقابلے میں نوربافوں کی بڑی جماعت ہے۔ کوئی سات آٹھ ہزار گھر ہوں گے اور ان میں بڑے بڑے مالدار اور تونگر ہیں اور اُن میں اکثر کے درمیان آپس میں مخالفت اور نااتفاقی ہے۔ خصوصاً ان سب میں دین محمد اور اللہ رکھو بڑے نامی زردار اور جتھے والے ہیں۔ اُن میں بھی مخالفت ۱۰ ہے اور اکثر شرک و بدعت کے افعال یہی لوگ کرتے ہیں۔ تعزیہ داری، گور پرستی، نوچندی جمعرات کا میلہ، غازی میاں کا میلہ اور اسی طرح کی دوسری باتوں میں یہ شامل ہیں۔ اگر کسی طرح دین محمد اور اللہ رکھو کا آپس میں ملاپ ہو جائے اور وہ آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لیں، تو سب کے درمیان ملاپ ہو جائے اور گویا اس شہر کا تمام شرک و بدعت دفع ہو جائے اور سب طریقِ ہدایت پر آجائیں"۔ ۱۵

آپ نے فرمایا کہ "ہاں، ہم اس حال سے واقف ہیں۔ دین محمد نے ہم سے کہا تھا، بلکہ اس امر میں ہم سے دعا بھی کرائی تھی۔ اب اس گفتگو سے آپ بھائیوں کی کیا مرضی ہے"؟

اُنھوں نے عرض کیا کہ ہماری مرضی یہی ہے کہ مسلمانوں کا آپس میں اتفاق اور ملاپ ہو جائے اور اس کے سبب سے دینِ اسلام کی ترقی ہو اور شرک و بدعت دُور ہو جائے، تو بہُت خوب بات ہے۔ ۲۰

---

[1] "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۷۲ - ۶۷۴

آپ نے فرمایا کہ "یہ بُغض و عداوت ان میں برسوں سے ہے اور بڑے بڑے لوگوں کے درمیان ہے۔ یہ کسی بندے کے قابو کی بات نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس میں مدد کرے، تو سب کچھ ہو جائے۔ ہم پھر کسی وقت دُعا کریں گے۔ آپ دین محمد اور اللہ رکھو کے پاس خبر کرنے کے لیے کسی کو تجویز کیجیے۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ ہم پرسوں یکشنبہ کے دن وہاں چلیں گے۔"

۵ تیسرے روز سویرے، سُورج نکلے، آپ دو سو آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور اُن کے محلّے کی مسجد میں اُترے۔ آپ کے وہاں آنے کا حال سُن کر ہزاروں آدمی، کیا ہندو، کیا مسلمان، سب آکر جمع ہو گئے کہ دیکھیں تو، سیّد صاحب کیونکر اُن کو ملاتے ہیں۔ لوگوں کے ازدحام کی خبر پا کر وہاں کا ایک انگریزی تھانیدار اور ناظر بھی چند برقندازوں کو لے کر حاضر ہُوا کہ کہیں کسی سے لڑائی بکھیڑا نہ ہونے پائے۔

۱۰ سیّد صاحبؒ نے دین محمدؐ، اللہ رکھو اور یارو کو بلوایا۔ وُہ آکر حاضر ہوئے اور کچھ شربت بنانے کی تدبیر کرنے لگے۔ آپ کو اس کی خبر ہُوئی۔ آپ نے فرمایا: "یہ تکلیف ہرگز نہ کرو، تمھارے فیصلے کے بغیر تمھارے یہاں کا پان تک ہم نہ کھائیں گے۔" اُنھوں نے شربت موقوف کیا۔ آپ نے اُن کو اپنے پاس بٹھایا اور اُن سے فرمایا کہ: "ہم نے اکثر لوگوں سے سُنا ہے کہ بہت برسوں سے تمھاری آپس میں خصُومت اور نااتّفاقی ہے اور کسی طور سے دفع نہیں ہوتی۔ یہ سب فریب

۱۵ شیطانی ہے۔ اس میں طرح طرح کے نقصان ہیں: دین کے بھی اور دُنیا کے بھی۔ اور سب سے بڑھ کر نقصان قطعِ رحمی کا ہے کہ نہ تم اُن کی شادی غمی میں شریک ہوتے ہو، نہ وُہ تمھاری۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو مالدار کیا ہے اور ہر طرح کا ہُنر دیا ہے۔ اس کو دُنیا کے کام میں جس طرح چاہتے ہو، صرف کرتے ہو اور اپنی ناموری پر مرتے ہو۔ تم کو لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرو اور اس کے کُفرانِ نعمت سے ڈرو اور اس لایعنی آپس کے جھگڑے کو

۲۰ دُور کرو اور آپس میں مل جاؤ۔" طرح طرح کی مثالوں سے اُن کو سمجھانا شروع کیا۔ جو لوگ وہاں حاضر تھے، سب پر ایک حال سا طاری تھا۔

جب وعظ و نصیحت سے آپ نے اُن کو خوب سمجھا لیا اور وہ راضی ہو گئے، تب آپ نے اُٹھ کر دین محمد اور اللہ رکھو اور لعل محمد اور یار محمد کو ملا دیا۔ ان چاروں نے آپس میں مصافحہ اور معانقہ کیا۔

پھر آپ نے فرمایا کہ: "بھائیو، جن کو ہم جانتے تھے کہ ان کا آپس میں نزاع ہے، اُن کو تو ملا دیا۔ باقی اور صاحبوں کو ہم پہچانتے نہیں۔ وہ صاحب آپ اُٹھ کر ایک دوسرے سے ۵ مصافحہ اور معانقہ کر لیں۔" پھر تو صدہا آدمی، جن کی ایک دوسرے سے نزاع تھی، آپس میں ملنے لگے اور اُن کی برادری والوں کے علاوہ جتنے ہندو مسلمان وہاں موجود تھے، یہ حال دیکھ کر عالمِ حیرت میں تھے اور کہتے تھے کہ: "برسوں سے یہاں کے سیٹھ ساہوکار اور شرفا، اُمرا اس امر کی کوشش کرتے رہے اور کسی سے کچھ نہ ہو سکا، سب عاجز ہو کر بیٹھ گئے اور سید صاحب نے ایک ہی جلسے میں برسوں کا یہ قصہ طے کر کے ملا دیا۔ کسی نے کچھ بھی چون و چرا نہ کیا۔ بیشک، ۱۰ یہ سید صاحب مقبولِ خدا اور صاحبِ کرامات ہیں۔"[1]

شرک و بدعات سے توبہ　دین محمد نے عرض کیا کہ کل آپ کی اور آپ کے تمام قافلے کی میرے یہاں دعوت ہے۔ آپ نے قبول کی۔ اگلے روز کوئی دو سو آدمیوں سمیت آپ دین محمد کے یہاں تشریف لے گئے اور وہاں دعوت میں اللہ رکھو اور یار محمد کو بھی دین محمد سے کہہ کر بلوایا۔ ۱۵

کھانے کے بعد دین محمد اور اُن کے اعزہ و اقربا نے بیعت کی۔ پھر زنانے مکان میں عورتوں کو ایک اور حویلی میں کر کے آپ کو اور ہمراہیوں کو لے گئے۔ اس مکان کے طاقوں میں طرح طرح کے صدہا کھلونے رکھے تھے۔ کہیں آدمیوں کی مورت تھی، کہیں جانوروں کی۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت ناخوش ہوئے، مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ ایک پختہ اینٹوں کا چبوترہ تھا۔ دین محمد نے حضرت سے عرض کی کہ: "یہ چبوترہ عورتوں نے تعزیہ رکھنے کے لیے بنوایا

(۱) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۷۶ - ۶۸۰

ہے اور ایک چبوترہ باہر امام باڑے میں مُردوں نے بنوایا ہے۔" آپ نے فرمایا کہ "یہ تو بہت بُری بات ہے۔ ان تمام تصویروں کو، جو طاق میں ہیں، توڑ ڈالو اور چبوتروں کو کھود کر برابر کر دو۔" اُنھوں نے عرض کی کہ "حضرت! اسی واسطے میں آپ کو اس مکان میں لایا ہوں کہ یہاں کا حال آپ ملاحظہ فرما کر کچھ ارشاد کریں۔ میں اگر ان خرافات کو دُور کروں گا، تو عورتیں بُرا مانیں گی اور لڑنے کو موجود ہوں گی۔ آپ بیعت لینے کے بعد اُن کو نصیحت اور فہمائش فرمائیں۔ تب بات دُرست ہوگی۔"

آپ نے اُن کی عورتوں سے بیعت لی اور تعزیہ داری اور تصویروں کی بُرائی اُن کے سامنے بیان کی اور فرمایا کہ "بیعت کرنا اسی کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں آدمی سچّے دل کے ساتھ سب بُری باتوں سے توبہ کرے اور اُن کو چھوڑ دے، نہیں تو بیعت کرنا نہ کرنا برابر ہے۔" اُن عورتوں نے عرض کی کہ "جو بہتر ہو، وُہ آپ کریں۔ ہم راضی ہیں۔"

آپ نے دین محمّد سے فرمایا کہ اپنے یہاں کے دونوں چبوترے کھود ڈالو اور تعزیہ داری کا جو اسباب ہو، سب دفع کرو اور ان طاقوں کے بُتوں کو توڑ ڈالو۔" اُنھوں نے اوّل اندر کے چبوترے کو کھود کر اور اسی کی اینٹوں سے ان تمام تصویروں کو توڑ پھوڑ کر انبار لگا دیا۔ اس کے بعد کچھ عَلَم، پنجے اور تعزیے تھے، وُہ توڑے۔ باہر کا چبوترہ کھودا۔

پھر آپ نے ان گھر والوں کے واسطے جناب الٰہی میں دُعا کی کہ "یا اللہ، تو اِن سب لوگوں کو ہدایت نصیب کر اور اپنی راہِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ۔" پھر آپ وہاں سے باہر تشریف لائے اور مسجد میں ظُہر کی نماز پڑھی اور مولانا عبدالحی صاحب سے وعظ کے لیے ارشاد فرمایا۔ وُہ وعظ فرمانے لگے اور آپ نے کچھ آدمی چھوڑ کر چلنے کی تیاری کی اور دین محمّد نے دُوسرے روز کی دعوت کے لیے اصرار کیا اور آپ نے بڑے عُذر کے بعد منظور فرمایا۔

دُوسرے روز آپ دین محمد کے مکان پر تشریف لے گئے۔ کوئی چار ہزار آدمی اُن

کی برادری کے تھے۔ کھانے کے بعد کئی ہزار آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مولانا عبدالحیؒ صاحب نے وعظ فرمایا۔(۱)

بدعات و رسوم کی اصلاح اور بیعت کا مقصد اگلے روز اللہ رکھو نے دعوت کی اور اُن کے خویش و اقربا نے بیعت کی اور اپنی عورتوں سے بیعت کرائی۔

اللہ رکھو نے عرض کیا کہ: "حضرت، بیعت تو ہم سب نے آپ کے ہاتھ پر کر لی، مگر کئی باتیں ہمارے یہاں ہیں۔ جب وُہ دُور ہوں، تب ہم لوگ پُورے مُسلمان ہوں"۔ آپ نے فرمایا کہ: وُہ کیا باتیں ہیں؟" کہا: "ایک تو ہم لوگ اپنے گھرانے میں بیاہ شادی نہیں کرتے۔ ہندوؤں کی طرح عَیب جانتے ہیں۔ دُوسرے، عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ تیسرے، ہمارے شہر میں نوچندی جُمعرات کا میلہ ہوتا ہے۔ تمام عورت مرد، ہندو مُسلمان ہزاروں جمع ہوتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں۔ اس نوچندی میں لباس و پوشاک کا ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ عیدین میں اس کا چوتھائی حصّہ بھی نہیں ہوتا"۔

یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ نعوُذُ باللہِ مِنْ ذٰلِکَ، یہ تو بہت بُری باتیں ہیں۔ اُن کو ضرور ترک کرنا چاہیے اور ان باتوں کی بُرائیاں خُوب بیان کیں۔

اور فرمایا کہ: "اکثر عوام النّاس، بلکہ بعض بعض خواص، جو کہ نام کو عالم اور درویش کہلاتے ہیں، اُن کے دلوں میں یہ بات سمائی ہے کہ جہاں ہم نے کسی بزرگِ کامل کے ہاتھ پر بیعت کر لی، پھر ہم کو کوئی بڑا چھوٹا گناہ نقصان نہیں کرے گا، ہمارے پیر صاحب اللہ تعالیٰ سے ہم کو بخشوا لیں گے اور بہشت میں لے جائیں گے۔ یہ محض اُن کا خام خیال اور وہم ہے۔ پیر صاحب خُود اپنے ہی مآلِ کار سے بے خبر ہیں۔ کُچھ نہیں جانتے کہ قیامت کے دن ہمارا کیا حال ہوگا اور وہاں کا تو حال دریافت کرنا امرِ محال ہے۔ یہاں دُنیا میں جن کاموں کے دن رات عادی اور خوگر ہیں، ان کا حال نہیں جانتے۔ چنانچہ بھُوک، پیاس، سونا، جاگنا، پاخانہ، پیشاب

(۱) "وقائعِ احمدیؒ"، صفحہ ۶۸۰-۶۸۲

وغیرہ۔ خود میں اپنا حال کہتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم کہ کس وقت مجھ کو بھوک پیاس لگے گی یا کب نیند کا غلبہ ہوگا یا کس وقت پاخانے پیشاب کی ضرورت ہوگی۔ یوں ہی اور بہت کام ہیں۔ جب ان ادنیٰ باتوں کو بالیقین نہیں جانتے ہیں، تو اور بڑے بڑے کاموں کی ہم کو کیا خبر؟ یہاں ہم کسی کی مصیبت دور نہیں کر سکتے، وہاں کب کسی کی مصیبت دور کر سکیں گے؟ مگر ہاں، پیر خدا و رسولؐ کے موافق جو طریقہ مرید کو بتا دے، مرید کو لازم ہے کہ اس کو نہ چھوڑے، اسی پر چلا جائے، وہی اس کی نجات کا وسیلہ ہے اور اس کے بغیر یہ تمام نفس کا فریب اور شیطان کا مکر ہے۔ خدا کی مخالفت کو نہ کوئی پیر بخشا سکے گا، نہ کوئی پیغمبر۔ جن صاحبوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، ان سے تم سمجھا کر کہہ دو کہ جو کام خدا و رسول کے حکم کے خلاف ہیں، سب کو ترک کرو، تب اس بیعت کرنے کا تم کو فائدہ ہوگا، نہیں تو محض لاحاصل ہے۔ نہ میں ان کا پیر ہوں، نہ وہ میرے مرید۔"

اللہ رکھو نے عرض کی کہ: "جو بھائی یہاں حاضر نہیں ہیں، ان کو میں سمجھا دوں گا اور جو موجود ہیں، وہ خود سنتے ہیں"۔ سب حاضرین بولے کہ: "حضرت، آپ حق فرماتے ہیں۔ بات یہی ہے، مگر کیا کریں؟ ہم لوگ ان بلاؤں میں مبتلا ہیں۔ اب انشاء اللہ ان سب باتوں کو چھوڑ دیں گے۔" پھر وہ سب آپ کو نذر دینے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ: "ہم تمھاری نذریں تب لیں گے، جب تم ان سب بری باتوں کے چھوڑنے کا عہد کرو۔ اس کے بغیر ہم کسی کی نذر نہیں لیں گے اور تعزیے کے جو چبوترے تمھارے گھروں کے اندر ہوں، ان کو کھود کر مسجدیں بناؤ کہ تمھاری عورتیں ان میں نماز پڑھا کریں"۔ جب سب نے اس کا عہد و پیمان کیا، تب آپ نے ان کی نذریں قبول کیں۔[1]

بنارس سے عظیم آباد تک

بنارس سے چار کشتیاں اور ایک بجرا کرائے پر لیا گیا۔ ۷ محرم جمعے کے روز بنارس سے روانگی ہوئی۔[2] شام کو قصبۂ زمانیہ کے سامنے کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ زمانیہ سے ۱۱ محرم شنبہ کو غازی پور منزل ہوئی۔[3] غازی پور کے رؤسا شاہ منصور عالم،

(1) "وقائع احمدی"، صفحہ ۶۸۲-۶۸۴ (2) یادداشت قلمی سفرِ حج (3) یادداشت قلمی سفرِ حج

شیخ غلام ضامن اور قاضی محمد حسن وغیرہ نے دعوت و بَیعت کی۔ شہر و اطرافِ شہر سے بے شمار خلقت نے آکر بَیعت کی، وعظ و نصائح سنے اور شرک و بدعت کی تمام باتوں سے توبہ کی۔

۱۴ محرم جمعے کو غازی پور سے روانہ ہو کر بلدیہ ٹھہرنا ہُوا۔ وہاں بھی بہت سے لوگوں نے بَیعت کی۔ آپ نے تیغ علی خاں صاحب کو اپنا خلیفہ بنایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر بکسر و بلیا مقام ہُوا۔ بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ 5

۱۶ محرم یک شنبہ کو چھپرہ پہنچے۔ بہت لوگ زیارت کے لیے آئے اور آپ کو دریا کنارے سے شہر لے گئے۔ فرحت علی صاحب کے مکان پر بہت لوگوں نے بَیعت کی اور آپ نے اُن کو خلیفہ بنایا اور اُن کی ذات سے لوگوں کو بہت ہدایت ہُوئی۔

وہاں سے روانہ ہو کر ۱۸ محرم سہ شنبہ کو داناپور قیام ہُوا۔ داناپور کے لوگ بنارس تک پیشوائی کے لیے آئے تھے اور بہت مشتاق تھے۔ شیخ علی جان ساکن موضع ڈنکھا آپ کو اپنے 10 مکان لے گئے اور اپنے تمام اعزا و متعلقین کے ساتھ داخلِ بَیعت ہوئے۔ صدرالدین نے بھی دعوت کی اور مع خاندان بیعت ہُوئے۔

علی جان کے مکان کے قریب ان کا ایک تعزیہ رکھنے کا چبُوترہ اور امام باڑہ تھا۔ لوگوں نے حضرت کو اطلاع کی۔ آپ نے علی جان سے فرمایا کہ "اس چبُوترے کو کھود کر یہاں مسجد بناؤ کہ محلّے کے لوگ اس میں نماز پڑھا کریں۔ امام باڑہ رہنے دو۔ مہمانوں اور مسافروں کے رہنے 15 کے کام آئے گا۔"

شیخ علی جان نے اسی وقت چبُوترہ کھود ڈالا اور عرض کی کہ "حضرت، اپنے ہی دستِ مبارک سے مسجد کی نیو ڈالیں اور دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نمازیوں سے آباد رکھے۔" پھر آپ نے مسجد کی نیو ڈالی اور پلاؤ پکوا کر تمام قافلے کی دعوت کی اور جیسی علی جان کی خلافِ شریعت ہیئت تھی، وَیسی ہی صدرالدین کی تھی۔ پھر اُنھوں نے اپنے اہل و عیال، عزیز و اقربا کو مُرید 20 کروایا۔ پھر اُن کا ایک احاطہ تھا، جہاں اُن کے جانور ذبح ہوتے تھے۔ اس میں فرش بچھوایا

اور حضرت کو لے جاکر بٹھایا اور وہیں بیعت کی۔ ایک پانچ چھ برس کا لڑکا عبدالرحیم نامی اُن کے پاس تھا۔ عرض کی کہ میرے تو کوئی لڑکا بالا نہیں۔ یہ میرا بھتیجا ہے اور یتیم ہے۔ حضرت نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ "بھائی صدرالدین، تم للّٰہ فی اللّٰہ اس اپنے بھتیجے کو بیٹے کے بجائے پرورش کرو۔ انشاءاللہ تعالیٰ دُنیا میں بیٹے کے بجائے یہی تمہارے کام آئے گا۔"

پھر آپ صدرالدین کے لیے اور جہاں بیٹھے تھے، اس مکان کے لیے دُعا کرنے لگے کہ الٰہی، تو اپنے فضل و کرم سے اِن کو خوش و خرّم رکھ اور شرک و بدعت سے اِن کو بچا اور توحید و سُنّت پر ثابت قدم کر اور اس سرزمین کو سرسبز اور آباد کر۔ یہاں مہمان و مُسافر اُترا کریں اور یہ للّٰہ فی اللّٰہ اُن کی خدمت کیا کریں اور دُنیا و آخرت میں اِن کو حرمت و عزّت کے ساتھ رکھ۔"[1]

دانا پور میں پانچ سات روز قیام رہا۔ انگریزی عملے کے لوگ اور عام اہلِ شہر بکثرت مُستفید ہوئے۔ مولانا عبدالحی صاحب و مولانا اسمٰعیل صاحب روزانہ جابجا وعظ فرماتے تھے۔ ہزاروں شرک و بدعت سے تائب ہوئے۔ بکثرت پیشہ ور عورتوں نے توبہ کی۔ ناجائز مال و دولت چھوڑ کر دینداری اور پاکبازی کی زندگی اختیار کی۔[2] بہت سے امام باڑے کھُد کر مسجدیں بنیں اور شہر میں خیر و برکت پھیلی۔[3]

عظیم آباد پٹنے میں دانا پور سے روانہ ہو کر ۱۹ محرم چہار شنبہ کو آپ عظیم آباد پٹنے میں داخل ہوئے۔ مدرسے کے متصل کشتیاں باندھ دی گئیں۔ دو ہفتے اس شہر میں قیام رہا۔ ہزارہا بندگانِ خدا نے فائدہ اُٹھایا۔

عظیم آباد کے مخلصین مولوی سیّد مظہر علی اپنے اہل و عیال کے ساتھ متعدد کشمیری شرفا، مثلاً خواجہ قمرالدین اور اُن کے اہلِ خانہ بیعت سے مشرف ہوئے۔ مولوی سیّد مظہر علی صاحب کو آپ نے خلافت عطا فرمائی۔[4]

(۱) "وقائع احمدی" (۲) "وقائع احمدی" (۳) "منظورۃ السُّعدا" (۴) "منظورۃ السُّعدا"

مولوی الٰہی بخش صاحب[1] نے اپنا آدمی بھیجا۔ وُہ آکر حضرت سے کہہ گیا کہ صبح کو مولوی الٰہی بخش صاحب کے یہاں آپ سب لوگوں کی مہمانی ہے۔ اگلے روز کئی گھڑی دن چڑھے ڈھائی تین سو آدمیوں کے ساتھ حضرت اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہاں دیوان خانے میں فرش کیا گیا تھا۔ وُہ مکان بہت وسیع تھا، لیکن وہاں آدمیوں کی اس قدر کثرت ہُوئی کہ آٹھ نو سو آدمیوں کے قریب ہوں گے۔ وہ مکان بھر گیا اور جگہ نہ رہی۔ مولوی الٰہی بخش صاحب متردّد تھے کہ آدمی بہت ہیں، کھانا تھوڑا۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ ہمارے حصّے کا کھانا ہم کو دے دیجیے اور کسی بات کا اندیشہ نہ کیجیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اور کھانا پکانا نہ پڑے گا۔ اس میں اللہ تعالیٰ برکت کرے گا اور سب لوگ بفراغت کھالیں گے۔" مولوی صاحب نے فرمایا کہ" : بہت خُوب، کھانا حاضر ہے۔" آپ نے فرمایا کہ" : کھانے کے برتن ڈھکے رہنے دینا۔ اس کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کر کے رکابیوں میں نکالنا۔ ہمارے آدمی بھی نکالیں، آپ کے آدمی بھی"۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ سب لوگ کھا کر آسودہ ہُوئے اور جو لوگ کشتیوں میں تھے، اُن کو بھی پہنچ گیا اور کھانا بچ رہا۔[2]

آپ نے مولوی فتح علی صاحب، شاہ محمّد حسین صاحب اور مولوی الٰہی بخش صاحب کو خلافت نامہ دیا اور اپنا خلیفہ کیا۔ اُنھوں نے عذر کیا کہ" : ہم خلافت کے لائق نہیں ہیں ہم سے یہ بارِ گراں کب اُٹھے گا کہ یہاں سے کہیں جائیں اور خلق اللہ کو خدا و رسولؐ کا حکم سُنائیں اور اُن کو راہِ ہدایت پر لائیں؟" آپ نے فرمایا کہ" : آپ اس بات میں پس وپیش نہ کیجیے۔ دیکھیے، اللہ تعالیٰ یہیں سے بیٹھے بیٹھے کیسی راہِ ہدایت نکالتا ہے کہ آپ کو کہیں جانے کی حاجت نہ پڑے گی"۔[3]

---

(۱) صادقپور پٹنے کے مشہور ذی علم اور ذی وجاہت رئیس جن کے صاحبزادے مولانا احمد اللہ صاحب اور مولانا یحییٰ علی صاحب سیّد صاحبؒ کی جماعت کے رکنِ رکین اور پُوری دعوت و تحریک کا مرکز تھے۔

(۲) "وقائع احمدی"، صفحہ ۷۶۵ - ۷۶۷　(۳) "وقائع احمدی"، صفحہ ۷۶۸

انگریز حاکم کے یہاں شکایت عظیم آباد پٹنے میں بعض شیعہ صاحبان نے انگریز حاکم سے جاکر کہا کہ یہ سید صاحب جو یہاں اتنے آدمیوں کے ساتھ آئے ہیں، ہم نے سُنا ہے کہ اُن کی نیت جہاد کی ہے اور وُہ کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے جہاد کریں گے۔ حاکم نے اِس کو تعصّب اور حسد پر محمول کیا اور اُن کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی مُفسدانہ بات نہ کہی جائے[1]

۵ شیعوں نے تعزیے کے چبوترون کے کھودنے کی بھی شکایت کی، لیکن تحقیق سے ثابت ہُوا کہ جو لوگ تائب ہوتے ہیں اور سُنّت کی پیروی اختیار کرتے ہیں، وُہ اپنی خوشی سے ایسا کرتے ہیں۔ اس پر حکام نے کہا کہ "اس میں سید صاحب کا کوئی قصور نہیں اور اُن پر کوئی اِلزام نہیں۔ اگر وُہ زور اور زیادتی سے یہ کام کرتے، تو ہم اس کا تدارک کرتے اور اُن کو روکتے۔ وُہ تو اپنے دین کے موافق لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔ اس میں جس کا جی ۱۰ چاہے، وُہ مانے اور اس پر عمل کرے اور جس کے دل میں نہ آئے، نہ مانے، مختار ہے۔"[2]

تبلیغی وفد تبت کو عظیم آباد میں ایک گھر میں چند تبتیوں سے مُلاقات ہُوئی، جو حج کے ارادے سے ٹھیرے ہُوئے تھے۔ سیّد صاحبؒ نے اُن سے اُن کے مُلک اور مُسلمانوں کا حال پُوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ "دُوسرے اور تیسرے تبت تک تو مسلمان بستیوں میں زیادہ ہیں اور کُفّار کم اور باقی چار تبتوں میں مُسلمان کم اور کافر زیادہ ہیں۔ کوئی کوئی لوگ نماز اور روزے سے ۱۵ واقف ہیں اور باقی لوگ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ گور پرستی اور پیر پرستی میں مبتلا ہیں۔"

حضرت نے اُن سے پُوچھا کہ "تم جو بیت اللہ شریف جانے کا ارادہ کرتے ہو، کس قدر زادِ راہ تمھارے ساتھ ہے؟ اگر اس قدر ہے کہ کھاتے جاؤ اور کھاتے آؤ، تو خیر، جاؤ۔"

اُنھوں نے عرض کیا کہ "اتنا خرچ تو ہمارے پاس نہیں ہے، مگر ہم نے سُنا ہے ۲۰ کہ آپ نے اِذنِ عام دے دیا ہے کہ جو چاہے، چلے۔ ہم اس کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۷۶۹ (۲) "وقائع"، صفحہ ۷۷۱

سو ہم بھی اُمیدوار ہیں"۔

آپ نے فرمایا کہ "یہ بات تو سچ ہے کہ جن شرطوں کے ساتھ ہم نے اِذنِ عام دے دیا ہے، اِن شرطوں کے ساتھ جو چاہے، چلے، مگر چونکہ زادِ راہ تمھارے ساتھ کم ہے، اس لیے حج تم پر فرض بھی نہیں ہے اور بیت اللہ شریف جانے سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ راضی ہو۔ اب اگر تم سب صاحب مانو، تو ایک بات ہم کہیں کہ اس طرح کے حج کرنے سے ثواب دوچند، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو"۔ ۵

اُنھوں نے عرض کیا کہ "اس سے بہتر کیا؟ ہم حاضر ہیں"۔

آپ نے فرمایا کہ "آؤ، بسم اللہ کر کے ہمارے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ پھر ہم وہ بات بتائیں"۔ پھر اُن سب نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "ہم تم سب کو خلافت نامہ دے کر اپنا خلیفہ کریں گے اور جہاں ہم تم کو بھیجیں، وہاں جاؤ"۔ ۱۰

اُنھوں نے عرض کیا کہ "ہم حاضر ہیں"۔ فرمایا کہ "ہم تم کو تمھارے ہی مُلک رخصت کریں گے اور اعلام نامے لکھ دیں گے۔ وہاں جا کر مسلمانوں کو احکامِ توحید و سُنّت سکھاؤ اور شرک و بدعت سے بچاؤ۔ مگر ایک بات ضرور کرنا کہ کوئی تم کو لکڑی، پتّھر، لات گھونسہ کتنا ہی مارے، تم اس پر صبر کرنا اور اُن کو کچھ نہ کہنا۔ اسی طور تعلیم و تلقین کرتے رہنا۔ پھر عنایتِ الٰہی سے دیکھنا کہ تھوڑی ہی مُدّت میں دینِ اسلام کی کیسی ترقّی ہوگی اور وہ سارے ایذا دینے والے خود آ کر تم سے خطا معاف کرائیں گے"۔ ۱۵

یہ تمام گفتگو سُن کر اُنھوں نے اپنا عُذر بیان کیا کہ ہم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور وعظ و نصیحت کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا: "اندیشہ نہ کرو، اسلام اللہ کا ہے۔ وہ آپ ہی مدد کرے گا اور اِنشاءاللہ تعالیٰ ہزاروں آدمی تمھارے ہاتھ سے ہدایت پائیں گے"۔ کئی ورقوں میں توحید و سُنّت کی تاکید اور شرک و بدعت کے رد کی آیتیں اور حدیثیں لکھوا کر دے دیں اور بنامِ خدا اُن کو روانہ کر دیا۔[1] ۲۰

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۵۱ - ۷۵۲

وفد کی کامیابی اور اثرات | سفرِ حج سے واپسی پر کلکتے میں کچھ لوگ تبت اور چین کے ملے۔ حضرت نے اُن سے اُن کے ملک اور وہاں کی دینداری کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ:

"دینِ اسلام کا جو کچھ طریق آپ لوگوں کو بتاتے ہیں اور توحید و سُنّت کی خُوبی اور شرک و بدعت کی بُرائی بیان کرتے ہیں، اسی طرح کئی آدمی ہمارے ملک میں بھی جابجا بیان کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے مَیں نے بھی تین شخصوں کو دیکھا ہے۔ بہت لوگ اُن کے مُرید بھی ہُوئے ہیں اور بہت لوگ اُن کو ایذا بھی دیتے ہیں اور بُرا بھلا بھی کہتے ہَیں، مگر وُہ صبر کرتے ہیں اور لوگوں کو نیک راہ بتاتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے۔"

یہ بات سُن کر حضرت نے فرمایا کہ تبت کے نو آدمی ہمارے ہاتھ پر بیعت کر کے خلافت نامہ لے گئے ہیں۔ اُن میں تین عورتیں بھی ہیں اور اُن کا نشان اور پتہ بھی بیان کیا۔ تب اُنھوں نے عرض کی کہ بیشک، وُہی لوگ ہیں۔[1]

میاں دین محمدؒ کہتے ہیں کہ مَیں سرحد سے کسی کام سے ہندوستان آیا۔ لکھنؤ میں خیالی گنج میں ٹھہرا۔ امام بخش جرّاح نے، جو اسی محلے میں رہتے تھے اور حضرت سے بیعت رکھتے تھے، کہا کہ: "تین شخص تبّت کے، جن میں دو مرد ہیں، ایک عورت، اس شہر میں چند روز ہُوئے، آئے ہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ ہم سیّد صاحب کے مُرید ہیں اور ہم کو سیّد صاحب نے خلیفہ کر کے وعظ و نصیحت کے لیے ہمارے مُلک کو بھیجا تھا۔ تیسرے روز وُہ تینوں شخص جرّاح مذکور کے پاس آئے۔ مَیں نے اُنھیں دیکھا اور پہچانا۔ وُہ بہت خُوش حال معلُوم ہوتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا حال سُنایا کہ "جب ہم نے حضرت پیر و مُرشد کے ارشاد کے مُطابق لوگوں میں توحید و سُنّت کی خُوبی اور شرک و بدعت کی بُرائی کا بیان شرُوع کیا، تو تمام لوگ یکبارگی مخالف ہو کر ہم پر زور زیادتی اور مار دھاڑ

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۷۵۴، ۷۵۵

کرنے لگے۔ یہ حال سید صاحب نے ہم سے پہلے ہی فرما دیا تھا۔ چند روز کے بعد ایسی تائیدِ الٰہی ہوئی کہ انھیں لوگوں میں سے دو دو چار چار ٹوٹ کر ہم سے ملنے لگے اور طریقِ حق قبول کرنے لگے اور اس ملک کے اکثر طالب علموں اور مولویوں کو ہم نے حضرت کا نصیحت نامہ دکھایا۔ بعضوں نے تو اس کو دیکھ کر کہا کہ اسلام کا طریق یہی ہے۔ تم شوق سے لوگوں کو تعلیم کرو، ہم راضی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی راہِ حق نصیب کرے۔ بعضے اس کو دیکھ کر ناخوش ہوئے اور کہنے لگے کہ کسی نے لوگوں کے بہکانے کا یہ نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ غرض کہ وہاں کے دو گروہ ہو گئے: موافق لوگ علیحدہ اور مخالف علیحدہ اور ہزاروں آدمی فضلِ الٰہی سے راہِ ہدایت پر آ گئے۔

پھر ہم نو شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہدایت کی راہ جاری کر دی، اب ہم کو ایک جگہ رہنا نہ چاہیے۔ پھر ہم میں سے چار آدمی خاص ملکِ چین کو گئے اور دو شخص چھٹے اور ساتویں تبت کی طرف، اور تین ہم اس طرف آئے اور ہم سب کا آپس میں عہد و پیمان ہے کہ ایک بار اور سید صاحب سے ملاقات کریں گے۔[1]

شیعہ رؤسا اور اہلِ شہر کا رجوع عظیم آباد میں ایک شیعہ رئیس نواب قطب الدین خاں نے دعوت کی۔ آپ تشریف لے گئے۔ انھوں نے توبہ اور بیعت کی اور آپ کو اپنے زنانہ مکان میں لے جا کر عورتوں سے توبہ کرائی اور بیعت لی۔ آپ اندر ہی تھے کہ نواب صاحب نے ایک سینی میں پانچ سو روپے، ایک سرخ دوشالہ، ایک بوٹے دار رومال اور کئی سپید تھان اور گلبدن اور مشروع کے کئی تھان اپنے آدمی کے ہاتھ بھیجے۔ ایک سینی میں پان اور عطر کی دو شیشیاں دوسرا آدمی لایا۔ ایک ٹوکرا بھر شیرینی تیسرا آدمی لایا۔ اس عرصے میں آپ اندر سے تشریف لائے اور دیوان خانے میں بیٹھے۔ اس وقت جو لوگ نواب صاحب کے نوکر چاکر خدمت گار حاضر تھے، ان کو نواب صاحب نے حکم دیا کہ تم بھی حضرت کے ہاتھ

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۷۵۵۔ ۷۵۷۔

پر بیعت کر لو۔ ان سب نے بھی بیعت کی۔

نواب قطب الدین خاں نے ایک بیش قیمت دو پہلی قبضے کی گجراتی تلوار جس پر سنہری دھاریاں تھیں، ایک بہت عمدہ ولایتی قبّے دار سپر اور ایک فرد انگریزی پستول اور ایک نہایت عمدہ بندوق اور دو کمانیں اور دو ترکش آپ کے سامنے نذر کے طور پر لا کر رکھے۔ آپ نے فرمایا کہ: "ابھی تو ہم حج کو جاتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کو کہاں لیے پھریں گے؟ ان کو آپ اپنے پاس رہنے دیجیے۔ انشاءاللہ اُدھر سے آ کر لے لیں گے۔" نواب صاحب ممدوح نے عرض کیا کہ: "مَیں تو آپ کی نذر کر چکا۔ اب اپنے یہاں نہ رکھوں گا۔ موت پیچھے لگی ہے۔ کیا خبر کس وقت آ جائے؟ یہ ہتھیار آپ ہی لیتے جائیں۔" کچھ ردّ و کد کے بعد آپ نے وہ ہتھیار قبول کیے اور اپنے پاس رکھ لیے۔[1]

نواب قطب الدین کے یہاں سے فراغت کے بعد آپ کو اور دو نواب زادے اپنے اپنے مکان پر لے گئے اور خود بیعت ہوئے اور گھر کے لوگوں کو بھی مرید کرایا اور نذر دی۔[2]

اسی روز ایک ڈومنی اپنی لڑکی اور دو لڑکوں کے ساتھ، جن میں سے ایک کا نام عنایت اللہ، دوسرے کا نام ہدایت اللہ تھا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ: "میں ڈومنی ہوں۔ گانے بجانے کا پیشہ کرتی ہوں۔ میرا کئی مہینے پیشتر سے ارادہ تھا کہ مَیں اس حرام پیشے سے توبہ کروں، مگر شرارتِ نفس سے باز رہی۔ اب اس نیت سے آپ کے پاس آئی ہوں۔" آپ نے خوش ہو کر فرمایا کہ: "ہم تم کو مرید بھی کریں گے اور جو تم ہمارے ساتھ چلو، تو حج بھی کروا لائیں۔"

یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ حضرت نے اس سے اور اس کی بیٹی اور دونوں بیٹوں سے بیعت لی اور اس سے فرمایا کہ: "تمھارے یہاں جو کچھ ساتھ لینے کا اسباب

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۳۰۳-۵۔ (۲) "وقائع" صفحہ ۳۰۶، ، ،

ہو، آج ہی یہاں لاکر کشتی میں چڑھا دو۔ پرسوں یہاں سے کوچ ہے۔" اُس نے اسی روز شام کو اپنا اسباب لاکر ناؤ پر چڑھا دیا۔[1]

عظیم آباد کے دو سوداگروں رحیم خاں افغان اور عبدالرحمٰن خاں نے بھی بیعت کی اور اپنے اہل و عیال کو بھی مُرید کرایا اور اپنے اور اپنے گھر والوں کے حق میں دُعا کرائی۔ مولانا عبدالحی صاحب نے وعظ کہا۔ آپ نے اُن کو زکوٰۃ کی تاکید کی اور فرمایا کہ: "یہ زکوٰۃ اپنے خویش و اقربا اور اپنے ہمسائے میں جو محتاج ہوں، اُن کو دینا اور جو تم سے ہو سکے، اپنے مال سے مسکین اور مُسافروں کی خدمت کیا کرنا۔ اس کے سبب سے اللہ تعالیٰ تمھارے مال میں خیر و برکت کرے گا۔"[2]

عظیم آباد سے کلکتے تک عظیم آباد میں قافلے کے لیے کھانے پکانے وغیرہ کا سفر کا ضروری سامان خریدا گیا اور کچھ پالیں عیالدار آدمیوں کے لیے تیار کرائی گئیں۔

۲۶ محرم چہار شنبہ کو عظیم آباد سے روانہ ہو کر ۲۷ محرم پنج شنبہ کو آپ سُورج گڑھ[3] پہنچے۔ باڑے میں قیام ہوا۔ بکثرت مُسلمانوں نے دینی نفع اور برکت حاصل کی۔ وہاں کے نامی شرفا میں سے خواجہ مولا بخش، خواجہ افضل علی، شیخ سوہن، واحد علی خاں، اکرام الحق اور صدہا آدمیوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ شاہ گھسیٹا نے، جو وہاں کمشنری کے نائب تھے اور اُن کی زندگی اور وضع قطع اوّل شرع کے مخالف تھی، توبہ اور بیعت کی۔ بیعت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو صراطِ مستقیم پر استقامت بخشی اور درجۂ خلافت سے ممتاز ہوئے۔[4]

یہاں سے چل کر رستے میں دو منزلیں کرتے ہوئے، جہاں زیادہ تر غربا نے بیعت کی، ۲۸ محرم کو مونگیر ٹھیرے۔ یہاں بھی عام طور پر غربا نے بیعت کی۔ اگلے روز ۲۹ محرم کو

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۷۷۷۔ (۲) "وقائع"، صفحہ ۷۸۰۔ (۳) یہ سُورج گڑھ مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ کا وطن ہے۔ مولانا نے، جیسا کہ ارمغانِ احباب اور نزہۃ الخواطر میں ہے، سید صاحبؒ کی زیارت سفرِ حج سے واپسی پر عظیم آباد میں کی۔ (۴) "وقائع"، صفحہ ۷۸۳-۷۸۶۔

بھاگلپور منزل ہوئی۔ وہاں سے راج محل قیام ہوا۔ یہاں سے منشی محمدی انصاری آپ کو اپنے وطن، جو راج محل سے دس گیارہ کوس تھا، لے گئے۔ آپ وہاں ایک رات رہے۔ منشی محمدی کے والد منشی رؤف الدین اور اُن کے عزیزوں میں منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی، فضل الرحمٰن، اور منشی عزیز الرحمٰن نے بیعت کی اور ان کے علاوہ اور بہت مردوں اور عورتوں نے بیعت
5 کا شرف حاصل کیا۔ منشی رؤف الدین اور منشی فضل الرحمٰن آپ کے ساتھ ہو لیے۔[1]

راج محل سے کوچ کر کے ۵ صفر جمعے کو مرشد آباد ٹھیرے۔ یہاں شیعیت کے اثرات بہت تھے۔ شیعہ سُنّیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب کو وعظ کا حکم دیا اور فرمایا کہ اہلِ سُنّت کے عقیدے اور مسلک کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔ ان مواعظ کو سُن کر سُنّیوں نے کہا کہ ہم تو سیّد صاحب کے طفیل آج مسلمان ہوئے۔ فریقین کے
10 صدہا آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔[2] ایک سیّد صاحب نے، جن کے آبا و اجداد کٹرہ کے رہنے والے تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ سَو آدمیوں کی دعوت کی۔[3]

بندر ہُوگلی مرشد آباد سے روانہ ہو کر ایک شب کٹوا قیام رہا۔ وہاں سے کوچ کر کے ہُوگلی قیام ہوا۔ بندر ہُوگلی میں ایک ہفتہ قیام رہا۔ اہلِ حرفہ اور شرفا میں سے ہزاروں اشخاص نے بیعت اور خاطر مدارات کی۔[4]

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۷۹۰، ۷۹۱ (۲) "وقائع"، صفحہ ۷۹۳ (۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۰
(۴) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۰۔ قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد آباد سے کلکتے تک ۷ روز کا عرصہ صرف ہوا، جس میں مختلف مقامات پر قیام رہا۔

بارھواں باب

کلکتے میں

ایک مخلص کی پیشقدمی

بندر ہُگلی میں کلکتے کی طرف سے ایک کشتی تیر کی طرح آتی ہوئی دکھائی دی۔ قریب آئی، تو معلوم ہُوا کہ ایک شخص جامہ پہنے، پگڑی باندھے سوار ہیں۔ کشتی قریب آئی، تو ان صاحب نے پکار کر پُوچھا کہ "یہی قافلہ حج کو جانے والا ہے؟" کسی نے جواب دیا کہ "ہاں، ۵ یہی قافلہ حج کو جاتا ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں اور اسم شریف کیا ہے؟" انھوں نے کہا: "میں کلکتے سے آیا ہُوں۔ میرا نام امین الدین ہے۔" قافلے کے لوگوں نے خط وکتابت سے اُن کا نام سُن رکھا تھا۔ اُنھوں نے پُوچھا کہ "حضرت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟" لوگوں نے بجرے کی طرف اشارہ کیا۔ اُنھوں نے اپنی کشتی لے جا کر بجرے سے لگا دی اور بجرے پر گئے اور سیّد صاحبؒ سے بڑے تپاک اور اشتیاق سے ملے۔ عافیتِ مزاج دریافت کرنے کے بعد ۱۰ کہا کہ "آپ نے اپنے وطنِ مبارک سے سرفرازنامہ بھیجا تھا کہ اب کے سال ہمارا ارادہ ہجرت کا ہے۔ تمھاری طرف ہمارا آنا نہ ہو سکے گا۔ جن صاحبوں کو ہماری بیعت کا اشتیاق ہو، وہ ایک مجلس کسی جگہ مقرر کریں اور سچے عقیدے سے سب کے سامنے شرک و بدعت اور فسق و فجور سے توبہ کریں اور سچے دل سے عجز و زاری کے ساتھ جنابِ الٰہی میں دُعا کریں کہ خداوندا، ہم کو اس توبہ پر ثابت قدم رکھ اور کچھ خرمے یا شیرینی لوگوں میں تقسیم کر دیں تاکہ لوگوں ۱۵ کو خبر ہو جائے کہ فلاں فلاں شخص نے بُرے کاموں سے توبہ کی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اس امر کی تجویز میں تھے۔ اس عرصے میں آپ کا دُوسرا عنایت نامہ وارد ہُوا کہ ابھی ہم نے ہجرت کا

سفر ملتوی کر دیا ہے۔ پہلے ہمارا ارادہ حج کا ہے اور ہم تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ آپ صاحبوں سے ملاقات ہو گی۔ ہم لوگوں کو اس سے کمال خوشی ہوئی کہ اب اللہ تعالیٰ ہماری مرادیں پوری کرے گا۔ پھر جب بنارس سے ہم لوگوں کے نام اس مضمون کا دوسرا الطاف نامہ آیا، تو ہر ایک کو اشتیاق ہوا کہ آپ کو اُتارنے کے لیے کوئی وسیع مکان تلاش کرے۔ اکثر صاحبوں نے اپنے حوصلے کے موافق مکان تلاش کیے اور مول لیے۔ میں نے بھی ارادہ کیا کہ کوئی مکان شہر کے اندر ملے، تو بہتر ہے۔ چنانچہ میری خواہش کے موافق ایک وسیع سائے دار اور میوے دار باغ مل گیا اور میں نے اس کو خرید لیا۔ اس میں میٹھے پانی کے تین تالاب ہیں۔ ایک کوٹھی مردوں کے رہنے کی ہے اور بہت سے زنانے مکان ہیں، جن میں عیال دار لوگ رہ سکتے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بہت لوگ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیکن میرا حق ثابت ہو چکا ہے۔ آپ میرے ہی باغ میں چل کر قافلے کے ساتھ رونق افروز ہوں۔ میں صرف اسی غرض کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ "بے شک آپ ہی پہلے آئے ہیں اور آپ کا حق ہم پر ثابت ہے۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہم آپ ہی کے باغ میں چل کر اُتریں گے۔"

منشی امین الدّین صاحب نے وہیں سیّد صاحبؒ کے پاس مولانا عبدالحی صاحب سے ملاقات کی اور اُن سے مولانا اسمٰعیل صاحب کے متعلّق دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب نے دوسری کشتی پر آدمی بھیج کر اُن کو بلوایا۔ وہ اسی طرح میلے کچیلے پُرانے سفری کپڑے پہنے اپنی کشتی سے خشکی پر اُتر آئے اور بجرے کی طرف چلے۔ لوگوں نے منشی صاحب سے کہا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب آتے ہیں۔ اُنھوں نے اس طرف دیکھ کر پوچھا کہ کہاں آتے ہیں۔ لوگوں نے اُن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ آئے ہیں۔ منشی صاحب نے جانا کہ یہ مولوی محمّد اسمٰعیل صاحب کوئی اور ہوں گے۔ کہا: "میں اُن مولوی محمّد اسمٰعیل

صاحب کو پوچھتا ہوں، جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے ہیں"۔ لوگوں نے کہا کہ وہ یہی ہیں۔ منشی صاحب آبدیدہ ہو کر تعجب میں رہ گئے اور بجرے سے خشکی میں اُترے اور دو چار قدم استقبال کر کے ملے۔ معانقہ و مصافحہ کیا۔ عافیتِ مزاج پوچھی اور مولانا کو لے کر بجرے پر آگئے۔

منشی امین الدین صاحب نے سیّد صاحب سے عرض کیا کہ: "ایک بات یہ چاہتا ہوں کہ جس دن کوئی بھائی دعوت کرے، آپ اُس کے مکان پر تشریف لے جائیں اور جس روز کہیں دعوت نہ ہو، اُس روز ہماری طرف سے ضیافت قبول فرمائیں"۔ کلکتے سے کشتیوں پر لوگ ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ: "یہ لوگ آتے ہیں۔ مجمع ہو جائے گا۔ فرصت نہ ملے گی۔ آپ جلد میرے سوال کا جواب مرحمت فرمائیں۔ میں رخصت ہوں"۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "اس کا اقرار تو ہم نہیں کریں گے۔ اس کو یوں ہی اللہ تعالیٰ پر رہنے دو"۔ انھوں نے کہا: "یہ بھی تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، میں یوں ہی کروں گا"۔

اس عرصے میں وہ لوگ بھی آپہنچے اور آپ سے ملے اور اپنے اپنے مکانوں پر اُتارنے کے لیے عرض کرنے لگے۔ کوئی کہتا تھا: میں نے آپ کے لیے اس قیمت کا مکان خریدا ہے، میں نے اتنے روپوں کا مکان لیا ہے۔ اب آپ جیسا مناسب جانیں، ویسا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: "آپ سب آپس میں صلاح کر کے اتفاق کر لیں۔ ہم تو آپ سب بھائیوں کے مہمان ہیں۔ جو کوئی ہم کو لے جائے گا، ہم اُس کے یہاں جائیں گے اور اُس کی ضیافت قبول کریں گے"۔ ان میں ایک شخص کا نام رمضانی تھا۔ منشی امین الدین نے اُن سے کہا کہ میں حضرت سے آپ سب سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ: "میں اپنے مکان پر اُتاروں گا اور جس دن کہیں دعوت نہ ہو گی، میں کھانا بھیجوں گا۔ اب تم صاحبوں کو اختیار ہے، شوق سے حضرت کی دعوت کرو۔ میں اس میں راضی ہوں۔ اب تم حضرت سے بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں اپنے مکان پر چلتا ہوں"۔ یہ کہہ کر منشی صاحب رخصت ہوئے۔ وہ لوگ سیّد صاحبؒ کے سامنے کہنے لگے کہ: "حضرت کا منشی صاحب کے مکان پر اُترنا ایک بات کے لیے تو بہتر ہوا کہ منشی صاحب راہِ راست

پر آجائیں گے اور اُن کی ہدایت سے اور بہُت لوگ ہدایت پائیں گے"۔ پھر وُہ سب آپ سے یہ کہہ کر رُخصت ہُوئے کہ اب ہم رُخصت ہوتے ہیں۔ آپ کی کشتیوں کے کھلنے کا وقت بھی قریب ہے۔"(۱)

منشی امین الدّین صاحب اور کلکتے کے لوگوں کے جانے کے بعد قافلے کے لوگوں نے سیّد صاحبؒ سے کہا کہ: "لوگ آئے اور گئے بھی، مگر یہ ذکر کسی سے نہیں کیا گیا کہ کلکتے" میں گھاٹ پر چل کر اسباب اور ہتھیاروں کی تلاشی کا کیا ہوگا۔ یہاں کلکتے میں کوئی چھُری، بلکہ لاٹھی تک باندھ کر نہیں جانے پاتا۔ یہاں ہم لوگوں کے پاس محصُولی اسباب بھی ہے اور ہتھیار بھی"۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "بات تو تُم نے اچھی کہی۔ وُہ لوگ چلے گئے۔ اب یہاں اللہ تعالیٰ ہے، اُس سے دُعا کرنی چاہیے۔ اُسی نے اپنے کرم اور فضل سے ہم سب کو یہاں تک پہنچایا اور وُہی ہماری سب مشکلیں آسان کر دے گا۔"

یہ فرما کر آپ سر برہنہ ہو کر کمال الحاح و زاری، اور عجز و انکسار کے ساتھ جناب باری میں دُعا کرنے لگے۔ بہت دیر تک دُعا کی۔ دُعا سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا کہ: "اس سفر میں ایک جگہ اس بات کا مجھ کو خیال آیا کہ لوگوں سے سُنتے ہیں کہ کلکتے میں میٹھے پانی کی بہت قلت ہے۔ مجھ کو تو شاید پیر سمجھ کر لوگ کہیں نہ کہیں سے میٹھا پانی لا دیں گے، مگر اتنے بھائی مُسلمان جو میرے ساتھ ہیں، اُن کو کیونکر ملے گا؟ اسی تشویش میں تھا کہ جنابِ الٰہی سے مجھ کو اطمینان دلایا گیا کہ ہم تو تجھ سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ سب لوگ تیرے ہمراہی ہمارے مہمان ہیں۔ جس طرح آرام سے اُن کو لیے جاتے ہیں، اُسی طرح آرام کے ساتھ لے آئیں گے۔ تُو کیوں اس کا فکر و تردُّد کرتا ہے؟ تُو اُن کے لیے جس چیز کی تشویش کرتا ہے، اس کے لیے وہاں تو اُنھیں کا محتاج ہوگا۔ سو یہی بات ظہور میں آئی کہ منشی امین الدّین نے آتے ہی پہلی یہی خوشخبری سُنائی کہ میرے باغ میں میٹھے پانی کے تین تالاب ہیں۔ فی الحقیقت اس

---

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۷۹۰-۸۰۱۔

اس میں اُن کا محتاج ہوں گا، اس لیے کہ وُہی لوگ تالاب سے لاکر مجھ کو پلائیں گے۔"(۱)

قیام گاہ گھاٹ سے قیام گاہ تک دو رویہ آدمیوں کا بازار لگا ہُوا تھا۔ ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی جمع تھے۔ اکثر ان میں ایک دُوسرے سے پُوچھتے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں کہ کھُلے ہُوئے ہتھیار بھی کراچیوں میں لیے جاتے ہیں اور مال و اسباب بھی۔ بعض کہتے تھے کہ معلُوم ہوتا ہے کہ کہیں سے مع اسباب و سلاح ڈاکو لوگ گرفتار ہو کر آئے ہیں۔ بعض کہتے تھے کہ ڈاکو تو نہیں ہیں۔ یہ تو اشراف اور اچھے لوگ معلُوم ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کا راجہ کسی الزام میں گرفتار ہو کر آیا ہو، تو عجب نہیں اور جن کو خبر پہُنچ گئی تھی، وہ کہتے تھے کہ یہ پیرزادہ صاحب ہیں، قافلہ لیے ہوُئے حج کو جاتے ہیں۔(۲)

نمازِ مغرب کے بعد آپ فینس پر منشی امین الدین صاحب کے باغ اور محلسرا میں آئے۔(۳) آدھی رات تک مستورات اور دُوسرے ہمراہی قیام گاہ کو منتقل ہو کر آگئے۔ سب کے پہُنچنے پر دسترخوان بچھا۔ پُر تکلف کھانا چُنا گیا۔ صُبح منشی صاحب نے تین سو روپے کی جُوتیاں خرید کر قافلے کے لوگوں کو پہنائیں، ایک ہزار روپے کا کپڑا خرید کر قطع کرا کے لوگوں کو کپڑے پہنائے۔(۴)

منشی امین الدین منشی امین الدین بنگال کے خاندانِ شیُوخ کے چشم و چراغ نہایت ذہین، زیرک اور اقبال مند نوجوان تھے۔ سیّد صاحبؒ کی تشریف بری کلکتہ سے دس بارہ سال پہلے سے کمپنی کے وکیل تھے کمپنی کی پُوری عملداری (خلیجِ بنگال سے دریائے ستلج تک) کے مقدمات سرکاری میں وُہی پیروکار تھے۔ آمدنی کا یہ حال تھا کہ صاحبِ "مخزنِ احمدی" کہتے ہیں کہ شروع مہینے میں دو بار میں نے تیس تیس اور چالیس چالیس ہزار روپے ہاتھی پر لد کر اُن کے گھر آتے دیکھے ہیں۔ پانچ سو طلبا اور فقرا اُن کی ڈیوڑھی سے دونوں وقت کھانا پاتے تھے اور ہر ششماہی پر اُن کو پوشاک ملتی

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۸۰۱، ۸۰۲ (۲) "وقائع"، صفحہ ۸۰۴، ۸۰۵ (۳) سفر کی قلمی یادداشت سے معلُوم ہوتا ہے کہ ۲۸ صفر شنبہ کو آپ سیالدہ میں منشی امین الدین صاحب کے باغ میں منتقل ہوئے۔ اس سے پہلے اس یادداشت میں چار روز کا قیام مختلف مقامات پر درج ہے، جن میں سے دو مقام چیت پور اور سیالدہ اب بھی معرُوف ہیں۔
(۴) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۷

تھی۔ اس کے علاوہ بیت اللہ شریف جانے یا اپنے وطن پہنچنے کے لیے جو شخص مصارفِ سفر کی درخواست کرتا، اُن کی سرکار سے اس کی امداد ہوتی، لیکن اس دُنیاوی، دولت و اقبال کے ساتھ دینی دولت سے بالکل محرُوم تھے۔ فرائضِ مذہبی اور عبادت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سرکاری کام سے فرصت پا کر سارا وقت شراب کباب، عیش و عشرت کی نذر ہو جاتا۔ انتظامِ خانگی کا دردِ سر بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ بھی ایک دُوسرے شخص کے حوالے تھا۔ خود ہمہ تن دولت پیدا کرنے اور دُنیا کا لُطف اُٹھانے کے لیے وقف تھے۔

سید صاحبؒ کے تشریف لانے کے بعد منشی صاحب نے خاطر تواضع بہت کی اور بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ دو ہفتے میں عمائدِ شہر، علما اور متوسلینِ سرکار میں سے تقریباً دو ہزار اشخاص نے بیعت کی۔ لیکن منشی صاحب اپنی اس رندانہ زندگی اور آزادروی کی وجہ سے سید صاحبؒ کی بیعت سے گریز کرتے رہے کہ ایسے مرشدِ کامل کے ہاتھ پر بیعت کی جائے، تو ان منکرات سے توبہ کی جائے، ورنہ مرشد کو بدنام کرنے سے کیا حاصل؟

لیکن چند دنوں کے بعد اپنے ہم نشینوں اور دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد بیعت کی اور جلد ہی اس بیعت و تعلق کی برکت و کرامت دیکھ کر منہیات و محرمات سے توبہ کی اور مذہبی پابندی اختیار کی۔[1]

قافلے کی سادگی تین دن تک دونوں وقت منشی امین الدین صاحب کے یہاں سے بہت نفیس اور مکلف انواع و اقسام کا کھانا آیا۔ حضرت نے قافلے کے منتظمین سے حال پوچھا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ کھانا بہت افراط سے اور بہت عمدہ آتا ہے، مگر طرح طرح کا آتا ہے، تقسیم میں دُشواری ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ ایک قسم کا کھانا لایا کرو۔ طرح طرح کا پُرتکلّف کھانا کیا ضرور؟ اوّل تو ہم لوگ تکلّف والے نہیں ہیں، دُوسرے تقسیم کرنے میں دِقت ہوتی ہے۔

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۵-۷۶ تاریخِ کلکتہ مؤلفہ بدر الزمان صاحب سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جہاں کلکتہ کی مشہور جامع مسجد ناخدا ہے یہاں منشی امین الدین صاحب وکیل صدر دیوانی کلکتہ کا مکان تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے منشی حسن علی مرحوم نے جو اس کے متولی تھے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنا دی تھی جس کو ناخداؤں نے خرید لیا اور عظیم الشان مسجد بنا دی۔ (ص ۹۰)

منشی صاحب سمجھے، شاید تکلفات میں کچھ کوتاہی ہوئی۔ اُنھوں نے داروغۂ مطبخ کو تاکید مزید کی۔ حضرت نے اُن سے کہا کہ: "آپ کھانے میں تکلّف بہت کرتے ہیں۔ ایسا نہ چاہیے۔ ہم لوگ تو ماش کی کھچڑی یا ماش کی دال چاول کھانے والے ہیں۔"

اُنھوں نے عرض کی کہ: "آپ یہ کیا فرماتے ہیں؟ ہم کس لائق ہیں، جو آپ کے لائق مکلّف کھانا پکوائیں؟ آپ کے واسطے تو جس قدر کسی سے کھانے میں اور خدمتگاری میں تکلّف ہو سکے، وہ تھوڑا ہے اور ہم نے تو اپنی اس عمر میں سب طرح کے کھانے کھائے بھی ہیں اور لوگوں کو کھلائے بھی ہیں اور سب طرح کے آدمیوں سے ملاقات کی ہے، مگر ایسے حقانی ربّانی خدا پرست بے ریا نہ اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھے اور نہ کسی سے ہم نے سُنے۔ آپ اس معاملے کو اسی طرح رہنے دیں اور جو کچھ دال دلیہ آتا ہے، اُسی کو قبول فرمائیں۔"

اس کے جواب میں سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "طرح طرح کی خدمت گزاری سے تو یہی غرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو۔ سو وُہ کام آدمی کرے کہ اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور اسراف و ریا اور نمود سے پاک ہو، تب وُہ کام رضامندی کے لائق ہے اور یہ جو آدمی کے پاس روپیہ پیسہ اور اسباب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ اس کو بیجا برباد کرنا نہ چاہیے۔ اسی کے فرمانے کے موافق اس کو صرف کرنا چاہیے۔ اس کی راہ ہم آپ کو بتائیں۔ کھانے سے غرض تو پیٹ بھرنا ہے۔ آپ ہم لوگوں کے واسطے ایک قسم کا کھانا، جیسا چاہیں، ویسا بھیجا کریں۔ طرح طرح کے کھانوں کا تکلّف کچھ ضرور نہیں۔ ہم آپ کے لیے جنابِ الٰہی میں دُعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے یہاں خیر و برکت کرے۔"

منشی صاحب نے عرض کیا کہ: "مجھ کو آپ کا فرمانا منظور ہے۔" سیّد صاحبؒ نے اُن کے واسطے دُعا کی اور فرمایا کہ چار پانچ روز کے بعد آپ اپنے شہر کے چالیس پچاس اچھے اچھے مُسلمانوں کو ایک جگہ جمع کیجیے۔ ہم کچھ خدا اور رسولؐ کا ذکر بیان کریں گے۔ آپ کے سبب سے وُہ بھی سُن لیں گے۔ آپ کو اور اُن کو سب کو دین و دُنیا دونوں کا فائدہ ہوگا۔"[1]

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۸۰۱ - ۸۰۹

اہلِ قافلہ کی احتیاط محلسرا کے باغ میں بکثرت میوہ دار درخت تھے۔ نارنگی، لیموں، چکوترہ، انجیر، انار، تُوت، امرود، ناریل، کیلہ، اننّاس، انگور وغیرہ سب طرح کے پھل تھے۔ اہلِ قافلہ کے لیے منشی صاحب کی عام اجازت تھی کہ جو میوہ چاہیں، درخت سے توڑ کر کھائیں، کوئی باغبان اُن کو نہ روکے۔ مگر ان لوگوں کی احتیاط یہ تھی کہ درخت سے توڑنے کا کیا ذکر، گرا ہُوا میوہ بھی زمین سے نہیں اُٹھاتے تھے۔ سیّد صاحبؒ کے پاس جو میوہ ڈالیوں میں لگ کر آتا تھا، وُہ آپ سب کو تقسیم کرتے تھے۔ لوگ وُہی کھاتے تھے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے۔[1]

رات کو عورتوں کا ہجُوم ہوتا۔ کوٹھی کے زنانہ مکان کے متّصل کا کمرہ تین چار سو عورتوں سے بھر جاتا۔ سیّد صاحبؒ کمرے کے دروازے پر تشریف لاتے اور دو تین پگڑیاں اُن میں پھیلا دیتے اور فرماتے کہ ان سب کو مل کر پکڑ لو۔ جب وُہ پکڑتیں، تب آپ اُن سے بیعت کے الفاظ کہلاتے۔ پھر کمرہ خالی کرا دیا جاتا اور دُوسری عورتوں سے بھر جاتا۔ اسی طرح اُن سے بیعت لیتے۔ ہر شب کو آٹھ دس بار عورتوں سے وُہ کمرہ بھر جاتا اور خالی کیا جاتا تھا۔[2]

مصروفیت اور بیعت کرنے والوں کا ہجُوم دو مہینے تک روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے۔ روز بروز ہجُوم بڑھتا جاتا تھا۔ کثرتِ بیعت کا یہ حال تھا کہ صُبح سے دو ڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا۔ حضرت کو سوائے نماز پڑھنے اور ضرُوریاتِ بشری کے فرصت نہ ملتی۔[3]

علٰیحدہ علٰیحدہ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا۔ ایک وسیع مکان میں سب جمع ہو جاتے۔ حضرت تشریف لاتے۔ سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے۔ لوگ اُن کو جا بجا تھام لیتے اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے۔ دن میں سترہ یا اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا۔[4]

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۸۱۰ (۲) "وقائع"، صفحہ ۸۱۵

(۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۵ (۴) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۵

شجرے کی مانگ دیکھ کر اہلِ مطابع نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شجرے چھاپے اور باغ کے دروازے پر شجروں کے لیے دو دکانیں لگا دیں۔(۱)

سید صاحبؒ کا وعظ اور عمومی اصلاح

سید صاحبؒ نے منشی امین الدین صاحب سے فرمایا کہ اُس دن ہم نے آپ سے کہا تھا کہ ایک روز کسی جگہ لوگوں کو جمع کیجیے۔ ہم آپ کو اور اُن کو کچھ اللہ کا ذکر اور وعظ و نصیحت سنائیں۔ اب کسی دن اس کا انتظام کیجیے۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ "جس روز ارشاد ہو، مَیں لوگوں کو جمع کر دوں۔" آپ نے فرمایا کہ: "کل سویرے، سورج نکلے، سب کو ہمارے یہاں باغ میں لائیے۔" اُنھوں نے وعدہ کیا۔ ۵

اگلے روز سویرے، سورج نکلے منشی صاحب ڈھائی تین سو آدمیوں کے ساتھ سید صاحبؒ کے پاس باغ میں آئے اور کوٹھی میں بیٹھے۔ پہلے سید صاحبؒ نے دُعا کی کہ الٰہی، جو کچھ مَیں جانتا ہوں، وہ بیان کروں گا اور بندوں کی ہدایت تیرے اختیار میں ہے۔ تو محض اپنے فضل و کرم سے ان بھائیوں کو ہدایت کر اور شرک و بدعت اور فسق و فجور سے اُن کو محفوظ رکھ اور سنّت و توحید پر اُن کو قائم کر۔ اسی طور کے اور بہت الفاظ فرمائے۔ دُعا کے بعد سورۂ فاتحہ کا وعظ شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی حکمتوں اور قدرتوں اور نعمتوں کو بیان کیا۔ لوگ سنتے تھے، بعض بعض بیہوش ہو جاتے تھے۔ اس روز کوئی تین گھڑی تک آپ نے وعظ فرمایا۔ وعظ کے بعد آپ نے دُعا کی اور سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "جن بھائیوں کا دل چاہے، وہ اسی وقت ہر روز تشریف لایا کریں اور خداؐ و رسولؐ کا ذکر سن کر چلے جایا کریں۔" اس کے بعد حاضرین میں سے اکثر لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر رخصت ہو کر سب اپنے اپنے مکان کو چلے گئے۔ ۱۰ ۱۵

اسی طرح نمازِ فجر کے بعد سید صاحبؒ نے ۱۵، ۲۰ روز تک وعظ فرمایا۔ دو ہزار سے زیادہ اُمرا اور علما اور درویش ہر روز آتے تھے اور غربا کا تو کچھ شمار نہ تھا۔ اکثر لوگ

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۸۱۸

ہر روز سیّد صاحبؒ کے رُوبرُو کہتے تھے کہ "حضرت! ہم تو سوائے مسلمانی کے نام کے اسلام کی کوئی اور بات نہیں جانتے تھے۔ اسلام کا حال ہم نے آج آپ کی زبان سے سُنا اور گویا آج ہی ہم مُسلمان ہُوئے"۔ اکثر کم علم آدمی آپس میں کہتے تھے کہ امامِ مہدی یہی ہیں۔ یہ بات سُن کر عالم لوگ اُن سے کہتے تھے کہ اس طرح نہ کہو۔ یہ کہو کہ نائبِ رسُولُ اللہ ہیں۔[1]

۵ **غیر مُسلموں کا قبولِ اسلام** مولانا عبدالحی صاحب جمعے کو اور سہ شنبے کو نمازِ ظہر کے بعد شام تک وعظ فرماتے تھے۔ لوگ پروانہ وار جمع ہوتے تھے۔ روزانہ ۱۰، ۱۵ ہندُو مسلمان ہوتے، دُوسرے تیسرے روز اُن کا ختنہ ہوتا۔ اُن کے رہنے کے لیے ایک علیحدہ مکان تھا۔ قافلے کے دس بارہ آدمی اُن کی خدمت و راحت کے لیے مقرّر تھے۔[2]

نکاح کی ترویج اس وقت بنگال میں کثرت سے رواج تھا کہ پہلا نکاح تو ماں باپ کر دیتے تھے،

۱۰ اس کے بعد جس کا جی چاہتا، کسی عورت کو اپنے گھر ڈال لیتا اور اس سے بغیر عقد و نکاح کے ازدواجی تعلقات قائم کر لیتا۔ چند متدین علما اس خدمت کے لیے متعیّن ہُوئے کہ بیعت کے بعد سو سو، پچاس پچاس آدمیوں کو الگ بٹھا کر اُن کے حالات دریافت کرتے۔ جس عورت یا مرد کے تعلّقات بغیر نکاح کے ہوتے اور وہ دونوں وہاں موجُود ہوتے، ان کا نکاح پڑھا دیا جاتا۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک غیر حاضر ہوتا، اس کو طلب کیا جاتا اور نکاح پڑھایا جاتا۔ اگر اس

۱۵ کی حاضری ممکن نہ ہوتی، تو سخت تاکید کی جاتی کہ جلد اس فرض کو ادا کیا جائے۔[3]

خلافِ شرع لوگوں کا مقاطعہ برادریوں اور خاندانوں کے چودھریوں اور سرداروں نے اپنے اپنے کنبے خاندان میں اعلان کر دیا کہ جس نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور شرعی پابندی اختیار نہیں کی، اس سے برادرانہ تعلّقات منقطع ہیں۔ ہمیں اس سے اور اُسے ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ اس اعلان پر اس قدر ہجوم اور رجوع اور دین کا ایسا رواجِ عام اور

۲۰ شریعت و سنّت کا ایسا بازار گرم ہُوا کہ بقولِ صاحبِ "مخزن"

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۸۱۳-۸۱۵ (۲) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۷۵ (۳) "مخزن"، صفحہ ۷۵، ۷۶

زِ دین خلق و عالم پُر آوازہ گشت
تو گفتی کہ عہدِ نبیؐ تازہ گشت[1]

شراب کی کساد بازاری

کلکتے میں شراب کی دوکانوں کا یہ حال تھا کہ یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی۔ دوکانداروں نے جاکر سرکارِ انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں اور دکانیں ہماری بند ہیں۔ جب سے ایک بزرگ اپنے قافلے کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان اُن کے مُرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے تمام نشہ آور چیزوں سے توبہ کی ہے۔ اب کوئی ہماری دُکانوں کو ہو کر بھی نہیں نکلتا۔[2]

بے پردگی کا انسداد

شیخ امام بخش نے، جو کلکتے کے بہت بڑے دولتمند تاجر تھے، دعوت کی۔ کھانے کے بعد سید صاحبؒ سے عرض کی کہ: "آپ میرے زنانہ مکان میں تشریف لے چلیں۔" ہمراہیوں نے کہا کہ آپ اندر جاکر پردہ کرآئیں۔ وہ اندر گئے اور باہر آکر کہا کہ پردہ ہوگیا۔ سید صاحبؒ آپ کے ساتھ مکان کے اندر گئے۔ وہاں تمام عورتیں لباسِ فاخرہ پہنے فرش پر بے پردہ بیٹھی تھیں۔ آپ یکایک اُن کو دیکھ کر گھبرائے اور دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر لاحول پڑھتے ہوئے باہر آگئے۔ عورتوں نے شیخ امام بخش سے کہا کہ: "حضرت دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر باہر کیوں تشریف لے گئے؟ خیر تو ہے؟" یہ سُن کر وہ باہر آئے۔ سید صاحبؒ نے مولوی یوسف صاحب سے فرمایا کہ: "یہ لوگ جانوروں کی مانند ہیں۔" انھوں نے پوچھا کہ: "حضرت، خیر تو ہے؟" فرمایا کہ: "شیخ صاحب مجھ کو اپنے مکان میں لے گئے اور کہا کہ پردہ ہوگیا ہے۔ وہاں جو میں گیا، تو دیکھا کہ تمام عورتیں ایک فرش پر بے پردہ بیٹھی ہیں۔ میں وہیں سے لوٹ آیا۔"

باہر مکان میں بہت سی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر سید صاحب بیٹھ

(۱) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۷۶　(۲) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۹۱۱

گئے۔ شیخ امام بخش بھی آپ کے پاس ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ اور کرسیوں پر اور لوگ بیٹھ گئے۔ آپ نے شیخ امام بخش کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "آپ کے اس ملک میں پردے کا دستور نہیں ہے اور یہاں کے لوگ اس کی برائی بھلائی کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔" انھوں نے عرض کی کہ: "اس وقت آپ کے لوگوں کے کہنے کے موافق میں اندر گیا۔ وہاں کوئی غیر ۵ مرد نہ تھا۔ میں نے فرش بچھوایا اور عورتوں کو اس پر بٹھا کر باہر چلا آیا۔ میں نے جانا، آپ اسی کو پردہ فرماتے ہیں۔"

آپ نے اُن سے فرمایا کہ: "اندر جائیے اور عورتوں کو ایک طرف دالان میں بٹھا کر دروں کے پردے چھوڑ دیجیے۔ پھر یہاں ہم باہر آکر پردے کا حال آپ کو بتائیں گے۔"

اس ملک کا یہ بھی دستور تھا کہ نوکر، خدمتگار بے تکلف زنانہ مکان میں چلے جاتے ۱۰ تھے اور جو چیز دینی ہوتی تھی، اُن کو دے آتے تھے، جو لینی ہوتی تھی، مانگ لاتے تھے۔ عورتیں اُن سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

شیخ امام بخش مکان کے اندر گئے اور پردہ کرا کر باہر آئے۔ آپ نے جاتے ہوئے اپنے لوگوں سے فرمایا کہ مولانا عبدالحی صاحب کو بلا کر بٹھانا، ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ یہ فرما کر اندر چلے گئے۔ لوگوں نے مولانا عبدالحی صاحب کو بلا کر بٹھایا۔ کچھ عرصے میں آپ اندر سے تشریف لائے ۱۵ اور شیخ امام بخش سے پردہ کرنے کی خوبی اور نہ کرنے کی برائی بیان کرنے لگے اور فرمایا کہ: "پردہ نہ کرنا کفار کی رسم ہے اور اس میں بڑے بڑے فساد اور قباحتیں ہیں اور خدا و رسول کی نافرمانی ہے۔ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔" اسی طور کے کلمات فرمائے۔ شیخ امام بخش نے عرض کی کہ: "ہمارے اس پورے ملک میں کسی کے یہاں شرعی پردہ نہیں ہوتا ہے۔ تمام شرفا، غربا کے گھروں کا یہی حال ہے۔ اب یکایک اس کا بند و بست کرنا دشوار کام ہے۔ آپ دعا کریں کہ ۲۰ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں سے اس بے دینی کو دفع کرے۔ اس کے بغیر خیال میں نہیں آتا کہ عورتیں مانیں گی۔"

سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ: "آپ ان لوگوں کو دو روز تک یہاں اس امر کے متعلق وعظ و نصیحت سنائیں"۔ مولانا نے فرمایا: "میں حاضر ہوں۔ جو ارشاد ہو، بجا لاؤں گا، مگر یہاں کی عورتیں تو طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہیں۔ فقط ایک پردہ نہ کرنا ہی تو نہیں ہے، شرک و بدعت کیا کم کرتی ہیں؟ آپ اُن کے لیے دُعا کریں اور ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے"۔ ۵

سید صاحبؒ نے ننگے سر ہو کر بڑی عاجزی اور زاری کے ساتھ دُعا کی اور فرمایا کہ: "انشاء اللہ، شیخ بھائی، تم سب دیکھو گے کہ جو اپنے یہاں پردہ کروانے سے گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے اس کا بند و بست کرنا مشکل ہے، وُہ آپ ہی خوشی خوشی پردہ کریں گی اور جو شرک و بدعت میں مبتلا ہیں، وُہ توحید اور سُنّت پر قائم ہو جائیں گی۔ جب اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو مع الخیر حرمین شریفین سے پھر یہاں لائے گا، تب تم ہی لوگ ہم سے بیان کرو گے کہ اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کو ایسی ہدایت کی"۔ اسی طرح آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں۔[1] ۱۰

چبوترے کے بجائے مسجد سید صاحبؒ جس وقت شیخ صاحب کے زنانہ مکان میں تشریف لے گئے، آپ کے ہمراہی ایک چبوترے پر جوتا پہنے کھڑے تھے۔ شیخ امام بخش کے نوکر چاکر اور محلے کے لوگ اُن لوگوں سے تو نہ بولے، لیکن آپس میں چپکے چپکے کچھ کہنے لگے۔ شیخ باقر علی نے ان لوگوں سے کہا کہ: "بھائیو، ہم لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کیا باتیں کرتے ہو؟" ان میں سے ایک نے کہا کہ: "یہ چبوترہ تعزیہ رکھنے کا ہے۔ ہم لوگ اس کا ادب کرتے ہیں اور تم سب جوتا پہنے اس پر کھڑے ہو! یہی باتیں آپس میں کر رہے ہیں"۔ ۱۵

ساتھی یہ سُن کر خاموش رہے۔ جب سید صاحبؒ اندر سے تشریف لائے، تب ساتھیوں نے یہ حال عرض کیا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ شیخ امام بخش نے کہا کہ: "حضرت، یہ چبوترہ ہمارے دادا نے بنایا تھا۔ تب سے ہمارے یہاں تعزیہ بنتا ہے"۔ آپ نے فرمایا کہ: "شیخ ۲۰

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۷۱ - ۹۷۵

بھائی، اب تم نے تمام شرک و بدعت سے توبہ کی ہے۔ اب یہ چبوترہ دُور کر دو۔"

اُنھوں نے عرض کیا کہ: "حکم ہو تو ابھی کھود ڈالوں؟" آپ نے فرمایا کہ: "ہے یہی بات، مگر اس پر چھوٹی سی مسجد بنا لو کہ تمھارے نوکر چاکر اس میں نماز پڑھیں گے۔"

شیخ صاحب موصوف یہ بات سُن کر خوش ہُوئے کہ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کروں گا۔

۵ پھر آپ نے وہاں شیخ صاحب کو خلافت عطا فرمائی اور اُن کے حق میں دُعا کی۔[1]

شیخ صاحب کی پیش کش اور سیّد صاحبؒ کی معذرت سیّد صاحبؒ شیخ امام بخش سے رُخصت ہونے لگے، تو اُنھوں نے عرض کیا کہ میرے باغیچے تک بھی تشریف لے چلیے۔ وہاں ایک بہت پُرتکلف کوٹھی بنی تھی۔ شیخ صاحب نے دروازہ کھولا۔ آپ اس کے اندر گئے۔ بہت نفیس فرش بچھا تھا اور دیواروں میں آئینے اپنے اپنے موقع پر لگے تھے۔ شیشے کے جھاڑ چھت میں لٹکتے تھے۔ ایک

۱۰ کرسی پر سیّد صاحبؒ کو بٹھایا اور وہاں کا سب کارخانہ اور اسباب دکھایا اور عرض کی کہ: "یہ کوٹھی آپ کی خادمہ نے بنوائی ہے۔ اس کی طرف سے یہ آپ کی نذر ہے۔ للہ آپ قبول فرمائیں۔"

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ اس کا اجر آپ کو دے گا۔ ہم نے اس کو قبول کیا۔ اب ہم نے اپنی طرف سے یہ کوٹھی آپ کو دی۔ آپ جو چاہیں، کریں۔ ہم لوگ تو مسافر ہیں، اِن مکانوں کو کیا کریں؟"

۱۵ شیخ صاحب نے فرمایا کہ: "حضرت، یہ بات تو نہ ہوگی۔ یہ مکان آپ کا ہے۔ چاہیے بیچ ڈالیے، چاہے کسی کرایے دار کو دیجیے۔" شیخ موصوف کے نوکروں نے سیّد صاحبؒ کے ہمراہیوں سے کہا کہ: "حضرت اس کوٹھی کو کیوں نہیں قبول کرتے؟ اگر کسی کرایے دار کو رکھ دیں، تو سو روپیہ ماہوار کرایہ آئے گا اور اگر بیچ ڈالیں، تو پندرہ ہزار روپیہ کی بکے گی۔" قادر بخش لکھنوی، جو کلکتے میں دلالی کرتے تھے، اُنھوں نے جا کر سیّد صاحبؒ کے کان میں کہا کہ شیخ

۲۰ امام بخش کے ملازمین یُوں کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تو غریب مُسافر ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۷۵، ۹۷۶

ہر روز نیا کھانا، نیا پانی اور نیا مکان دیتا ہے۔ پھر بھلا ہم مکان لے کر کیا کریں؟

آپ نے شیخ صاحب موصُوف سے فرمایا کہ یہ مکان ہم نے اپنی طرف سے آپ کو دیا، یہ آپ کو مبارک ہے اور اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ اپنی جنّت میں اس سے بہتر مکان آپ کو عطا کرے! پھر آپ نے اُن کے لیے دیر تک دُعا کی۔[1]

بنگال و آسام میں تبلیغ و اصلاح مولوی امام الدین بنگالی آپ سے اجازت لے کر اپنی والدہ کی ملاقات کے لیے اپنے وطن سودارام[2] گئے۔ ان کی تبلیغ و ترغیب سے حاجی پور اور سودارام کے چالیس پچاس آدمی سیّد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کلکتے کے بعض رؤسا نے ڈھاکے خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کو پڑھ کر کچھ لوگ ڈھاکے سے آئے۔ اُنھوں نے آپ سے ملاقات کی اور مولانا عبدالحی صاحب کا وعظ سُنا اور اپنے میزبانوں سے جا کر بیان کیا کہ: "ہم لوگ تو جانتے تھے کہ تعزیے بنانا، نشان کھڑے کرنا، پیروں، شہیدوں کی نذر و نیاز کرنا، ان سے مرادیں مانگنا اور شادی غمی میں طرح طرح کی خرافات کرنا یہی کام دینداروں کے ہیں۔ اب وعظ کے سُننے سے معلوم ہُوا کہ وہ سب بُرے کام ہیں اور اُن کا کرنے والا مشرک اور بد دین ہے۔ ہم لوگ آج تک بڑی غلطی پر تھے۔" اُنھوں نے کہا کہ: "تم کیا، خود ہم بھی یوں ہی جانتے تھے۔ سیّد صاحبؒ کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت کی اور ہم تو سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ اب تم بھی چل کر بیعت کر لو۔"

وہ لوگ ان کو سیّد صاحبؒ کے پاس لائے اور اُن کا حال عرض کیا کہ یہ لوگ ڈھاکے سے بیعت کے واسطے آئے ہیں۔ آپ نے اُن سے بیعت لی۔ بیعت کے بعد اُنھوں نے اپنی تعزیہ داری پیر پرستی وغیرہ شرک و بدعت کا حال آپ سے عرض کیا اور کہا کہ: "ہم لوگ آج تک اسی کو دینداری جانتے تھے۔ یہاں وعظ کے سُننے سے معلوم ہُوا کہ یہ سب کام بُرے ہیں اور اُن کے کرنے والے مُشرک و مُبتدع ہیں۔"

(۱) "وقائع احمدی" ج صفحہ ۹۷۷ تا ۹۷۸ (۲) بنگال: ضلع نواکھالی

ایک خط وہ اپنے شہر سے لائے تھے۔ وُہ آپ کو دیا اور عرض کی کہ: "ہمارے شہر کے تمام شرفا اور غربا آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں۔ اگر آپ وہاں تشریف لے جائیں، تو ہزاروں غریب اور امیر مُسلمان راہِ راست پر آجائیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔"

آپ نے وُہ خط دیکھ کر اور اُن کی عرض سُن کر فرمایا کہ: "انشاءاللہ، ہم اس کا جواب آپ کو کسی اور وقت دیں گے۔"

اس عرصے میں سلہٹ، چاٹ گام اور آسام وغیرہ کے لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر کلکتے آئے اور وہاں کے لوگوں سے ملاقات کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے ہمراہ عورتیں بھی تھیں۔ سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کے بعد جو لوگ ان میں ہوشیار تھے، انھوں نے مولوی امام الدین صاحب کے ذریعے آپ سے عرض کیا کہ ڈھاکے کے لوگوں نے جو اپنا حال بیان کیا ہے، بعینہٖ یہی حال تمام مُلک بنگال کا ہے۔ نہ کوئی کبھی نماز پڑھتا ہے، نہ روزہ رکھتا ہے۔

سلہٹ اور چاٹ گام کے کئی شخصوں نے بیان کیا کہ ہمارے یہاں شادی غمی میں برادری کے واسطے جو کھانا پکتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ مٹی کے برتن تو کم ہوتے ہیں، اکثر کیلوں کے پتّوں میں لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ کھانے کے بعد جو کھانا برتنوں اور پتّوں میں بچتا ہے، اُس کو پھینک دیتے ہیں۔ وہ کوّے، کُتّے کھاتے ہیں۔

سودارام اور آسام کے لوگوں نے عرض کی کہ کھانا تو کیلوں کے پتّوں میں کھاتے ہی ہیں، اس کے علاوہ مُلکِ بنگال میں اور بھی بہت بلائیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بکری کا گوشت تو کھاتے ہیں، بکرے کا گوشت حرام جان کر نہیں کھاتے۔ ہندو ان کے برعکس بکرا کھاتے ہیں، بکری نہیں کھاتے۔

چاٹگام کے لوگوں نے کہا کہ ہمارے یہاں دستور ہے کہ عورتیں ہر روز ہندوؤں کی طرح برتن مانجھتی ہیں اور گوبر سے لیپ کر اور چوکا دے کر کھانا پکاتی ہیں۔ مجال نہیں کہ اُن کے

چوکے میں دوسرا شخص چلا جائے۔ جب کھانا تیار ہوا، تب کھانے والے آئے اور اپنی اپنی تھالی رکابی دھو کر چوکے کے قریب لائے اور الگ بیٹھے۔ بعض ننگے سر، بعض سر میں کچھ کپڑا باندھ کر۔ پھر پکانے والی نے جو کھانا اُن کے برتن میں الگ سے رکھ دیا، وہ اُنھوں نے کھا لیا اور جو کھانا برتن میں بچ رہا، اس کو اُنھوں نے اپنے ملک کی رسم کے موافق ایک جگہ ڈال دیا اور اس برتن کو راکھ سے دھو مانجھ کر چوکے میں رکھ دیا۔ یہ رسم ہمارے یہاں بزرگوں سے چلی آتی ہے۔ ۵

اور ایک دستور ہمارے یہاں یہ بھی ہے کہ جو لوگ دونوں عیدوں کے تہوار کرتے ہیں وہ اپنے کو بڑا مسلمان جانتے ہیں اور بعض لوگ عیدین اور محرم بھی کرتے ہیں اور ہولی، دیوالی، دسہرا بھی کرتے ہیں۔ بھوانی کی پوجا بھی کرتے ہیں، پیروں، شہیدوں کی نذر نیاز بھی کرتے ہیں۔ اور ایک یہ رسم بھی ہمارے بزرگوں سے چلی آتی ہے کہ عورتوں سے نکاح بھی کرتے ہیں اور بے نکاح بھی عورتیں گھر میں ڈال لیتے ہیں اور اُن سے جو لڑکے بالے پیدا ہوتے ہیں، اُن کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ ۱۰

جب یہ حال سب اپنے اپنے ملک کا بیان کر چکے، تو ان میں جو لوگ رئیس اور سربرآوردہ تھے، اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت، جس طرح ہو سکے، آپ ہمارے ملک میں تشریف لے چلیں اور ہم لوگوں کو گویا ازسرِنو مسلمان بنائیں۔

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ: "یہ ملک بہت وسیع ہے۔ اگر برس، دو برس ہمارا رہنا ہوتا، تو تمھارے ملک کا دورہ کرتے۔ اب جہاز کھلنے کا زمانہ قریب آیا۔ اب زیادہ ٹھیرنا نہیں ہو سکتا۔ مگر مولوی امام الدین صاحب، جو سودارام کے رہنے والے ہیں، اور صوفی نور محمد صاحب سلہٹی، جو اب کلکتے ہی میں رہتے ہیں اور تمھارے قریب الوطن ہیں، اُن سے کہہ دیں گے۔ وہ تم سب کو ضروری دینی مسائل تعلیم کیا کریں گے۔ جس مسئلے کی تم کو ضرورت ہوا کرے، اُن سے پوچھ لیا کرنا، خواہ خط کے ذریعے، خواہ بذاتِ خود۔" ۱۵ ۲۰

اُن میں سے جو لوگ ہوشیار تھے، آپ نے اُن کو تربیت کے لیے ان دونوں صاحبوں کے

سپرد کیا اور ان حضرات نے توجہ فرمائی۔ چند دنوں کے بعد اُنھوں نے عرض کیا کہ "حضرت، ہم تو اب آپ ہی کی خدمت میں رہیں گے اور اپنے گھر نہ جائیں گے۔" آپ نے اُن کو سمجھا کر فرمایا کہ: "جہاں ہم تم کو بھیجیں، وہاں جاؤ۔ وہاں جانا گویا ہمارے ہی ساتھ رہنا ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ: "ہم فرماں بردار ہیں۔ جو ارشاد ہو، بلا عذر حاضر ہیں۔"

۵ آپ نے اُن کو ایک ایک خلافت نامہ دیا اور اپنا خلیفہ کیا اور کسی کو کُرتا دیا، کسی کو عمامہ عنایت کیا اور کسی کو فقط تاج عطا فرمایا اور دُعا کر کے اُن کو اُن کے ملکوں کو رُخصت کیا اور ہر ایک سے کہہ دیا کہ جابجا سَیر اور دَورہ کرتے رہنا اور توحید و سُنّت کا جو مضمون تم نے یہاں سیکھا ہے، وُہی لوگوں کو سکھانا اور اُن سے شرک و بدعت کے کام چھڑانا اور جو تم کو مارے کوٹے، رنج و ایذا دے، صبر کرنا اور وعظ و نصیحت سے باز نہ رہنا۔ ہم تمھارے بعد بھی جنابِ الٰہی میں دُعا ۱۰ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید قوی ہے کہ تمھارے ہاتھوں سے بہت لوگوں کو ہدایت ہوگی۔ جو کوئی زندہ رہے گا، تھوڑی مدّت میں اس ملکِ بنگال کا حال دیکھے گا کہ اللہ تعالےٰ کس طرح ہدایت عام کرتا ہے۔ لوگ اپنے دل میں کہیں گے کہ یہ وُہی ملکِ بنگال ہے اور یہ وُہی آدمی ہیں کہ کوئی توحید و سُنّت کا نام نہیں جانتا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ فضل و کرم کیا۔"

یہ سُن کر وہ سب لوگ اپنے اپنے شہر کو گئے۔ کلکتّے کے اطراف کے جو لوگ کشتیوں میں ۱۵ سوار ہو کر آئے تھے اور آپ سے بیعت کی تھی، آپ نے اُن سے فرمایا کہ "جن کو ہم نے اپنا خلیفہ کیا ہے اور خلافت نامہ لکھ دیا ہے، اگر تمھاری بستیوں میں جائیں، تو جس کسی کو اللہ کا نام سیکھنا منظور ہو، اُن سے سیکھ لے۔" جو لوگ مُلکِ جاوا سے آئے تھے، اُن سے بھی آپ نے بیعت لی اور تعلیم اور توجّہ کے لیے مولوی امام الدّین صاحب اور صُوفی نور محمد صاحب کے سپُرد کیا۔ تعلیم اور توجّہ کے بعد ان ہی سے دو آدمیوں کو اپنا خلیفہ کیا۔ وُہ دونوں کچھ علم بھی رکھتے ۲۰ تھے۔ توحید و سنّت کی خُوبی اور شرک و بدعت کی بُرائی اُن کو خوب سمجھادی اور رُخصت کیا۔(۱)

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۴۵-۹۴۳

آسام کے کچھ اور لوگ بھی آئے۔ ان میں دو شخصوں کو بیعت کے بعد خلافت نامہ دیا اور توحید و سنّت کی خوبی اور شرک و بدعت کی برائی کے مسائل خوب سمجھا دیے اور فرمایا کہ "تم جب تک اس شہر میں ہو، تب تک ہر روز ہمارے پاس آیا کرو۔ ہم تم کو توجہ دیا کریں گے۔ اور جب اپنے ملک کو جانا، تب وہاں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیا کرنا اور لوگوں سے بیعت لیا کرنا اور اُن کو توجّہ دینا"۔ پھر آپ نے اُن کے لیے دُعا کی۔(۱) ۵

سلطان ٹیپُو کے شہزادے

ایک روز سیّد صاحبؒ کی خدمت میں محمد قاسم نام ایک خواجہ سرا آئے اور سلام کے بعد عرض کی کہ "یہاں شہر میں سلطان ٹیپُو کے جو شہزادے نظربندوں کے طور پر رہتے ہیں، اُنھوں نے جب سُنا کہ تکیے کے ایک پیرزادہ صاحب منشی امین الدین کے باغ میں اُترے ہیں، تو اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم جا کر اُن کا حال دریافت کرو کہ وہ کس کی اولاد میں ہیں کیونکہ سیّد ابُو سعید اور سیّد ابواللّیث مرحُوم و مغفُور ہمارے خاندان کے مرشدوں میں ہیں۔ ان کا مکان بھی وہیں ہے۔ اگر اسی خاندان کے کوئی صاحب ہیں، تو ہم بھی اُن کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوں"۔ ۱۰

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "سیّد ابُو سعید صاحب تو ہمارے حقیقی نانا اور سیّد ابواللّیث صاحب ماموں تھے"۔

یہ بات سُن کر محمد قاسم خواجہ سرا آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ اُدھر کلکتّے کے بعض معتمد لوگوں نے بیان کیا کہ اِن شاہزادوں کے مکان میں عبدالرحیم نامی(۲) ایک بڑا منطقی اور فلسفی ملحد رہتا ہے۔ اسی کے وہ سب معتقد ہیں۔ اس نے سب کو ملحد بنا دیا ہے کہ نہ خُدا کو ۱۵

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۴۶ (۲) عبدالرحیم کے والد کا نام مصاحب علی تھا۔ گورکھپور کے رہنے والے۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیزؒ اور اُن کے نامور بھائیوں سے تعلیم حاصل کی اور عُلُومِ عقلیہ میں توغل کیا۔ کلکتے کے سفر میں انگریزی زبان کی تحصیل کی۔ اِلحاد و زندقہ کی عام شہرت تھی۔ تصنیفات میں "کارنامۂ حیدری" ہے جو سلطان ٹیپو اور ان کے والد حیدر علی کے حالات پر مشتمل ہے۔ عربی اور فارسی زبان کے مقابلے پر بھی ایک کتاب لکھی، جس میں فارسی کو عربی پر فضیلت دی ہے۔ آفتاب کے سکون پر بھی ایک رسالہ ہے۔ ایک کتاب "الأنوارُ المشرقیۃ فی الأسرارِ المنطقیۃ" اور "التالیفات التمثیلیہ الی الرسالۃ الاسرار المنطقیہ" بھی اُن کی تصنیفات میں سے ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۷)۔

خدا جانتے ہیں اور نہ رسول کو رسول۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ تو مخلوق کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، نہ کوئی مارنے والا۔ ہمیشہ سے اس عالم کا یہی خاصہ ہے کہ سب چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، پھر خود بخود فنا ہو جاتی ہیں۔

آپ نے ان کا یہ حال سُن کر کچھ دیر سکوت کیا اور فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار ملاقاتوں میں وہ سب درست ہو کر راہِ راست پر آ جائیں گے۔ ۵

دُوسری بار اسی دن یا اگلے روز محمد قاسم خواجہ سرا پھر آئے اور ان شاہزادوں کا پیام آپ کے پاس لائے کہ شاہزادوں نے آداب و تسلیمات کے بعد عرض کیا ہے کہ: "آپ تو ہمارے خاندان کے پیر و مرشد ہیں۔ ہم لوگوں کی بڑی بے نصیبی ہے کہ تمام اہلِ شہر آپ کے شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے اور ہم اب تک اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔ آپ ضرور غریب خانے پر تشریف لائیں اور اپنے دیدارِ فیض آثار سے ہم کو محظوظ فرمائیں۔" ۱۰

آپ نے فرمایا کہ بہتر ہے، ہم چلیں گے۔ آپ پنس پر سوار ہو کر محمد قاسم کے ساتھ تشریف لے چلے۔[1] مولانا عبدالحی صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور آپ کے بھانجے سید احمد علی صاحب، ان کے علاوہ اور بھی کوئی دو ڈھائی سو آدمی ہمرکاب ہوئے۔ قیام گاہ سے ان شاہزادوں کا مکان کوئی دو کوس تھا۔ محلّے کا نام رسا پگلا تھا۔ جاتے ہوئے عبدالرحیم کا مکان راستے میں بائیں ہاتھ پڑتا تھا، مگر سرِ راہ سے کچھ دُور الگ تھا۔ جب سید صاحبؒ کی سواری اُن کے مکان کے برابر پہنچی، آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ: "آپ عبدالرحیم کے پاس جائیے اور دیکھیے کہ ان کا کیا حال ہے۔ جیسا لوگ کہتے ہیں، ویسے ہی ہیں، تو اُن کو سمجھا کر معقول کیجیے۔ ایک آدمی اور بھی ساتھ لے لیجیے۔ چنانچہ سید احمد علی صاحب مولانا کے ساتھ گئے اور اُن سے جا کر ملاقات کی۔ مولانا کے وہ اس زمانے سے واقف تھے، جب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ۱۵

(۱) قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ٹیپو سلطان کے شاہزادوں کے مکان پر ۳۰ ربیع الاوّل چہار شنبہ کے دن تشریف لے گئے۔

پاس دہلی میں پڑھتے تھے۔ چار پانچ گھنٹے گفتگو رہی، جس میں بالآخر عبدالرحیم کو ساکت ہونا پڑا اور مولانا اُٹھ کر سید صاحبؒ کے پاس آگئے۔

ہر شاہزادے کا ایک جُدا جُدا بنگلہ بہت نفیس و مکلّف بنا ہوا تھا۔ بڑے شاہزادے کو اپنے اُستاد کی شکست کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے ان حضرات کی آمد کی خبر سُن کر اپنے بنگلے کا دروازہ بند کر لیا۔ محمّد قاسم خواجہ سرا نے سید صاحبؒ کو ایک بنگلے میں جا کر بٹھایا اور شاہزادوں کو وہیں بُلا لیا۔ بڑا شاہزادہ تو غصّے اور رنج کی وجہ سے نہیں آیا، باقی سب شاہزادے حاضر ہو گئے۔ دس دس، بارہ بارہ برس کے تھے۔[1] محمّد قاسم نے اُن کو سید صاحبؒ کے پاس لا کر بٹھایا اور سب کا علٰحدہ علٰحدہ تعارف کرایا۔ آپ نے اُن سے بیعت لی۔ محمّد قاسم آپ کو شاہزادوں کے زنانے مکانوں میں بھی لے گئے۔ وہاں بیگمات نے بیعت کی اور چند تھان نذر کیے۔ آپ نے محمّد قاسم کو اطمینان دلایا کہ انشاء اللّٰہ تین چار بار کے آنے میں تمام شاہزادے دُرست ہو جائیں گے۔

آپ وہاں سے باغ میں تشریف لائے۔ محمّد قاسم بھی ساتھ آئے۔ وہ تمام دن سید صاحبؒ کی خدمت میں رہتے تھے اور دونوں وقت کھانا اپنے مکان سے منگوا کر یہیں کھاتے تھے اور روزانہ عشا کی نماز پڑھ کر واپس مکان جاتے تھے اور صُبح کو پھر حاضر ہوتے تھے۔[2] آپ نے شاہزادوں کو توجّہ دینے کے لیے حاجی احمد صاحب، عُرف حاجی بُوڑھے صاحب، ولایتی کو مامُور کیا تھا۔ ان شاہزادوں کے احوال اور ترقّیات کو دیکھ کر جن شاہزادوں نے بیعت نہیں کی تھی اُن کو بھی کمال اشتیاق ہُوا کہ ہم بھی بیعت کر کے اس نعمت سے بہرہ یاب ہوں۔ چنانچہ ان شاہزادوں نے بھی بیعت کی۔ صرف بڑا شاہزادہ باقی رہ گیا اور اس نے ملاقات بھی نہیں کی۔

(۱) سلطان ٹیپو کی شہادت ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) کو ہُوئی، جس کو سید صاحبؒ کے سفرِ حج اور قیامِ کلکتہ کے زمانے میں ۲۲ برس ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ شاہزادے جن کی عمر دس دس، بارہ بارہ برس بتلائی گئی ہے، سلطان شہید کے پوتے ہوں گے۔ (۲) محمّد قاسم کا تعلق سید صاحبؒ سے اتنا گہرا اور مستحکم ہُوا کہ مجاہدین کے ساتھ ہجرت کی اور جہاد میں شریک ہُوئے۔ "منظورہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک شریک رہے اور اعانتِ مجاہدین کے لیے مولانا اسمٰعیل شہید سے اجازت لے کر ہندوستان واپس ہُوئے ("منظورہ"، صفحہ ۹۴)

محمد قاسم خواجہ سرا شاہزادوں کو لے کر بڑے شاہزادے کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ: "آپ سید صاحبؒ کے پاس چل کر ملاقات تو کر لیں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ بیعت کا آپ کو اختیار ہے۔ چاہے کریں؛ چاہے نہ کریں۔" چنانچہ اُس کو راضی کر کے سید صاحبؒ کے پاس آئے اور آپ کو بڑے شاہزادے کی کوٹھی میں لے گئے۔ شاہزادہ کوٹھی کے دروازے تک استقبال کو آیا اور آپ کو کوٹھی کے اندر لے گیا۔ ہمراہیوں میں سے دو یا تین آدمی ساتھ گئے اور باقی باہر کھڑے رہے۔(۱)

شاہزادے نے عربی زبان میں واجبُ الوُجُود کے وُجُود اور رسالت اور قرآن کے انکار پر تقریر کی۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ: "ہماری پیدائش اور نشو و نما ہندوستان میں ہُوئی ہے کبھی عربی زبان میں بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ اصل غرض مقصد کا ظاہر کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ہندوستانی میں گفتگو کریں تاکہ میں اور حاضرینِ مجلس آپ کے کلام کو سمجھیں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد فارسی میں گفتگو شروع کی۔ آپ نے فرمایا: "ہر چند کہ فارسی زبان کو سمجھتا ہوں اور آپ کی عربی اور فارسی زباندانی حاضرین پر ظاہر ہوگئی ہے، یہ سب تکلف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنی مادری زبان میں گفتگو کریں۔" اس وقت انھوں نے اُردو میں قواعدِ مَنطقیہ اور دلائلِ کلامیہ کی رعایت کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید حضرت مجھ سے جواب دینے کے لیے ارشاد فرمائیں، مگر سید صاحبؒ نے خُود ہی قواعدِ مَنطِقیہ کا لحاظ کیے بغیر جیسے کسی طفلِ مکتب کو تعلیم کرتے ہیں، کلماتِ عارفانہ، بلکہ سپاہیانہ سے اُس کو سمجھانا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں قائل کر دیا۔(۲)

محمد قاسم آپ کو بیگمات میں لے گئے۔ ٹیپو سلطان کی بیٹی نے آپ کو بلایا تھا۔ اس نے عرض کی کہ: "ہمارے بڑے بھائی صاحب نے آپ سے ملاقات کی۔ الحمد للہ، ہم کو کمال خوشی حاصل ہُوئی۔ ہم کو ان کا حال اور خیال دیکھ کر اس کی اُمید ہرگز نہ تھی۔ اب خدا کی ذات سے

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۸۹۸ - ۹۰۲ (۲) "منظورة السعدا"

اُمید ہے کہ وہ بیعت بھی کر لیں گے"۔

بیگم نے اور بیگمات کو بھی وہیں بلایا اور سب سے بیعت کرائی اور خود بھی بیعت کی اور عرض کی کہ: "آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہمارے بھائی صاحب کو ہدایت نصیب کرے"۔ آپ نے ان سب کے لیے دعا کی۔ ان بیگمات نے کوئی چالیس پچاس چھوٹی چھوٹی تشتریوں میں کئی اقسام کی مٹھائی پیش کی۔ کسی تشتری میں مٹھائی کی الائچیاں تھیں اور کسی میں مٹھائی کے جائے ۵ پھل اور بادام اور کسی میں شیرینی اور میوے تھے۔ تشتریاں بھی رنگارنگ آبگینے کی تھیں: کوئی سبز، کوئی زرد، کوئی گلابی، کوئی نیلی، کوئی سپید شفاف اور کوئی منقش چینی کی۔ وہ سب تشتریاں آپ نے باہر لوگوں میں بھیج دیں۔ شیرینی تھوڑی تھوڑی سب میں تقسیم ہوئی اور آپ سوار ہو کر باغ میں تشریف لائے۔

۱۰ کئی روز کے بعد محمد قاسم خواجہ سرا آئے اور عرض کیا کہ کل بڑے شاہزادے کے یہاں آپ کی اور تمام قافلے کی دعوت ہے۔ اگلے روز سویرے شاہزادے کے یہاں سے طرح طرح کی بہت سواریاں آئیں۔ کوئی چھ گھڑی دن چڑھے آپ باغ سے سوار ہوئے اور قافلے کے کوئی تین سو آدمی آپ کے ہم رکاب ہوئے۔ بنگلے کے قریب پنیس رکھی گئی۔ آپ اتر کر بنگلے میں تشریف لے گئے اور کچھ دیر بیٹھے۔ سب شاہزادے جمع ہو کر آپ کو بڑے شاہزادے ۱۵ کی کوٹھی میں لے گئے۔ وہاں بڑے شاہزادے نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور کئی من رنگ برنگ کی انگریزی اور ہندوستانی مٹھائی لوگوں میں تقسیم کروائی۔ بیعت کے بعد شاہزادہ آپ کو زنانہ مکان میں لے گیا۔ وہاں عورتوں نے بیعت کی۔ دوپہر کے قریب آپ وہاں سے باہر تشریف لائے اور تھوڑا کھانا کھا کر سو رہے۔ ظہر کے وقت آپ نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی اور بیٹھ کر دو چار گھڑی وعظ فرمایا۔

۲۰ اس عرصے میں محمد قاسم خواجہ سرا نے آکر عرض کی کہ ایک بیگم صاحبہ کا محل باقی ہے، وہاں بھی تشریف لے چلیے۔ آپ اُن کے ساتھ وہاں بھی تشریف لے گئے۔ وہاں کی تمام عورتوں

نے بھی بیعت کی۔ عصر کے قریب آپ وہاں سے باہر آئے۔ ان بیگم نے بھی بہت شیرینی بھیجی
وہ تقسیم کی گئی۔ آپ نے عصر کی نماز پڑھی۔ دو تین گھڑی کے بعد سب ہمراہیوں نے کھانا کھایا۔
آپ نے مغرب کی نماز وہیں پڑھی اور عشا بھی۔ اس کے بعد آپ نے کھانا تناول فرمایا۔ پھر سب
چھوٹے بڑے شہزادے جمع ہو کر آپ کے پاس آئے اور عرض کی کہ: "حضرت، ہم تو آج از
۵ سرِ نو مسلمان ہوئے اور آج ہی دینِ اسلام کی قدر جانی۔ اب ہم سب کے لیے دعا کریں کہ
اللہ تعالیٰ ہم کو تاحینِ حیات اسی راہِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے اور شیطان کے مکر و فریب سے
محفوظ رکھے۔" آپ نے بہت دیر تک کمال الحاح و زاری اور عجز و انکسار کے ساتھ دعا کی
اور فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ نے اب شیطان کو تمھارے یہاں سے دفع کر دیا۔ چند روز کے بعد دیکھنا
کہ اللہ تعالیٰ تمھارے یہاں کیسی خیر و برکت کرے گا۔"

۱۰ ان شاہزادوں نے ملازموں سے تاکید کی کہ عبدالرحیم ہمارے یہاں نہ آنے پائے۔
آپ ان سب سے رخصت ہو کر باغ میں تشریف لائے۔(۱)

ایک پیرزادے کے مکان پر کلکتے میں ایک پیرزادہ صاحب تھے۔ انھوں نے سید صاحبؒ
سے کہلا بھیجا کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ
ہم کسی وقت آئیں گے۔ یہ سن کر شہر کے چند شخصوں نے آپ سے عرض کی کہ: "آپ نے
۱۵ ان پیرزادہ صاحب کے مکان پر جانے کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ شخص تو کچھ خلافِ شرع
سے ہیں۔"

آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا خلافِ شرع کام کرتے ہیں۔ انھوں نے عرض
کی کہ: "وہ نجومی ہیں۔ شہر کے اکثر پنڈت، نجومی اُن کے پاس جاتے ہیں اور ان سے قواعدِ
نجوم دریافت کرتے ہیں۔ آپ کو جو وہ وہاں اپنے مکان پر بلاتے ہیں، وہ صرف اسی امر
۲۰ پر مباحثہ کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں۔" آپ نے فرمایا:

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۰۳ - ۹۰۵

"خیر، جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا" اور اُن پیر زادہ صاحب کے آدمی سے فرمایا کہ تم پرسوں آنا، انشاء اللہ تعالیٰ ہم تمھارے ساتھ چلیں گے۔

وُہ شخص وعدے کے موافق لینے آیا۔ آپ پینس پر سوار ہوئے پچیس تیس آدمی آپ کے ہمراہ ہوئے۔ جب آپ کی سواری پیرزادہ صاحب کے احاطے کے پھاٹک پر پہنچی، آپ سواری سے اُترے، تو دیکھا کہ پھاٹک کی چوکھٹ سے پیرزادہ صاحب کی کوٹھی تک پگڑیاں ۵ بچھی ہیں۔ اُن کے لوگ، جو وہاں سے آپ کو لینے آئے، اُنھوں نے عرض کی کہ آپ ان پگڑیوں پر چلیے۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ: "پگڑی تو سر پر باندھنی چاہیے اور چلنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی ہے۔ ہم تو زمین پر چلیں گے۔" اُنھوں نے کئی بار بتکرار وُہی عرض کی کہ آپ اس پر چلیے۔ آپ نے کسی طور نہ مانا اور زمین پر ہو کر اُن کے بنگلے میں، جہاں وُہ پیرزادہ صاحب تھے، تشریف لے گئے اور سَلَامٌ عَلَیْکُمْ کہا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ و معانقہ کر کے ۱۰ آپ کو فرش پر بٹھایا اور عافیتِ مزاج پُوچھی۔ آپ نے ان کی خیر و عافیت پُوچھی۔ کچھ گفتگو اور تواضع کے بعد اُنھوں نے بیعت کی درخواست کی اور سب باتوں سے توبہ کی۔ اُن کے جو مُرید حاضر تھے، اُن سب سے بیعت کروائی اور جو وہاں حاضر نہ تھے، اُن کو حکم دیا کہ ہمارا جو مُرید سیّد صاحب کے دستِ مبارک پر بیعت نہ کرے گا، وہ ہمارا مرید نہیں ہے۔ پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ ۱۵

یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ: "آپ کو میری طرف سے اجازت ہے کہ آپ ہی اُن سے بیعت لیں۔ ہم آپ کو خلافت نامہ دیں گے۔" یہ بات سُن کر وُہ بہُت خوش ہُوئے۔ پھر انھوں نے بہُت سی مٹھائی منگوائی اور تقسیم کروائی۔ اس کے بعد آپ مکان پر تشریف لائے۔

ایک دن کے بعد آپ نے اُن کو ایک کُرتا دیا اور ایک پگڑی عنایت فرمائی اور اُن کو مولانا عبدالحی صاحب سے خلافت نامہ لکھوا دیا اور اُن کو حاجی عبدالرحیم صاحب کے ۲۰ سپُرد کیا۔ ایک دن اُنھوں نے سیّد صاحبؒ سے عرض کی کہ: "مجھ پر اللہ تعالیٰ نے بڑی عنایت

کی۔ اگر میں آپ کے دستِ مبارک پر توبہ نہ کرتا اور یُوں ہی مرجاتا، تو میری عاقبت تباہ ہوجاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں آپ کو گویا میری ہی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ اب آپ دُعا کریں کہ پروردگار مجھے تادمِ موت اسی توبہ پر قائم رکھے"۔ آپ نے اُن کے لیے دُعا کی۔(۱)

ایک نایاب تحفہ | آپ کے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد سیّد احمد علی صاحب، جو بعض ضروری کاموں کے لیے وطن ٹھیر گئے تھے، کلکتے آئے اور امانت کے پانچ ہزار روپے، جو فقیر محمد خاں کے پاس تھے، لائے۔ اُنھوں نے سیّد صاحبؒ اور سب عزیزوں اور دوستوں سے کہا کہ میں سب صاحبوں کو ایک خوشخبری سُناتا ہوں۔ سب نے بڑے اشتیاق سے کہا کہ فرمایئے، کیا خوشخبری ہے۔ کہا: "شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ستر روپے کا قلمی ترجمۂ قرآن لایا ہوں" اور سب کو دکھلایا۔ سب لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ستر روپے میں گویا مفت مِلا۔(۲)

اس ترجمے کو سب سے پہلے مولوی عبداللہ پسر سیّد بہادر علی اودھی مرحوم نے کلکتے میں طبع کرایا۔ پھر اُس کی اشاعت عام ہوگئی۔(۳)

فقیرِ منعم | کلکتے کی مدّتِ قیام میں صدہا حاجتمند سائل اور شرفا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کوئی اپنی لڑکی، لڑکے کی شادی کے لیے، کوئی قرض ادا کرنے کے لیے، کوئی مسجد اور کُنواں بنانے کے لیے امداد طلب کرتا۔ آپ کسی کے سوال پر "نہیں" نہ کرتے۔ شیخ عبداللطیف صاحب تاجرِ مرزاپور، جن کے سپرد یہ خدمت تھی، کہتے ہیں کہ کلکتے کے قیام میں دس ہزار روپے اہلِ حاجت اور سائلوں کو دیے گئے۔(۴)

مردِ خدا کا یقین | بغداد کے ایک پیرزادے سیّد احمد نام منشی امیر کے مکان پر اُترے تھے۔ وُہ بھی حج کے ارادے سے آئے تھے اور جہازوں کی روانگی کے موسم کے منتظر تھے۔ اُن کو درویشی و بزرگی کا بھی دعویٰ تھا۔ جب منشی کے یہاں وُہ ٹھیرے تھے، بڑا مال دار اور صاحبِ اعتبار

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۷۸ - ۹۸۶ (۲) "وقائع"، صفحہ ۹۹۱
(۳) "منظورۃ السعدا" (۴) "مخزنِ احمدی" صفحہ ۷۷

تھا اور اُن کا مُرید بھی تھا۔ اُن کو یہ خیال ہُوا کہ سید صاحبؒ کسی طرح میری ملاقات کو آئیں، اس سے میری عزت و عظمت لوگوں کے دل میں زیادہ ہوگی۔ بعد میں میں بھی اُن کی ملاقات کو چلا جاؤں گا۔ انھوں نے ایک شخص کی زبانی آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے، لیکن میں بیماری کے باعث آپ کی ملاقات کو نہیں آسکتا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ: "بیمار کی عیادت سُنّت ہے۔ ہم ہی ان کی مُلاقات کے لیے آئیں گے۔ اُن سے کہنا کہ وہ یہاں آنے کی تکلیف نہ کریں۔"

اسی روز نمازِ مغرب کے بعد آپ چند آدمیوں کے ساتھ سید بغدادی صاحب کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اُن سے مُلاقات اور مزاج پُرسی کی۔ اُنھوں نے کہا کہ: "میں نے سُنا ہے کہ آپ یہ قافلہ لے کر بارادۂ حج تشریف لائے ہیں۔ اس جمِّ غفیر اور جماعتِ کثیر کے ساتھ آپ کو مناسب نہ تھا۔ اتنے لوگوں کو جہاز پر کون بٹھائے گا اور کھانے کپڑے کا خرچ کہاں سے آئے گا؟"

آپ نے اُن سے فرمایا کہ: "ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر انگریز حاکم چاہے، تو ہزار دو ہزار آدمی جہاز پر سوار کرکے حج کو یا کسی اور مُلک کو پہنچائے۔ یہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟" انھوں نے کہا کہ: "ہزار، دو ہزار کی کیا حقیقت ہے؟ اگر وہ چاہے، تو دس پانچ ہزار آدمیوں کو جہاز پر سوار کرکے جہاں چاہے، وہاں پہنچا دے۔"

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ: "سبحان اللہ! مخلوق انگریز حاکم، جو ہر اَمر میں جنابِ باری تعالےٰ کا محتاج ہے، اس کو تو یہ مقدور کہ ہزاروں آدمی جہازوں پر چڑھا کر جہاں چاہے، وہاں پہنچا دے اور وہ شہنشاہِ عالم پناہ، پروردگارِ جہاں، جس کے آگے انگریز حاکم ادنیٰ فقیر سے بھی زیادہ محتاج ہے، اِتنا مقدور نہیں رکھتا کہ ہم چھ سات سو غربا کو مکّے میں پہنچا دے؟ آپ کا عقیدہ عجیب ہے!"

یہ تقریرِ پُرتاثیر سُن کر وہ اپنے دل میں نہایت پشیمان و شرمندہ ہُوئے اور کچھ نہ بولے۔

آپ نے فرمایا کہ: "آپ سُن لیں گے کہ اِن شاءَ اللہ تعالیٰ، میں جہازوں کا کرایہ دے کر اور سب بھائیوں کو ہمراہ لے کر جاؤں گا اور حج کر کے مع الخیر آؤں گا اور خیراتی جہازوں پر نہ آپ سوار ہُوں گا، نہ اَوروں کو سوار کراؤں گا۔"[1]

اہلِ خیر کی مسابقت ایک روز منشی امینُ الدین صاحب کے یہاں سے اہلِ قافلہ کی پوشاک کے لیے کپڑے کی گٹھڑیاں آئیں۔ اس کے بعد شیخ رمضانی، سعدالدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخشؒ صاحب حساب کی ایک ایک فرد لائے اور سیّد صاحبؒ کو دکھائی اور عرض کیا کہ: "ہم نے اس قدر تھان آپ کے لیے خریدے ہیں۔ اگر ارشاد ہو، تو گٹھڑیوں میں باندھ کر یہاں لائیں، ورنہ جب جہازوں پر آپ کا اسباب چڑھایا جائے گا، اس کو بھی چڑھوا دیں گے اور ہم سب نے پانچ سو جامۂ احرام کی تدبیر کی ہے۔ اگر آپ کے آدمیوں کا شمار معلوم ہو، تو حساب سے اس کا انتظام کیا جائے۔"

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ: "احرام تو اپنے لوگوں کے موافق ہمارے پاس تیّار ہیں، اب

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۹۴۹ - ۹۵۱ - یہ پیش گوئی حرف بحرف پُوری ہُوئی۔ اس کے بالمقابل سیّد احمد بغدادی صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ "وقائعِ احمدی" میں ہے کہ باوجودیکہ سیّد بغدادی کے میزبان و مُرید منشی امیر اکثر ناخداؤں سے تعارف رکھتا تھا اور صاحبِ مقدور تھا، مگر ہر چند سعی اور کوشش کی، کوئی جہاز نہ ملا کہ سیّد بغدادی کو سوار کراتا۔ سیّد صاحبؒ کے قافلے کی روانگی کے چند دنوں بعد منشی امیر کا ایک واقف ناخدا بمبئی کو جاتا تھا۔ منشی امیر نے سیّد بغدادی کو اُس کے جہاز پر سوار کر دیا۔ ایک مغل کی بیوی اس ناخدا سے آشنائی رکھتی تھی۔ وہ بھی ناخدا کے جہاز پر سوار ہو گئی اور وہ جہاز کلکتے سے روانہ ہو گیا۔ دُوسرے روز اس مغل کو خبر ہُوئی۔ اس نے عدالت میں جا کر اس ناخدا پر نالش کی۔ عدالت سے اس جہاز کی واپسی کا حکم ہُوا۔ کئی دن بعد کلکتے میں یہ خبر مشہور ہُوئی کہ سیّد احمد، جو قافلہ لے کر حج کو گئے ہیں، وہ پکڑے گئے۔ سیّد صاحبؒ کے مُخلص و معتقد (اگرچہ اُن کو اس خبر کا یقین نہ تھا) بڑے مضطرب و متفکّر ہُوئے اور معاندین خُوش ہُوئے۔ جب وہ جہاز کلکتے واپس آیا، تب معلوم ہُوا کہ اس جہاز میں سیّد احمد بغدادی ہیں۔ اس وقت معاندین شرمندہ ہُوئے اور مخلصین سُرخرُو و مطمئن۔

عبرت کی بات یہ ہے کہ سیّد بغدادی باوجودیکہ تنِ تنہا تھے اور ایک بڑے شخص کے مہمان و مُرشد، اُس سال سفرِ حج سے محروم رہے۔ "وقائع"، صفحہ ۹۵۱، ۹۵۲

اِحراموں کی کچھ حاجت نہیں اور جو کچھ کپڑا تم نے تیار کیا ہے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ تم کو دُنیا و آخرت میں دے۔ وہ نہ ہمارے پاس لاؤ، نہ جہاز پر چڑھاؤ۔ جس قدر حاجت تھی، اس قدر کپڑا ہم نے لے لیا۔ اب زیادہ بوجھ لادنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہیں ضرورت ہوگی، تب اللہ تعالیٰ انتظام فرما دے گا۔"

اُنھوں نے کئی بار بہ تکرار کہا کہ: "حضرت، آپ قبول فرمائیں۔ ہماری یہی خوشی ہے۔" ۵ آپ نے فرمایا کہ: "لینے میں تو کچھ نقصان نہیں ہے، مگر لاد کر لے جانا اور اس کی نگہبانی کرنا کچھ کام کی بات نہیں ہے، نہ لینے کا یہی سبب ہے۔"

اُنھوں نے کہا کہ: "اگر اور کپڑا آپ نہیں لیتے، تو خیر، مگر احرام آپ ضرور قبول کریں۔" آپ نے فرمایا کہ: "خیر، تمھاری خوشی۔ تم بھی کچھ ساتھ کر دو۔" یہ بات سُن کر وہ خوش ہوئے اور ہر ایک کہنے لگا کہ: "ہم ہی سب احرام دیں۔" آپس میں بحث ہونے لگی۔ حضرت نے فرمایا کہ: ۱۰ "اس میں جھگڑا نہ کرو۔ تم سب اپنے اپنے حصّے کے موافق جمع کر کے ہمارے پاس لاؤ۔"

اُنھوں نے الگ بیٹھ کر صلاح کی کہ فی نفر دو دو احرام دینے چاہییں۔ ساڑھے سات سو آدمی ہیں۔ اُنھوں نے پندرہ سو احرام تجویز کیے اور حضرت سے عرض کیا کہ: "اگر آپ اپنے پاس کے احرام میقاتِ یلملم سے بندھوائیں، تو ہمارے احرام عرفات جانے کے وقت یا اس کے برعکس، جس طرح مناسب سمجھیں۔" ان کی یہ تجویز آپ کو بہت پسند آئی۔ پھر آپ نے اُن ۱۵ کے لیے دُعا کی اور فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر دے اور یہ کپڑا اپنی راہ میں خرچ کرائے۔ انشاءاللہ ہم تمھارے لیے بیت اللہ میں جا کر دعا کریں گے۔ پروردگار سے اُمید ہے کہ وہ تمھارے یہاں بہت خیر و برکت کرے گا۔"(۱)

جہازوں کے انتظامات کلکتے سے چلنے کی تیاری شروع ہوئی۔ گیارہ جہاز کرایے پر لیے گئے اور بارہ ہزار روپیہ کرایہ تجویز ہوا۔ ہر جہاز پر ایک امیر مقرر ہوا اور بارہ ہزار روپے کی جنس اور ۲۰

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۹۶۱ تا ۹۶۲

اشیائے خوردنی خرید کر جہازوں پر رکھ دی گئیں[1]۔

جہازوں کی روانگی سے پہلے راستے میں کھانا کھانے کے لیے چھ سو تینتیس روپے کے مسّی ظروف خرید کر جہازوں پر چڑھائے گئے اور چھ سو ترانوے آدمیوں کا کرایہ فی نفر بیس روپے کے حساب سے تیرہ ہزار آٹھ سو ساٹھ روپے دیے گئے۔ عورتوں کے واسطے بین جہازوں کے نیچے کے دبو سے لیے گئے۔ ایک جہاز "فتح الکریم" کے آدھے دبوسے کے چار سو روپے اور ایک جہاز "غراب احمدی" کے پورے دبو سے کے آٹھ سو روپے کرایے کے علاوہ دیے گئے اور پانی کے پیپے رکھے گئے[2]۔

اللہ تعالیٰ سے عہد شیخ غلام حسین خاں فخر التجار کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ جہازوں کے سب انتظامات مکمل ہو گئے، تو ایک دن سیّد صاحبؒ کے پاس آکر عرض کیا کہ ان دنوں میرے چار جہاز خالی کھڑے ہیں۔ آپ انھیں پر اپنے لوگوں کو سوار کر کے بیت اللہ شریف تشریف لے جائیں۔ یہاں سے مکے تک کا جو کچھ زادِ راہ اور ضروری اسباب ہے، وہ سب جہازوں پر سوار کر دیا جائے گا اور زیارتِ حرمینِ شریفین سے فراغت کر کے پھر اسی سامان کے ساتھ انھیں جہازوں پر وہاں سے تشریف لائیں، یہ بھی میرے ذمّے ہے"۔

آپ نے فرمایا کہ: "شیخ بھائی، تم نے بات معقول کہی، مگر ہم نے اپنے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ جب ہمارے لیے زاد و راحلہ کا سامان کر دے گا، تب ہم جہازوں کا کرایہ دے کر اور اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر بیت اللہ شریف کو جائیں گے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی مخلوق کا بارِ احسان نہ اٹھائیں گے۔ اس میں چاہے برس گزر جائیں، اس کا کچھ غم نہیں[3]۔"

جہازوں کا معاینہ اور ناخداؤں کو ہدایات جہازوں کے منتظمین نے عرض کیا کہ: "اگر مرضیِ مبارک میں آئے، تو چل کر جہازوں کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ سب جہاز گنگا کے کنارے کھڑے ہیں۔ آپ

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۸۰ (۲) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۰۱۰ (۳) "وقائع"، صفحہ ۱۰۰۳ تا ۱۰۰۴

نے فرمایا: "بہتر ہے، ہم چلیں گے۔" آپ نمازِ ظہر پڑھ کر تشریف لے گئے[1] اور تختوں کی سڑک پر پہنچے۔ وہ سڑک بہت ہی مکلف اور خوبصورت بنی تھی۔ آپ اس سڑک پر کھڑے ہوئے۔ پھر ایک کشتی پر سوار ہو کر جہاز پر گئے اور اُس کے نیچے اور اُوپر کے سب مکان دیکھے اور فرمایا کہ: "الحمدُ للہ! اللہ تعالیٰ یہ دِن تو لایا کہ جہاز دیکھنے میں آئے۔"

۵　جہاز کے ناخدا کو آپ نے ایک بیش قیمت مسقطی لُنگی عطا فرمائی اور نینو نین سُکھ وغیرہ کے کئی تھان عنایت کیے اور فرمایا کہ: "ہمارے لوگوں کو آرام کے ساتھ لے جانا۔ کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انشاء اللہ تُمھارا جہاز جلد خیر و عافیت کے ساتھ جدّے پہنچے گا اور ہر صدمے سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے گا۔ اگر تقدیر سے کسی طرح کا صدمہ پیش آ جائے، تو گھبرانا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محفوظ رکھے گا۔"

۱۰　سعدالدّین ناخدا، شیخ امام بخش، شیخ رمضانی اور شیخ عبداللطیف وغیرہ نے عرض کیا کہ: "سب جہازوں کے ناخدا منتظر ہیں کہ حضرت ہمارے جہازوں کو دیکھنے تشریف لائیں۔ اگر مناسب سمجھیں، تو تشریف لے چلیں۔" آپ نے فرمایا: "عصر کا وقت قریب ہے۔ اب جا کر نماز پڑھیں گے۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ پھر کسی وقت انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے۔"[2]

ایک روز سب جہازوں کے ناخداؤں کو بُلا کر فرمایا کہ: "ہمارے لوگوں کو آرام کے ۱۵　ساتھ لے جانا، ان کو کسی طرح کی تکلیف و رنج نہ ہونے پائے۔ اس میں انشاء اللہ تعالیٰ تمھارے لیے دُنیا میں بھی بہتری ہو گی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا کا فائدہ تو تم اسی سفر میں دیکھ لوگے اور آخرت کا فائدہ، اللہ تعالیٰ چاہے گا، تو وہاں دیکھو گے۔ اگر اُن کو کسی قسم کی تکلیف دو گے، تو تمھارے دین میں بھی نقصان ہو گا اور دنیا میں بھی، کیونکہ یہ سب لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے واسطے جاتے ہیں۔"

---

(۱) قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۲۰ صفر شنبہ کے روز جہاز دیکھنے تشریف لے گئے۔

(۲) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۱۰۰۶، ۱۰۰۷

یہ بھی فرمایا کہ اگر سمندر میں صدمے کی کوئی جگہ آجائے، تو تم ان لوگوں سے دُعا کرانا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے خیر و عافیت کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔"

ان سب نے اقرار کیا کہ: "اِنشاء اللہ تعالیٰ، ہم اُن کو بڑے آرام کے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے ہاتھوں اُن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ آپ ہمارے لیے دُعا فرمائیں۔" آپ نے ان سب صاحبوں کے لیے دُعا کی۔[1]

سفر کی ترتیب جہازوں کے ناخداؤں نے عرض کیا کہ: "آپ اپنے سب جہازوں کے آگے سوار ہو کر روانہ ہوں گے یا سب کے پیچھے؟ جو منظور ہو، ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا: "جس طرح تُمھاری خُوشی ہو، ہمیں منظور ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ: "اگر آپ سب کے پیشتر روانہ ہوں، تو بھی، اِنشاء اللہ تعالیٰ، ہم آپ کے لوگوں کو آرام کے ساتھ سوار کر کے لے جائیں گے اور اگر آپ سب کے پیچھے روانہ ہوں، تو بھی۔ مگر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ جہازوں پر آپ کے سامنے روانہ ہو جائیں اور آپ سب کے پیچھے سوار ہوں، تب تک خدا کے اور بندے آپ کے فیض سے فیضیاب ہوں گے۔"

آپ کو اُن کی یہ صلاح پسند آئی۔ پھر ہر ایک ناخدا اپنے اپنے جہاز کی تعریف کرنے لگا کہ ہمارا جہاز ایسا تیز رفتار اور اس خُوبی کا ہے، آپ ہمارے جہاز پر سوار ہوں۔ آپ نے اُس وقت اُن کو کوئی جواب نہیں دیا۔ جب رُخصت ہو کر چلے گئے، تب شہر کے دُوسرے صاحبوں سے آپ نے فرمایا کہ: "سب کے پیچھے یہاں سے کون سا جہاز روانہ ہو گا؟ اس کو دریافت کیجیے۔ ہم اُسی پر سوار ہوں گے۔" اُنھوں نے شہر میں جا کر ناخداؤں سے پُوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ: "سب کے پیچھے 'دریا بقی' روانہ ہو گا، مگر 'دریا بقی' بہت پرانا اور سُست رفتار ہے۔" اُنھوں نے یہی حال سیّد صاحبؒ سے آکر بیان کیا اور عرض کر دیا کہ 'دریا بقی' پُرانا اور سُست رو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: "اِنشاء اللہ تعالیٰ ہم اس کا جواب تیسرے یا

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۰۱۱ تا ۱۰۱۲۔

چوتھے روز دیں گے۔ اگر ہم اس پر نہ چڑھے، تو ہمارے دُوسرے بھائی چڑھیں گے۔"

شہر کے لوگوں نے یہ سُن کر کہ سید صاحبؒ نے اپنے سفر کے لیے دریا بقیٰ کا انتخاب کیا ہے، آکر عرض کی کہ تمام شہر میں مشہور ہے کہ جہاز "دریا بقیٰ" بہت کم چلتا ہے اور بہت کُہنہ اور شکستہ بھی ہے۔ آپ تو کسی اور جہاز پر سوار ہوں"۔ آپ نے فرمایا کہ: "تم خاطر جمع رکھو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے نئے اور پُرانے سب یکساں ہیں۔ اگر وُہ چاہے گا، تو اس کو تیز رو کر دے گا۔"(۱)

اہلِ دُنیا کی عزت و حُرمت کی طرف عدمِ التفات غلام حسین خاں فخرُ التجّار کلکتہ نے کہا کہ جہاز عطیۃ الرحمٰن بادشاہی ہے اور اس پر ساٹھ ضرب توپ چڑھی ہے۔ محمد حسین ترک اس کا ناخدا ہے اور وُہ چالیس جہازوں کا کپتان ہے۔ آپ اس پر سوار ہوں۔ جس وقت آپ مُلکِ عرب میں پہنچیں گے، وہاں کے لوگ آپ کی بہت بڑی عزت و حُرمت کریں گے۔"

یہ سُن کر آپ کا چہرۂ مبارک غصّے سے متغیّر ہو گیا اور فرمایا کہ: "غلام حسین خاں، یہ تُم نے کیا کہا؟ عزت و حرمت تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کی طرف سے نہیں۔ ہم دُنیا کی قدر و منزلت کو ایسا جانتے ہیں، جیسا سڑا کُتّا"۔ اور بہت سی باتیں اسی طرح کی فرمائیں اس وقت تمام اہلِ مجلس عالمِ سکُوت میں تھے۔ غلام حسین خاں کے چہرے پر دہشتِ خداوندی سے زردی چھا گئی۔ سر نیچے کیے ہُوئے بیٹھے رہے۔ اس طرح کی ندامت ہُوئی کہ سر اُٹھا کر نہ دیکھا۔(۲)

روانگی کا دن(۳) روانگی کے دن منشی امینُ الدین صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مجمع بے اندازہ تھا۔ آپ نے ظہر کی نماز اُنھیں کے یہاں ادا کی اور بہت سی نصیحتیں اور ہدایتیں فرمائیں۔ خلفا میں سے جو لوگ موجُود تھے، ان کو باہم اتفاق اور ایک دُوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرنے

---

(۱) "وقائع احمدی" صفحہ ۱۰۱۲، ۱۰۱۳ (۲) "وقائع" صفحہ ۱۰۸۷، ۱۰۸۸ (۳) قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کو کلکتے میں تقریباً تین مہینے صرف ہُوئے۔ اس یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ صفر کو آپ نواحیِ کلکتہ میں پہنچے تھے اور جمادی الاولیٰ میں وہاں سے روانگی ہُوئی۔

کی تاکید فرمائی۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ: "اگر کوئی کہے کہ سید احمد کی توجّہ میں بڑی قوی تاثیر ہے، تو اس کو کاذب اور مُفتری سمجھنا چاہیے۔ یہ معاملہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو میں نے چاہا کہ فائدہ ہو اور بڑی کوشش کی، ان کو ذرا نفع نہ ہُوا اور بعض لوگوں کی طرف میرا خیال بھی نہ تھا، لیکن اُن کو اتنا فائدہ پہنچا کہ اعلیٰ مراتب ولایت تک پہنچ گئے۔ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور بالکل من جانب اللہ بات ہے۔"

وعظ کے بعد آپ نے سر سے دستار اُتار کر منشی صاحب موصوف کے سر پر رکھی۔ اُس وقت منشی صاحب بہت روئے۔(۱)

(۱) "منظورۃ السعداء"

تیرھواں باب

کلکتے سے مکّہ معظّمہ تک

روانگی کا منظر سید عبدالرحمٰن صاحب راوی ہیں کہ روانگی کے دن باغ کے دروازے پر سواریاں کھڑی تھیں۔ آپ بگھی پر سوار ہوئے۔ مَیں اور عبداللہ (فرزند شیخ غلام حسین خاں) اور مولانا عبدالحی صاحب اور منشی امین الدین خاں آپ کے ساتھ بگھی میں بیٹھے۔ سید محمد یعقوب اور مولوی محمد یوسف صاحب بگھی کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ ۵

وہاں سے روانہ ہو کر جب بڑے مدرسے کے قریب پہنچے، تو دیکھا کہ لارڈ مائرا کے گرجے تک عورت و مرد، ہندو و مسلمان، یہودی و نصارٰی اس کثرت سے آپ کے دیدار کے لیے جمع تھے کہ آدمی کا اِدھر سے اُدھر گزرنا بہت دشوار تھا۔ صدہا آدمی پکارتے تھے کہ "بچو! بچو!"، مگر کون کس کی سُنتا تھا؟ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کچھ دیر میں بگھی دبی جاتی ہے۔ آخر کو ۱۰ بہ ہزار دشواری سواری غلام حسین خاں فخر التجّار کے دروازے پر پہنچی۔ حضرت بگھی سے اُتر کر اندر تشریف لے گئے اور غلام حسین خاں کو، جو بیمار تھے، دیکھا۔ پھر اسی بگھی پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چاند پول گھاٹ کو روانہ ہوئے اور لارڈ مائرا کے گرجے کے برابر یہودیوں کے محلّے میں پہنچے۔ وہاں سے آپ کے ہمراہی کلمہ باآوازِ بلند پڑھتے ہوئے گزرے اور قلعے کے میدان میں جا کر سواری ٹھہری۔ اس وقت ایک جمِ غفیر اور مجمعِ کثیر، یہودی اور نصرانی، سب چھتریاں ۱۵ لگائے ہوئے کوٹھوں پر اور راستے میں کھڑے تھے اور اُن کی عورتیں اُن کے ساتھ تھیں، بلکہ تمام اہلِ قلم وغیرہ اپنی کچہریاں خالی چھوڑ کر اس وقت وہاں موجود تھے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے

کہ لاٹ اپنی کوٹھی پر تمام عملے سمیت کھڑا ہُوا دیکھ رہا ہے۔

جب قلعے کے میدان میں پہنچے، عصر کا وقت ہُوا۔ لوگوں نے دریا میں وضو کیا اور اذان کہی۔ پھر صفیں آراستہ ہونے لگیں۔ اُس وقت خدا کی قُدرت نظر آتی تھی کہ ہزاروں ہزار نمازی کہ اُن کی تعداد گنتی سے باہر تھی، کھڑے تھے۔ جب صفیں آراستہ ہو چکیں اور ایک صف دونوں جانب دُور، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، گئی تھی، سیّد صاحبؒ امامت کے لیے بڑھے اور نیت باندھی۔ اُس وقت صدہا آدمی بآوازِ بلند تکبیر کہتے تھے۔ اس کے باوجُود تکبیر کی آواز سننے میں نہ آتی تھی، مگر آپ کی آواز سب کو پہنچ رہی تھی۔ نماز کے بعد آپ نے دُعا کی۔ پھر بگھی کے پاس آئے اور لوگوں سے رُخصت ہونے لگے۔ آپ نے ایک ایک دو دو روپے غربا میں تقسیم کیے۔ سات سو روپے تو صرف میرے ہاتھوں تقسیم ہُوئے۔ اس کے بعد آپ نے دوسروں سے لے کر روپیہ تقسیم کیا۔ اس کے بعد آپ بڑی پھرتی کے ساتھ لوگوں کے بیچ میں سے کشتی پر سوار ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کو بیٹھنے کے بعد دیکھا اور تعجب کیا۔

بہت سے لوگ کشتیاں لیے ہُوئے موجُود تھے۔ ان پر سوار ہو کر آپ کی کشتی کے ساتھ روانہ ہُوئے۔ دریا کے کنارے خلقت کا ہجُوم تھا۔ آپ نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز سے اَلسَّلامُ عَلَیکُم فرمایا۔ لوگوں نے سلام کا جواب دیا اور بہت روئے۔ دُور دُور تک جہاں سلام کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی، ہاتھ کے اشارے ہو رہے تھے۔

آپ نے مغرب کی نماز کشتی پر پڑھی اور سب کشتیاں روانہ ہُوئیں۔ جب اندھیرا بہت ہو گیا، تو دُوسری کشتیوں کے لوگ رُخصت ہو کر واپس ہُوئے[1]۔

جہازوں کے انتظامات آپ جس جہاز پر سوار تھے، اس کا ناخدا عبدالرحمٰن حضرمی تھا، جس کا ایک مکان بندرگاہِ مخہ میں بھی تھا۔ آپ کے متعلّقین اور اعزہ آپ کے ساتھ تھے۔ سب مرد و عورت ملا کر ایک سو چالیس آدمی ہوتے تھے۔

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۰۹۰-۱۰۹۳ و "منظورۃ السعدا"

آپ نے اپنے جہاز سے پہلے دُوسرے جہاز روانہ کر دیے تھے۔ تفصیل اُن کی یہ ہے کہ ایک جہاز کا نام 'فتحُ الباری' تھا۔ اس کا ناخدا عبد اللہ بلال عرب تھا۔ اس پر قافلے میں سے ستر آدمی سوار تھے اور مولوی عبد الحق صاحب نیوتنوی ان کے امیر تھے۔

'عطیۃ الرحمٰن' بڑا جنگی جہاز تھا۔ اس پر ساٹھ ضرب توپ تھی۔ محمد حسین ترک رُومی، جو چالیس جہازوں کا کپتان تھا، اس کا ناخدا، اور اہلِ قافلہ میں سے سرسٹھ نفر قاضی احمد اللہ صاحب میرٹھی کی امارت میں اس پر سوار تھے۔ ۵

'غرابِ احمدی' پر گیارہ توپیں تھیں، ناخدا احمد ترک رومی۔ اس پر پچاس آدمی، جو مولوی وحید الدّین، حکیم مغیث الدّین سہارنپوری کی سرکردگی میں تھے، سوار تھے۔

'فتحُ الکریم' پر چھہتّر آدمی میاں دین محمّد کی سرکردگی میں، 'فیضِ ربّانی' پر چھہتّر آدمی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی امارت میں، 'فیضُ الکریم' پر پچاس آدمی قاضی عبد الستّار گڈھ مکتیسری کی امارت میں، 'عباسی' پر چالیس نفر حاجی پیر محمّد بریلوی کی، 'تاج' پر پینسٹھ آدمی قادر شاہ ہریانوی کی، 'فتحُ الرحمٰن' پر پچاس آدمی حاجی محمد یُوسف کشمیری کی امارت میں۔(۱) ۱۰

اہلِ قافلہ کی تعداد چھ سو ترانوے تھی۔ اُن کے علاوہ مساکین ایک سو سات کی تعداد میں تھے، جو تین جہازوں پر تقسیم تھے۔ دیگیں اور دُوسرے ضرُوری برتن نئے خرید کر جہازوں پر رکھ دیے گئے تھے۔ چنانچہ چار دیگیں اپنے لوازمات کے ساتھ آپ کے جہاز پر، اور دو دو دیگیں ہر جہاز پر تھیں۔ غلّہ اور کپڑا ہر ایک پہ بقدرِ ضرُورت بار کر دیا گیا تھا۔(۲) ۱۵

تقسیمِ عمل

آپ نے فرمایا تھا کہ اس سفر کے تمام کام کاج عبادت ہیں۔ اس لیے رُفقا اور ہمراہی بڑے ذوق اور اپنی خُوشی سے خدمت کرتے تھے اور بعض بعض کام مستقل طور پر بعض لوگوں نے اپنے ذمّے لے لیے تھے۔ بادل خاں نے تمام اہلِ قافلہ کو، خصُوصًا معذور لوگوں ۲۰

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۰۷۸-۱۰۸۰ و "منظُورہ"　(۲) "منظورۃ السّعداء"

کو، وضو کرانے کی ذمے واری لی۔ وہ سمندر سے پانی کھینچ کر بڑے بڑے طاشوں میں بھر لیتے تھے اور اس سے لوگوں کو وضو کراتے تھے۔ پانی کھینچتے وقت اللّٰہ کا نام اُن کے وردِ زبان ہوتا تھا۔

شیخ باقر علی نے کھانا پکانے کا ذمہ لیا۔ دُوسرے آدمی بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس جہاز کے آگے کی طرف ایک بڑا دالان تھا۔ اس میں کھانا پکایا جاتا تھا۔ آدھے میں تو ناخدا اور معلّم اور خلاصیوں کا اور آدھے میں آپ کا کھانا پکتا تھا۔ وُہ دالان نیچے اور دائیں بائیں تمام تانبے کی چادروں سے منڈھا ہُوا تھا تاکہ آگ نہ لگ جائے۔ دو دیگیں چاول کی اور ایک دیگ دال کی آپ کے قافلے میں روزانہ پکتی تھی۔ بیماروں اور جن لوگوں کو دورانِ سر کی شکایت ہوتی تھی، اُن کو روٹی ملتی تھی۔[1]

جہاز پر آپ کے معمولات آپ کا روزانہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد حِزبُ البحر پڑھتے اور مولوی محمد یُوسف صاحب سے سورۂ زُخرُف کا پہلا رکُوع سُنتے۔ جب آپ اس سے فارغ ہوتے، تو لوگ آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ کوئی کسی آیت کا مطلب پُوچھتا، کوئی کسی حدیث کا۔ سوا پہر دن چڑھے تک اسی طرح مجلس رہتی۔ اس کے بعد آپ اندر تشریف لے جاتے اور وہیں کھانا تناول فرماتے۔ فراغت کے بعد باہر تشریف لاتے۔ دبوسے کے دروازے پر ایک کوٹھڑی تھی۔ اس میں دوپہر کو آرام فرماتے۔ اس کے دروازے پر شمشیر خاں کا پہرہ رہتا تھا اور اُن کی ایک دری بچھی رہتی تھی۔ جب ظہر کا وقت آتا، آپ اُٹھتے اور نماز پڑھتے۔ نماز سے فارغ ہو کر اسی دری پر بیٹھ جاتے اور اس طرح سے لوگ آپ کے پاس جمع ہو جاتے اور جو جس بات کا سوال کرتا، اس کا جواب دیتے۔

آپ کی صُحبت کی برکت سے قافلے میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا کبھی پیش نہیں آیا۔ وقت بڑی راحت اور عافیت سے گُزرتا تھا۔ ہر کسی کو دِن عید اور شب شبِ برات تھی۔ سوکھی

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۱۰۹۸ تا ۱۰۹۹ و "منظُورۃُ السعدا"

گھومتا تھا اور قے بھی ہوتی تھی، مگر دل میں راحت و خوشی تھی، رنج و الم کا ذکر نہ تھا۔[1]

سمندر میں تلاطم تھا۔ کسی ساتھی کو قے ہوتی، کسی کا سر گھومتا۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب سے جمع بین الصلاتین کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ سفر میں جمع بین الصلاتین مذہب حنفی کے سوائے تینوں مذاہب میں درست ہے۔ آپ نے فرمایا: "ایسے مقام پر نماز جمع کرنی چاہیے۔ اگر نماز جمع نہیں کرتے، تو نماز کے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔" ۵
چنانچہ اسی روز سے اس پر عمل شروع ہوا۔[2]

جہاز سیلون سے گزرتا ہوا راس کماری[3] کا چکر کاٹ کر الپی[4] ٹھیرا۔ اس حصے سے بخیریت گزر جانے کی وجہ سے جہاز کے خلاصیوں نے بڑی خوشی منائی اور مسافروں سے پیسے وصول کیے۔

بندرگاہ الپی اور کالی کٹ میں جب جہاز لنکا سے گزر کر الفی (الپی) پہنچا، تو ایک کشتی جہاز ۱۰
کے پاس آئی۔ لوگ آپ کو پوچھتے جہاز پر آئے اور عرض کیا کہ: "آپ کے آدمیوں سے، جو دوسرے جہازوں پر گئے ہیں، آپ کے اوصاف حمیدہ سن کر بڑے اشتیاق سے ہم لوگ حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارا ناخدا، جس کا نام دوسل ہے، آپ سے ملنے کا بہت مشتاق ہے۔ ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ ہم آپ سے تشریف لے چلنے کی درخواست کریں۔" آپ نے فرمایا: "ہم ضرور چلیں گے۔" آپ نے ان کو کھانا کھلا کر رخصت کیا اور ایک رفیق ساتھ کر دیا کہ میٹھے ۱۵
پانی کا ایک پیپہ بھر کر لے آئے۔

دوسرے روز آپ تشریف لے گئے اور ناخدا کے مکان پر دو روز قیام فرمایا۔ ناخدا نے اپنے اہل و عیال اور وہاں کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ بیعت کی۔ اس زمانے میں وہاں

---

(۱) "وقائع احمدی"، روایت سید عبدالرحمٰن صفحہ ۱۰۰۱، ۱۱۰۱ (۲) "وقائع" صفحہ ۱۰۹۸ (۳) راس کماری کو "وقائع" اور "مخزن احمدی" میں بقاف قمری لکھا ہے۔ (۴) الپی جنوبی و مغربی ہندوستان کی مشہور بندرگاہ ہے، جو کوچین کے جنوب میں واقع ہے (سید احمد شہیدؒ)۔ اس کو سید صاحبؒ کے وقائع نگاروں نے الفی کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

عورتوں میں برہنگی بہت تھی۔ واپسی کے وقت آپ نے لوگوں سے کہا کہ: "یہاں عورتیں بے ستر ہیں۔ تم سب ہمارے گرد ہو جاؤ۔" سب لوگ آپ کے گرد ہو گئے۔ آپ وہاں سے روانہ ہوئے لیکن لوگوں نے، مردوں عورتوں نے، آپ کی زیارت کے لیے بہت ہجوم کیا۔ ہر چند لوگ ہٹاتے تھے، مگر وہ کچھ نہیں سنتے تھے۔ آخر آپ وہاں سے دوڑ کر جھولے پر سوار ہو گئے۔

کالی کٹ میں بھی آپ اُترے۔ اس شہر میں ایک پختہ تالاب تھا اور اس کے بیچ میں ایک بڑی مسجد چار درجے کی تھی۔ وہاں آپ ٹھیرے۔ پچیس تیس آدمیوں نے بیعت کی۔[1]
کالی کٹ سے روانہ ہو کر اینی اور عقیدی[2] اور جزیرۂ سقوطرہ کے پاس سے عدن پہنچے۔

عدن — عدن کا پہاڑ دکھائی دیا، تو آپ بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عرب کا ملک دکھایا۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ: "جب ہم جہاز سے اُتریں گے، شکر کا دوگانہ پڑھیں گے۔"[3]

آپ عدن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُترے اور دو رکعت نماز پڑھ کر عدن کو تشریف لے گئے۔ اس وقت گرمی کا یہ عالم تھا کہ دھوپ کی تپش سے زمین پر قدم نہ رکھا جاتا تھا اور دریا کے کنارے سے عدن تک نہ کہیں پانی تھا، نہ سایہ دار درخت۔ دھوپ اور پیاس سے لوگ بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ: "اگر دو تین اونٹ ہوتے، تو اُن پر سوار ہو کر چلتے۔" لوگوں نے عرض کیا کہ: "حضرت، اونٹ یہاں کہاں؟ ہاں، آپ دعا فرمائیں۔" آپ نے فرمایا کہ: "تم سب مل کر سات سات بار اَلْحَمْد پڑھو۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔" لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ساتویں بار تک پہنچے تھے کہ ایک شخص نے کہا کہ: "وہ دیکھو، چار اونٹ دامنِ کوہ میں معلوم ہوتے ہیں۔" دو شتربان ان کو اس طرف لیے آتے تھے۔ تمام لوگ اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ جب نزدیک آئے، لوگوں نے

---

(۱) "وقائع"، صفحہ ۱۱۰۶، ۱۱۰۷۔ (۲) "اینی" کا پورا نام "ایمن دیپ" ہے۔ "دیپ" جزیرے کو کہتے ہیں۔ عقیدی کا انگریزی نام (AGATHE) ہے (سید احمد شہیدؒ)۔ (۳) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۱۱۳

شتربانوں سے کہا کہ اگر اونٹ کرایے پر دو، تو تمھارا احسان ہوگا۔ اُنھوں نے کرایہ لینے کا تو کچھ ذِکر نہ کیا، لوگوں کو سوار کر لیا اور عدن میں جاکر اُتار دیا۔ لوگ کھانے پینے کی تدبیر میں لگے۔ جب کھا پی کر فارغ ہوئے، تب اُن اونٹوں اور اونٹ والوں کو تلاش کیا کہ اُن کو مزدوری دیں۔ ہرچند اُن کو ڈھونڈا، مگر نہ پایا۔ وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ: "اِس ہیئت اور لباس کے چار اونٹ ہیں اور اس صورت اور پوشاک کے ساربان۔ اگر تم جانتے ہو، تو بتادو۔" اُنھوں نے کہا کہ: "یہاں ۵ نہ اس طرح کے اونٹ ہیں، نہ اونٹ والے، یہاں تو بار برداری کے اونٹ ہیں۔" لوگوں نے آپ سے یہ حال بیان کیا۔ آپ خاموش ہو رہے۔[1]

عدن کے قریب بہت لوگ آپ کے استقبال کو آئے۔ آپ شہر میں ایک مسجد میں، جو کسی سوداگر نے بنوائی تھی، اُترے۔ آپ نے وہاں کے دُنبے منگوائے، ذبح کر کے پکوائے اور روٹیاں بھی پکیں۔ رات کو اسی مسجد میں رہے۔ دوسرے روز جہاز کا لنگر اُٹھا اور ۱۰ روانہ ہوگئے۔[2] عدن سے روانہ ہونے کے چھ سات روز بعد مُعلّم نے کہا کہ آج چھوٹے باب سکندر[3] میں پہنچیں گے۔ تھوڑی رات باقی ہوگی کہ ناخدا نے سید صاحبؒ کو جگایا اور عرض کی کہ: "یہ وقت دُعا کا ہے۔ آپ دُعا کیجیے۔" پھر سب لوگوں کو جگایا اور تمام لوگ دُعا میں مشغول ہوئے۔ خدا کے فضل و کرم سے جہاز بخیریت گزر گیا۔[4]

جہاز میں کیفِ وذوق

۱۵ سید زین العابدین، جو آپ کے رفیقِ سفر تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک روز سید صاحبؒ جہاز کے اگلے مکان کی چھت پر مستول کا رسا پکڑے ہوئے کھڑے تھے اور دریا کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں اس وقت آپ کے پیچھے کھڑا تھا اور دو تین شخص میرے سوا اور بھی تھے۔ اس وقت آپ سمندر کو دیکھ کر بار بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم

---

(۱) "وقائعِ احمدی" صفحہ ۱۱۴، روایتِ سید عبدالرحمٰن "مخزنِ احمدی" (۲) "وقائع" صفحہ ۱۱۶

(۳) یہ باب المندب ہے، جو جہازوں کے لیے خطرناک جگہ سمجھی جاتی تھی۔ تنگ سمندر کے عین بیچ میں ایک پہاڑی ہے جس سے جہاز کے ٹکرا جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ رہا کرتا تھا۔ (۴) "وقائع" صفحہ ۱۱۶ تا ۱۱۷

پڑھتے تھے اور دیوانِ حافظ کے کچھ اشعار بھی پڑھتے تھے، جو مجھے یاد نہیں۔ آنکھوں سے آپ کے چہرے پر آنسو جاری تھے اور آواز میں بھی فرق ہو گیا تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی بیان فرماتے جاتے تھے۔ اس میں کئی گھڑی کا عرصہ ہو گیا۔ پھر وہاں سے آپ نیچے تشریف لائے، مگر زبانِ مبارک سے کچھ نہیں فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ظہر کا وقت ہوا۔ اذان ہوئی۔ آپ نماز کو تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔ اس نماز میں ایسی برکت اور تاثیر تھی کہ ہر ایک کے اوپر ایک حال سا واقع تھا کہ اس کی لذّت زبان سے بیان نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کی طبیعت متوجہ الی اللہ تھی۔[1]

مخہ مخہ میں ناخدا نے ایک مہینے کے لیے اپنے مکان پر قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ضروری سامان اُتار کر ایک مکان کرایے پر لیا اور جامع مسجد کے قریب قیام فرمایا۔[2]

برہنہ غسل کی روک تھام مخہ میں رواج تھا کہ لوگ بے تکلّف حوض، تالاب وغیرہ میں برہنہ غسل کرتے تھے۔ آپ کو یہ بات بہت ناپسند آئی۔ بنگالے کے مولوی امام الدین نے ایک دن حوض میں تہہ بند باندھ کر غسل کیا۔ دو آدمیوں نے اُن کو پکڑ لیا اور قاضی کے پاس لے گئے اور کہا: "یہ شخص تہہ بند باندھ کر نہاتا ہے۔ اس نے ہمارے حوض کو نجس کر دیا" اور خواہش کی کہ اُن کو سزا دی جائے۔ قاضی صاحب نے پورا واقعہ سُنا۔ ان دونوں شخصوں سے بہت ناراض ہوئے اور مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ اُنھوں نے آکر حضرت کو سارا ماجرا سُنایا۔[3]

ایک دن مولوی عبدالحیّ صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ قاضی محمد بن علی شوکانی محدّثِ یمن نے ایک رسالہ موضوعاتِ حدیث میں تصنیف کیا ہے۔ اگر وہ رسالہ ہاتھ آجائے، تو بڑا فائدہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مولانا عبدالحیّ صاحب سے کہیے کہ وہ اس کا کچھ انتظام کریں۔ مولانا ممدوح مخہ کے قاضی صاحب کے پاس گئے اور یہ خواہش ظاہر کی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ: "آپ ایک خط لکھ کر مجھے دے دیجیے۔ میں وہ خط صنعا بھیج کر رسالہ منگوا کر اپنے پاس رکھوں گا اور واپسی میں آپ کو دے دوں گا۔" مولانا عبدالحیّ صاحب نے علامہ شوکانی کے نام عربی میں ایک مفصّل

(۱) "وقائع" صفحہ ۱۱۱۹ (۲) "وقائع" صفحہ ۱۱۱۷ (۳) "وقائع" بروایاتِ مختلفہ، صفحہ ۱۱۱۸

اور پُر زور خط لکھا، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ، رحمۃ اللہ علیہ، کے فضل و کمال اور اُن کے خاندان کی علمی خصوصیات اور دینی خدمات کا تعارُف کرایا اور حضرت شاہ عبدالعزیز، رحمۃ اللہ علیہ، سے اپنے تلمّذ کا تعلق اور سید صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا تذکرہ کیا اور جب یہ خط لکھ کر قاضی صاحب کے پاس لے جانے لگے، تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ: "مولانا، آپ قاضی صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ ذرا برہنہ غسل کی روک تھام کا بھی انتظام کرتے آیئے گا۔" مولانا نے قاضی صاحب کو خط پڑھ کر سُنایا۔ قاضی صاحب بہت خُوش ہُوئے اور آپ کے عِلم اور تبحُّر کی تعریف کی اور خط لے کر صنعا روانہ کر دیا۔[1]　　۵

اس سے فُرصت پا کر مولانا نے قاضی صاحب سے فرمایا کہ: "ہم نے اس شہر میں ایک عجیب رسم دیکھی کہ مسلمان اہلِ علم و فضل غُسل کرتے وقت برہنہ ہو جاتے ہیں۔ چُونکہ دین کی ابتدا عرب سے ہے اور متقدّمین اور سلف کے رسُوم ہمارے لیے سند کا حکم رکھتے ہیں، یہ خلافِ شرع و حیا عمل، جس پر وعید وارد ہے، ایسی جگہ کیسے ہو سکتی ہے؟" قاضی صاحب نے فرمایا کہ: "لوگ بے غیرت ہیں۔ جرمانے اور سزا کے باوجُود اس سے باز نہیں آتے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ حاکمِ شہر کے پاس چلیے۔" مولانا قاضی صاحب کے ہمراہ حاکم کے پاس گئے۔ حاکم نے قاضی صاحب کی درخواست پر چند سپاہی مقرّر کر دیے کہ جب تک سید صاحبؒ کے قافلے کا قیام رہے، کوئی برہنہ غسل نہ کرنے پائے۔[2]　　۱۰　　۱۵

وحدتِ وُجُود پر گفتگو کرنے کی ممانعت　مولوی عبدالرحمٰن صاحب صُوفی کے مُرید مولوی محمد یوسف لکھنوی بھی مخہ میں اُترے ہُوئے تھے۔ وہ اکثر جہاں کہیں بیٹھتے، لوگوں کو وحدتِ وُجُود کے مسائل کی تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ ایک روز مولوی یُوسف اور قافلے کے لوگوں سے وحدتِ وُجُود پر مباحثہ ہو رہا تھا۔ آپ تشریف لے آئے۔ مولانا عبدالحی صاحب بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اُن کی تقریر سُن کر مولانا نے ہر چند علمی تقریر سے اُن کو سمجھایا، مگر وہ کُچھ نہ سمجھے۔ اسی طرح　　۲۰

(۱) "وقائع"، صفحہ ۱۲۱۱　　(۲) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۸۹

سید صاحبؒ نے بھی اُن کو خُوب معقول کیا، مگر وہ اپنے ہی اصرار پر رہے۔ آپ کو بہت غُصّہ آیا۔ چہرۂ مُبارک غُصّے سے سُرخ ہو گیا اور آپ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور اُن کی طرف طمانچہ اُٹھایا، مگر یاد نہیں، مارا یا نہیں۔ لوگوں نے جلدی سے مولوی یُوسف کو وہاں سے اُٹھا کر حویلی کے باہر نکال دیا۔ آپ نے سب ہمراہیوں سے فرمایا کہ کوئی اِس شخص سے مُلاقات نہ کرے اور ان کی بات نہ سُنے۔[1]

حُدَیبِدہ ایک مہینے کے بعد جہاز نے لنگر اُٹھایا اور مخہ سے روانہ ہو کر بندرگاہ حُدَیبِدہ پہنچا۔ آپ کے معتقدین میں سے ایک ہندی سید وہاں مُقیم اور آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر آئے۔ آپ نے اُن کے حال پر بڑی عنایت فرمائی اور ایک لائق تلوار اور ایک دونالی بندوق اور سپر عنایت کی۔ سیدِ مَوصُوف نے کھانے کی دعوت کی۔ دُوسرے روز آپ اُن کے مکان پر تشریف لے گئے اور دو وقت کھانا تناول فرما کر واپس تشریف لائے اور جہاز نے لنگر اُٹھایا۔[2]

اِحرام چوتھے روز فجر کے وقت مُعلّم نے اِطلاع دی کہ آج عصر کی نماز یلملم کے مقابل پہنچ کر ہوگی۔ جب میقات آیا، تو آپ نے غُسلِ مسنُون فرمایا۔ رُفقا نے آپ کو غُسل دیا اور بشارتوں سے ممتاز ہوئے۔

غُسل کر کے آپ نے اِحرام باندھا اور دو رکعتیں پڑھ کر تلبیہ[3] کہا اور بڑی گریہ وزاری کے ساتھ دُعا کی۔[4]

جدّہ ۲۳ شعبان چہار شنبہ کے روز آپ جدّے[5] پہنچے۔ کچھ ہمراہی جدّے میں آپ کے

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۱۲۴ (۲) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۱۲۴ (۳) لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ، لَبَّیْکَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ۔ (حاضر ہوں، اے اللہ، حاضر ہوں۔ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں۔ سب تعریف سارا احسان تیرا ہی ہے اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔)

(۴) "وقائع"، صفحہ ۱۱۲۵ (۵) یادداشتِ قلمی۔

منتظر تھے اور بعض مکۂ معظمہ روانہ ہو چکے تھے۔ نواب محمود نواز خاں اور سلطان حسین خاں دونوں بھائی، جو امراے حیدرآباد میں سے تھے اور ایک سال پہلے سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے، آپ کی تشریف آوری کے مشتاق تھے۔ وہ اور مُطَوِّف محمد رئیس آپ کی تشریف آوری کو سن کر مکۂ معظمہ سے جدّے آئے۔ معلّم صاحب نے آپ کے ماموں حضرت شاہ ابواللّیث ابن حضرت شاہ ابوسعید کی سند پیش کی اور عرض کیا کہ: "میں آپ کے خاندان کا مُطَوِّف ہوں۔ آپ کا تمام ۵ قافلہ مجھ ہی سے تعلق رکھتا ہے۔" آپ نے منظور فرمایا۔[1]

جدّے میں اتر کر آپ نے دوسرے جہازوں کے مسافروں کا حال احوال دریافت کیا اور مصارف کو پوچھا۔ سب نے عرض کی کہ: "جو کچھ روپیہ آپ نے عنایت فرمایا تھا، وہ صرف میں آگیا اور اس کے علاوہ اکیس سو روپے اور خرچ ہوئے" اور اس کی فرد دکھائی۔ آپ نے دیکھ کر مولوی یوسف صاحب سے فرمایا کہ: "یہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ الحمد للہ کہ اس کے بندوں کے ۱۰ صرف میں آیا۔ آپ اکیس سو روپے اُن کو دے دیں۔"[2]

پانچ روز جدّے میں قیام فرمایا۔[3] ۲۷ شعبان یک شنبہ کو جدّے سے مکۂ معظمہ روانہ ہوئے۔[4] مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو محصول کا تصفیہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔[5]

حُدَیبیہ میں راستے میں کچھ دیر کے لیے آپ حدیبیہ میں ٹھیرے اور وہاں تمام رُفقا کے ساتھ بہت تضرّع وزاری سے دعا فرمائی اور ساتھیوں سے بیعتِ جہاد لی۔[6]

---

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۲۷۔ (۲) "وقائع"، صفحہ ۱۱۲۷۔ (۳) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۹۰۔ (۴) یادداشتِ قلمی

(۵) "وقائع"، صفحہ ۱۱۳۰۔ (۶) "مخزن احمدی"، صفحہ ۱۱۷۔

چودھواں باب

سرزمینِ حجاز میں

داخلہ ۲۹ شعبان ۱۲۳۷ھ کو آپ کچھ دن چڑھے مکّۂ معظّمہ کے قریب پہنچے[1]۔ رفقا، جو پہلے سے مکّۂ معظّمہ پہنچ چکے تھے، آبِ زمزم سے بھرے ہوئے لوٹے اور صُراحیاں لیے استقبال کو موجود تھے۔ تمام قافلہ زمزم سے سیراب ہُوا۔ اس کے بعد مقامِ ذی طُویٰ میں، جو مکّۂ معظّمہ کی آبادی سے متصل ہے، پہنچ کر غسل کیا۔ سیّد زین العابدین وغیرہ کو زنانی سواری کے ساتھ روانہ کر دیا اور مولانا عبدالحی صاحب سے پُوچھ کر مکّۂ معظّمہ کی بالائی جانب سے، جو جنّت المعلّٰی کے شمالی سمت ہے، مکّۂ معظّمہ میں داخل ہُوئے۔

مکّۂ معظّمہ میں داخل ہوتے وقت ہر شخص پر گریہ طاری تھا۔ باب السّلام سے داخل ہُوئے طواف کے بعد مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی اور بڑے تضرّع کے ساتھ دُعا کر کے چاہِ زمزم پر جا کر زمزم پیا اور غسل کیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ باب الصفا سے سعی کے لیے تشریف لے گئے۔ سعی کے بعد سر کے بال مُنڈائے اور احرام سے باہر ہو گئے۔

بابِ عُمرہ کے قریب میاں زین العابدین نے حویلی کرایے پر لی تھی۔ اس میں آپ کا قیام تھا۔ دُوسرے روز رمضان المبارک کا چاند دیکھا گیا[2]۔

دن رات کے معمولات روزانہ دن کو مکّے کے علما و فضلا و مشائخ کی آپ کے پاس عصر تک نشست

(۱) یادداشتِ قلمی۔ "مخزنِ احمدی" میں مکّۂ معظّمہ کے داخلے کی تاریخ ۲۸ شعبان ہے۔
(۲) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۳۷۱۔ قلمی یادداشت میں تصریح ہے کہ چاند تیس کا تھا۔

رہتی۔ عصر کی اذان کے بعد آپ نماز پڑھنے کو حرم شریف جاتے۔ عصر سے مغرب تک آپ حرم میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں آپ کے پاس لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔ افطار کے بعد طواف کر کے قیام گاہ پر واپس تشریف لاتے۔ حرم میں چونکہ تراویح کی نماز میں بڑا ہجوم ہوتا تھا اور بڑا شور و شغب ہوتا تھا، آپ نے مولانا عبدالحی صاحب سے فرمایا کہ اس شور و شغب میں اطمینانِ قلب اور نماز کا لطف نہیں آتا۔ مشورے سے یہ طے پایا کہ جب تک حرم میں لوگ تراویح پڑھیں، تب تک آپ یہاں کے لوگوں کا قرآن سنیں۔[1] شور بند ہو جانے کے بعد مطاف میں اپنی جماعت کی جائے۔ چنانچہ سکون ہونے کے بعد آپ کے ماموں زاد بھائی حافظ سید محمد بن شاہ سید ابواللیث بن حضرت سید شاہ ابوسعید روز دو پارے تراویح میں سناتے تھے۔[2]

تراویح کے بعد آپ کرایے کا جانور لے کر سوار ہو کر تنعیم تک جاتے اور عمرے کا احرام باندھ کر واپس آ کر طواف و سعی و حلق سے فراغت کرتے۔ اگر رات زیادہ ہوتی، تو طواف و سعی کر کے سحر کا کھانا کھاتے، اگر کم ہوتی، تو طواف کر کے کھانا کھا لیتے، پھر سعی کرتے۔

نمازِ فجر کے بعد بھی طواف کر کے اشراق پڑھ کر قیام گاہ پر تشریف لاتے۔

آپ کی قیام گاہ کے قریب ایک مینار تھا۔ جب زوال کے وقت مذکّر تذکیر کرتا، آپ قیلولے سے بیدار ہوتے، ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور حرم آ جاتے۔[3]

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تشریف آوری ایک ہفتے کے بعد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب محصول وغیرہ کے معاملات سے فرصت کر کے جدے سے مکۂ معظمہ آ گئے اور اپنے ساتھ کچھ غلّہ بھی لائے۔[4] ۲۰ رمضان المبارک اور اکیسویں شب سے آپ نے اعتکاف فرمایا۔ شوال کا چاند دیکھ کر نمازِ مغرب پڑھ کر آپ قیام گاہ پر تشریف لائے۔[5]

عید اور عمائدِ مکہ کی ملاقات عید کے روز مکۂ معظمہ کے علما اور صلحا سید صاحبؒ کی ملاقات کے

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱ (۲) "وقائع"، صفحہ ۱۴۱ (۳) "وقائع"، صفحہ ۱۴۲
(۴) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۹۲ (۵) "وقائع"

لیے تشریف لائے۔ محدث شیخ عمر بن عبدالرسول حنفی، جو ایک مشہور عالم اور باخدا بزرگ تھے اور عرب میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، آپ کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ سید صاحبؒ نے پانچ ریال ہدیۂ خدمت کیے۔ آپ نے کچھ معذرت کی۔ اس کے بعد قبول کر لیا۔ شیخ عمر نے اس سے پہلے سلطانِ ترکی کا ہدیہ قبول نہیں کیا تھا اور اشرفیوں سے لدا ہوا اونٹ واپس کر دیا تھا اور کہا تھا کہ "اس کی ضرورت نہیں، ہم نے سلطان کی طرف سے حج کر لیا ہے"۔ سید صاحبؒ کا ہدیہ قبول کر لینے پر رؤسائے مکہ کو بڑا تعجب ہوا۔(۱)

عید کے دن بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں میں حنفی مصلے کے امام شیخ مصطفیٰ، خواجہ آغا الماس ہندی اور بعض دوسرے خواجہ سرا، شیخ شمس الدین شطا، احمد پاشا سلطانِ مصر کے نائب شیخ حسن آفندی جیسے فضلا اور عمائد تھے۔ بلغار کے ایک بزرگ، جن کے پاس بلغار کے مطبع کا چھپا ہوا ایک قرآنِ مجید بھی تھا اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، بیعت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ علمائے مکہ میں سے شیخ عبداللہ سراج اور دوسرے علما بھی حاضرِ خدمت ہوا کرتے تھے۔ مغربی قافلے کے ایک بزرگ، جو سلطانِ مغرب کے وزرا میں سے تھے، نام غالباً سید محمد تھا اور صحیح بخاری مع قسطلانی اُن کو حفظ تھی، نیز شیخ حمزہ محدث، شیخ احمد بن ادریس، محمد علی ہندی، ملا بخاری، شافعی مصلے کے امام شیخ صالح شافعی، حنفی مفتی و واعظ شیخ علی سے برابر ملاقات ہوتی رہتی۔ لوگ کہتے تھے کہ مکہ مرجعِ عالم ہے۔ یہاں ہر صفت اور ہر کمال کے لوگ آتے ہیں، لیکن جو رجوعِ عام اور انجذاب و کشش سید صاحب کی طرف ہے، وہ کسی کی طرف دیکھی نہیں گئی۔(۲)

"صراطِ مستقیم" کا عربی ترجمہ شیخ حسن آفندی کی خاطر مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسمٰعیل نے "صراطِ مستقیم" کا عربی میں ترجمہ کیا، جس کی نقلیں ان علمائے بھی لیں، جو داخلِ بیعت

(۱) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۱۱۴۷، ۱۱۴۸ (۲) "منظورہ"

ہُوئے تھے۔[۱]

جاوی حجاج کی بیعت　جاوا کے تین شخصوں نے عرض کیا کہ: "ہم آپ کے خُلفا کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے ہیں۔ اب بلا واسطہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔" اُنھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے اُن کا کھانا اپنے ساتھ "مقرّر" کر دیا، اُن کے لیے دُعائے خیر فرمائی اور اپنے بدن کے کپڑے اُن کو عنایت فرما کر رُخصت کیا۔ کسی کو کرتا عطا فرمایا، کسی کو ٹوپی، کسی کو عمامہ اور کسی کو دونوں عطا ہُوئے۔ خلافت نامہ دے کر اُن کو رُخصت کیا اور اُن کے واسطے دُعا کی اور فرمایا کہ: "جہاں کہیں تم کو مُسلمان بھائی ملیں، اُن کو خُوب تعلیم و تلقین کرنا۔" وہ کہنے لگے کہ: "جس طرح حضرت نے ہمارے واسطے دُعا کی ہے، ہم نے اس طرح دُعا کرتے ہُوئے نہ کسی کو دیکھا، نہ سُنا اور نہ ایسے الفاظ ہم نے کبھی پڑھے۔ حضرت نے ہمارے واسطے اور مخلوق کے واسطے کیا اچھی دُعا کی۔" پھر وہ مصافحہ کر کے رُخصت ہُوئے۔[۲]

مناسکِ حج　یَوْمُ التَّرْوِیَہ ۸ ذی الحجہ ۱۲۳۷ھ کو آپ نے اپنے رفقا کے ساتھ حطیم میں بڑے تضرّع و الحاح و زاری کے ساتھ طویل دُعا فرمائی تمام حاضرین پر عجیب کیفیت و رِقّت طاری ہُوئی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مکّۂ معظّمہ سے روانہ ہو کر منیٰ میں مسجدِ خَیف کی مشرقی جانب چھوٹی مسجد کے متّصل آپ کا خیمہ استادہ تھا۔ اس رات کو آپ نے بعض دُوسرے علما اور رُؤسائے مکّہ کے ساتھ وہیں رات گزاری۔ صبح عرفات روانہ ہُوئے۔ عرفات میں زوال کے وقت امام کے پیچھے ظُہر و عصر کی نماز پڑھ کر اپنے خیمے میں آ کر دُعا و زاری میں مشغول ہو گئے۔

اسی اثنا میں پھلت کے بعض شُرفا اور دُوسرے رُفقا نے از سرِ نو طریقۂ محمّدیہ میں بیعت کی۔[۳] عرفات کی دعاؤں میں آپ کی ایک دعا یہ بھی تھی کہ: "الٰہی، اس قافلے میں

(۱) اس ترجمے کا مکّی نسخہ صاحبزادہ عبد الرحیم خاں مرحوم کے کتب خانۂ ٹونک میں موجود تھا۔ راقم السطور کی نظر سے گزرا ہے۔　(۲) "وقائع"، صفحہ ۱۱۶۰ - ۱۱۶۲　(۳) "منظورہ"

سے جس کو تُو نے محض اپنے فضل سے حج کی دولت نصیب فرمائی ہے، کوئی حاجی کے لقب سے مشہور نہ ہو۔"(۱)

غروبِ آفتاب کے بعد مزدلفہ کی طرف کوچ ہُوا۔ رات مزدلفے میں گزری۔ نمازِ فجر کے بعد مِنٰی کو روانگی ہوئی۔ مِنٰی میں داخل ہو کر جمرۂ عقبہ سے فراغت کے بعد بڑی دیر تک بڑے الحاح و زاری کے ساتھ دعا کی اور قربانی کرنے کے بعد سر کے بال منڈائے۔ آپ نے قربانی کے لیے سو بکریوں سے زیادہ خریدی تھیں۔ لوگوں نے آ کر ادائے حج کی مبارکباد پیش کی اور آپ نے قبولیتِ حج کی دعا دی۔ عصر کی نماز کے بعد رُفقا کی ایک جماعت کے ساتھ طوافِ زیارت کے لیے مکۂ معظمہ روانہ ہوئے۔ نہر پر پہنچ کر غسل فرمایا۔ احرام اُتارا اور دوسرا جوڑا زیبِ تن کیا۔ طواف، سعیِ صفا و مروہ اور طواف کی دو رکعتیں پڑھ کر مِنٰی واپس تشریف لائے۔(۲)

عقبہ میں بیعتِ جہاد

مِنٰی میں عقبہ(۳) میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی۔ یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کے بعد تین روز مِنٰی میں قیام فرمایا اور ہر روز مکۂ معظمہ میں قربانی کی۔ ۱۳ ذی الحجہ کو رمیِ جمار کے بعد دعائیں کر کے اور نمازِ عصر پڑھ کر مکۂ معظمہ روانہ ہوئے۔

غرۂ محرم سے آپ نے محمد سعید عرب کی حویلی حجاز کے معمول کے مطابق ایک سال کے لیے کرایے پر لے لی اور وہاں قیام فرمایا۔(۴)

رمضانِ مبارک سے ۵ صفر تک پانچ مہینے آپ نے مکۂ معظمہ میں قیام فرمایا۔

سفرِ مدینہ

جب مدینۂ منورہ کے سفر کا قصد ہُوا تو آپ نے قافلے میں سے کمزور اور معذور اشخاص

---

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۹۷۔ مولوی سید محمد علی صاحب "مخزن" لکھتے ہیں کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ آج بیس سال سے کچھ اوپر سال ہو چکے ہیں، ابھی تک اس قافلے کا کوئی فرد حاجی کے لقب سے مشہور نہیں ہُوا۔ غالباً سید صاحبؒ نے اہتمام کے ساتھ یہ دعا اس لیے فرمائی کہ حج ایک رکنِ دین اور فریضہ ہے۔ جس طرح نماز پڑھنے والا "نمازی" اور زکوٰۃ دینے والا "زکوٰتی" اور روزہ دار "صائم" یا "روزے دار" کے لقب سے مشہور نہیں ہوتا، اسی طرح حج کا فریضہ ادا کرنے والا "حاجی" کے لقب سے مشہور کیوں ہو؟

(۲) "منظورہ"

(۳) عقبہ وہ مقام ہے، جہاں سنہ ۱۱ نبوی میں چھ یا آٹھ انصاریوں نے اسلام قبول کیا، جن کی وجہ سے اسلام مدینے میں گھر گھر پہنچا۔ دوسرے سال مدینے کے بارہ اشخاص نے اسی مقام پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور اگلے سال بہتّر اشخاص نے آ کر بیعت کی۔ یہ دونوں بیعتیں بیعتِ عقبۂ اُولیٰ و عقبۂ ثانیہ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۴) "منظورہ"

کو مولانا محمد اسمٰعیلؒ کے سپرد کیا۔ ان معذورین میں حافظ معین الدین پھلتی، جو بیمار تھے، مولوی وحید الدین، اُن کے صاحبزادے میاں سعد الدین، مولوی امام الدین بنگالی اور میاں دین محمد وغیرہ تھے۔[1]

آپ نے سفر کے لیے محمد رئیس معلّم اور شیخ الجمالین کے ذریعے پچاس پچاس اونٹ اور مولوی سید محمد علی کی روایت کے مطابق احمد پاشا حاکمِ مکّہ کے ذریعے ۱۲۰ اونٹ کرایے پر لیے۔ پچھتر اونٹ سلطان حسین خاں اور محمود نواز خاں حیدر آبادی نے کرایہ کیے۔ چند اونٹ پانی لے جانے کے لیے متعین کیے۔[2]

اہلِ حرم کا احترام

آپ نے معلّم، حمّالوں اور دوسرے آدمیوں سے فرمایا کہ: "ہتھیار لے چلنے چاہییں یا یہاں چھوڑ دینے چاہییں؟" اکثر آدمیوں نے عرض کیا کہ: "ہتھیار لے چلنا ہی قرینِ مصلحت ہے، اس لیے کہ آپ کے قافلے کی دُور دُور تک شہرت ہو چکی ہے اور اس کی دولتمندی اور خوشحالی کا سب کو علم ہے۔ اگر قزاقوں کو اس کا بھی علم ہو گیا کہ قافلہ نہتا ہے، تو وہ خواہ مخواہ دست اندازی کریں گے، لیکن اگر ان کو یہ معلوم ہوا کہ قافلہ مسلّح جاتا ہے، تو اُن کو اہلِ قافلہ کی شجاعت اور دلیری کا علم ہے، وہ مقابلے کا حوصلہ نہ کر سکیں گے۔"

آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "ہم اتنا طُول طویل سفر طے کر کے زیارتِ حرمین کے لیے اس متبرّک مقام پر پہنچے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں کے خاص و عام شہری و بدوی سب واجب التعظیم ہیں۔ ہمارے لیے اُن سے مقابلہ کرنا ہرگز روا نہیں۔"

یہ کہہ کر آپ نے چاقو بھی کمر سے کھول کر زمین پر ڈال دیا اور فرمایا کہ: "مسلمانوں کے خیال سے ہم نے یہ چاقو بھی رکھ دیا ہے۔ اگر کوئی ہم پر حملہ آور ہوگا، تو ہم سارا سامان اُس کے سامنے ڈال دیں گے۔ اللہ دینے والا ہے۔ وہ ہم کو پھر عطا کرے گا۔"

یہ سُن کر تمام اہلِ قافلہ نے اپنے ہتھیار نکال کر مکان کے حجرے میں مقفل کر دیے اور

---

(۱) قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کی مدینۂ طیبہ سے مراجعت کے بعد مولانا اسمٰعیل صاحب مدینۂ طیبہ روانہ ہوئے۔ یادداشت میں اُن کی روانگیِ مدینہ کی تاریخ ۱۶ جمادی الاولیٰ چہار شنبہ درج ہے (۲) "منظورۃ السعدا"

اسی طرح خالی ہاتھ مدینۂ منوّرہ چل کھڑے ہُوئے (۱)۔

دوشنبہ ۵ صفر کو مکۂ معظمہ سے روانہ ہُوئے (۲)۔ میدانِ طُویٰ میں آپ نے قیام فرمایا۔ وہاں سے عصر کے وقت کُوچ کرکے وادیِ فاطمہ اور وہاں سے خلیص پر قیام فرمایا اور نمازِ جمعہ ادا فرمائی (۳)۔

۵ **چھیڑ چھاڑ** رابغ میں شُتربانوں نے سہارنپور کے لوگوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور اُن کو مار پیٹ کی۔ کسی نے سیّد صاحبؒ سے جاکر عرض کیا کہ بدّوؤں نے مولوی وحید الدین سہارنپوری پر تلوار سے حملہ کیا۔ آپ نے امام خاں خیرآبادی اور محسن خاں بریلوی کو اشارہ فرمایا کہ تحقیق کریں۔ پیچھے سے آپ نے امام خاں کے بھائی ابراہیم خاں کو بھیجا۔ سیّد عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھے بھی حکم ہُوا کہ خبر لاؤ۔ میرے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ مَیں دَوڑتا ہُوا پہنچا۔ ایک پتّھر میرے ہاتھ پر اتنے ۱۰ زور سے پڑا کہ مَیں نے چھڑی دُوسرے ہاتھ میں لے لی۔ دُوسرا پتّھر دُوسرے ہاتھ میں ایسا لگا کہ چھڑی ہاتھ سے گر گئی اور مَیں نے زمین سے اُٹھالی۔ یہ دیکھ کر میرے بڑے بھائی سیّد احمد علی دَوڑے آئے۔ ایک پتّھر اُن کے بھی لگا۔ شیخ الطاف دَوڑے۔ اُنھوں نے بھی سر پر پتّھر کا زخم کھایا۔ قافلے کے اکثر لوگ زخمی ہُوئے۔ خود سیّد صاحبؒ کے سینے پر بھی ایک دو پتّھر لگے۔ آپ نے بلند آواز کے ساتھ اپنے قافلے کو بدّوؤں کو مارنے سے روکا۔ اس وجہ سے اکثر اہلِ قافلہ مجروح ہُوئے ۱۵ اور کسی بدّو کو ذرا بھی چوٹ نہ آئی۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ قافلے کے اکثر لوگ زخمی ہوگئے، تو اُنھوں نے کھجُور کی ٹہنیاں لے کر حملہ کیا۔ بدّوؤں کو سخت چوٹیں آئیں اور وہ پسپا ہوکر پہاڑ پر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان سب نے بندوق کے فتیلے روشن کیے اور کمر میں جنبیاں باندھ کر جنگ کے لیے آمادہ ہُوئے۔ سیّد صاحبؒ نے "حزبُ البحر" پڑھ کر دُعا فرمائی اور آدھے قافلے نے کُوچ کیا۔ اُس وقت ایک دُوسرا ۲۰ شیخ الجمّالین اپنے ماتحتوں کے ساتھ مسلح ہوکر سیّد صاحبؒ کے قافلے کو اپنے پیچھے لے کر

(۱) "منظورہ" (۲) یادداشتِ سفرِ حج قلمی (۳) "منظورہ"

سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر اور خود اپنے آدھے گروہ کو قافلے کی حمایت پر آمادہ پاکر عورتوں اور بچّوں نے شور و غوغا بلند کیا اور اپنی بختی کو بھول گئے۔ شیخ الجمّالین نے کہا کہ: "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے سب ہتھیار مکۂ معظمہ میں چھوڑ دیے اور زیارت کے لیے یوں ہی خالی ہاتھ مکّے سے چل کھڑے ہوئے۔ اگر ان کے پاس ہتھیار ہوتے، تو تم کو اشاروں میں عدم کا راستہ دکھلاتے۔ یہ لوگ چونکہ محض راہِ خدا میں نکلے ہیں، میں اس ۵
الٰہی گروہ کا للّٰہ فی اللّٰہ مددگار رہوں"۔ دوسرے شیخ الجمّالین نے، جو مخالف تھا، یہ دیکھ کر اپنے حمایتیوں کو اینٹ پتھر پھینکنے سے منع کر دیا۔ ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے اونٹ لے کر اپنے گھر کا راستہ لیں اور ساتھ چھوڑ دیں، مگر ایک دوسرے کے سمجھانے سے یہ طے ہوا کہ دونوں فریقوں کے زخمی سوار ہو جائیں اور وادیِ صفرا میں پہنچ کر، جہاں رئیس الجمّالین رہتا ہے، اس کے سامنے اس قضیے کا فیصلہ ہو۔ وادیِ صفرا میں پہنچ کر رئیس الجمّالین کو سب واقعہ سنایا گیا۔ رئیس الجمّالین بڑے ۱۰
اشتیاق کے ساتھ ایک جماعت لے کر سیّد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، شتربانوں کی شرارت کا حال سن کر ان کو ملامت کی اور برطرف کیا اور دوسرے شتربانوں کو ان کے اونٹوں کے ساتھ قافلے کی خدمت کے لیے متعیّن کیا۔ ان شتربانوں میں سے ہر ایک خدمتگزار، فرماں بردار، نیک سیرت اور نرم خو تھا۔ اہلِ قافلہ کی ایک آواز پر یہ لوگ دوڑتے تھے اور کسی خدمت سے عذر نہ تھا۔ بقیہ سفر بڑی راحت و آرام اور محبّت و ہمدردی کے ساتھ طے ہوا۔ جب ان جمّالوں کی رخصت کا وقت آیا، تو ہر ایک ۱۵
کو دوسرے کی جدائی کا رنج تھا۔[1]

وادیِ صفرا سے روانہ ہو کر وادیِ خَیف میں مقام ہوا۔ وہاں سے چل کر راستے میں ایک جگہ سیّد صاحبؒ اٹھ کر بیٹھ گئے اور رہراہیوں کو آواز دی۔ آپ نے فرمایا کہ: "قافلہ ٹھہر جائے۔ یہ زمین برکت و رحمت کی جگہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی تک عرب کی سرزمین میں ایسی جگہ نہیں دیکھی گئی"۔ آپ نے وہاں دعا اور التجا کی اور بدّوؤں سے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتنا سنا ہے کہ یہاں ۲۰

(۱) "منظورہ"

بہت شہدا دفن ہیں۔(۱)

بدوؤں کی دوبارہ شرارت راستے میں کچھ دن چڑھے قافلے میں کسی نے آواز دی کہ عظیم خاں اور چند آدمی کنوئیں پر برتن لے کر گئے تھے۔ قزاقوں نے اُن سے زبردستی لے لیے۔ آپ نے جمالوں کو حکم دیا۔ وہ اُن سے برتن واپس لے آئے۔ صرف ایک برتن واپس نہ ملا۔ عصر کے وقت اطلاع ملی کہ سنہر اُونٹوں پر دو دو آدمی فتیلے جلائے ہُوئے حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ اس سے قافلے میں بڑی تشویش پیدا ہُوئی۔ اس طرف کے جمّال اپنے ہتھیار لے کر جست لگاتے گلنے تحقیق کے لیے چلے۔ آپ بھی سواری سے اُتر آئے اور اہلِ قافلہ کو بھی اُتر جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ "سب بھائی اپنے ہاتھ میں پتھر لے کر اپنے سامان کے گرد کھڑے ہو جائیں اور چار جماعتیں ہو کر اُونٹوں کے آگے پیچھے، دائیں بائیں رہیں اور پتّھر اپنے سامنے رکھ کر مقابلہ کریں اور اللہ تعالٰی سے عجز و زاری کے ساتھ نصرت کی دُعا کریں۔" رئیس الجمّالین بندوقیں اور جنبیاں لے کر مُقابل ہُوا۔ بدّو پہلی بار پسپا ہُوئے۔ اتنی دیر میں قافلے کی عورتوں نے نماز سے فرصت کر لی۔ اس کے بعد مردوں نے نماز پڑھی۔ جب قزاقوں کے قافلے سے رئیس الجمّالین کا آمنا سامنا ہُوا، تو ایک نے دُوسرے کو پہچانا، ایک دُوسرے سے ملے اور خیر و عافیت دریافت کی۔ جمالوں نے سردار سے کہا کہ "ہمارے قافلے میں بجز کھانے پہننے کی ضروری چیزوں کے کوئی سامان نہیں ہے، جس کو لے کر تم خوش ہو اور اس قافلے کو احمد پاشا نائب سلطان نے اپنی ضمانت پر میرے سپرد کیا ہے اگر آپ اس کو چھوڑ دیں گے، مُجھ پر احسان کریں گے۔" یہ سُن کر قزاق اپنے راستے چلے گئے اور قافلے نے بخیر و عافیت وہاں سے کُوچ کیا۔(۲)

زیارتِ نبویؐ مدینۂ منوّرہ پہنچنے سے دو رات پہلے آپ کی طبیعت سخت ناساز ہو گئی۔ بُخار اور دردِ سر کی شدّت تھی۔ رات کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم، حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجہَہٗ، حضرتِ فاطمہ رضی اللّٰہ عنہا، اور حضراتِ حسنینؓ رضی اللّٰہ عنہما تشریف لائے ہیں اور ہر ایک نے آپ کے سینے پر ہاتھ رکھا اور تسلّی و تشفّی اور مختلف بشارتیں دیں۔

(۱) "منظورہ" (۲) "منظورہ"

بہتر از صحت است آں مرضم	کہ تو بہرِ عیادتم آئی
دارم امید بستہ آں بہتر	کہ تو از دستِ خویش بکشائی
اے خوش آں گمرہیِ راہ روی	کہ تو آئی و راہ بنمائی
طرفہ آں تشنگی کہ سیرابم	تو زِ لطف و کرم بفرمائی

اے علی، شہرِ دوست نزدیک است
چوں نگہ دی در و تماشائی[1]

مدینۂ طیبہ کا داخلہ

شفق کے ڈوبنے کے وقت قافلہ ذوالحلیفہ پہنچا۔ وہاں سے چل کر ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں سے روضۂ منورہ نظر آتا تھا۔ ہر ایک پر محبت و اشتیاق کا غلبہ تھا۔ درود و قصائدِ مدحیہ اور اشعارِ نعتیہ زبان پر تھے۔ رات کے پچھلے پہر مدینۂ طیبہ کے حدود میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر مقامِ مناخہ میں آرام کیا۔ پھر غسل کیا، کپڑے بدلے اور جب مدینۂ طیبہ کی فصیل کا دروازہ کھلا اور مصطفیٰ داغستانی معلم، جن کو محمد رئیس معلم نے آپ کے آنے کی اطلاع کر دی تھی، آئے، تو آپ اُن کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے اور باب السلام سے مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ صبح کی نمازِ اشراق سے فارغ ہو کر روضۂ منورہ کی زیارت کی اور سید سمہودی مصنفِ کتاب "وفاء الوفاء فی اخبارِ دارِ المصطفیٰ" کے مکان میں باب الرحمۃ کے قریب قیام کیا۔[2] دوسرے رفقا کر لیے گئے دوسرے مکانوں میں ٹھہرے۔ مزاج کی ناسازی اور علالت کے باوجود ہر نماز کے وقت مسجدِ نبوی میں حاضر ہوتے۔[3]

محفلِ میلاد کی شرکت سے معذرت

۱۲ ربیع الاول کو علماء و رؤسائے شہر مسجد میں جمع ہوئے اور سید صاحبؒ کو بھی اس مجلس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایک شخص نے آ کر کہا کہ: "آج ربیع الاول کی مجلس ہے۔ فلاں فلاں شرفا اور رؤسا آپ کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔" آپ آرام فرما رہے تھے۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور مولانا عبدالحئی صاحب سے فرمایا کہ: "ان سے فرمائیے کہ اگر اس مجلس کا انعقاد محض لہو و لعب کے لیے ہے تو ہم کو شرکت سے معذور رکھیں اور اگر عبادت کی نیت سے ہے، تو اس کو کتاب و سنت سے ثابت کر دیں، اس لیے کہ

---

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۴۔ (۲) یہ مکان باب جبرئیل کا وہ مکان نہیں ہے، جس میں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی تھی۔ یہ باب الرحمۃ پر تھا اور مسجدِ نبوی کی حالیہ توسیع کے موقع پر منہدم ہو کر مسجد میں شامل ہوا۔ (۳) "منظورہ"

ہم لوگ عبادت اور کارِ ثواب ہی کے لیے اپنے گھروں سے آئے ہیں۔ اگر ثابت ہو جائے گا، تو میں بسر و چشم حاضر ہو جاؤں گا، ورنہ ہم کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔" مولانا عبدالحی صاحب نے یہ مضمون اچھی طرح سمجھا دیا۔ قاصد نے جا کر یہ مضمون اہلِ مجلس کو پہنچا دیا۔ حاضرین سُن کر خاموش ہو گئے۔(1)

بیت المقدس جانے کی نیت اور فسخِ عزیمت مدینۂ طیبہ کے قیام کے زمانے میں آپ نے بیت المقدس جانے اور وہاں سے عمرے کا احرام باندھ کر آنے کا ارادہ کیا اور چالیس آدمیوں کو اپنی ہمراہی کے لیے انتخاب فرمایا۔ قافلے میں یہ خبر مشہور ہوئی۔ اخوند محمد عظیم چند آدمیوں کے ساتھ آئے اور عرض کیا کہ "بیت المقدس جانا فرائض و واجبات میں سے نہیں ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر ہم اپنی تکلیفیں بھول جاتے ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں قافلے میں سخت انتشار و تکلیف ہو گی۔" آپ نے یہ سُن کر بیت المقدس کی عزیمت فسخ کر دی اور قافلے میں وعظ فرمایا اور قیام کی نیت کر لی۔(2)

واپسی کا قصد مدینۂ طیبہ میں سردی تیز ہو گئی تھی اور رفقا کے پاس سرمائی سامان کافی نہ تھا۔ شیخ عبداللطیف مرزاپوری نے، جو شریکِ قافلہ تھے، کمبل خرید کر تیس تیس کر کے ساٹھ چوغے سلوا کر دو بار ہدیہ کیے، جن لوگوں کو زیادہ ضرورت تھی، اُن کو تقسیم کر دیے گئے۔

ایک روز آپ نے خواب میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ ارشاد ہوا کہ "احمد، اب یہاں سے جاؤ۔ تمھارے ساتھیوں کو سردی سے تکلیف ہے۔"

زیارات مدینۂ طیبہ کے قیام میں آپ نے مسجدِ قبا، مسجدِ قبلتین وغیرہ اور جنت البقیع کی بار بار زیارت کی۔ ایک بار جالیوں کے اندر شب گزاری کا موقع بھی بخوبی ملا۔ مراقبے میں بارہا احوال و کیفیات اور بار بار زیارتِ نبوی سے فائز ہوئے۔

ایک روز بقیع جا کر ازواجِ مطہرات رض، حضرت حسن اور دوسرے حضراتِ اہلِ بیت کی زیارت کی۔ دوسرے روز خاص طور پر حضرت عثمان رض کی زیارت کے لیے گئے۔

اہلِ قافلہ مدینۂ طیبہ کے گرد و پیش کے مشاہد و مآثر کی زیارت کر چکے تھے۔ آپ طبیعت

---

(1) "منظورہ" (2) "منظورہ" (3) "منظورہ"

کی ناسازی کی وجہ سے نہیں جا سکے تھے۔ ایک روز آپ جبلِ اُحد گئے اور سیدنا حمزہؓ اور دُوسرے شُہدا کے مقابر کی زیارت کی۔ آنحضرت صلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کے دندانِ مبارک جہاں شہید ہُوئے تھے، اس جگہ کی بھی زیارت کی۔ بعض بعض مقامات پر دُعا کی۔

ایک دن بئرِ رومہ، مسجدِ ذُوالقبلتین، مسجدِ اَحزاب تشریف لے گئے اور دُعا فرمائی۔ تیسرے روز مسجدِ قُبا گئے، دوگانہ ادا کیا اور دُعا فرمائی۔ نگہبانوں اور سامان کے پہرے داروں کے سوا سب شُرکائے قافلہ ہمراہ تھے اور دُعا و نماز میں شریک۔ بئرِ خاتم کی بھی زیارت کی۔ واپسی میں بنی قُریظہ کی طرف سے آئے۔[1]

روانگی | زیارتوں کے بعد آپ نے مکّۂ معظّمہ واپسی کا قصد فرما لیا اور سفر کی تیاری کی۔ وہی جمّال، جو وادیِ صفرا سے قافلے کو سواریوں پر لائے تھے، اپنے اُونٹ لائے اور سامانِ سفر بار کر کے سب کو سوار کرایا۔ آپ مسجدِ نبوی اور روضۂ منوّرہ سے رُخصت ہو کر ذُوالحُلَیفہ پہنچے، جو اہلِ مدینہ کا میقات ہے اور اب "ابیارِ علی" کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں رات بسر کی، نمازِ ظہر کے بعد غسل فرمایا اور دو رکعت پڑھ کر احرام باندھا۔ قافلے میں جو تندرست اور قوی لوگ تھے، اُنھوں نے بھی اسی میقات سے احرام باندھ لیے اور جو کمزور تھے، اُنھوں نے جحفہ سے، جو اہلِ شام کا میقات ہے، احرام باندھا۔

ذُوالحُلَیفہ سے اُنھیں منازل سے ہوتے ہُوئے جن سے مدینۂ منوّرہ آنا ہُوا تھا، مکّۂ معظّمہ کی طرف کُوچ ہوا۔ وادیِ فاطمہ پہنچ کر بڑے تضرّع و زاری کے ساتھ دُعا کی۔ جو رُفقا مکّۂ معظّمہ میں مقیم تھے، اُن کو جب تشریف آوری کی خبر ملی، استقبال کو آئے۔ آدھی رات کے بعد مکّۂ معظّمہ میں داخل ہُوئے اور طوافِ بیت اللہ اور سعیِ صفا و مروہ سے فارغ ہو کر بال منڈائے اور احرام سے باہر ہُوئے اور مکان پر آرام فرمایا۔ صُبح مکّۂ معظّمہ کے علما و فُضلا اور چاروں مصلّوں کے امام صاحبان ملاقات کے لیے تشریف لائے۔[2]

---

(۱) "منظورہ" (۲) "منظورہ"۔ سید صاحبؒ کی مراجعت کی تاریخ ۹ ربیع الاوّل صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ "منظورہ" کی روایت کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل کو آپ مدینۂ طیبہ ہی میں تھے اور آپ کو محفلِ میلاد میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس لیے روانگی یقیناً اس تاریخ کے بعد ہے۔ "مخزنِ احمدی" میں روانگی کی تاریخ ۲۹ ماہِ ربیع الاوّل درج ہے (مخزن، صفحہ ۱۰۹)۔

مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل کا درس مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ: "اس متبرک مقام میں کچھ علومِ دینیہ کا مشغلہ ہونا چاہیے۔ یہ وقت غنیمت ہے۔" چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب نے حافظ سید محمد کو مشکوٰۃ کا اور مولانا اسمٰعیل نے مولوی وحید الدین پھلتی کو حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کیا۔ دونوں مجلسوں میں بڑا مجمع ہونے لگا اور لوگوں کو عام استفادے کا موقع ملا۔[1]

مکہ معظمہ میں دوسرا رمضان المبارک مکہ معظمہ کے دوبارہ قیام میں دوسرا ماہِ مبارک آ گیا۔ تمام اہلِ قافلہ روزہ و نماز اور عمرہ و طواف میں حسبِ معمول سرگرم و مشغول ہو گئے۔

---

(۱) "منظورہ" قلمی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درس مکہ معظمہ کے اوّل قیام میں شروع نہیں ہوا، بلکہ مدینہ طیبہ سے واپسی پر طویل قیام کے زمانے میں شروع ہوا۔ یادداشت میں ہے۔ "ماہ جمادی الثانی ۵ دوشنبہ میاں محمد مشکوٰۃ شریف شروع کردند۔"
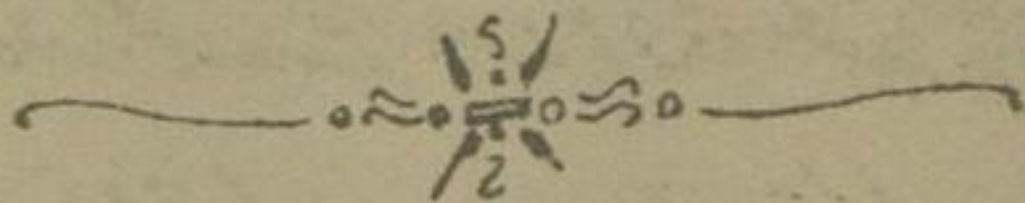
پندرھواں باب

سفرِ واپسی اور رائے بریلی کا قیامِ عارضی

سفر کی تیاری　۱۵ شوال کو سفر کی تیاری ہوئی۔ آپ نے قاضی احمد اللہ صاحب میرٹھی کو جہازوں کے انتخاب و انتظام کے لیے جدّے بھیجا تھا، لیکن اہلِ کلکتہ نے آپ کے رُفقائے سفر کے لیے جہازوں کی تعیین و تجویز کر کے محمد رجب ناخدا کے ذریعے مکۂ معظمہ میں آپ کو اطلاع کی اور آپ کے سفر کے ۵ لیے 'ملک البحر' نامی جہاز تجویز کیا۔(۱)

یکم ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ کو آپ نے طوافِ وداع کیا اور مکۂ معظمہ کو الوداع کہا۔ ہر شخص بیت اللہ کی جدائی سے اشکبار اور دل فگار تھا۔ دوسرے روز بندرگاہِ جدّہ پہنچنا ہوا۔(۲)

سفرِ واپسی　آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے لیے جو جہاز نامزد ہو چکا ہے، اس پر سوار ہو جائے۔ آغا حسین ترکی کپتان نے، جو جہاز 'عطیۃ الرحمٰن' کے ناخدا تھے، آ کر عرض کیا کہ "'ملک البحر'، جو جناب ۱۰ کے سفر کے لیے تجویز ہوا ہے، بہت سست رفتار ہے۔ بہتر ہے کہ آپ جہاز 'عطیۃ الرحمٰن' پر سوار ہوں۔" آپ نے فرمایا: "جو جہاز ہمارے لیے تجویز ہو چکا ہے، اُس کو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ رفتار اللہ کے قبضے میں ہے۔ سُست رفتار کو چاہے، تیز رفتار بنا دے اور تیز رفتار کو چاہے، سُست رفتار کر دے۔"(۳)

بمبئی　اوائلِ ذی الحجہ میں جدّے سے روانہ ہو کر بندرگاہِ مخہ پہنچے۔ ایک ماہ یہاں قیام رہا۔(۴) آپ ۱۵ کو بمبئی تشریف لے جانے کا بہت خیال تھا۔ چنانچہ بمبئی جانے والے جہاز کے ذریعے آپ نے

(۱) "منظورہ" (۲) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۱۰ (۳) "منظورہ" (۴) "منظورہ"۔ "مخزن" میں ۱۵ روز مدتِ قیام لکھی ہے، صفحہ ۱۱۱۔

مولوی انس صاحب کو ایک خط بھیجا، جس میں ہجرت و جہاد کی ترغیب دی۔ 'ملک البحر' کے ناخدا محمد رجب نے عرض کیا کہ: "ہم کو بمبئی کی سواریاں مل گئی ہیں اور ہم بمبئی ہو کر کلکتے جائیں گے۔" آپ نے فرمایا کہ: "یہ ہماری عین مراد ہے۔" جس جہاز سے آپ نے خط بھیجا تھا، وہ بیس روز پہلے بمبئی روانہ ہو چکا تھا۔ چار جہاز، جن پر آپ کا قافلہ سفر کر رہا تھا، سقوطرہ تک 'ملک البحر' کا اور

۵ اُن کا ساتھ رہا۔ سقوطرہ سے وہ ملیبار کی طرف چلے گئے اور 'ملک البحر' نے بمبئی کا رُخ کیا۔ بارھویں روز ایک گھڑی دن چڑھے 'ملک البحر' خیر و عافیت کے ساتھ ساحلِ بمبئی پر لنگر انداز ہوا۔[1] اس وقت تک کوئی جہاز بمبئی نہیں پہنچا تھا۔ بمبئی کے ناخدا اور تجار کا بیان ہے کہ چالیس سال کے عرصے میں کوئی جہاز اِتنے کم وقت میں اور اتنی سُرعت کے ساتھ بمبئی نہیں پہنچا۔[2] جس جہاز کے ذریعے آپ نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط بھیجا تھا، وہ خود سولہ روز کے بعد بمبئی پہنچا۔[3]

۱۰ بمبئی میں آپ نے محلہ میمن واڑے میں مولوی اُنس صاحب کی مسجد میں قیام فرمایا۔ مولوی صاحب بیعت ہوئے۔ چونکہ بمبئی میں بھی کلکتے کی طرح آپ کی شہرت تھی، دن رات لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور کبھی وقت فرصت نہیں ہوتی تھی۔ لوگوں نے بکثرت دعوت و ضیافت کا شرف حاصل کیا اور ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی سعادت حاصل کی۔

مالابار ضروریاتِ سفر بمبئی سے خرید کر جہاز پر بار کیں۔ اٹھارہ دن کے بعد اُنیسویں دن

۱۵ بمبئی سے روانگی ہوئی اور جہاز نے مالابار کی طرف رُخ کیا۔ مولوی انس صاحب کے صاحبزادے نیز مولوی محمد صدیق محمدی، امام الدین، شیخ بدھن بمبئی سے ساتھ ہوئے۔ ساتویں روز 'ملک البحر' بندر الیپی پہنچ گیا۔ عطیۃ الرحمٰن وغیرہ جہاز وہاں ایک روز پہلے سے لنگر انداز تھے۔ عطیۃ الرحمٰن کے سواروں نے کہا کہ آخر آپ مالابار کے سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ لوگ ابھی تک بمبئی نہیں گئے۔ 'ملک البحر' کے سواروں نے کہا کہ ہم بمبئی سے اٹھارہ دن قیام کر کے آ رہے ہیں اور بمبئی جانے کی علامت یہ ہے کہ مولوی

۲۰ انس صاحب کے صاحبزادے ہمارے ساتھ ہیں۔ لوگوں کو اس تیز رفتاری پر بڑا تعجب ہوا۔

(۱) "منظورہ" (۲) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۱۰ (۳) "منظورہ"

سید صاحبؒ قصبۂ الپی میں تشریف لے گئے۔ مُریدین و معتقدین آپ کی زیارت سے مشرف و مسرور ہوئے۔ دو روز وہاں قیام کر کے تیسرے روز وہاں سے کوچ ہوا۔(۱)

کلکتہ مولانا عبدالحی صاحب کے ایک رُقعے سے کلکتے کے مُحبّین و مُخلِصین کو آپ کی تشریف آوری کا علم ہو گیا تھا۔ شیخ غلام حسین فخرُ التجار نے چند روز پہلے انتقال کیا تھا۔ اُن کے صاحبزادے عبداللہ فینس پر سوار کرا کے اپنے باغ میں لائے۔ لوگ جُوق جُوق زیارت و ملاقات کے لیے جمع ہو گئے ۵ اور ہدایت و ارشاد سے مشرّف ہوئے۔

اہلِ قافلہ کے تمام جہاز بخیر و عافیت پہنچ گئے، لیکن عطیۃ الرحمٰن راستہ بھول گیا اور ایک مہینہ بھٹکتا رہا۔ آپ کلکتے میں اُس کے بخیریت پہنچنے کے لیے دُعائیں فرماتے تھے اور قنوت پڑھتے تھے اور اکثر فرماتے تھے کہ تکبّر بڑی چیز ہے۔ جب عطیۃ الرحمٰن کے پہنچنے کی خبر ڈاک سے آئی، تو تمام اہلِ قافلہ کو بڑی مسرّت و شادمانی ہوئی۔

کلکتے میں مولوی امام الدین اور صوفی نور محمد صاحب نے گھر جانے کی اجازت لی اور اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے۔ عنایت اللہ نامی ایک مخلص بیعت و خلافت سے مشرّف ہوئے اور اخلاص و عقیدت مندی کا حق ادا کیا۔(۲)

ایک مخلص کی بلند حوصلگی کلکتے سے روانہ ہو کر آپ منگل کوٹ اور اس کے قریب منشی محمدی کے دیہات تشریف لے گئے۔ مرشد آباد میں دیوان غلام مرتضیٰ کی درخواست پر قافلے کے ساتھ ان کے مقامِ ۱۵ گُہنہ پر تشریف لے گئے۔ دیوانِ موصوف کا خس پوش بنگلہ ایسا شاندار تھا کہ اس کی درستی پر پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ بنگلے کے باہر بازار تھا، جس میں ہر قسم کے میوے اور مٹھائیاں مِلتی تھیں اور ہر قسم کے پیشہ ور اور اہلِ حرفہ موجود تھے۔ دیوان صاحب نے بازار میں منادی کرادی کہ

---

(۱) "منظورہ"　(۲) ان بزرگ کے گاؤں کے نیچے ایک ندی بہتی ہے، جس کا نام بھاگی رتی ہے۔ یہ ندی سمندر میں گرتی ہے۔ میاں عنایت اللہ نے ایک خط لکھ کر سمندر کے جزر کے زمانے میں بنامِ خدا اس ندی میں ڈال دیا۔ خدا کا کرنا کہ یہ خط کسی طرح بہتا بہتا کلکتے میں ایک مخلص کے ہاتھ لگا اور سید صاحبؒ تک پہنچا۔ مکۂ معظمہ سے واپسی پر یہ صاحب کلکتے میں ملے اور بیعت و خدمت سے مشرف ہوئے۔

سیّد صاحبؒ کے قافلے کا جو آدمی اس بازار سے کچھ خریدے یا کسی دستکار سے کام لے، تو اس کی قیمت و اُجرت میرے ذمّے ہے۔ سیّد صاحبؒ نے اُن کو سمجھایا کہ: "اس قدر زیرِ باری کیوں لیتے ہو؟" اُنھوں نے عرض کیا کہ: "اگر کسی مسلمان کے گھر کوئی حاجی آجاتا ہے، تو اس کی بڑی سرفرازی ہوتی ہے۔ مَیں اپنی قسمت پر نازاں ہُوں کہ مجھے اتنے حجّاج نے سرفراز فرمایا۔"[1]

۵ دو تین روز وہاں قیام کر کے روانگی ہُوئی۔ دیوان صاحب نے دُوسرے تحائف کے ساتھ ایک نہایت نفیس رُومی بندوق، جس میں سات دیدبان تھے، سات عمدہ طمنچے اور ایک تیر پیش کش کیا۔ سات دیدبانوں کا حساب یہ تھا کہ ہر دیدبان سے دو سو قدم فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ چنانچہ ساتویں دیدبان سے ایک ہزار چار سو قدم کا فاصلہ ہوتا تھا۔[2]

صُوبۂ بہار — کھنہ سے آپ واپس مرشد آباد تشریف لائے اور کشتی وہاں سے روانہ ہو کر مونگیر کے

۱۰ سامنے لنگر انداز ہوئی۔ جمعے کے دن آپ اور دُوسرے اہلِ قافلہ کشتی سے اُتر کر شہر تشریف لے گئے اور نمازِ جمعہ ادا کی۔ مونگیر میں آپ نے وہاں کے اسلحہ سازوں سے بندوقیں اور طمنچے خریدے۔ اہلِ قافلہ نے بھی بعض اسلحہ خرید کیے۔ سیّد صاحبؒ نے ایک چار نالی بندوق خریدی۔

مونگیر سے روانگی پر مولوی ولایت علی عظیم آبادی، شاہ محمد حسین اور سیّد کرامت اللہ وغیرہ کے ساتھ قصبۂ باڑھ میں پہنچ کر ملاقات سے سرفراز ہوئے۔ اس وقت مولوی ولایت علی صاحب کی ڈاڑھی

۱۵ مُنڈی ہُوئی تھی۔ غیر متشرّع اور آزاد لوگوں کا لباس پہنے ہُوئے تھے۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب نے سیّد صاحب سے ان کی وضع کی شکایت کی۔ فرمایا کہ: "انشاء اللہ تعالیٰ یہ قدیم ہمراہیوں میں شامل ہو جائیں گے اور یہ سب ظاہری صورت بدل جائے گی۔" یہ سب حضرتؒ آپ کے ساتھ عظیم آباد آئے اور دس روز تک اپنے مکان پر ٹھیرایا۔[3]

عظیم آباد کے قیام کے دَوران میں آپ چند آدمیوں کو ساتھ لے کر پھلواری تشریف لے گئے،

۲۰ جو مشائخ و علما کی مشہور بستی اور سجادہ ہے۔ اس وقت وہاں بہت سے لوگ انگریزی سرکار میں بھی

---

(۱) "منظورہ" (۲) یہ بندوق آپ سے یار محمد خاں درّانی والیِ پشاور نے مانگ لی تھی۔ (۳) "منظورہ"

بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ حضراتِ پھلواری نے آپ کے شایانِ شان تعظیم و تکریم کی۔ ایک رات آپ نے وہاں گزاری اور تنہائی میں شاہ نعمت اللہ صاحب[1] سے گفتگو کر کے صبح عظیم آباد تشریف لے آئے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو چند رفقا کے ساتھ پھلواری روانہ کیا۔ مولانا نے شاہ نعمت اللہ صاحب، مولوی احمدی صاحب[2] اور دوسرے بزرگوں سے ملاقات کی اور رسوم مروجہ وغیرہ کے متعلق دیر تک گفتگو رہی۔ پھلواری کے چند رند مشرب آزاد لوگوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور تمام خلافِ شرع افعال و عادات اور رسومِ جاہلیت سے تائب ہوئے اور اپنے وطن میں دینی اصلاح و امر بالمعروف و نہی عن المنکر[3] کا فرض انجام دیا۔ ۵

عظیم آباد سے روانگی کے وقت مولوی ولایت علی، طالب حسین، شاہ محمد حسین، محمد حیات، سید کرامت وغیرہ اپنا اپنا سامان لے کر ہم رکاب ہوئے۔ سید عبدالرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ: میں نے ولایت علی صاحب کو دیکھ کر سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہیں، یہ ضرور ہم پر بار ہوں گے۔ آپ نے فرمایا: "نہیں، یہ بڑے پرانے پرانے رفیقوں سے بھی بازی لے جائیں گے۔"[4] ۱۰

یوسف پور، غازی پور عظیم آباد سے ڈھکیا اور داناپور کے راستے سے کشتیاں رائے بریلی کی طرف روانہ ہوئیں۔ بھوج پور، بلسار، چھپرا، ریل گنج اور بکسر ہوتے ہوئے محمود آباد پہنچے۔ محمود آباد سے آپ ایک طرف کو روانہ ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا: "کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟" فرمایا کہ: "محمود آباد کے پاس ایک دیہات ہے، جہاں سے ایک دوست کی بو آتی ہے، ملاقات کے لیے جاتا ہوں۔" راستے میں ایک جگہ سے ڈھولک کی آواز آتی تھی۔ آپ نے مولانا اسمٰعیل سے فرمایا کہ سورۂ یٰسٓ پڑھیے۔ ۱۵

---

(۱) شاہ نعمت اللہ بن حبیب اللہ بن ظہور اللہ ہاشمی جعفری مشہور مشائخ عصر میں سے ہیں۔ ۱۱۶۰ھ میں ولادت ہوئی۔ اکثر درسی کتابیں مولانا وحید الحق پھلواروی سے پڑھیں۔ پھر اپنے والد سے استفادۂ باطنی کیا اور ان کے بعد اکتیس سال کی عمر میں خانقاہی سجادے کو رونق دی۔ علما و مشائخ کی ایک بڑی جماعت نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔ ۱۲۴۶ھ میں وفات پائی (نزہۃ، ج ۷)۔

(۲) ۱۱۶۰ھ۔ ۱۲۵۲ھ۔ والد کا نام مولوی وحید الحق، دادا کا نام وجیہ الحق تھا۔ اپنے والد سے درسی کتابیں پڑھیں۔ ریاضی اور علوم عقلیہ میں تبحر پیدا کیا۔ پورب کے اضلاع میں آپ کی ذات مرجع تلامذہ تھی اور درس و تدریس، تحشیہ و تصنیف کی شہرت تھی۔ منطق اور فلسفے کی کتابوں اور رسالوں پر آپ کے حواشی مشہور ہیں (نزہۃ، ج ۷)۔ (۳) منظورہ۔ (۴) منظورہ۔

آپ نے سورہ پڑھنی شروع کی اور ڈھولک کی آواز موقوف ہوئی۔ لوگوں نے دریافت کیا، تو فرمایا کہ: "مجھے ڈھولک کی آواز ناگوار ہوئی۔ اشارۂ غیبی ہوا کہ اس کو روکنے کے لیے سورۂ یٰسٓ پڑھی جائے۔ چنانچہ اس کی برکت سے یہ آواز بند ہوگئی۔"(۱)

آپ جب یوسف پور پہنچے، شیخ فرزند علی غازی پوری اس موضع میں بیمار تھے۔ وہ ناطاقتی کی وجہ سے خود تشریف نہ لا سکے۔ اُنھوں نے اپنے لڑکوں کو اِستقبال کے لیے بھیجا تھا۔ آپ اُن کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ شیخ صاحب نے بڑی تعظیم و تکریم اور بڑی خدمت گزاری اور مہمانداری کی اور اپنے تمام اہل و عیال کو بیعت کرایا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ: "تم نے ہمارے دوست کو دیکھا؟" دوسرے روز کشتیاں غازی پور پہنچیں۔ شیخ صاحب اپنے بچوں کے ساتھ ہمراہ تھے۔ آپ نے شیخ صاحب کے مکان پر چھ روز قیام فرمایا۔ شہر کے لوگ بکثرت بیعت ہوئے اور راہِ راست پر آئے۔ شہر کی جامع مسجد، جو ویران ہو چکی تھی، آباد ہوئی اور پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ہونے لگی۔(۲)

بنارس غازی پور سے چل کر جب بنارس دو تین فرلانگ رہا، مرزا محمود بخت شاہزادہ استقبال کے لیے آئے۔ مرزا بلاقی شاہزادہ، جو پہلے سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، بجرے پر بیٹھ کر آئے۔ یہاں ایک جگہ، جو پایاب تھی، پانی اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ مضبوط آدمی کے پاؤں بھی نہیں جمتے تھے۔ ایک شخص اُترے، سو اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ لوگ اُن کو بچانے کے لیے دوڑے، یہاں تک کہ خود سیّد صاحبؒ بھی اپنے بجرے سے اُتر کر اُن کی طرف بڑھے۔ پانی کی تیزی سے سب کے پاؤں اُٹھ گئے اور سب خطرے میں پڑ گئے۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب ایک کشتی لے کر اُن کی طرف بڑھے۔ دیکھا کہ سیّد صاحبؒ پاؤں جمائے کھڑے ہیں، باقی کسی کے پاؤں نہیں جمتے۔ وہ سب کو سوار کر کے کنارے لے آئے۔(۳)

بنارس میں چند روز قیام کر کے، جس میں سابق مریدین کو زیارت کا موقع ملا، بنارس سے واپسی ہوئی۔

مرزا پور مرزا پور میں شیخ غلام علی الٰہ آبادی کے بیٹے تشریف لائے اور قافلے کے تمام

(۱) "منظورہ" (۲) "منظورہ"، روایتِ سیّد محمد مستقیم نصیر آبادی (۳) "منظورہ"

اخراجات اپنے ذمے لے لیے۔ شیخ عبد اللطیف اور دُوسرے پٹھانوں کی طرف سے دعوت ہُوئی۔[1]

اللہ کی حمد اور آخری آرزو سید مستقیم صاحب کہتے ہیں کہ واپسی میں ایک دن آپ نے مجھ سے وطن اور برادرانِ وطن کی خیریت اور حالات دریافت کیے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ نے حمد و شکر کے عجیب عجیب مضامین و الفاظ ادا فرمائے، حج و عُمرہ و زیارتِ حرَمَین کے احسان پر اللہ تعالیٰ کا بےحد شکر ادا کیا اور بخیریت جانے اور واپس آنے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کیا اور بہت دُعا و التجا کر کے یہ عرض کیا کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال تیرے راستے میں صرف ہوں۔ یہ فرماتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تمام حاضرین پر ایسی تاثیر اور رِقّت طاری تھی کہ زار زار رو رہے تھے اور ایک بیہوشی اور خُود فراموشی کا عالم تھا۔[2]

مسجد اور غریب پڑوسیوں کے لیے تحفہ مرزاپور میں دو تین روز شیخ عبد اللطیف وغیرہ کی دعوتوں کی وجہ سے قیام رہا۔ آپ نے تکیے کی مسجد کے راستے اور گھاٹ کے لیے پتّھر خریدے اور اپنے غریب پڑوسیوں اور ہمسایوں کے لیے بہت سی چکیاں خریدیں۔[3]

شیخ غلام علی کی اُولُوالعزمی سید کرامت اللہ عظیم آبادی بیان کرتے ہیں کہ بنارس سے روانگی کے بعد ہر منزل و مقام پر روزانہ شیخ غلام علی صاحب کی طرف سے دعوت کا سامان پہنچتا تھا۔ دال چاول اور مصالحہ اُنھیں کی طرف سے آتا تھا۔ شیخ صاحب کے اجارے کے گاؤں دریا کے کنارے پڑتے تھے۔ کشتیاں دریائے جمنا کے کنارے شیخ صاحب موصُوف کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر لنگر انداز ہُوئیں۔ کئی روز وہاں ٹھیرنا ہُوا۔ روزانہ شیخ صاحب کی طرف سے پُورے قافلے کی پُرتکلف دعوت ہوتی تھی۔ قسم قسم کے لذیذ کھانے، انواع و اقسام کے اچار مُربّے، یہاں تک کہ پرہیزی کھانا، مُونگ کی دال، کھچڑی وغیرہ دسترخوان پر موجُود رہتی۔ قافلے میں جو شخص کسی کھانے کا نام لیتا، اہلِ کار اُسی وقت حاضر کرتے۔ قافلے میں سات سو آدمی تھے اور عظیم آباد، غازی پور مقامات سے اور آدمیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ خُود الٰہ آباد میں قرب و جوار کے سیکڑوں آدمی ہر روز آتے تھے اور سب سیر ہو کر

(۱) "منظورہ"　(۲) "منظورہ"　(۳) "منظورہ"

اُٹھتے تھے؛ بلکہ شہر کے کھاتے پیتے لوگ بھی گھر بیٹھے شیخ صاحب کی ضیافت میں شریک ہوتے۔ کھانا اس افراط سے پکتا کہ جو کچھ بچتا، دریا میں ڈال دیا جاتا، یہاں تک کہ دریا کے پانی کا رنگ بدل گیا اور ہندوؤں نے شکایت کی۔ غربا شیرمال، پلاؤ، زردہ، فیرنی اور کھانے کے دُوسرے انواع و اقسام سے ایسے آسُودہ ہُوئے کہ اُن کی طبیعت بالکل سیر ہوگئی۔ سیّد صاحبؒ ۵ شیخ غلام علی صاحب سے فرماتے کہ: "شیخ صاحب، آپ اس قدر فضول خرچی کیوں کرتے ہیں؟" شیخ صاحب نے جواب دیا کہ: "مَیں اپنے حوصلے کے مطابق نہیں کرسکا۔ جو کچھ مَیں نے کیا ہے، یہ آخرت کا اندوختہ ہے۔" ضلع لکھنؤ، الٰہ آباد اور قرب و جوار کے تمام مقامات میں شیخ صاحب کی اُولُوالعزمی اور بلند ہمتی کا چرچا تھا۔"(۱)

وطن میں الٰہ آباد سے آپ خشکی خشکی رائے بریلی کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے الٰہ آباد سے مہرونڈے، ۱۰ جو شیخ صاحب کا آبائی وطن ہے، تشریف لے گئے۔ ایک روز وہاں ٹھہر کر اہلاد گنج میں دُوسری منزل کی۔ وہاں کا حاکم اور بہت سے سوار آپ سے بَیعت تھے۔ وُہ سب زیارت اور ملاقات سے مشرّف ہُوئے۔ وطن میں آپ کی آمد کی اِطلاع اچانک پہنچی۔ اعزّہ استقبال کے لیے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ قافلے کے ایک ہمراہی، جو راستہ بھُول گئے تھے، تکیے پہنچے اور اُنھوں نے دریافت کیا کہ: "کیا سیّد صاحب تشریف لائے؟" اعزّہ نے کہا کہ: "الٰہ آباد تک تشریف لانے ۱۵ کی خبر تو ہم کو تھی۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ یہاں تک تشریف لے آئے۔ صُبح ہی اعزّہ استقبال کے لیے روانہ ہُوئے۔ کوئی شہر تک پہنچ سکا، کوئی سامنے والی بستی تک کہ آپ تشریف لے آئے اور آپ کا یہ فرمانا صحیح نکلا کہ ہم بخیر و عافیت اچانک تُمھارے پاس پہنچیں گے اور تم کو تعجب ہوگا۔ اکثر عزیزوں نے اہلِ قافلہ میں سے بہت سے لوگوں کو اس لیے نہیں پہچانا کہ چہرے پر تر و تازگی تھی اور لباس عُمدہ تھا۔ یہاں سے گئے تھے تو بالکل بے سر و سامانی کی حالت میں۔(۲) ۲۰ اواخرِ شعبان کی کسی تاریخ میں آپ مع الخیر داخلِ وطن ہوُئے۔ زنانی کشتیاں گنگا کے راستے

(۱) "منظُورہ" (۲) "منظُورہ"

چند روز بعد ڈلمئو پہنچیں۔ رائے بریلی سے بہلیاں، میانے اور ڈولیاں گئیں اور تمام سواریاں رمضان المبارک کی ابتدائی تاریخوں میں کسی تاریخ کو پہنچ گئیں۔

گھروں میں جانے سے پہلے معذور اور بیمار لوگوں کے علاوہ آپ نے مرد و عورت تمام حجاج کو مسجد میں جمع کر کے اپنے اور اپنے تمام عزیزوں کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کے لیے دعا کی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔

حج سے واپسی کے بعد باوجود اس کے کہ مہمانوں کی ایک بڑی جماعت مقیم تھی اور روزانہ بہت بڑی رقم خرچ ہوتی تھی، پھر بھی ایک روز ایک ضرورت سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بیت المال میں دس ہزار روپے موجود ہیں۔

سید صاحبؒ آخر شعبان یا غرۂ رمضان ۱۲۳۹ھ کو پہنچے۔ گویا دو سال دس مہینے کے بعد وطن واپسی ہوئی۔[1]

قصیدۂ تہنیت سید صاحبؒ اور ان کے مبارک قافلے کی واپسی پر اہلِ ایمان اور اہلِ دین کو جو مسرت و شادمانی ہوئی، اس کا اظہار ایک شاعر نے، جو حسن[2] تخلص کرتے تھے، اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے، جس میں انھوں نے اس قافلۂ حجاج اور اس کے میرِ کارواں کی خصوصیات اور ان کے دینی اثرات و برکات بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں۔ اس قصیدے کے اکثر شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔[3]

قصیدہ

ہے گا اس نور سے پُر گنبدِ چرخِ اخضر — جس کے لمعان سے ہے کُند فرشتوں کی نظر

نہ اسے روشنیِ شمس و قمر سے نسبت — نہ یہ روشنی اسے اخبر، نہ ترقی اختر

جلوۂ طور کہوں یا کہ شبِ قدر کا نور — یا ترقی پہ ہوئی روشنیِ تازہ سحر

---

(۱) "منظورہ" (۲) یہ شاعر غالباً مولانا ابوالحسن کاندھلوی ابنِ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی ہیں، جو حسن تخلص کرتے تھے اور اپنے زمانے کے خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مثنوی گلزارِ ابراہیم انھیں کی یادگار ہے (۳) پورا قصیدہ "سوانحِ احمدی" میں منقول ہے۔

جس طرف دیکھیے، وُہ نور نظر آتا ہے | عقلِ اوّل بھی جسے دیکھ کے رہ جائے ششدر
آسماں پر جو نظر کی، تو بسانِ فانوس | مشتعل روشنیِ عرش سے تھا اُس کا گھر
کر کے مَیں غور جو پھر رُوئے زمیں کو دیکھا | تھی وُہ خورشید سے بھی نُور میں زیادہ انور
تھا عجب طور کا کچھ رُوئے زمیں پر جلوہ | عرش پر جس کی تجلّی کا پہنچتا تھا اثر
شرق سے غرب تلک نُور سے تھا مالا مال | عرش سے فرش تلک برق سے تھا روشن تر ۵
کیا عجب ہے کہ اگر ہند کے نظّارے کو | حُور جنّت سے چلی آئے نکل کر باہر
اس ترقّی پہ غرض دیکھ کے مَیں خطّۂ ہند | سجدۂ شکر ادا مَیں نے کیا خوش ہو کر
تھی عجب طرح کی دل کو مرے اُس دم فرحت | جسم ہرگز نہ سماتا تھا قبا کے اندر
تھا تہِ دل سے مَیں تفتیشِ سبب کے درپے | کس کے انوار سے یارب، ہے زمیں رشکِ قمر؟
کس کے باعث ہے جو یُوں مُلک میں ہے آبادی؟ | کیا خوشی ہے کہ جو یُوں عیش و طرب ہے گھر گھر؟ ۱۰
شکلِ فردوس جو سرسبز ہُوا یہ خطّہ | یارب، اس بھید سے کچھ مجھ کو بھی تُو آگہ کر
یک بیک غیب سے آئی یہ ندائے ہاتف | گوش سے پنبۂ غفلت کو ذرا باہر کر
اب تلک پہنچا نہیں مژدۂ جاں بخش تجھے؟ | جس سے شاداں ہیں ملک، خوش ہیں ہر اک جن و بشر
آیا ہے قافلہ حج کر کے وُہ اس مُلک کے بیچ | جس میں ہر اک ہے ولی، عارفِ نیکو منظر
اُس کے انوار سے روشن ہے زمیں تا بفلک | اُن کی ہمت سے ہُوئی دین کو سو زینت و فر ۱۵
ہے ہر اک شخص وہاں آمرِ امرِ معرُوف | قامعِ بدعت و ناہیِ اُصُولِ منکر
ماحیِ کفر زِ دل، قاتلِ کفّار زِ جاں | قامعِ رسمِ زبُوں، تابعِ حکمِ داور
اُن میں ہر اک ہے فرید اور وحیدِ اقراں | حافظ و عالم و عادل، سخی و نیک نظر
ظاہر آراستہ بر ملّتِ بیضائے نبیؐ | باطن اس طور کا پاکیزہ ہو جیسا گوہر
کد و کاوش نہ کسی میں، نہ بیادِ کینہ | نہ حسد دل میں، تکبّر نہ کسی کے اندر ۲۰
کیا کروں قافلہ سالار کا مَیں اُس کے بیاں | جس کے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر؟

عادل و عالم و عابد، شہِ والا ہمت　　اشجع و افصح و ابلغ، سخی و نیک نظر

عاقل و فاضل و راسخ، زکی و عالی طبع　　زاہد و متقی و صابر و زیبا منظر

ترک و تجرید و توکل میں فریدِ دوراں　　حلم اور خُلق و دیانت میں وحیدِ اکبر

معدنِ لطف و حیا، مجمعِ جود و ہمت　　مخزنِ عفت و الفت، شرفِ نوعِ بشر

بحرِ جود و کرم و گلشنِ عرفانِ نبیؐ　　مشعلِ راہِ طریقت، بحقیقت رہبر

صدق میں ثانیِ اثنینؓ کے مانند قوی　　جدّ اور جہد میں اسلام کے ثانی عُمرؓ

شرم میں حضرتِ عثمانؓ سا جوں بحرِ حیا　　اور صفِ جنگ میں ہم طرزِ علیؓ صفدر

طور اور طرز میں سب طینتِ اصحابِ نبیؐ　　قاف سے راہِ شریعت میں ہے مستحکم تر

وعظ میں اُس کے یہ تاثیر کہ پڑھ لیں کلمہ　　لات و عُزّیٰ و منات اور ہبل بھی فرفر

سیدِ صفدر و عالی نسب و زینتِ دیں　　زیبِ اسلام و امامِ حق و عاجز پرور

سیدِ احمد و عالی حسب و فخرِ زماں　　رہبرِ راہِ شریعت، خلفِ پیغمبرؐ

ہوتا معصوم اگر بعد نبیؐ کے کوئی　　ہوتی اس عصر میں عصمت بھی اُسی کے اندر

سینۂ صاف سے اُس کے ہے خجل آئینہ　　نورِ ایمان سے ہے قلبِ مصفّا گوہر

حق میں گمراہوں کے تاثیر جو کچھ ہے اس کی　　جوششِ خون میں کرے کام نہ ایسا نشتر

ہو جو صحبت سے تری تخلیہ و تحلیہ　　لاکھ چلّوں سے بھی باطن میں نہ ہو اتنا اثر

اسمِ اعظم کو جو پڑھ کر کرے وہ گرہ پہ دم　　ہوں طلا، جتنے ہیں کہسار کے سارے پتھر

خار کو ہاتھ لگا دے، تو وہ ہو گلدستہ　　رشکِ الماس ہو، گر ہاتھ میں لے کنکر

رنگ میں گو کہ رہے سُرخ بسانِ یاقوت　　سرد ہو یخ کی طرح ہاتھ میں اُس کے اخگر

اُس کی نظروں سے گرے مشک تو ہو پشک سے کم　　کوئلہ ہاتھ میں اُس کے ہو مثالِ عنبر

ناخدا جوئے حقیقت کا یہ ہے کشتی باں　　بحرِ زخارِ طریقت کا حقیقی معبر

علم کو اُس کے مگر علمِ لدُنّی کہیے　　جو کہ آتا ہے اُسے، ہے وہ کسبے متحضر

آب پاشی سے تری قوّتِ بازو کے بزور
پھر کے سرسبز ہُوا خشک شریعت کا شجر

فیض سے تیرے نمازی ہُوئی خلقت یہاں تک
پڑھے بیمار بھی ہذیان میں سُورہ کوثر

جس طرف دیکھیے تعمیرِ مساجد ہے گی
ہے ہر اک شخص کی تحقیقِ مسائل پہ نظر

آتی ہر سمت سے ہے بانگِ مؤذّن کی صدا
جس کو سُنیے، یہی کہتا ہے کہ اللّٰہ اکبر

اس قدر عصر میں تیرے ہُوئی افراطِ نمازہ
لاکھوں تیّار ہُوئے مُلک میں چھوٹے منبر

قطعِ بدعات ہُوئی فیض سے تیرے ایسی
ہند سے رسمیں بُری اُٹھ گئیں صدہا یکسر

دیکھیے جس کو، سو کرتا ہے کلام اللّٰہ یاد!
باندھی ہر شخص نے تہذیب و ہدایت پہ کمر

تیری تائید سے اک خلق ہُوئی ہے تائب
تیری تنبیہ سے لاکھوں ہُوئے فاسق اطہر

اک قدم دھرنے کی جا گہ بھی نہیں مُول ملتی
جو کہ پھُوٹی ڈھٹی مسجد تھی پڑی صاف کھنڈر

جو ملا تجھ سے، ہُوا راہِ خدا میں مصروف
جو پھرا تجھ سے، جماعت سے ہُوا وہ باہر

تیری صُحبت کے سوا ہو نہ کسی کا طالب
جس کو باطن کی ہُوئی راہ کی ذرّہ بھی خبر

نعل بالنّعل ہے کچھ فرق نہیں ہے تجھ میں
دیکھا پچھلوں سے تجھے جس نے مطابق کر کر

تجھ سے باطن کے قوانین ہُوئے ایسے درُست
جیسے کاتب کوئی لکھنے کو بنا دے مسطر

منکشف تجھ پہ ہر اک شے کی ہے کمیّت
نہ فتاوٰی میں وہ حجّت، نہ کُتُب کے اندر

نہ ہدایہ میں وہ علّت، نہ وقایہ میں نشاں
دُرِّ مختار میں اُس کا، نہ سراجی میں اثر

نہ ہے سُلّم میں پتہ اور نہ توضیح میں کچھ
خالی ہے فقہ کا اس علم سے سارا دفتر

کچھ نہیں تیری شجاعت تو بیاں کی محتاج
صاف چہرے سے عیاں ہے تری شانِ حیدرؓ

خاکِ پا سے تری اکسیر کو کیا ہے نسبت؟
آدمی کو تو فرشتہ کرے اور مس کو زر

فیض سے تیرے ہُوا دم میں وحیدِ دوراں
جس نے دروازے پہ تیرے کیا آ کر بستر

رکنِ دیں مولوی عبدالحی و شہِ اسمٰعیل
فیض سے تیرے ہُوئے کاملوں کے سر دفتر

تیری صحبت نے ملائک کی کری خاصیت
گو کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں ہمشکلِ بشر

حق میں کفّاروں کے ضیغم کی طرح ہے خونخوار　　مومنوں کے لیے شفقت میں پدر سے بہتر

فخرِ ابنائے زماں، قبلۂ اربابِ صفا　　کعبۂ اہلِ یقین، دادرسِ ہر مضطر

ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت　　زنِ بیوہ کے تو حق میں ہے سحابِ مُمطر

تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح　　کھوئی یہ رسمِ زبوں، رحمتِ حق ہو تجھ پر!

جس میں راضی ہو خدا، ہے وُ ہی اُن کو منظور　　آبرو کا نہ اُنھیں خوف، نہ کچھ جی کا ڈر

جو مسلمان کرے اُن سے ذرا سا بھی سلوک　　اُس کے بدلے میں نہ کوئی کرے اُن سے بہتر

کیوں منافق نہ ہو صورت کو تری دیکھ کے غش　　ٹھیرے کس طور سے خورشید کے آگے شپّر؟

حق تعالیٰ کرے اقبال ترا روز افزوں　　تیرے انصاف سے آباد ہوں ساتوں کشور

تجھ پہ ہر لحظہ بلا ریب ہے امدادِ خدا　　جلوہ گر ذات سے تیرے ہے عجائب مظہر

چاہِ بیژن میں گرے یا چہِ بابل میں پڑے　　کھائے دشمن ترا اس طور کی بیڈھب ٹھوکر

مُنّہ میں دشمن کے ترے قند ہو حنظل کا مزہ　　ہو محبّوں کے دہن میں ترے حنظل شکّر

نوشدارو بھی اگر کھائے باُمیدِ شفا　　مُنّہ میں دشمن کے ترے ہوئے بجائے کنکر

یوں کہا غیب سے ہاتف نے "یہ حج ہے منظور"　　فکرِ تاریخ میں جب نیچے کیا میں نے سر
۱۲۳۷ھ

اور گھر آنے کی تاریخ میں یہ بیت پڑھی،　　تہنیت دے کے مجھے اور تبسّم کر کر

حاجیانِ حرمِ کعبہ بہ آوانِ مجید　　آئے حج کر کے بڑی دھوم سے اب اپنے گھر

ہو حسن بھی ترے الطاف سے ممنون سدا　　رہے جمعیتِ باطن سے نہایت خوشتر

رائے بریلی کا آخری قیام رمضان ۱۲۳۹ھ سے ۷ جمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ تک ایک سال دس مہینے رائے بریلی قیام رہا۔[1] یہ زندگی کا آخری قیام تھا۔ اس زمانۂ قیام کے اہم مشاغل میں سے مکانوں کی

---

(۱) "منظورہ"۔ اس موقع پر مصنّف سے شمار میں سہو ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں، "ہجرتِ امیر المؤمنین از وطنِ مالوف بعدِ یک سال و دہ ماہ واقع شد، چہ آنجناب در اواخرِ شعبان یا غرّۂ رمضان ۱۲۳۹ھ یک ہزار و دو صد و سی و نہ ہجری در وطن رونق افروز شدہ بود و در سالِ دیگر بتاریخِ ہفتم جمادی الثانیہ ۱۲۴۰ھ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری روزِ دوشنبہ از دولت خانۂ ہدایت کاشانہ برآمدہ عقبۂ دریائے سئی کردہ در خیمہ شب باش شدند" (صفحہ ۲۷۵)۔ یہاں ۱۲۴۰ھ کے بجائے ۱۲۴۱ھ ہونا چاہیے۔

مرمت، مساجد کی تعمیر، جہاد کی ترغیب و دعوت اور رفقا کی ایمانی اور عملی تربیت ہے۔

مکانوں کی مرمت مولوی سید محمد علی "مخزنِ احمدی" میں لکھتے ہیں کہ "سید صاحبؒ کی غیر موجودگی میں مکاناتِ مسکونہ شکستہ اور مرمت طلب ہو گئے تھے اور برسات کا موسم قریب تھا۔ آپ نے اپنے رفقا کے ساتھ ان آبائی مکانات کی مرمت اور درستی فرمائی اور قلیل مدت میں اس سے فراغت حاصل کر لی۔"(۱)

مساجد کی تعمیر اسی زمانۂ قیام میں اقربا نے عرض کیا کہ مولوی سید محمد اسحٰق مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ وسعت دیتا، تو لوہانی پور میں بلند خاں کی مسجد کی از سرِ نو تعمیر کرتے۔ آپ نے یہ سُن کر اس مسجد کی تعمیر کا ارادہ فرمالیا۔ اس بستی میں آپ کے بہت مرید تھے۔ وہاں کے رؤسا نے مسجد کے لیے بہت سی اینٹیں دیں۔ باقی آپ نے خرید فرمائیں اور معمار مقرر کیے۔ محمد زماں خاں زمیندار لوہانی پور کو، جو آپ کے مرید تھے، اس کا مہتمم و نگران مقرر کیا۔ ان کے ساتھ خود کام میں شریک ہوتے۔ محرم ۱۲۴۰ھ میں کام شروع ہوا اور دو تین مہینے کے قلیل عرصے میں وہ مسجد بن کر تیار ہو گئی۔(۲)

ایک دوسری مسجد شیخوں کے محلے میں شہر رائے بریلی میں تعمیر کرائی۔ دونوں مسجدوں کی تیاری کے بعد آپ ان مسجدوں میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نمازِ نفل پڑھی اور امام کا تقرر فرمایا۔ جن لوگوں نے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، ان کو مبارکباد دی اور اس کارِ خیر کی فضیلت اور بشارتیں سنائیں۔(۳)

عملی و روحانی تربیت گاہ ایک سال دس مہینے کی یہ مدت ایک ایسی فضا اور ماحول میں گزری، جس میں ایک طرف دینی جذبات اور ایمانی کیفیات کی ترقی اور نشوونما کا سامان تھا اور دوسری طرف جفاکشی، مجاہدۂ سادہ اور سپاہیانہ زندگی اور خود شکنی کی تعلیم۔ یہی دو سرچشمے ہیں، جن سے

(۱) "مخزنِ احمدی"، صفحہ ۱۱۶ (۲) اس مسجد کے حسابات کے کاغذات میں محرم و صفر ۱۲۴۰ھ کی تاریخیں اور مزدوروں کے نام اور مزدوری کی تفصیل درج ہے۔ (۳) "وقائعِ احمدی"، صفحہ ۲۲۷، ۲۲۸

جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی قوّت اور توفیق پیدا ہوتی ہے۔ جماعت، جو اس وقت کئی سو افراد پر مشتمل تھی اور امیرِ جماعت ایک طرف ذکر و نوافل، تذکیر و دعوت میں مشغول تھے، دُوسری طرف فنونِ حرب اور محنت و مشقت کے کاموں میں مستعد اور چاق چوبند تھے۔ ان کو کسی کام سے عار نہ تھی، اور وُہ کسی محنت اور جفاکشی سے عاجز نہ تھے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کہ نکیے پر ان بندگانِ خدا کے شب و روز کس طرح گزرتے تھے اور بلند مقصد، رضائے الٰہی کے شوق اور رہبرِ کامل کی صُحبت نے ان میں کیا انقلاب اور کس درجے کا عشق اور مستی پیدا کر دی تھی، یہاں مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی[(۱)] کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری "الدر المنثور" میں لکھتے ہیں:۔

حینِ قیامِ بریلی، جناب مولانا، حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کی جماعت میں داخل تھے اور اُن سے حدیث بھی پڑھا کرتے تھے۔ مولانا شہید نے اپنی جماعت میں اُن کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا، مگر جناب مولانا کو جو ایمانی مزہ حاصل ہُوا تھا، تو اپنی جماعت والوں کی آپ خدمت کیا کرتے تھے۔ اب وُہ پٹنے کے بانکے اور ناز و نعم بہار کے لاڈلے، خمرِ محبتِ ایمانی سے مخمُور ہو کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اپنے سر پر لایا کرتے تھے۔ کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے، مٹی گارے کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے اور جب اپنی جماعت کے کام سے فرصت پاتے، تو سیّد صاحبؒ کی صُحبت میں جا بیٹھتے یا تنہا نماز اور دعا میں مشغُول رہتے۔ انھیں ایّام میں جب آپ بمقامِ بریلی تحصیلِ حُبِّ ایمانی میں مصرُوف تھے، آپ کے والدِ ماجد مولوی فتح علی صاحب نے ایک خدمتگار

---

(۱) اُوپر گزر چکا ہے کہ مولانا ولایت علی سفرِ حج سے سیّد صاحبؒ کی واپسی پر پٹنے سے ہمراہ ہو گئے تھے۔ سیّد عبدالرحمٰن نے اس پر اپنے اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ یہ صاحب ضرُور ہم پر بار ہوں گے اور سیّد صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ نہیں، یہ بڑے پُرانے رفیقوں سے بھی بازی لے جائیں گے۔ "منظُورہ" سے تصریحاً معلوم ہوتا ہے اور "الدر المنثور" سے، جو مولانا کے عزیزِ قریب کی لکھی ہُوئی ہے، مترشح ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی صاحب کا قیام رائے بریلی میں سیّد صاحبؒ کے پاس سفرِ حج سے واپسی پر ہُوا ہے۔ ملاحظہ ہو "الدر المنثور" (تذکرۂ صادقہ) صفحہ ۹۳، ۹۴

کو، جو بچپن سے آپ کی خدمت میں رہتا تھا، چار سو روپے نقد اور دس پندرہ عمدہ
کپڑے اور جوتے وغیرہ ضروری اسباب دے کر آپ کے پاس بریلی کو روانہ کیا تھا۔ جب
وہ نوکر مع اسباب کے بریلی میں پہنچا، تو اُس نے قافلے میں جا کر پوچھا کہ: "پٹنے
والے مولوی ولایت علی صاحب کہاں ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ: "دریا کے کنارے پر
مٹی کا کام کر رہے ہیں۔" وہ نوکر دریا کے کنارے پر پہنچا۔ وہاں بہت سے لوگ
گارے مٹی کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ اُن میں جناب مولانا بھی سیاہ رنگا ہوا ایک
موٹا تہبند باندھے ہوئے اور گارے میں لتھڑے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے۔ اُن
ایام میں آپ کی صورت ایسی متغیّر ہو گئی تھی کہ اُس قدیمی نوکر نے، جو تیس برس
آپ کا خدمتگار رہ چکا تھا، آپ کو نہیں پہچانا۔ خود مولانا سے اُس نے پوچھا کہ:
"پٹنے والے مولوی ولایت علی صاحب کہاں ہیں؟" آپ نے فرمایا کہ: "بھائی،
ولایت علی تو میرا ہی نام ہے۔" اُس نے بہت غصے ہو کر کہا کہ: "میں تم کو نہیں کھوجتا
ہیں اُن ولایت علی کو کھوجتا ہوں، جو مولوی فتح علی صاحب صادق پوری عظیم آبادی کے
صاحبزادے ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ: "بھائی، صادق پوری ولایت علی تو میں ہی ہوں۔"
وہ نوکر اور بھی خفا ہوا اور بولا کہ: "تم مجھ سے ہنسی کرتے ہو۔" جب آپ نے دیکھا کہ
اس کو ہرگز یقین نہیں ہوتا، تو آپ نے فرمایا: "اچھا، جاؤ، قافلے میں تلاش
کرو۔" جب وہ اودھر گیا اور دریافت کیا، تو ہر شخص نے آپ ہی کی طرف اشارہ کیا کہ
مولوی ولایت علی عظیم آبادی تو وہی شخص ہیں، جن سے تم دریا کے کنارے بات کر آئے
ہو۔ تب وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا اور اپنی جسارت پر نادم ہو کر معافی چاہی۔ آپ نے
اُس کو گلے سے لگا لیا اور بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اُس نے وہ خطوط سمیت روپے
وغیرہ آپ کے حوالے کیے اور عرض کی کہ: "ان کپڑوں کو پہنیے اور روپوں کو اپنے خرچ
میں لائیے"، کیونکہ وہ نادان سمجھتا تھا کہ خرچ نہ ہونے کے باعث آپ کی ایسی صورت

ہو رہی ہے اور آپ کی پہلی کیفیت اور پوشاک وغیرہ کو یاد کر کے وُہ زار زار
رونے لگا۔ آپ نے اُس کی تسلی کر کے اُس کو چپ کیا۔ جب رات ہوئی، آپ
وُہ روپے اور کپڑے وغیرہ، جیسے بندھے ہوئے آئے تھے، ویسے کے ویسے ہی
لے کر سید صاحبؒ کے حضور میں حاضر ہوئے اور اُن سب کو آپ کے سامنے رکھ کر
خاموش اُٹھ کر چلے آئے اور دُوسری فجر کو اُسی کُہنہ تہبند سے اپنا معمُولی کام	۵
کرنے لگے۔ تین چار روز تک وُہ نوکر وہاں رہ کر اس بات کا منتظر رہا کہ مولوی صاحب
وُہ عُمدہ کپڑا آمدۂ پٹنہ زیبِ تن فرما کر میرے پژمُردہ دل کو خُوش کریں گے، لیکن اُس
نے دیکھا کہ مولوی صاحب کی حالت میں ذرا بھی تغیّر نہ ہُوا۔ آخر چند روز کے بعد مولوی
صاحب نے اُن کو رُخصت کر دیا۔ اُس نے یہ ساری کیفیت پٹنے میں آ کر بیان کی کہ
جس کے سُننے سے صاحب دلوں کو سرُور اور بے خبروں کو رنج ہُوا ؎	۱۰

دیوانہ کُنی، ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند؟

اے مرغِ سحر، عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیان در طلبش بے خبرانند	۱۵
کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد (سعدیؒ)

اس کیفیت کو سُن کر آپ کے والدِ ماجد مولوی فتح علی صاحب اپنے فرزند
مولوی فرحت حسین صاحب سمیت خُود بریلی پہنچے اور ایک مدّتِ دراز تک سید
صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر فیض یاب ہُوئے۔ پھر جب سید صاحبؒ بطرفِ ملکِ
انغانستان ہجرت کر کے جانے لگے، تو مولوی فتح علی صاحب کو بوجہِ کبرسنی اور	۲۰
مولوی فرحت حسین کو بوجہِ صغرسنی پٹنے کو واپس کر دیا اور اُن کو خلافت اور بیعت

لینے کی اجازت عطا کی۔ مولوی ولایت علی صاحب مع مولوی عنایت علی و مولوی طالب علی صاحب اپنے حقیقی بھائیوں اور مولوی باقر علی صاحب، مولوی قمر الدین صاحب و میر عثمان علی صاحب اپنے قرابت داروں کے ہمرکاب سید صاحب رح ملکِ خراسان کو روانہ ہو گئے۔[1]

(۱) "الدر المنثور فی تراجم اہلِ صادق فور" (تذکرۂ صادقہ) از مولوی عبدالرحیم صادقپوری رح، صفحہ ۹۴ - ۹۶

سولھواں باب

جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب

یہاں سے سید صاحبؒ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، جس کی سُرخی "آپ کی کتاب میں سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہ ہجرت و جہاد کا باب ہے۔

مقاصد و اسباب اس جدّ و جہد کے اصل مقاصد، محرکات اور اسباب کیا تھے؟ بجائے اس کے ۵
کہ ہم اپنی زبان سے بیان کریں، بہتر یہ ہے کہ خود سید صاحبؒ کی زبان سے سُنیں۔ اس سلسلے میں آپؒ نے اپنے خطوط و مکاتیب میں اپنے اصلی جذبات و خیالات کا اظہار جابجا فرمایا ہے اور اُن اسباب کا ذکر کیا ہے، جو اندرونی طور پر اس عظیم مہم کے محرک و باعث ہوئے۔ آپؒ کی قلبی کیفیات و عزائم معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس آپؒ کے مکاتیب و ارشادات سے زیادہ کوئی قابلِ وثوق اور مستند ذریعہ نہیں۔ ذیل میں ان تحریرات کے چند اقتباسات ۱۰
پیش کیے جاتے ہیں، جن کی مدد سے ہم آپؒ کی عظیم الشان دعوت اور جدّ و جہد کے حقیقی مقاصد و محرکات کو مفصل و مرتب طریقے سے معلوم کر سکتے ہیں اور ہمیں کسی قیاس آرائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی:-

تعمیلِ حکم فقیر را از تمامِ ایں جدّ و جہد ہمیں معنی منظور است کہ احکامِ الٰہیہ کہ در مقدمۂ قتالِ اہلِ کفر و ضلال وارد شدہ چنانچہ کلمۂ "جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ"

اس تمام جدّ و جہد سے فقیر کا مقصود صرف یہ ہے کہ اہلِ کفر و ضلالت سے جنگ کرنے کے بارے ۱۵
میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمانِ خداوندی "جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ" (اپنے مال

ودر کلامِ مجید واقع گردیدہ از فقیر صورت بندد۔ بلکہ
بندۂ اطاعت شعار را بجز امتثالِ اوامرِ مولائے
خود چارہ نیست۔ (مکتوب بنامِ سردار یار محمد خان)

و جان کے ساتھ جہاد کرو) کی تعمیل کی صورت پیدا
ہو۔ فرماں بردار بندے کے لیے اپنے مالک کے حکم کی
تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔

فقیر بر ہمیں مواعیدِ الٰہیہ اعتماد نمودہ
و امتثالِ احکامِ خود را قبلۂ ہمت ساختہ و جمیع
ماسوی اللہ را پسِ پشت انداختہ و از چپ و
راست چشمِ ہمت بستہ و راہِ راست رضائے
مولائے خود پیشِ رُو نہادہ بکمالِ اطمینان و
فرحت و غایتِ بشارت و مسرت دریں راہ
تگاپو می نماید۔ (ایضاً)

فقیر نے اللہ کے وعدوں پر اعتماد کیا اور
حکمِ حاکم (خداوندِ عالم) کی تعمیل کو اپنا مرکزِ
توجہ بنایا، ماسوی اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا، گرد
و پیش سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور رضائے
مولیٰ کی راہِ راست کو سامنے رکھ کر کمالِ اطمینان،
فرحت اور بشارت و مسرت کے ساتھ اس
راستے پر چلا جا رہا ہے۔

فقیر را امتثالِ حکمِ الٰہی از تہِ دل مقصود
است و اعتماد بوعدۂ الٰہیہ بہر طریق ظاہر خواہد
گردید۔ پس بندۂ عبودیت شعار را چہ یارا کہ
از مالکِ خود پرسد کہ وعدۂ خود را بچہ
طریق ایفا خواہی کرد کہ ایں سوال خارج از
قانونِ عبودیت است۔ (ایضاً)

فقیر کو حکمِ الٰہی کی تعمیل تہِ دل سے مقصود
ہے اور اللہ کے وعدے پر اعتماد ہے۔ باقی اس
کی شکل کیا ہوگی؟ غلام کی کیا مجال کہ وہ اپنے مالک
سے پوچھے کہ وہ اپنے وعدے کا ایفا کس
صورت سے کرے گا کہ یہ سوال آئینِ بندگی
کے خلاف ہے۔

چوں ما مردم کہ از بندگانِ پروردگار
و اُمتیانِ رسولِ مختارؐ دعوائے اسلام می داریم

ہم لوگ خدا کے بندے اور رسولؐ کی
اُمت ہیں۔ بلاشبہ اسلام کا دعوٰی رکھتے ہیں اور

وجانِ خود را در محمدیان می شماریم، چوں کلام اللّٰہ را برایں معنی ناطق دانستیم و رسول اللّٰہ را صادق، لامحالہ محض للّٰہ فی اللّٰہ امتثالاً لامر اللّٰہ کمرِ ہمت بربستیم و اتباعاً لسنۃ رسول اللّٰہ بر اسپِ سفر نشستیم۔ (مکتوب عام بنام علماء و رؤسائے سرحد)

اپنے کو پیروانِ رسولؐ میں شمار کرتے ہیں۔ جب ہم نے اس بات (جہاد) پر کلامِ الٰہی کو ناطق مان لیا ہے اور نبی کریمؐ کو سچا سمجھ لیا ہے، لامحالہ ہم نے اللہ اور اس کے حکم کی بجاآوری کے لیے کمرِ ہمت باندھی ہے اور اسوۂ رسولؐ کے اتباع میں سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ۵

رضاء محبتِ الٰہی

محض طالبِ رضاے حق ہستیم۔ از غیرِ او چشم و گوش بربستیم و از دنیا و مافیہا دست برداشتیم و محض لوجہ اللّٰہ علمِ جہاد برافراشتیم و ما از طلبِ مال و منال و جاہ و جلال و امارت و ریاست و حکومت و سیاست بر جستیم و ہرگز طالبِ غیرِ حق نیستیم۔ (مکتوب عام بنام علماء و رؤسائے سرحد)

ہم محض رضائے الٰہی کے آرزومند ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں۔ ہم نے محض اللہ کے لیے علمِ جہاد بلند کیا ہے۔ ہم مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست، حکومت و سیاست کی طلب و آرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔ خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں۔ ۱۰

مائیم ہرچند عاجز و خاکسار و ذرۂ بے مقدار، امّا بلاشک در محبتِ حضرتِ حق مست و سرشار و از محبتِ غیرِ حق دستبردار (ایضاً)

اگرچہ ہم عاجز و خاکسار، ذرۂ بے مقدار ہیں، لیکن بلاشک محبتِ الٰہی سے سرشار اور غیرِ خدا کی محبت سے بالکل دستبردار ہیں۔ ۱۵

و ایں ہمہ محض للّٰہ فی اللّٰہ است۔ وسوسۂ شیطانی و شائبۂ ہوائے نفسانی بایں داعیۂ رحمانی اصلاً مخلوط نگردیدہ۔ ہر چند ایں معنی بر

یہ سب کچھ محض اللہ کے لیے ہے۔ اس جذبۂ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے کا شائبہ بھی نہیں۔ اگرچہ یہ بات تقدیر کے اکثر واقفانِ حال

اکثر واقفانِ حالِ فقیر ظاہر و باہر است،
امّا بر سبیلِ مزید تاکید بطریقِ تجدید می گوید کہ
خدائے پاک ما، جلّ شانُہٗ، کہ دانندۂ نہان و
آشکار و محیط بجمیعِ خفیات و اسرار است گواہ
می کنم برایں معنیٰ کہ آنچہ داعیۂ جہاد با اہلِ کفر
و عناد از دلِ فقیر جوش می زند، اصلاً و مطلقاً
بوجہٍ من الوجوہ بکدورتِ مال و عزت و جاہ و
حشمت و امارت و سلطنت و نام و نشان و
ترفّع بر اخوان و اقران، بالجملہ بطلبِ چیزے
کہ سوائے رضائے مالکِ حقیقی باشد، ہرگز ہرگز
ممزوج نیست واللہ علیٰ ما نقول وکیل۔
(۲۸: ۲۸)۔ (بنامِ علماء و مشائخ و اُمرائے ہندوستان)

پر ظاہر ہے، لیکن مزید تاکید کے لیے
پھر نئے سرے سے کہتا ہوں کہ میں خدائے
علّام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور
دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد فقیر کے دل
میں موجزن ہے، اس میں رضائے الٰہی
اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا عزت
و جاہ و مال و دولت، شہرت و ناموری،
امارت و سلطنت، برادران و معاصرین
پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز
کا فاسد خیال ہرگز مل نہیں ہے۔ اور
ہم جو بات کہہ رہے ہیں، اللہ اُس
کا گواہ ہے"۔

مسلمانوں کی بے بسی اور اہلِ کفر کا غلبہ

ہر چند قتالِ اہلِ کفر و طغیان در ہر زمان و ہر مکان لازم
است، الّا دریں جزوِ زمان کہ شورشِ اہلِ کفر و
طغیان از حد گزشتہ کہ فریادِ مظلوماں از
دستِ تظلمِ ایشاں سر بفلک کشیدہ و تخریبِ
شعائرِ اسلام از دستِ تعدیٔ ایشاں ہویدا
گردیدہ، پس بریں تقدیر اقامتِ ایں رکنِ
رکین، یعنی، مقاتلۂ مشرکین بر ذمّۂ جمہورِ مسلمین

اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے اور
ہر مقام میں جنگ کرنا لازم ہے، لیکن
خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ
اہلِ کفر و طغیان کی سرکشی حد سے گزر چکی
ہے، مظلوموں کی آہ و فریاد کا غلغلہ بلند ہے،
شعائرِ اسلام کی توہین ان کے ہاتھوں صاف نظر
آ رہی ہے۔ اس بنا پر اب اقامتِ رکنِ دین یعنی
اہلِ شرک سے جہاد عامۂ مسلمین کے ذمے کہیں

در ایں ایام اوکد و واجب گردیدہ۔ (بنامِ شہزادہ و سادات و علماء و مشائخ ہندوستان)

زیادہ مؤکد اور واجب ہو گیا ہے۔

ہندوستان پر کفار کا تسلط اور اسلام کا زوال

قضارا از مدتِ چند سال حکومت و سلطنتِ ایں ملک برایں عنوان گردیدہ کہ نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکینِ بدمآل بر اکثرِ بلادِ ہند استیلا یافتند و آں دیار را بظلماتِ ظلم و بیداد مشحون ساختند و در آں بلاد و امصار رسومِ کفر و شرک اشتہار یافتہ، شعائرِ اسلام را رو بہ استتار آوردہ، ناگزیر سینۂ بے کینہ بمعاینۂ ایں حال پر از رنج و ملال بود، بشوقِ ہجرت مالامال، غیرتِ ایمانی بدل در جوش بود و اقامتِ جہاد بسر خروش۔ (بنامِ شاہ سلیمان[1])

تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائی اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائرِ اسلام اٹھ گئے۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامنگیر ہوا، دل میں غیرتِ ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے۔

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط

بر رائے سامی روشن و مبرہن است کہ بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمین و زمن گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ امارتِ امرائے کبار و ریاستِ رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبارِ ایشاں بالکل ربودہ۔ چوں

جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے، دنیا جہان کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت و سیاست کے

(۱) غالباً والیِ کاشغار (چترال)

اہلِ ریاست و سیاست در زاویۂ خمول
نشستہ اند، ناچار چندے از اہلِ فقر و مسکنت
کمرِ ہمت بستہ۔ ایں جماعتِ ضعفا محض بنا
بر خدمتِ دینِ ربّ العالمین برجستند۔ ہرگز
۵ ہرگز از دُنیا دارانِ جاہ طلب نیستند۔ محض بنا
بر خدمتِ ربِّ ذوالجلال برخاستہ اند، نہ بنا بر
طمعِ مال و منال۔ (بنامِ راجہ ہندو راؤ، وزیرِ گوالیار)

مردِ میدان تھے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس لیے مجبوراً چند غریب و بے سروسامان کمرِ ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دُنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اُٹھے ہیں، مال و دولت کی اُن کو ذرہ بھر طمع نہیں۔

اکثر بلادِ ہندوستان بدستِ بیگانگاں
اُفتادہ و ایشاں ہر جا بُنیادِ آئینِ جور و ظُلم
۱۰ نہادہ۔ ریاستِ رؤسائے ہندوستان برباد
رفتہ۔ کسے تابِ مقاومتِ ایشاں نمی دارد،
بلکہ ہر کس ایشاں را آقائے خُود می شمارد و
چُوں رؤسائے کبار از مقابلۂ ایشاں نشستند،
لاچار چند کس از ضُعفائے بے مقدار
۱۵ کمر بستند۔ (بنامِ غلام حیدر خاں)

مُلکِ ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور اُنھوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی۔ کسی کو اُن سے مقابلے کی تاب نہیں، بلکہ ہر ایک اُن کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چُونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت اُن کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں، اس لیے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑہ اُٹھایا۔

اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے سُنّت اور بلادِ اسلامیہ کا استخلاص

مقصود از تمام ایں معرکہ پیرائی
و عربدہ آرائی غیر از اعلائے کلمۂ ربّ العالمین
و احیائے سُنّتِ سیدالمرسلین و استخلاص

اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آزمائی کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، رسُول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلّم، کی سُنّت زندہ ہو اور

بلادِ مؤمنین از دستِ کفار و مشرکین امرِ دیگر نیست۔ (بنامِ شاہ سلیمان)

مسلمانوں کا ایک ملک کفار و مشرکین کے قبضے سے نکل آئے۔ اس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔

ایں فقیر بتحصیلِ مال و منال و تصرفِ بلاد و امصار غرضے ندارد۔ ہر کہ از اخوانِ مؤمنین استخلاصِ بلاد از دستِ کفار و مشرکین نمودہ در اجرائے احکامِ رب العالمین و افشائے سنتِ سید المرسلین کوشید و قوانینِ شریعت در ریاست و عدالت سعی داشت، مقصودِ فقیر حاصل گشت و تیرِ سعی من بہدف نشست۔ (بنامِ شاہ سلیمان)

اس فقیر کو مال و دولت اور حصولِ سلطنت و حکومت سے کچھ غرض نہیں۔ دینی بھائیوں میں سے جو شخص بھی کفار کے ہاتھوں سے ملک کو آزاد کرکے، رب العالمین کے احکام کو رواج دینے اور سید المرسلین، صلی اللہ علیہ وسلم، کی سنت کو پھیلانے کی کوشش کرے گا اور ریاست و عدالت میں قوانینِ شریعت کی رعایت و پابندی کرے گا، فقیر کا مقصود حاصل ہو جائے گا اور میری کوشش کامیاب ہو جائے گی۔

دین کا قیام سلطنت سے ہے

فی الواقع بمقتضائے "الملک والدین توأمان" گر ایں کلام قابلِ احتجاج نباشد، لیکن موافقِ مدعا است کہ قیامِ دین بملک است و احکامِ دینیہ کہ تعلق بحکومت دارند، بوقت نبودنِ مملکت صاف از دست می روند و خرابیِ امورِ مسلمین و ذلت و نکبتِ ایشاں از دستِ کفارِ متمرداں و اہانتِ شعائرِ مقدسہ و تخریبِ معابد و مساجدِ مسلمین کہ می شود، پر ہویدا است۔ (مکاتیب)

حقیقت میں مطابق مقولہ "سلطنت و مذہب جڑواں ہیں" اگرچہ یہ قول حجتِ شرعی نہیں، لیکن مدعا کے موافق ہے کہ دین کا قیام سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام، جن کا تعلق سلطنت سے ہے، سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کاموں کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھوں اُن کی ذلت و نکبت اور شریعتِ مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مساجد و معابد کی تخریب جو ہوتی ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔

احکامِ شرعی کا نفاذ

این جانب را از قبولِ
این منصب غیر از اقامتِ جہاد بر وجہِ
مشروع و حصولِ معنیِ انتظام در عساکرِ اہلِ
اسلام غرضِ دیگر از اغراضِ نفسانیہ مثلِ
حصولِ خزائنِ درہم و دینار یا تسلّط بر بلاد
و امصار یا حصولِ معنیِ سلطنت و ریاست،
یا تذلیلِ اہلِ ریاست و وجاہت یا تنفیذِ
احکامِ خود بر سائرِ اخوان یا حصولِ امتیازِ خود
از سائرِ اقران اصلاً و مطلقاً درمیان
نیست، بلکہ آرزوے این امر گاہے نہ
بر زبان جاری می گردد و نہ خیالِ آں در
دل می گذرد و تاجِ فریدوں و تختِ
اسکندر بجوے نمی شمارم و
مملکتِ کسرٰے و قیصر بخیال ہم
نمی آرم۔ آرے این قدر آرزو دارم
کہ در اکثر افرادِ بنی آدم، بلکہ جمیع اقطارِ
عالم احکامِ حضرتِ ربّ العالمین کہ مسمّٰی بشرعِ
متین است بلا منازعتِ احدے نافذ گردد، خواہ
از دستِ من، خواہ از دستِ کسے دیگر۔ پس ہر
حیلہ کہ باعثِ حصولِ این معنی باشد، بروے
کار می آرم و ہر تدبیریکہ دریں مقدمہ می باشد،

میرا اس منصب (امامت) کے قبول کرنے
سے اس کے سوا کوئی مقصود نہیں کہ جہاد کو شرعی
طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی
فوجوں میں نظم قائم ہو۔ اس کے سوا کوئی
دوسری نفسانی غرض، مثلاً روپے پیسے کے
خزانے یا ملکوں اور شہروں پر تسلّط یا حصولِ
سلطنت و ریاست یا اہلِ حکومت و صاحبِ
اقتدار لوگوں کی تذلیل یا اپنے ہمسروں
پر اپنے احکام کا اجرا یا اپنے
ہم عصروں پر فوقیت و امتیاز قطعاً و بالکلیّہ
شامل نہیں، بلکہ ایسی بات نہ کبھی زبان
پر آتی ہے، نہ کبھی خیال میں گزرتی ہے۔
تاجِ فریدوں و تختِ سکندری کی قیمت میرے
نزدیک ایک جَو کے برابر بھی نہیں۔ کسریٰ و
قیصر کی سلطنت بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ہاں
اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی، بلکہ
تمام ممالکِ عالم میں ربّ العالمین کے احکام،
جن کا نام شرعِ متین ہے، کسی کی مخالفت کے
بغیر جاری ہو جائیں، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ
کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ پس ہر ترکیب،
تدبیر، جو اس مقصد کے حصول کے لیے

می آرم۔ (بنام سردار سلطان محمد خان و سردار سید محمد خان)

مفید ہوگی، عمل میں لاؤں گا۔

زبانی دعوت و تبلیغ جہاد کے بغیر ممکن نہیں

از انجا کہ دعوتِ لسان بدونِ انضمامِ جہادِ سیف و سنان کامل و تام نمی گردد، لہٰذا امامِ ہادیان و رئیسِ داعیان، یعنی، سیدِ وُلدِ عدنان علیہ الصلوٰۃ والسلام، آخرِ کار بقتالِ کفار مامور گردیدند و ظہورِ شعائرِ دینِ متین و علوِّ اعلامِ شرعِ مبین از اقامتِ ایں رکنِ رکین صورت بست۔ (سادات، علماء، مشائخ و امرائے ہندوستان کے نام)

چونکہ زبانی دعوت و تبلیغ شمشیر و سنان سے جہاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اس لیے رہنماؤں کے پیشوا اور مبلغوں کے سردار محمد رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، آخر میں کفار ۵ سے جنگ کرنے کے لیے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت اور شریعت کی سربلندی و ترقی اسی رکنِ جہاد کی اقامت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی۔

عزمِ راسخ

عزمِ ادائے عبادتِ عظمیٰ و ادراکِ ایں سعادتِ علیا بوجہے در خاطرِ ایں فقیر القا کردہ اند کہ صرفِ جان و مال و ترکِ اہل و عیال و مہاجرتِ اخوان و اوطان در جنبِ سرانجام دادنِ ایں امرِ عظیم و اتمامِ ایں مہمِ فخیم مثلِ راندنِ مگسِ ناپاک و برتافتنِ خس و خاشاک می نماید۔ (علماء، مشائخ و شرفاء و امراء کے نام)

۱۰ اس عبادتِ عظمیٰ کا ادا کرنا اور سعادتِ عالیہ کے حصول کا عزم اس طرح اس فقیر پر القا کیا گیا ہے کہ اس عظیم المرتبت کے کام کے انجام دینے میں جان و مال قربان کر دینا، اہل و عیال کو خیرباد کہنا اور وطن سے ہجرت کر جانا، ناپاک مکھیوں کو ہانکنے اور خس و خاشاک کو دور کرنے ۱۵ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔

ما مردم تا جان در بدن داریم و سر بر تن، مشغولِ ہمیں کار و بادیم بصد حیلہ و فن

جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہمارے سر جسموں کے ساتھ ہیں، ہم بصد حیلہ و فن

امّا بصد زبان شکرِ حق بجامی آریم کہ با طاعتِ مالکِ خود شغل داریم و محض طالبِ رضائے حق ہستیم۔ (مکتوبِ عام علماء و رؤسائے سرحد کے نام)

اسی سودے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے مالک کی اطاعت میں مشغول ہیں اور محض رضائے الٰہی کے آرزو مند۔

ہماری جنگ صرف اہلِ کُفر سے ہے

نہ با کسے از امرائے مُسلمین منازعت داریم، نہ با کسے از رؤسائے مؤمنین مخالفت۔ با کُفّارِ لئام مقابلہ داریم، نہ با مدّعیانِ اسلام۔ با دراز مُویان، بلکہ با سائرِ کُفر جُویان مُقابلہ خواہیم، نہ با کلمہ گویان و اسلام جُویان۔ (مکتوبِ عام علماء و رؤسائے سرحد کے نام)

ہمارا جھگڑا اُمرا و رؤسائے اسلام سے نہیں ہے، بلکہ ہم کو لانبے بال والوں، بلکہ تمام فتنہ انگیز کافروں سے جنگ کرنا ہے، نہ کہ اپنے کلمہ گو بھائیوں سے اور ہم مذہب مُسلمانوں سے۔

مقصودِ اصلی ہندوستان ہے

بعد از پاک کردنِ بلاد از انجاسِ مشرکین و الواثِ مُنافقین بمستحقینِ حکومت و سلطنت و مُستعدینِ ریاست و مملکت تفویض کردہ خواہد شد، امّا بشرطیکہ شُکرِ ایں انعامِ الٰہی بجا آورند و علی الدوام جہاد را بہر حال قائم دارند و گاہے معطّل نہ گذارند و در ابوابِ عدالت و فصلِ خصومات از قوانینِ شرعِ شریف سرِ مو تجاوز و تفاوت بمیان نیارند و از ظلم و فسق بکلّی اجتناب ورزند۔ باز خود ایں جانب مع مجاہدینِ

اس ملک (سرحد) کو مُشرکین کی نجاستوں سے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحقاق اور ریاست و انتظامِ سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسانِ خداوندی کا شُکر بجا لائیں گے اور ہمیشہ اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے اور کبھی اس کو موقوف نہیں کریں گے اور انصاف اور مقدمات کے فیصلے میں شرعِ شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز و انحراف نہیں کریں گے اور ظُلم و فسق سے کُلیتہً اجتناب کریں گے

صادقین بسمتِ بلادِ ہندوستان بنا برازالۂ کفر و طغیان متوجہ خواہد شد کہ مقصودِ اصلی خود اقامتِ جہاد بر ہندوستان است، نہ توطّن در دیارِ خراسان۔ (بنامِ شاہزادہ کامران)

اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کروں گا تاکہ اس کو شرک و کفر سے پاک کیا جائے، اس لیے کہ میرا مقصودِ اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملکِ خراسان (سرحد و افغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔ ۵

"صراطِ مستقیم" میں، جو سید صاحبؒ کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے، جہاد کے برکات و منافع پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ نے سید صاحبؒ کی تقریر اور خیالات قلمبند کیے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ جہاد کو کس قدر بابرکت اور پُرمنفعت سمجھتے ہیں اور اس کو عام زندگی اور انسانی بہبود کے لیے کس قدر ضروری اور اہم خیال کرتے ہیں۔ دین کے ارکانِ اربعہ کے ساتھ جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے فوائد و برکات اور روحانی، باطنی، ذہنی اور اخلاقی نتائج ۱۰ و اثرات کو بیان کرتے ہیں:۔

جہاد کے عمومی و خصوصی منافع

باید دانست کہ جہاد امریست کثیر الفوائد، عمیم المنافع کہ منفعتِ آں بوجوہِ متعددہ بہ جمہورِ انام می رسد بمثابۂ باراں کہ منفعتش نبات و حیوان و انسان را احاطہ کردہ و منافعِ ایں امرِ عظیم دو قسم است: منفعتِ عامہ کہ مؤمنینِ مطیعین و کفارِ متمردین و فساق و منافقین، بلکہ جن و انس و حیوان و نبات دراں اشتراک می دارند و منافعِ مخصوصہ بجماعاتِ خاصہ،

جس طرح بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بکثرت فوائد پہنچتے ہیں، اسی طرح جہاد سے عامۂ خلائق کو نفع پہنچتا ہے۔ ایک نفع تو وہ ہے جو اہلِ ایمان، فرمانبردار اور منکروں اور سرکشوں ۱۵ اور فاسقوں اور منافقوں کو یکساں پہنچتا ہے، بلکہ جن و انس، حیوانات و نباتات بھی اس میں شریک ہوتے ہیں اور ایک یہ کہ بعض خاص خاص جماعتوں اور بعض خاص خاص اشخاص کو ایک طرح کا نفع حاصل ہوتا ہے ۲۰

یعنی، بعضے اشخاص را منفعتے حاصل می شود
و بعضے دیگر را منفعتے دیگر۔

منفعتِ عامّہ اما منفعتِ عامّہ، پس
بیانش آں کہ بتجربۂ صحیحہ ثابت شدہ کہ بسبب
۵ عدالتِ حکّام و دیانتِ اہلِ معاملات و
سخا وجودِ اربابِ اموال و نیک نیتیِ جمہورِ
انام برکاتِ سماویہ مثلِ نزولِ باراں بروقت
و کثرتِ نباتات و نفاقِ مکاسب و معاملات
و دفعِ بلایا و آفات و نموّ در اموال و ظہورِ
۱۰ اربابِ ہنر و کمال بیش از بیش متحقق می گردد،
ہمچنیں مثلِ آں بلکہ صد چند ازاں بسببِ
شوکتِ دینِ حق و عروجِ سلاطینِ متدینین
ظہورِ شوکتِ ایشاں در اقطار و اکنافِ زمین و
قوّتِ عساکرِ ملّتِ حقہ و انتشارِ احکامِ شرع در
۱۵ قرائے و امصار بظہور می رسد۔

ہندوستان اور آزاد اسلامی ممالک کا مقابلہ چنانچہ
حالِ ہندوستان را با حالِ روم و توران در نزولِ
برکاتِ سماویہ باید سنجید۔

گزشتہ و موجودہ ہندوستان بلکہ حالِ ہندوستان
۲۰ را دریں جزوِ زمان کہ سنہ یک ہزار و دو صد و
سی و سوم است کہ اکثرش مدیں ایام دار الحرب

اور دُوسری جماعتوں اور دُوسرے اشخاص کو
دُوسری طرح کا۔

عمومی نفع کی تفصیل یہ ہے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ
اہلِ حکومت کے انصاف، اہلِ معاملات کی دیانتداری
اہلِ دولت کی سخاوت و فیّاضی اور عام لوگوں کی
نیک نیتی سے آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں، وقت
پر بارشیں ہوتی ہیں، پیداوار کی بُہتات ہوتی ہے،
فصلیں اچھی ہوتی ہیں، تجارت کا فروغ ہوتا ہے،
سامانِ تجارت کا چلن اچھا ہوتا ہے، بلائیں ٹلتی ہیں،
مالوں میں ترقی اور نموّ ہوتا ہے، اہلِ ہنر اور اربابِ
کمال بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، دینِ حق کی
قوّت و شوکت، دیندار سلاطین کے عُروج اور اطرافِ
ممالک میں اُن کی حکومت کی ترقی، ملّتِ حقّہ کے عساکر و
افواج کی قوّت اور احکامِ شریعت کی اشاعت و عمومیت سے
بدرجہا زیادہ نتائج و برکات ظاہر ہوتے ہیں۔

آسمانی برکتوں کے نزول کے
سلسلے میں رُوم اور ترکی سے ہندوستان کا
مقابلہ کر کے دیکھ لو۔

بلکہ موجودہ (۱۲۳۳ھ) ہندوستان،
جس کا بڑا حصہ دار الحرب بن چکا ہے، اُس کا مقابلہ
دو سو تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو،

گر دیدہ بحالِ ہمیں ولایت کہ پیش ازیں دو صد
یا سہ صد سال بودہ در نزولِ برکاتِ سماویہ و ظہورِ
اولیائے عظام و علمائے کرام قیاس باید کرد۔

منفعتِ مخصوص بمجاہدین امّا منافعِ مخصوصہ پس
حصولِ آں بہ نسبتِ شہدائے مومنین و غزاۃ
مسلمین و سلاطینِ ذوی الاقتدار و جوانمردانِ
کارزار مستغنی از بیان است۔

اصحابِ باطن امّا نسبتِ اربابِ بواطنِ صافیہ
پس حصولِ ترقیاتِ عظیمہ در اوقاتِ قلیلہ
و فوز بمراتبِ ولایت و مناصبِ وجاہت
بریاضاتِ یسیرہ است۔

علما و امّا بہ نسبتِ علما، پس انتشارِ علومِ
حقّہ و کثرتِ معلّمین و متعلّمین و فوزِ علما بمراتبِ
احتساب و قضا و اجتہاد و افتا و قیام
بر منصبِ امامتِ باطنہ، یعنی، دعوتِ عامّۂ
ظاہرہ بسوئے ملّتِ مقبولہ و حصولِ نیابتِ
انبیا بسبب نشرِ عقائدِ حقّہ و احکامِ مرضیّہ و
ظہورِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر است۔

عوامِ صلحا و امّا بہ نسبتِ عوامِ صلحا، پس
و فورِ رغبتِ ایشاں در صلاح و تقویٰ بسبب
اعزازِ اہلِ صلاح و اہانتِ اہلِ فجور و بسبب شہرتِ

آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا اور اولیائے
عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد
پائی جاتی تھی۔

باقی رہے خصوصی فوائد، تو شہدائے مومنین،
مسلمان مجاہدین، صاحبِ اقتدار سلاطین اور میدانِ ۵
کارزار کے جوانمردوں کو جو فوائد پہنچتے ہیں، اُن کی
تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ان کے علاوہ اربابِ باطن کو تھوڑے تھوڑے
وقت میں بڑی بڑی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں اور
معمولی ریاضتوں سے مراتبِ ولایت اور مناصب ۱۰
وجاہت پر فائز ہوتے ہیں۔

علومِ حقّہ کی عام اشاعت ہوتی ہے، معلّمین و
طلبہ کی کثرت ہوتی ہے۔ علما احتساب و قضا اور
اجتہاد و افتا کے عہدوں پر فائز اور امامتِ باطنی
کے منصب سے سرفراز ہوتے ہیں، یعنی دینِ حق کی طرف ۱۵
کھلی ہوئی عمومی دعوت اور عقائدِ حق اور احکامِ شریعت کی
اشاعت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے انبیاء
علیہم السلام کی نیابت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

عام اہلِ اصلاح بھی اس کے برکات سے محروم
نہیں رہتے۔ نیکوکاری اور خدا ترسی کا شوق ترقی کر جاتا ۲۰
ہے۔ اس لیے کہ نیکوکار انسانوں کا اعزاز ہوتا ہے،

اُمورِ محمودۂ مشروعہ و خمولِ اُمورِ مذمومۂ ممنوعہ و نیز تضاعُفِ اجرِ طاعاتِ ایشاں بسببِ انقیادِ سلاطینِ اہلِ اسلام و اکرامِ علماے ذَوِی الاحترام و اولیاے عظام بسببِ دخول در جماعاتِ عظیمۂ کافۂ اہلِ اسلام است۔

بداخلاق اَور فاجر انسانوں کی تذلیل کا زمانہ ہوتا ہے، مستحسن اَور شرعی باتوں کا فروغ ہوتا ہے، مذموم اَور ممنوع اُمور کا عام زوال ہوتا ہے، مُسلمان سلاطین کی اِطاعت اَور علماے کرام کی عِزّت اَور اولیاے عظام کی عقیدت اَور مُسلمانوں کے سوادِ اعظم میں شمُولیّت کی برکت سے اُن کی طاعات کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔

عوامِ مؤمنین

واما بہ نسبتِ عوامِ مؤمنین، پس حدوثِ نیّتِ صحیحہ در معاملات و میلان بسوے طاعات در قلوبِ ایشاں بسببِ انتشارِ انوارِ دینِ حق و الطافِ جوادِ مطلق و انقیاد در رسُومِ شرعیّہ بسببِ شہرتِ آں، اگرچہ تقلیداً باشد، و نیز رفاہتِ معاش بسببِ نزُولِ برکاتِ سماویّہ و بسببِ عدالتِ سلاطینِ ذَوِی الاقتدار و جود و کرمہاے سخاوت شعار و انتظامِ اُمورِ معاشیّہ و معادیّۂ ایشاں بسببِ مطبوع بودنِ قوانینِ شرعیّہ است۔

عام مُسلمان بھی اس کے برکات سے محرُوم نہیں رہتے۔ مُعاملات میں دُرستیٔ نیّت اَور اِطاعت کی طرف عام رغبت اَور شوق دِلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دین کے انوار ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے خاص الطاف و عنایات کا زمانہ ہوتا ہے، شرعی رسُوم و عادات کا ایسا چرچا اَور رواج ہوتا ہے کہ لوگ (خواہ تقلیدی طور پر) اُن کے پابند ہوتے ہیں، آسمانی برکتوں کے نزُول، سلاطین کے اِنصاف اَور اہلِ سخاوت کی فیاضی کی وجہ سے فارغ البالی اَور خوشحالی عام ہوتی ہے اَور قوانینِ شرعیّہ کی پابندی کی وجہ سے دُنیوی و اُخروی اُمور و معاملات دُرست اَور باقاعدہ ہو جاتے ہیں۔

فُسّاق

واما بہ نسبتِ فُسّاق و فُجّار، پس حصُولِ توبہ، یعنی، حدوثِ کراہت در قلوبِ ایشاں از فسق و فجور بسببِ سریانِ انوارِ ملّتِ حقّہ در قلوبِ بنی آدم و بسببِ

فُسّاق و فُجّار بھی اس کے برکات سے محرُوم نہیں رہتے۔ ملّتِ حقّہ کے انوار بنی آدم کے قلوب میں اس طرح ساری ہو جاتے ہیں اَور ملّتِ حق کی شہرت کی وجہ سے مذموم افعال کی قباحت عوام کے

رسوخِ شناعتِ افعالِ قبیحہ در عقولِ جمہورِ
انام بسببِ شہرتِ ملّتِ حقّہ و نیز دست
کشیدن از اظہارِ منکرات و بدعات
بسببِ خوفِ اقامتِ حدود و تعزیرات یا
خوفِ لحوقِ عار بسببِ طعنِ اخوان و ملامتِ
اقران بسببِ شہرتِ قبحِ منکرات و
بدعات است ۔

منافقین امّا بہ نسبتِ اہلِ نفاق، پس
استقامتِ ایشاں بر دینِ حق ظاہراً و عدمِ
دخولِ ایشاں در زمرۂ کفرۂ جہرہ بسببِ خوفِ
قتل یا بسببِ ملاحظۂ عزّتِ اہلِ ایمان و
ذلّتِ اہلِ طغیان و نیز امیدِ سرایتِ
نورِ ملّتِ حقّہ در جذرِ قلوبِ ایشاں
بسببِ انتشارِ انوارِ ملّتِ حقّہ و نزولِ
برکاتِ سماویّہ بسببِ ملاحظۂ شوکتِ
اہلِ اسلام و بسببِ مخالطت با اولیاے
عظام و علماے کرام و انعکاسِ انوار
و نفوذِ مواعظِ ایں بزرگواراں را در قلوبِ
ایشاں است ۔

ذمّی کفّار امّا بہ نسبتِ اہلِ
ذمّہ، پس رفاہتِ معیشت

دماغوں میں اس طرح راسخ اور جاگزیں ہو جاتی
ہے اور منکرات و بدعات کی قباحت ایسی مشہور
و مسلّم ہوتی ہے کہ حدود و تعزیرات کے خوف
یا ہمچشموں اور ہمسروں کے طعن و ملامت کے
اندیشے اور بدنامی کے خطرے سے فسّاق و ۵
فجّار منکرات و بدعات کے اظہار سے دستکش
ہو جاتے ہیں۔

اہلِ نفاق بھی اس کے برکات سے
محروم نہیں رہتے۔ وہ قتل کے خوف سے
یا اہلِ ایمان کے دبدبے اور غلبے اور سرکشوں ۱۰
کی ذلّت و نکبت کو دیکھ کر ظاہری طور پر دینِ حق
پر قائم رہتے ہیں اور کھلے ہوئے کافروں کے
زمرے میں شامل نہیں ہوتے، نیز دین کی روشنی کے
پھیل جانے اور آسمانی برکتوں کے نزول اور مسلمانوں
کی عظمت و شوکت دیکھ دیکھ کر اور اولیاے عظام اور ۱۵
علماے کرام کے ساتھ اختلاط اور رہنے سہنے کی وجہ سے
اور ان کے انوار کا ان کے قلوب پر عکس اور ان کے
مواعظ کا ان کے دلوں پر اثر پڑنے سے اس کی بھی
امید کی جاتی ہے کہ دین کا نور ان کے دلوں کی گہرائی میں اتر جائے گا۔

ذمّی کافر بھی، جو مسلمانوں کی رعیّت بن کر رہیں اور ۲۰
جزیہ دیں، اس کے برکات سے محروم نہیں رہتے۔ آسمانی

بسببِ نزولِ برکاتِ سماویّہ و نفاقِ مکاسب و عدالتِ سلاطین و اطمینان از لصوص و قطّاع الطّریق و امیدِ حدوثِ رغبت بسوئے اسلام بسببِ مخالطت با اہلِ حق و شہرتِ رسومِ ایشاں بسببِ ملاحظۂ انتظامِ امورِ معاش و معادِ اہلِ دینِ حق بسببِ اتباعِ شرع است۔

برکتوں، تجارت کے فروغ، بادشاہوں کے انصاف اور رہزنوں سے امن و اطمینان کی وجہ سے وہ اسلامی ممالک میں فارغ البال اور خوشحال رہتے ہیں، اہلِ حق کے ساتھ رہنے سہنے اور شہری زندگی گزارنے اور اُن کے رسُوم و عادات کے رواج و شہرت کی وجہ سے، نیز دینِ حق کے ماننے والوں کے اِتّباعِ شریعت کی وجہ سے معاشی و اُخروی اُمور و معاملات کی دُرستی اور باقاعدگی دیکھ دیکھ کر وہ متاثّر ہوتے ہیں اور اِس کی اُمید کی جاسکتی ہے کہ اُن کے دِل میں دینِ حق کی طرف میلان ہو جائے گا۔

اہلِ حرب و امّا بہ نسبتِ اہلِ حرب، پس در حقِ کسانیکہ در جہاد از دستِ اہلِ اسلام مقتول شدند باوجودیکہ ایشاں اقلِ قلیل بہ نسبتِ فارّین می باشند خصوصًا وقتِ ظہورِ شوکتِ جانبِ مخالف، القصّہ درحقِ ایشاں مقتول شدن باعثِ تخفیفِ عذاب و تقلیلِ عقاب است، چہ اگر مقتول نمی شدند، البتّہ بر کفر تا مدّتے باقی می ماندند۔ پس لابد کفرِ ایشاں متزاید می شد و ہر قدر کہ کفر تزاید می شود، بازہ وباں عقاب متضاعف می گردد۔

اہلِ حرب بھی اس کے برکات سے محرُوم نہیں رہتے۔ جو لوگ جہاد میں اہلِ اسلام کے ہاتھ سے مقتُول ہوتے ہیں، اگرچہ وُہ اقلِ قلیل ہوتے ہیں، اس لیے کہ جھگڑوں میں بھاگ جانے والوں کے مقابلے میں قتل ہونے والے (خصُوصًا جانبِ مخالف کی شوکت و قوّت کے ظہُور کے زمانے میں) کہیں کم ہوتے ہیں، پھر بھی جو مقتُول ہوتے ہیں، اُن کے حق میں اُن کا قتل ہونا عذابِ خداوندی کی تخفیف اور سزا کی تقلیل کا سبب ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر وُہ مقتُول نہ ہوتے، تو اپنے کُفر پر مُدّت تک باقی رہتے، اس طرح اُن کا کُفر بڑھتا ہی رہتا اور کُفر جتنا بڑھتا اور جتنے دنوں قائم رہتا، اُس کی سزا بھی اُتنی ہی زیادہ ہوتی۔

ذریتِ کفار

اما در حقِ ذراریِ ایشاں از نساء و صبیان، پس از بسکہ ایشاں را بسببِ استرقاق مخالطت با اہلِ حق بدست می آید، البتہ حصولِ منافعِ صحبتِ اہلِ حق در حقِ ایشاں مظنون می نماید۔ این است پارہ از ذکرِ منافعِ جہاد۔ اما تفصیلِ آں، پس احاطہ اش دریں مقام نمی تواند شد۔

اہلِ حرب کی نسل و اولاد کے حق میں بھی وہ نفع اور برکت سے خالی نہیں، چونکہ غلامی کی وجہ سے اُن کو اہلِ حق کے ساتھ اختلاط و معاشرت کا موقع ملتا ہے، اس لیے اہلِ حق کی صحبت کے فوائد اُن کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ جہاد کے برکات و فوائد کا ایک حصہ ہے، جو بیان کیا گیا۔ اس کی تفصیل اور اس کا پورا بیان اس موقع پر ممکن نہیں۔

جہاد کی مثال بارش کی سی ہے

القصہ، وجوبِ جہاد بر اہلِ ایمان و امر بر اقامتِ آں الی انقراض الزمان در کارخانۂ تشریع بمثابۂ انزالِ غیث و اجرائے انہار است در کارخانۂ تکوین۔ اما تلف شدنِ چندے اشخاصِ فاقد الاستعداد مثلِ بعضے از اہلِ اسلام کہ مانع از وقوعِ جہاد می شوند و راہِ مخالفتِ غزاۃ و مجاہدین بسببِ خبثِ باطن و حسد و محبتِ کفرہ می پیمایند، در ورطۂ ہلاکتِ ابدی خود را می اندازند و در زمرۂ اخبثِ منافقین داخل می شوند، پس در عمومِ منافعِ جہاد مخل نمی تواند شد، چہ ہمیں باران است کہ عمومِ نفعِ او در حقِ جمہورِ انام بدیہی است، باوجودیکہ بعضے از اشخاص بسببِ انہدامِ عمارات یا طغیانِ سیول و انہار

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان پر جہاد کا وجوب اور قیامت تک اس کو قائم رکھنے کا حکم کارخانۂ تشریع میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو بارش کے نازل کرنے اور نہروں کے جاری کرنے کی حیثیت کارخانۂ تکوین میں ہے۔ باقی چند ایسے اشخاص کی ہلاکت، جو اپنی استعداد کھو چکے ہیں، مثلاً بعض مسلمان، جو جہاد کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اپنی باطنی خرابی، حسد اور کفار سے محبت کی بنا پر مجاہدین کی مخالفت اختیار کرتے ہیں اور ہلاکتِ ابدی میں اپنے کو مبتلا کرتے ہیں اور بدترین منافقین کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں، تو اُن لوگوں کی ہلاکت و بربادی جہاد کے عمومی منافع میں مخل نہیں، اس لیے کہ یہی بارش ہے جس کا نفع عام انسانوں کے حق میں بدیہی ہے، گو بعض آدمی عمارتوں کے انہدام یا سیلاب اور نہروں کی طغیانی سے تلف ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے

تلف می شوند۔(۱) باوجود بارش کی برکت اور نفع میں کلام نہیں۔

مندرجۂ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کی نظر میں جہادِ دین کا ایک نہایت اہم شعبہ اور تکمیلی قدم ہے۔ اُن کو قرآنِ مجید کی صریح آیات اور واضح احادیث کے پیشِ نظر تعمیل کا جذبہ اس پر اُبھارتا ہے، رضاء و محبتِ الٰہی کا شوق دل کو گدگداتا ہے، پھر مسلمانوں کی بے بسی اور اہلِ کفر کا غلبہ رہ رہ کر ان کے حساس دل میں چٹکیاں لیتا ہے، ہندوستان پر کفار کے تسلط اور اسلام کے زوال کا مشاہدہ اُن کو بے چین کر رہا ہے، اُن کے نزدیک اعلائے کلمۃ اللہ اور بلادِ اسلامیہ کے استخلاص کی ضرورت ہر غیور اور فرض شناس مسلمان سے جہاد کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اُن کا یقین ہے کہ سلطنت کے بغیر نہ دین کا قیام ہو سکتا ہے، نہ احکامِ شرعی کا نفاذ ممکن ہے، نہ دعوت و تبلیغ کا کام مکمل ہے۔ پھر جہاد ایسا بابرکت عمل ہے جس سے ساری دُنیا کو فیض پہنچتا ہے اور انسانوں کا کوئی طبقہ اس کے برکات و منافع سے محروم نہیں رہتا۔ اُن کے نزدیک حالات کی ابتری اور عالم کا فساد اس اہم فریضے کے تعطّل کا نتیجہ ہے۔ یہ سب حقائق اُن کے دِل میں جہاد کا عزمِ راسخ پیدا کرتے ہیں اور وہ اسی راستے میں جان کی بازی لگا دینا چاہتے ہیں۔

محض جنگِ آزادی

سید صاحبؒ کی تحریروں اور ذاتی بیانات کے بعد اگرچہ بظاہر اس کی گنجائش نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی خیال قائم کیا جائے کہ وہ صاف صاف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کوشاں اور دین کے ایسے غلبے اور اقتدارِ اعلیٰ کے لیے جدّ و جُہد کر رہے تھے، جس میں بے تکلّف احکامِ شرعی کا نفاذ اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو سکے اور حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (۸ : ۳۹) (یہاں تک کہ شرک کا غلبہ نہ رہنے پائے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے) کی حقیقت کا ظہور ہو۔

لیکن پچھلے برسوں میں بعض فاضل اہلِ قلم اور اہلِ علم کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ جنگِ آزادی کے ایک رہنما تھے، جن کا مقصدِ وحید ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور مُلک

(۱) "صراطِ مستقیم"، بابِ دوم، فصلِ چہارم، افادۂ پنجم، صفحہ ۹۵-۹۶ (مطبعِ مجتبائی)

کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرا کے ایک خالص ملکی حکومت قائم کرنا تھا، جس میں عقیدہ و اصول اور حکمران کے دین و مذہب اور مسلک و عمل کی کوئی بحث نہ تھی۔ بلکہ لکھنے والوں نے صاف صاف یہاں تک لکھا ہے کہ "آپؒ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی، اس سے آپؒ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں، وہ حکومت کریں گے۔"

اس عمارت کو جس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، وہ سید صاحبؒ کا خود ایک مکتوب ہے جو آپؒ نے مہاراج دولت رائے سندھیا کے نسبتی برادر راجہ ہندو راؤ کو تحریر فرمایا تھا[۱] اور جس کا ایک ٹکڑا پچھلے اقتباسات میں "ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط" کے عنوان کے ماتحت گزر چکا ہے۔ اس خط کے آخر میں انگریزوں کے تسلط و اقتدار اور اس کے تباہ کن نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"وقتے کہ میدانِ ہندوستان از بیگانگان دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعیِ ایشاں بر ہدفِ مراد رسیدہ، آیندہ مناصبِ ریاست و سیاست بطالبین آں مسلّم بادو بیخ شوکت و سطوتِ ایشاں محکم شود، و ایں ضعفا را از رؤسائے کبار و عظمائے عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمتِ اسلام بجان و دل کنند و بر مسندِ مملکت متمکن شوند۔"

"جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب اُن لوگوں کو ملیں گے، جن کو اُن کی طلب ہوگی اور ان (ملکی) حکام و اہلِ ریاست کی شوکت و قوت کی بنیاد مستحکم ہوگی۔ ہم کمزوروں کو والیانِ ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنی مسندِ حکومت پر برقرار رہیں۔"

ریاستِ گوالیار کے ایک مسلمان عہدیدار غلام حیدر خاں کے نام ایک مکتوب میں مزید تحریر فرماتے ہیں:۔

پس دریں صورت رؤسائے عالی مقدار را لازم، چنانکہ بر مسندِ ریاست سالہا سال متمکن ماندہ اند،

اس صورت میں ان بڑے سرداروں کے لیے مناسب یہی ہے، جو سالہا سال سے اپنی مسندِ ریاست پر متمکن

(۱) اس مکتوب کی اشاعت سب سے پہلے خاکسار مؤلف کی کتاب "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" میں ہوئی تھی۔ اسی کے حوالے سے وہ جا بجا نقل ہوا اور اس پر اس دعوے کی بنیاد رکھی گئی کہ سید صاحبؒ کی تحریک ایک مشترک وطنی تحریک تھی۔

بالفعل در اعانتِ ضعفائے مذکورین مساعیِ بلیغہ بجا آرند و آں را باعثِ استحکامِ بُنیانِ ریاستِ خود شمارند
چلے آرہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا باعث سمجھیں

ان اقتباسات سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد صاحبؒ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و تسلّط اور انگریزی اقتدار کو حقیقی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے کے ازالے اور ان "بیگانگانِ بعید
۵ الوطن" اور "تاجرانِ متاع فروش" کے اخراج کے لیے غیر مسلم والیانِ ریاست اور اہلِ حکومت و طاقت کو اپنے ساتھ جدّ و جہد کرنے اور تعاون کی دعوت دیتے ہیں، جو اُن کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ وہ اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ اس منظّم و متّحد مقابلے اور جدّ و جہد ہی میں اُن کی ریاست اور طاقت کی بقا ہے، اُن کی زندگی اور عزّت و منزلت اسی پر منحصر ہے کہ انگریزی غلبہ و اقتدار کا یہ سرطان ہندوستان کے جسم سے خارج کر دیا جائے اور مُلک کو اس غیر ملکی طاقت کے چُنگل سے نکال لیا جائے۔ آپؒ یہ بھی
۱۰ فرماتے ہیں کہ اس مقصد کے حصُول کے بعد وہ اہلِ ریاست و سیاست، جنھوں نے اس مقصد کے لیے اشتراکِ عمل کیا ہے، اپنے منصبوں (ریاست اور امارت کی گدیوں) پر فائز رہیں گے۔ وہ مناسب عہدوں اور منصبوں سے سرفراز ہوں گے اور اُن کی شوکت و سطوت میں، جو انگریزوں کے اثر اور تدبیر سے برہم متزلزل اور رُو بزوال ہے، استحکام پیدا ہو جائے گا۔

یہ سب حرف بحرف صحیح اور تاریخی و سیاسی حیثیت سے نہایت معقول اور متوازن دعوت و
۱۵ اعلان ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ گویا انگریزوں کے اخراج کے بعد سیّد صاحبؒ اقتدارِ اعلیٰ اور ہندوستان کی حکومت والیانِ ریاست اور غیر مسلم اشخاص کے حوالے کر کے خود گوشہ نشین اور ذکر و عبادت میں مشغول ہو جائیں گے اور ہندوستان میں ایک ایسی غیر مسلم ریاست یا مشترک ہندو مسلم ریاست کے قیام پر رضامند ہو جائیں گے، جس میں اسلام و قوانینِ اسلام کو کوئی بُنیادی و مرکزی حیثیت حاصل نہ ہوگی اور اقتدارِ اعلیٰ اسلامی طاقت کے ہاتھ میں نہ ہوگا، یہ سیّد صاحبؒ کی زندگی، اُن کے اصلی جذبات اور اُن
۲۰ کی رُوحِ تحریک سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور انھیں خطُوط کے اندر اس کے خلاف صریح شہادتیں موجود ہیں۔

سب سے پہلے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلّط و اقتدار سے سیّد صاحبؒ

کی قلبی اذیت کی اصل وجہ کیا ہے اور وہ کونسا جذبہ ہے، جو اُن کو اُس کا مقابلہ کرنے اور اُس کے خلاف صف آرا ہونے پر بے اختیار آمادہ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس مکتوب کو دوبارہ پڑھیے، جو آپؒ نے شاہ سلیمان والیِ چترال کے نام لکھا ہے۔ اس میں آپؒ فرماتے ہیں :۔

قضارا از مدتِ چند سال حکومت و سلطنتِ ایں ملک بر ایں منوال گردیدہ کہ نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکینِ بدمآل بر اکثر بلادِ ہند استیلا یافتند و آں دیار را بظلماتِ ظلم و بیداد مشحون ساختند و در آں بلاد و امصار رسومِ کفر و شرک اشتہار یافتہ شعائرِ اسلام مائل باستتار آوردہ۔ ناگزیر سینۂ مر بے کینہ بمعاینۂ ایں حال پُر از رنج و ملال بُود۔ بشوقِ ہجرت مالامال غیرتِ ایمانی بدل در جوش بُود و اقامتِ جہاد بسر خروش۔

تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائرِ اسلام اُٹھ گئے۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا۔ دِل میں غیرتِ ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے۔

اس مکتوب میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اصل تکلیف و اذیت کا باعث یہ ہے کہ نصاریٰ و مشرکین کے اقتدار کی وجہ سے کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ اور شعائرِ اسلام کا روز بروز زوال ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی بنائے شکایت اور جس کی جدّ و جُہد کا محرّک یہ احساس ہے کہ اسلام اور شعائرِ اسلام روز بروز زوال پذیر ہیں اور کفر و شرک کا غلبہ روز افزوں ہے، وہ اس پر کس طرح رضامند ہو سکتا ہے کہ اس مُلک کے حاکموں میں تبدیلی ہو جائے اور صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو؟ کیا وہ کفر و شرک کے اس غلبے کو پردیسیوں کے زیرِ اثر تو برداشت نہیں کر سکتا، مگر دیسیوں کے زیرِ اثر برداشت کر سکتا ہے؟ بساطِ حکومت کے مُہروں کی ظاہری تبدیلی اور ملک کے آقاؤں اور منتظموں کی قومیت کا تبادلہ کسی مُحبِ وطن قائد اور سیاسی رہنما کے مزاج و مذاق سے کتنی ہی مناسبت رکھتا ہو، سید صاحبؒ جیسے داعی اور حقیقت شناس کے فکر و مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ وہ صاف صاف ایک مکتوب میں

فرماتے ہیں کہ اُن کا مقصود صرف خدا کے نام کی بلندی اور رسول اللہ ؐ کی سُنّت کا احیا اور ملک کو (بلا لحاظِ قومیّت و وطنیّت) اہلِ کُفر و شرک کے اقتدار سے آزاد کرنا ہے:۔

مقصود از تمامِ ایں معرکہ پیرائی و عربدہ آرائی غیر از اعلاے کلمۂ ربّ العالمین و اعلاے سُنّتِ سیّد المرسلین و استخلاصِ بلادِ مؤمنین از دستِ کفّار و مشرکین امرِ دیگر نیست ۔ (بنامِ شاہ سلیمان)	اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آزمائی کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم، کی سُنّت زندہ ہو اور مُسلمانوں کا ملک کفّار و مُشرکین کے قبضے سے نکل آئے۔ اِس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔

اُن کی جِدّ و جُہد کا محرّک یہ نہیں کہ ملک غلام ہے اور اہلِ مُلک کو اپنی خواہشات اور تصرفات اور خود ساختہ انسانی قوانین کے اِجرا کا موقع نہیں ملتا، بلکہ محرّک صرف یہ ہے کہ اسلام اس مُلک میں بے پر و بال اور مجبور و مفلوج ہے اور سیاسی قُوّت و حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے اِلٰہی قوانین و احکام کے اِجرا کا کوئی موقع نہیں اور مسلمان ذِلّت و اہانت اور شعائرِ اسلام تحقیر و تذلیل کا نشانہ ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

قیامِ دین بملک است و احکامِ دینیّہ کہ تعلّق بحکومت دارند، بوقتِ نبودنِ مملکت صاف از دست می روند و خرابیِ امورِ مسلمین و ذِلّت و نکبتِ ایشاں از دستِ کفّارِ متمردان و اہانتِ شعائرِ مقدّس و تخریبِ معابد و مساجدِ مسلمین کہ می شود، پُر ہویدا است ۔	دین کا قیام سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام، جن کا تعلّق حکومت سے ہے، سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کام کی خرابی اور سرکش کفّار کے ہاتھ سے اُن کی ذِلّت و نکبت اور شریعتِ مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کے معابد و مساجد کی جو تخریب ہوتی ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔

اُن کے سامنے ایک ملک کی آزادی اور غلامی کا مسئلہ نہیں ہے، اُن کے سامنے تو ساری دُنیا پر خدا کی حکومت کے قیام اور تمام انسانوں پر قوانینِ الٰہیّہ کے نفاذ کا مسئلہ ہے۔

ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افرادِ بنی آدم ،	اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی، بلکہ

بلکہ جمیعِ اقطارِ عالم احکامِ حضرتِ ربّ العالمین کہ مسمّٰی بشرعِ متین است، بلا ممانعتِ احدے نافذ گردد۔ (مکتوب بنام سردار سلطان محمد خان والیِ پشاور)	تمام ممالکِ عالم میں رب العالمین کے احکام، جن کا نام شرعِ متین ہے، بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں۔

اس داعی الی اللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ کے متعلق، جس سے بڑھ کر نظامِ اسلامی کا حامل اور خلافتِ نبوّت کا پرتوِ کامل کم سے کم ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں ہمارے علم میں پیدا نہیں ہوا، ۵ یہ خیال کر وہ صرف آزادیِ ملک اور انگریزوں کے اخراج کا داعی تھا اور اس کا مقصد صرف پردیسیوں کی حکومت کا ختم کر دینا تھا، اس کو حکومت کے اصول و مقاصد اور اس کے اخلاقی و دینی نتائج سے بحث نہ تھی، ایک ایسی نسبت ہے جس کے متعلق اُس کی رُوح کو شکایت کا موقع ہے کہ ؎

ہر کسے از ظنِّ خود شد یارِ من
از درونِ من نہ جُست اسرارِ من ۱۰

سترھواں باب

سرحد کا انتخاب اور پنجاب، افغانستان اور سرحد کے حالات

سید صاحبؒ کے نزدیک اگرچہ مقصودِ اصلی ہندوستان تھا، جیسا کہ خود ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

بازخود ایں جانب مع مجاہدینِ صادقین بسمتِ بلادِ ہندوستان بنابر ازالۂ کفر و طغیان متوجہ خواہد شد کہ مقصودِ اصلی خود اقامتِ جہاد بر ہندوستان است، نہ توطّن در دیارِ خراسان۔(۱)	اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کروں گا تاکہ اسے کفر و شرک سے پاک کیا جائے، اس لیے کہ میرا مقصودِ اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملکِ خراسان (سرحدِ افغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔

لیکن پنجاب میں، جس پر کچھ عرصے سے رنجیت سنگھ کی باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی تھی، مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات، اُن کی فوری امداد کی ضرورت، جو ایک شرعی فریضہ تھا، نیز فوجی مصالح اور سیاسی تدبّر کا تقاضا تھا کہ یہ مُہم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے شروع کی جائے، جو طاقتور، پُرجوش افغانی قبائل کا مرکز ہے اور جہاں سے ترکستان تک آزاد مسلمان حکومتوں کی ایک مسلسل زنجیر ہے۔ نقشے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی امداد، ہندوستان کی دوبارہ تسخیر اور ایک طاقتور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے بظاہر اس سے زیادہ موزوں مقام نہیں ہوسکتا۔

سید صاحبؒ کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا، جنھوں نے ہندوستان کے کسی حصے کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد اُن کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں

(۱) مکتوب بنام شاہزادہ کامران۔

کا ایک جال پھیلا دیا گیا، جس میں وہ جکڑتے چلے گئے اور اُن کے ہاتھ پاؤں بندھ کر رہ گئے۔ انگریزوں کی زیرک و پُرفن حکومت ہر حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی تھی کہ اُس کی جنگی کارروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا اور وہ بہت جلد محسوس کر لیتا کہ وہ ایک قفس میں محبوس ہے اور بالکل بے بال و پر اور بے دست و پا رہ گیا ہے۔ نواب امیر خاں کا سارا معاملہ سید صاحبؒ کی نظر کے سامنے تھا کہ انگریزوں کے جوڑ توڑ سے وہ کس طرح اکیلا رہ گیا اور کس طرح انھوں نے اُس کے مختلف سرداروں کو اُس سے توڑ لیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ اپنے کو معاہدے اور مصالحت پر مجبور سمجھنے لگا۔ اس سے پہلے ہندوستان کے دورِ آخر کے سب سے بڑے صاحبِ عزم امیر ٹیپو سلطان کو انھوں نے کس طرح سب سے کاٹ لیا تھا اور کس طرح اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ آخر اُس جوانمرد نے تنہا سرخروئی حاصل کی اور ہندوستان کے کسی والیِ ریاست یا امیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ سید صاحبؒ کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا، جس کے لیے بہت جلد ایک ایسا جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے، جس کے چاروں طرف مخالفتوں، مزاحمتوں اور سازشوں کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہوتا، اور جس کو کہیں سے کمک یا رسد ملنے کی کوئی توقع نہ رہتی۔

اس مرکز، یعنی، ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد دی ہوگی کہ افغانوں کی جوانمردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و تہوّر کی ہندوستان میں بڑی شہرت تھی۔ جو افغانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں عرصے سے سکونت پذیر ہو گئے تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی فوج کا بڑا حصہ ان پٹھانوں پر مشتمل تھا، جو یا تو خود افغانستان و سرحد سے آئے تھے یا اُن کے قریبی مُورث منتقل ہوئے تھے۔ شاہِ اودھ کی فوج انھیں پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ نواب فقیر محمد خاں آفریدی، عبدالباقی خاں قندھاری، ینڈو خاں رسالدار، یہ سب افغانی الاصل اور سرحدی پٹھان تھے۔ خود نواب امیر خاں اور اس کے اکثر سردار اور رُفقائے کار افغانی تھے۔ روہیلکھنڈ، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اور

دینی حمیت کا ایک بڑا مخزن تھا، جو وقتاً فوقتاً مرکز (دہلی) کو بھی تازہ خون اور نئی طاقت عطا کرتا رہا۔
افغانوں سے آباد تھا۔ خود رائے بریلی میں، جو سیّد صاحبؒ کا وطن ہے، جہاں آباد کا محلّہ پٹھانوں کا محلّہ تھا اور
سیّد صاحبؒ اُن کی مردانگی اور جوانمردی سے خوب واقف تھے۔ ان میں سے کثیر التعداد لوگ سیّد صاحبؒ سے
ارادت اور بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور آپؒ کی رفاقت کے لیے کمربستہ تھے۔ اُن سب کے تعلّقات اور رشتے داریاں
۵ افغانستان اور سرحد کے افغانی قبائل میں تھیں۔ انھوں نے بھی سیّد صاحبؒ کو اپنے وطن یعنی افغانستان و سرحد کو
اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنانے کا مشورہ دیا ہوگا اور اپنے اعزّا اور اہلِ تعلق کی مدد کی اُمید دلائی ہوگی۔ ان سب چیزوں نے
آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ اس افغانی آزاد علاقے کو اپنی مجاہدانہ دعوت و تحریک کا مرکز بنائیں، جس سے
آپ کو اپنے مقصد کے لیے بہترین سپاہی اور جنگجو اور جنگ آزما رفیق بہت بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

عواقب و نتائج اور اصلی حقائق کا علم تو صرف عالمُ الغیب ہی کو ہوسکتا ہے۔ ایک غیر معصوم
۱۰ انسان، جو صرف غور و فکر، صلاح اور مشورے اور دُعا اور استخارے سے زیادہ کوئی اور ذریعہ نہیں رکھتا،
یہی کرسکتا ہے کہ اپنی کوششوں اور صلاحیتوں کے استعمال کے لیے بہتر سے بہتر میدان انتخاب کرے،
پھر اس میدان میں اپنی ساری طاقت صرف کردے۔ اِتنے عرصے کے بعد اور ان کوششوں کا انجام
دیکھ لینے کے بعد اس انتخاب پر تنقید و تبصرہ بہت آسان ہے، لیکن اُنیسویں صدی کی ابتدا کے
ہندوستان کا سیاسی نقشہ سامنے رکھنے اور یہاں سعی و جہاد کے مواقع اور وسائل کا پورا پورا جائزہ
۱۵ لینے کے بعد ایک منصف اور سلیمُ الطبع انسان یہی فیصلہ کرے گا کہ سیّد صاحبؒ اس انتخاب میں
حق بجانب تھے۔ پنجاب میں مُسلمان جس نازک دَور سے گزر رہے تھے اور جن مظالم اور اہانتوں
کا نشانہ تھے، سارے مُلک پر جو بے حمیّتی اور بے حسی طاری تھی، افغانستان و سرحد اپنی بہترین
فوجی صلاحیتوں کے باوجود کسی دینی دعوت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح چھوٹے چھوٹے مناقشات
اور حقیر منافع و مقاصد کے لیے اپنی اس طاقت کو، جو تنظیم اور دینی رُوح کے بعد سارے ہندوستان
۲۰ کو فتح کرلینے کے لیے کافی تھی، ضائع کر رہے تھے، ان سب حقائق کا تقاضا تھا کہ ایک صاحبِ حمیّت
و عزم انسان، جس کے سینے میں حمیّتِ اسلامی کا دریا موجزن ہو اور جس کے ساتھ مخلصین صادقین

اور جانبازوں کی ایک منتخب جماعت ہو، وہ اپنا کام ایسے رُخ سے شروع کرے، جہاں ایک طرف وہ اس عظیم الشّان طاقت کو صحیح مصرف پر لگائے، دُوسری طرف پنجاب کے اُن مسلمانوں کی مدد کرتا ہُوا، جو ظلم کی اس چکّی میں پس رہے تھے، ہندوستان کی طرف بڑھے اور اس مُلک کو فرنگی تسلّط سے آزاد کراتا ہُوا صحیح اسلامی حکُومت قائم کرے۔ خود سیّد صاحبؒ اپنے اس انتخاب اور فیصلے کی وجہ اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ پنجتار[1] کے ایک اجتماع میں، جس میں بہت بڑی ۵
تعداد میں علما و خوانین جمع تھے، آپ نے تقریر کرتے ہُوئے فرمایا:

"مَیں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامُون ہو کہ وہاں مُسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں۔ باوجود اس وُسعت کے کہ صدہا کروہ (کوس) میں مُلکِ ہند واقع ہُوا ہے، کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں جہاد کرو۔ جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو، ہم دیں گے، مگر مجھ کو ۱۰
منظُور نہ ہُوا، اس لیے کہ جہاد سُنّت کے موافق چاہیے، بلوہ کرنا منظُور نہیں۔ تُمھارے مُلک کے ولایتی بھائی بھی حاضر تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارا مُلک اس کے واسطے بہت خُوب ہے۔ اگر وہاں چل کر کسی مُلک میں قیام اختیار کریں، تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے، خصُوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والیِ لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو نہایت تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کی بے آبرُوئی کرتا ہے۔ ۱۵
جب اس کی فوج کے لوگ اس مُلک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے ہیں، مال و اسباب لُوٹ لیتے ہیں، بلکہ عورتوں اور بچّوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے مُلک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ پنجاب میں وہ مُسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں۔ گاؤ کشی کا تو کیا ذکر، جہاں سُنتے ہیں کہ کسی

---

(۱) ریاستِ سوات کی سرحد پر ضلع مردان کے قریب پٹھانوں کی ایک بستی تھی، جو کئی سال تک سیّد صاحبؒ اور جماعت مجاہدین کا مستقر اور فوجی و دعوتی مرکز رہی۔

مُسلمان نے گائے ذبح کی، اُس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ یہ سُن کر میرے خیال میں
آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کرکے وہیں چل کر ٹھیریں اور
سب مسلمانوں کو متفق کرکے کُفّار سے جہاد کریں اور اُن کے ظلم سے مسلمانوں کو چھڑائیں"۔
پنجاب و سرحد اور افغانستان کے وہ حالات کیا تھے، جو ایک صاحب حمیّت و عزم اور ایک
صاحبِ بصیرت و فہم شخصیّت داعی کی عنانِ توجہ اپنی طرف موڑتے تھے اور اُس کو پیش قدمی کی
دعوت دیتے تھے، اُن کو تفصیل سے جاننے کی ضرورت ہے۔

پنجاب میں مُسلمانوں کی حالت اٹھارھویں صدی کے وسط ہی میں سکھوں نے پنجاب میں اہم سیاسی طاقت
حاصل کر لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات پر شمالی ہندوستان میں سکھ ہی اصل طاقت تھے۔ پورا پنجاب،
مُلتان کا ایک حصّہ، جمنا اور ستلج کے درمیان کا سب سے بڑا علاقہ سکھ رئیسوں اور سرداروں کے
قبضے میں تھا۔ شمال مغرب میں دریائے سندھ، مشرق میں جمّوں کی ریاست، جنوب میں انگریزی
عملداری اور حصار اور جیسلمیر کے ریگستان اُن کے وسیع اقتدار کی سرحدیں تھیں۔
مُسلمان اس فوخیز طاقت کے اصل حریف رہ چکے تھے۔ کئی صدیوں کی تاریخ اور دینی و
سیاسی کشمکش نے اس قوم کے دل میں مسلمانوں کی نفرت کا بیج بو دیا تھا اور وہ یوماً فیوماً ترقّی اور نشوونما
حاصل کرتا جاتا تھا۔ بالآخر وہ اس شدید تعصّب اور عداوت کی حد کو پہنچ گیا، جس کی نہایت وحشیانہ
مثال "بندا بیراگی" کی زندگی اور اُس کی خونریز و خون آشام جنگی سرگرمیاں ہیں، جن کی مثال ہندوستان
کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[1]

یہ بالکل قُدرتی بات تھی کہ جب اقتدار مُسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر سکھوں کے ہاتھ میں
منتقل ہو، تو اس انقلاب کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑے، جو کل تک اس ملک کے حکمران
اور اس بڑھتی ہوئی طاقت کے راستے میں مُزاحم تھے۔ اب پنجاب میں مُسلمان ایک ایسی غلام قوم
کے فرد تھے، جس سے حاکموں کی قدیم سیاسی رقابت بھی تھی اور شدید مذہبی نفرت بھی۔

(۱) ملاحظہ ہو سر جان میلکم کی کتاب The Sketch of the Sikhs مطبوعۂ لندن ۱۸۱۲ء۔

۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور کو، جس کا پروانۂ حکومت شاہ زماں سے مل گیا تھا،
اُن تین سکھ سرداروں سے چھین لیا، جو اس پر حکومت کرتے تھے۔ حوصلہ مند و حریص طبیعت،
ایک تازہ دم جنگجو اور جفاکش نسل کی رفاقت، جو تمدّن کی لائی ہوئی خرابیوں اور کمزوریوں سے
ناآشنا تھی اور اکالیوں کے مذہبی جوش اور جذبۂ قربانی نے رنجیت سنگھ کو کامیابی کے وہ عناصر بخشے،
جو کبھی وسطِ ایشیا کی فاتح قوموں کو حاصل تھے اور جنھوں نے رنجیت سنگھ کو ایک طاقتور حکمران اور ۵
ایک مہیب فاتح بنا دیا، جس کو شکست دینا غیر منظّم افغانی قبائل اور پنجاب کی چھوٹی چھوٹی مسلمان
ریاستوں کے بس کی بات نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے وہ تمام ریاستیں اور صوبے،
جو خود مختار سکھ سرداروں اور مسلمان حکمرانوں کے پاس تھے، فتح کر لیے۔ جن مسلمان ریاستوں نے
نذرانہ دینے سے اِنکار کیا اور مقابلہ کیا، اُن کو بے تربیت، نیم وحشی اور فتح کے نشے میں سرشار
فوجوں کے ہاتھوں سخت ذِلّت و عذاب کا سامنا کرنا پڑا، اُن کے شہر اکالیوں اور خالصہ فوج کے ۱۰
ہاتھوں بُری طرح تباہ و برباد ہوئے اور مسلمان رعیّت کو لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بننا پڑا۔ "احمد خاں
رئیسِ جھنگ کی شکست کے بعد سکھّوں نے شہر کو لوٹ لیا اور تمام رعیّت کو روٹی کے ٹکڑوں کا محتاج
کر دیا۔ اس بات کی فریاد چودھریوں نے جب مہاراج سے کی تو فرمایا کہ ہماری فتحیاب فوج فتح کے
وقت بے بس ہوتی ہے"۔[1] "سن رسیدہ نواب مظفّر خاں والیِ ملتان اور اُس کے جوانمرد بیٹوں
کی دست بدست جنگ اور دلیرانہ شہادت کے بعد ملتان حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تھا۔ چار ۱۵
پانچ سو مکانات پیوندِ زمین ہو گئے، کسی کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا نہ رہا۔ شہر میں مکانات کو
آگ لگا دی گئی اور سب کچھ لے لیا گیا، سیکڑوں آدمی برہنہ کر دیے گئے، عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک
کیا گیا، بہت سی شریف عورتوں نے کنوؤں میں گر کر جان دی اور عزّت بچائی"۔[2] "قصور میں سکھّوں
نے لوگوں کے بدن کے کپڑے تک اُتار لیے، عورتیں ننگے سر، ننگے بدن، بے ستر ہو کر جابجا اپنے آپ

(۱) "تاریخ پنجاب (اردو)" از رائے بہادر کنھیا لال، اگزیکٹو انجینئر لاہور، صفحہ ۱۷۰
(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محمد لطیف کی "The History of the Punjab"، صفحہ ۳۱۲۔

کو چھپاتی پھرتی تھیں، مگر کوئی جگہ امن کی نہیں ملتی تھی۔ بہت سی اشراف عورتیں، جنھوں نے کبھی بیگانے مرد کی صورت نہیں دیکھی تھی، اپنے ہاتھ سے پھانسی لے کر مر گئیں، کئی چاہات میں کود پڑیں۔ غرض، ہر ایک امیر و غریب شہر کا رہنے والا ایسا لٹا کہ پارۂ نان کو محتاج ہو گیا۔ بڑے بڑے مکانوں کو سکھوں نے آگ سے جلا دیا..... بہت سی جوان عورتیں اور لڑکیاں اور لڑکے سکھوں نے شہر سے پکڑ لیے اور غلام بنانے کے ارادے سے اپنے پاس رکھ لیے۔"(۱)

رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت اگرچہ سکھوں کے اقتدار کی تاریخ کا سب سے زیادہ منظم اور ترقی یافتہ دور تھا، لیکن اُس کی حقیقت ایک عارضی فوجی حکومت سے زیادہ نہ تھی، جس میں فوجوں اور فوجی سرداروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل تھی اور وہ اس آزادی سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ بڑے بڑے فوجی سرداروں اور صوبیداروں کی حکومت دہشت انگیزی اور وحشیانہ سزاؤں پر قائم تھی۔ ہری سنگھ نلوہ کے متعلق انگریز مؤرخ لکھتا ہے:۔

"وہ صرف اس خوف و دہشت کے سہارے حکومت کرتا تھا، جو لوگوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور اہلِ ملک کے لیے ایک خوفناک شخصیت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک روایتی آدم خور اور وحشی انسان کی طرح ہزارے کے علاقے میں مشہور رہتا۔ اب بھی مائیں اس کا نام لے کر رونے والے بچوں کو چپ کراتی ہیں۔"(۲)

یہی شہرت اور تاثر پھولا سنگھ اکالی اور بعض دوسرے فوجی سرداروں اور صوبیداروں کے متعلق تھا۔(۳)

قوم کی جنگجویانہ روح (مارشل اسپرٹ) کو قائم رکھنے کے لیے، جو مہاراجہ کا اصل سرمایہ اور اُس کے غلبے کا سب سے بڑا سہارا تھا، فوج کو ہمیشہ جنگوں میں مشغول رکھنے اور نئے نئے میدانِ جنگ مہیا کرنے کی ضرورت تھی۔ نیز اس پر کم سے کم اخلاقی اور سیاسی پابندیاں عائد کرنے کی گنجائش تھی، جو ایک باضابطہ اور ذمے دار حکومت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کے اندر خصوصاً اُن علاقوں میں، جو دارالسلطنت سے فاصلے پر واقع ہوئے تھے، جو حاکم یا فوجی افسر جتنا ظلم کرنا چاہتا

(۱) تاریخ پنجاب (اردو) از رائے بہادر کنھیا لال، صفحہ ۱۸۲

(۲) The Gazetteer of the Hazara District, P. 131

(۳) The Punjab Government Records, V. 5. P. 106.

تھا، کہ تا تھا اور عام طور پر مسلمان ہی اس کا نشانہ بنتے تھے۔ مہاراجہ کی اصل طاقت اکالیوں کا وہ مذہبی جوش اور خالصہ فوج کی وہ مذہبی عصبیت تھی، جس کی مدد سے اُس نے سارے پنجاب کو تسخیر کر لیا تھا اور جو پورے ہندوستان کے لیے ایک خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس مذہبی جوش و عصبیت کو نہ وہ سرد و پابند بنانا چاہتا تھا، نہ وہ ایسا کر ہی سکتا تھا۔ اس کا ہدف عام طور پر مسلمان ہی تھے، جن کو سیاسی انقلابات نے اس قوم کا محکوم بنا دیا تھا اور مرکز کی کمزوری، افغانوں کی نااتفاقی اور کوتاہ نظری نے بالکل لاوارث اور بے بس بنا کر چھوڑ دیا تھا اور جن کے مذہب کے بہت سے عقائد، اعمال و فرائض غیر تعلیم یافتہ اور نشۂ حکومت میں سرشار اکالیوں اور عام سکھوں کے لیے اشتعال کا سبب بن جاتے اور مہاراجہ اپنی خواہش کے باوجود اس کو قابو میں نہ رکھ سکتا۔ سر لیپل گریفن لکھتا ہے:

"مہاراجہ یا تو بالکل غیر متعصب تھا یا کم از کم لاپروا تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی مسلمان رعایا بلا مزاحمت مراسم مذہبی ادا کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن اس کو مجبور ہونا پڑا کہ اونچی آواز سے اذان کی ممانعت کر دے، کیونکہ اس سے اکالی برافروختہ ہوتے تھے۔"(1)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب پر رنجیت سنگھ کی "باقاعدہ" حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو وہ عام شہری حقوق اور مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوئی، جو ایک باضابطہ اور منظم حکومت میں رعیت کو حاصل ہوتی ہے، اُن کو بعض مذہبی احکام ادا کرنے کی اجازت نہ تھی، بہت سی اہم مسجدیں فوج کے استعمال اور لوگوں کے ذاتی قبضے میں تھیں۔

رائے بہادر کنہیا لال، ایگزیکٹو انجینئر، لاہور، اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں شاہی مسجد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بادشاہی عہد میں اس مسجد کی آرائش کا سامان فرش، جھاڑ، فانوس وغیرہ لاکھوں روپے کا تھا۔ جب زمانے نے پلٹا کھایا اور سکھی سلطنت ہوئی، تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت کبھی اس میں توپ خانہ، کبھی پلٹن اور سواری کی فوج کی چھاؤنی رہا کرتی تھی، حجروں میں میگزین بھرا رہتا تھا۔ سکھ

(1) Sir Lepel Griffin : Ranjit Singh, P. 96 ,

لوگ پتھّروں کی سلیں اُکھاڑ کر لے گئے۔[1]

مستی دروازے کی مسجد کے متعلّق لکھتے ہیں :۔

"جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت ہُوئی، تو اس مسجد پر سرکاری تسلط ہو گیا اَور بارُود بھری گئی۔ سالہا سال اس میں بارُود بنتی رہی، یہاں تک کہ بارُود خانے والی مسجد مشہور ہو گئی۔"[2]

سُنہری مسجد کے متعلق کنھیا لال نے جو حکایت لکھی ہے، اس سے حکُومت کے طریقِ عمل اَور اس مُلک میں مُسلمانوں اَور اُن کی مذہبی آزادی کا جو حال تھا، اس پر پُوری روشنی پڑتی ہے :۔

"مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں بھی پہلے کوئی متعرّض اس مسجد کا نہ ہُوا۔ آخر جب باولی کا مکان مسجد کے متّصل بن گیا اَور اس میں گرنتھ صاحب رکھّا گیا، تو باولی کے بھائی سکھ اَور اکالیہ اس مسجد کے درپے ہو گئے اَور مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی کہ اس مسجد کا مُلّا بآوازِ بلند اذان دیتا ہے، تو ہمارے کان میں پڑتی ہے۔ یہ مسجد بھی باولی کے ساتھ شامل ہو کر ہمارے قبضے میں رہنی چاہیے یا گرادی جائے کہ مسلمانوں کی ہمسائگی گرُو کے سکھّوں کے ساتھ نہ چاہیے۔ مہاراجہ نے فی الفور حکم دے دیا کہ مسجد سے مُلّا نکال دیا جائے اَور گرنتھ رکھا جائے۔ اس حکم کے صادر ہوتے ہی مُلّا بیچارہ نکال کر باہر کر دیا گیا اَور مسجد پر اکالیوں نے قبضہ کر لیا اَور تمام مسجد میں گوبر کا لیپن دے کر گرنتھ رکھ دیا گیا۔ دُکانوں کی آمدنی ضبط ہو کر باولی کے محال کے ساتھ شامل کر دی گئی۔ وقوع اس حال سے شہر کے مسلمان نہایت غمگین ہوئے اَور سب نے مجمع فقیر عزیز اللہ و نورالدّین کے مکان پر کیا اَور چاہا کہ اُن کے ذریعے سے مہاراجہ کے حضُور میں مسجد کی واگزاری کے لیے عرض کی جائے۔ چُونکہ اس زمانے میں مہاراجہ کے دربار میں سب سے بڑھ کر توقیر گھلو ماشکی کی تھی اَور مہاراجہ کسی بات میں اس کے کہنے سے باہر نہ تھا، فقیر صاحبان نے مسجد کے معاملے میں اس کو اپنے ساتھ ملایا اَور اُس کے ذریعے سے مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی اَور بیان کیا کہ تمام پنجاب کی مسجدوں کے مُلّا کہیں بانگ بلند آواز سے نہیں کہتے، چہ جائے کہ

(۱) صفحہ ۱۴۳۔ (۲) "تاریخِ لاہور"، صفحہ ۹۴۔

باؤلی صاحب کے پاس، جہاں گرنتھ صاحب رکھا ہو، مسجد کا مُلّا اذان دے۔ یہ بات بالکل برخلاف ہے۔ ہم آئندہ مُلّا سے مچلکا لے لیتے ہیں کہ کبھی بانگ نہ دے۔ اس بات پر مہاراجہ راضی ہُوا کہ مسجد بدستور مُلّا کے حوالے کر دی جائے اور اس سے مچلکا لے لیا جائے کہ بانگ نہ دے۔ مسجد کی دُکانوں کا کرایہ ضبط رہے۔ مُسلمانوں نے اتنی بات ہی کو غنیمت جانا اور مسجد پر دوبارہ قبضہ پایا، مگر دُکانیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔"(۱)

یہی مصنّف ایک دُوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"مسجد کا گرانا سکھوں کے وقت کُچھ بڑی بات نہ تھی۔ ہزاروں مسجدیں سکھوں نے گرا کر اپنی عمارت کے ساتھ شامل کر لی تھیں۔"(۲)

اس دَورِ حکومت میں مسلمان جس طرح کی غلامانہ اور حقیر زندگی گزار رہے تھے اور پُوری قوم جس بے اعتمادی، محرُومی و بے عزّتی کا شکار تھی، اس کا خاکہ رنجیت سنگھ کے ایک مُعاصر انگریز مصنّف (کرنل مالکم) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"واقعہ یہ ہے کہ پنجاب میں ایک بھی ایسے مُسلمان خاندان کی مثال نہیں ملتی، جس کو عزّت و اقتدار حاصل ہو۔ یہ صُورتِ حال اس نفرت کا نتیجہ ہے، جو گرُو گوبند سنگھ کے پیروؤں کو اپنے قدیم حریفوں کی نسل سے چلی آ رہی ہے، جنھوں نے اُن پر مظالم کیے تھے۔ اس کا ثبُوت کہ یہ گہری عداوت اب بھی زائل نہیں ہُوئی ہے، اس سُلوک سے ملتا ہے، جو ان بدقسمت مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو ابھی تک سکھوں کی عملداری میں رہتے ہیں، جو اگرچہ کثیر التعداد ہیں، لیکن سب غریب نظر آتے ہیں اور ایک مظلوم اور ذلیل قوم کے فرد معلُوم ہوتے ہیں۔ وُہ زیادہ تر اُن سے قُلی گیری، بوجھ ڈھونے اور محنت و مشقّت کے کام لیے جاتے ہیں۔ اُن کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں، نماز نہیں پڑھ سکتے، شاذ و نادر مسجد میں جمع ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجدوں میں بھی تھوڑی مسجدیں تباہی سے بچی ہیں۔"(۳)

---

(۱) "تاریخ لاہور" صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱ (۲) "تاریخ لاہور" صفحہ ۳۵۰ (۳) Lieut. Col. Malcolm : The Sketch of the Sikhs (London, 1812) PP. 123, 124

اس غلامی، مذہبی بندش اور ذلت آمیز طرزِ عمل سے مسلمانوں کے اخلاق پست ہو گئے تھے، ساری قوم پر بے اعتمادی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی اور وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ عقائد و اخلاق و عادات مسخ ہو رہے تھے، دینی حمیت اور اسلامی رُوح سے پوری قوم محروم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مذہب، معاشرت، دل و دماغ پر اس بدترین قسم کی غلامی کے بدترین اثرات پڑ رہے تھے، جن کا مٹنا آسان نہ تھا۔ اقبالؒ نے سچ کہا ہے:

خالصہ شمشیر و قرآں را ببُرد اندراں کشور مسلمانی بمُرد!

افغانستان و سرحد افغانستان و سرحد مسلمانوں کی طاقت کا بڑا مرکز رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان فاتح یا تو اسی ملک کے رہنے والے تھے یا اس راستے سے آئے۔ آخر آخر میں بھی، جب ہندوستان کے مسلمانوں اور اُن کی حکومت پر کوئی نازک وقت آیا ہے، اور وہ یہاں کے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکی، تو اس ملک نے عین وقت پر مدد کی ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے تو آخر وقت میں مسلمانوں کی عزت رکھ لی اور مرہٹوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا۔

لیکن اُنیسویں صدی کی ابتدا میں جب تمام عالمِ اسلام میں ایک عام زوال تھا، یہ مُلک بھی طوائفُ الملوکی اور بے نظمی کا شکار ہو گیا۔ نااتفاقی اور خانہ جنگی نے اس طاقتور مُلک کو اتنا کمزور کر دیا کہ ہندوستان اور پنجاب کے مسلمانوں کی مدد تو درکنار، اس کو اپنی آزادی اور اپنے مقبوضات کا برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ کیا واقعات و تغیرات تھے، جنھوں نے اس مردم خیز اور طاقتور مُلک کو اس درجے تک پہنچا دیا، سید صاحبؒ کے سفرِ ہجرت اور اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی داستان سُننے سے پہلے اس کی تفصیل معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس تاریخ کا پس منظر اور اِن سرگرمیوں کا ماحول سمجھنا دشوار ہے۔

دُرّانی خاندان کا زوال اور اس کے اسباب احمد شاہ ابدالی[1] نے ۲۶ سال، بڑی باعظمت اور پُرشوکت سلطنت کے

(۱) احمد شاہ کا تعلق سدوزئی قبیلے سے تھا، جو ابدالیوں کی ایک اہم شاخ ہے۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ افغانستان کی مہم میں داخل ہوا ... جرأت و قابلیت سے بہت جلد نادر شاہ کی نگاہ میں مقام پیدا کر لیا۔ ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ قتل ہوا، تو احمد شاہ اس افغانی جمعیت کے ساتھ، جو نادر شاہ کی فوج میں تھی، علیحدہ ہو گیا اور سدوزئی قبیلے کی مدد سے افغانستان پر قابض ہو گیا اور دُرِّ دوراں کا خطاب اختیار کیا اور دُرّانی مشہور ہوا۔ اس کی فوج کی ترک تازیاں ایک طرف مشرق میں دہلی تک پہنچتی تھیں، دوسری طرف مغرب میں نیشاپور اور استرآباد تک۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں وہ وسط ایشیا کی سب سے بڑی تازہ دم فوجی طاقت تھی۔

بعد، جس کی بنیاد اس نے اپنے عزم و ہمت اور دست و بازو سے رکھی تھی، جب ۱۷۷۳ء میں انتقال کیا، تو عالمگیرِ اعظم کی طرح اس کا بھی کوئی صحیح اور اہل جانشین نہ تھا۔ تیمور شاہ کو، جو اس عظیم سلطنت کا وارث ہوا، اپنے نامور و صاحبِ عزم باپ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ بیس سال کمزوری کے ساتھ سلطنت کرنے کے بعد، جس میں اس جواں سال سلطنت کے اندر زوال کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، ۱۷۹۳ء میں اس نے انتقال کیا۔ تیمور نے اپنے پیچھے کئی فرزند چھوڑے، جو تختِ سلطنت کے مدعی اور اس کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔ ان میں ہمایوں، شاہ زماں، شاہ شجاع، شاہ محمود، شاہزادہ فیروز اور شاہ ایوب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۵

تیمور شاہ کے جانشین کا چونکہ تعین نہیں ہوا تھا، شاہ زماں نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، لیکن اس کی بادشاہی اور تخت نشینی درحقیقت پائندہ خاں کی رہینِ منت تھی، جو افغانستان کے طاقتور قبیلۂ بارک زئی کا سردار تھا اور جس کی تائید و رفاقت اور تدبیر و حکمت نے تمام مخالف طاقتوں کو زیر اور دوسرے امرا و سردارانِ قبائل کو ہمنوا بنا لیا۔ شاہ زماں نے استحکامِ سلطنت کے بعد اپنے نامور دادا کی طرح ہندوستان پر بار بار حملے کیے، لیکن ملک کے اندرونی حالات اس کو بار بار واپس آنے پر مجبور کرتے رہے۔ ۱۰

زماں شاہ نے جس شخص کو وزارت کے منصب پر فائز کیا تھا اور جس پر اعتمادِ کلی کیا، اس نے اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔ ملک میں بادشاہ سے ناراضگی اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھائی بھی نزدیک و دور موقع کے منتظر تھے۔ بالآخر کابل میں چند سرداروں نے وزیر کو ختم کر دینے اور بادشاہ کو معزول کر دینے کا تہیہ کیا۔ زماں شاہ نے ان چھ سرداروں کو اپنے محسن پائندہ خاں الملقب بہ سرفراز خاں سمیت قتل کرا دیا۔ یہ غیر دانشمندانہ اقدام افغانستان کی آزاد سلطنت کے زوال اور نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کا پیش خیمہ اور پورے ملک و قوم کے لیے سرچشمۂ فساد تھا۔ ۱۵

پائندہ خاں ایک طاقتور سردار اور نہایت کثیر الاولاد شخص تھا۔ اس کے بیٹوں میں فتح خاں، محمد عظیم خاں، یار محمد خاں، سلطان محمد خاں، سید محمد خاں، پیر محمد خاں، دوست محمد خاں، میر محمد خاں، تیمور قلی خاں ۲۰

عبدالجبار خاں، عبدالصمد خاں، پُردل خاں، شیر دل خاں، کہن دل خاں، میر دل خاں، رحمدل خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فتح خاں نے اپنے باپ کے قتل کے بعد اپنے بھائیوں اور برادری کو جمع کیا اور فوجی طاقت اکٹھی کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور زمان شاہ کی جگہ پر محمود شاہ کو جو ایران میں مقیم اور گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا، طلب کر کے افغانستان کے تخت پر بٹھایا۔ زمان شاہ اس وقت ہندوستان پر حملہ آور تھا۔ بغاوت کی خبر سن کر واپس ہوا۔ باغی فوجوں نے چند معرکوں کے بعد تخت پر قبضہ کیا اور زمان شاہ کی آنکھوں میں سلائی کر کے قید کر دیا۔ فتح خاں نے زمامِ وزارت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس طرح اس کو اپنے جذبۂ انتقام اور اپنی حوصلہ مندی دونوں کی تکمیل کا موقع ہاتھ آگیا۔

محمود کے کئی سال اپنے بھائی شاہ شجاع سے معرکہ آرائی میں گزرے اور اس کو ایک بار تخت و تاج سے بھی محروم ہونا پڑا، لیکن پھر فتح خاں کے اثر و رسوخ اور تدبیر سے تختِ کابل پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ شاہ شجاع ۱۸۱۰ء میں ہندوستان آگیا۔ اب محمود سلطنتِ افغانستان کا فرمانروا تھا اور فتح خاں اس کا وزیر در اصل مختارِ سلطنت۔ فتح خاں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور بڑے بڑے منصب اور عہدے اپنے بھائیوں میں تقسیم کر دیے۔ محمد عظیم خاں کو کشمیر، یار محمد خاں، سلطان محمد خاں، سید محمد خاں، پیر محمد خاں کو پشاور کا علاقہ، دوست محمد خاں کو کابل، میر محمد خاں کو غزنی، پُردل خاں اور شیر دل خاں کو صوبۂ قندھار کی صوبے داری اور حکومت سپرد کی اور اس طرح یہ خاندان پورے افغانستان اور صوبۂ سرحد کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔

۱۸۱۸ء میں محمود شاہ نے فتح خاں کو ہرات اپنے بھائی حاجی فیروز کے پاس اس لیے بھیجا کہ ایرانی خراسان کے والی حسن علی مرزا (قاچاری) نے والیِ ہرات سے اپنی حکومت کے تسلیم کرنے اور ہرات کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور والیِ ہرات نے والیِ قندھار سے مدد چاہی تھی۔ محمود شاہ نے فتح خاں سے اشارۃً یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر موقع ہو، تو حاجی فیروز کو، جس نے مصیبت کے زمانے میں محمود شاہ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، معزول کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا جائے۔ فتح خاں نے حاجی فیروز کو گرفتار کر لیا۔ اس نے اور اس کے بھائی دوست محمد خاں وغیرہ نے بیگماتِ شاہی کے زیورات تک اتار

لیے اور شاہزادے اور اُس کے حرم کی سخت توہین کی۔ یہ حد سے بڑھی ہُوئی دست درازی اور خاندان شاہی کی توہین محمود شاہ اور شاہزادۂ کامران کو سخت ناگوار ہُوئی اور انھوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ مالِ غنیمت میں سے جس میں قیمتی جواہرات، زیورات اور اسلحہ کا بڑا ذخیرہ تھا، خود والیِ افغانستان کو صرف چند گھوڑے ملے۔ باقی سب فتح خاں اور اُس کے بھائیوں کے ہاتھ آیا۔

۵ حاجی فیروز سے فُرصت پانے اور ہرات پر قبضہ کرنے کے بعد فتح خاں نے حسن علی مرزا کے مطالبات کو سختی سے ٹھکرا دیا اور اعلانِ جنگ کیا۔ ایرانی فوجیں مشہد سے آگے بڑھیں اور افغانی فوجوں نے بارک زئی سرداروں کی قیادت میں اقدام کیا۔ افغانی فوجیں اگرچہ تعداد میں ایرانی فوجوں سے فائق تھیں، لیکن ایرانیوں نے افغانیوں کو شکست دی اور افغانی فوجیں پسپا ہو کر ہرات واپس آگئیں۔

اس عرصے میں شاہزادۂ کامران قندھار سے اپنے والد کا بھیجا ہُوا واپس ہُوا۔ حاجی فیروز ۱۰ معزول و محبوس تھا اور ہرات فتح خاں کے قبضے اور اس کے بھتیجے معین الملک کے قبضہ و انتظام میں تھا۔ شاہزادہ شہر سے ایک میل کے فاصلے پر "باغ شاہ" میں فروکش ہُوا۔ فتح خاں روزانہ سلام کو جاتا اور واپس آجاتا۔ فتح خاں سے کہا گیا کہ وُہ حاجی فیروز کے مال میں سے کچھ حصّہ شہزادے کی خدمت میں پیش کر دے تاکہ اُس کا ملالِ خاطر جاتا رہے۔ فتح خاں نے پہلے تو اُس کو ٹالا، پھر صاف کہا کہ اُس نے جس مال کو نوکِ شمشیر سے حاصل کیا ہے، وُہ کسی اور کو دینے کو تیار نہیں۔ بہی خواہوں ۱۵ نے وزیر کو سمجھایا کہ حریمِ شاہی کی اہانت نے شاہِ افغانستان اور شہزادۂ کامران کو اُس کی طرف سے سخت برہم کر رکھا ہے، لیکن فتح خاں نے صاف جواب دیا کہ میں نے محمود شاہ کو دو بار تختِ کابل پر بٹھایا ہے، اس کی سلطنت اس وقت میرے اہلِ خاندان کی مُٹھّی میں ہے۔ کامران مجھے زک پہنچانے کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے؟

یہ صاف جواب سُن کر کامران نے شاہ کو لکھ دیا کہ فتح خاں سلطنت کا مالک بنا ہُوا ہے اور ۲۰ خاندانِ شاہی کو راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے شاہزادے کو اختیار دے دیا کہ جو کارروائی وُہ مُناسب سمجھے، کرے۔ شاہزادۂ کامران نے فتح خاں سے انتقام لینے کا تہیّہ کر لیا۔ ایک مجلسِ شاہی

میں، جس میں اُس کے معتمد سردار جمع تھے اور بعض ایسے سردار بھی تھے، جو فتح خاں سے خار کھائے بیٹھے تھے، فتح خاں کو "بددین"، ایرانیوں سے شکست کھانے اور افغانوں کے نام پر بٹّہ لگانے کا طعنہ دیا۔ فتح خاں نے اس کا جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ بات بڑھی۔ شاہزادے نے اہلِ مجلس کو، جو قتل کے منصوبے سے آگاہ تھے، حکم دیا اور انھوں نے فتح خاں کو پکڑ لیا۔ عطا محمد خاں نے، جو وزیر کا حریفِ
۵ قدیم تھا، برچھے کی نوک سے فتح خاں کی آنکھیں نکال لیں۔ نابینا وزیر کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ فتح خاں کے بھائی بھتیجے منتشر ہو گئے اور انھوں نے بھاگ کر جان بچائی۔

بارکزئی خانوں کا اقتدار

اس کارروائی کا فوری ردِّ عمل یہ ہُوا کہ فتح خاں کے سب بھائیوں نے، جو خود ایک لشکر تھے، بغاوت کر دی۔ محمود نے جلد محسوس کر لیا کہ وُہ نام کا بادشاہ رہ گیا ہے۔ دوست محمّد خاں نے اپنے چند بھائیوں کے ساتھ کابل پر قبضہ کر لیا۔ عطا محمّد خاں کو دھوکے سے ایک صورت میں بُلا کر اس
۱۰ کی آنکھیں نکال لی گئیں۔ محمود نے قندھار سے کابل کی بازیافت کے لیے لشکر کشی کی۔ فوری حملے کے بجائے اپنی فطری کمزوری اور سستی کی وجہ سے عرصے تک نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں اس کو اپنے متعدد سرداروں کی بے دلی اور بے تعلقی کی اطلاعات ملتی رہیں۔ بالآخر اُس نے جنگ کو ملتوی کر دینے کا ارادہ کر لیا اور فتح خاں کو، جو ایک مجبور و بے بس اسیر کی طرح اُس کے ساتھ تھا، دربار میں طلب کیا اور اُس سے کہا کہ اگر وُہ اپنے بھائیوں کو اطاعت پر آمادہ کرے، تو وُہ سب اپنے عہدوں
۱۵ پر بحال کر دیے جائیں گے۔ فتح خاں نے صاف اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ "یہ طوفان، جو آپ کا اُٹھایا ہُوا ہے، اب اس کا فرو کرنا میرے جیسے معذور انسان کے بس میں نہیں ہے"۔ محمود یہ کھرا جواب سن کر مغلوب الغضب ہو گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور بیسیوں تلواریں اس نابینا انسان پر، جس کی مہربانی سے وُہ دو مرتبہ تخت پر بیٹھا تھا، پڑیں اور وُہ دیکھتے دیکھتے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

سردارانِ دربار اور اہلِ لشکر نے جب ایک محسن وزیر کا یہ انجام دیکھا، بادشاہ کی دُون ہمتی
۲۰ اور قوتِ مقابلہ کی کمی اور حریف کی طاقت کا بھی اُن کو علم تھا، اس سب کی بنا پر اگلی رات اس کی فوج کا بڑا حصّہ اُسے اچانک چھوڑ کر چلا گیا اور آدھی رات کو بادشاہ اور شاہزادے کو دفعۃً یہ معلوم

ہُوا کہ صرف تھوڑی سی فوج اُن کے گرد جمع ہے، باقی لشکر گاہ خالی ہے۔ چُنانچہ دونوں ایک مختصر دستے کے ساتھ ہرات روانہ ہو گئے۔

اس طرح دُرّانی خاندان کی حکُومت کا خاتمہ ہُوا اَور افغانستان کی حکُومت، بارک زئی خاندان میں منتقل ہو گئی۔ افغانستان و سرحد کے تمام صُوبوں پر پائندہ خاں کے لڑکوں کی خود مختار حکُومت قائم ہو گئی

بارک زئی خاندان کا افتراق اَور اُس کے نتائج

یہ افغانستان و سرحد کی طاقت اَور سیاسی وحدت کے لیے بڑا نادر اَور نزدیں موقع تھا، اِس لیے کہ افغانستان سے لے کر پشاور و کشمیر تک ایک ہی باپ کے فرزندوں کی حکُومت تھی۔ اگر ان بھائیوں میں اتحاد و یک جہتی، خلوص و باہمی اعتماد اَور سیاسی شعور ہوتا، تو وہ ایک ایسی مضبُوط افغانی سلطنت قائم کر سکتے تھے، جو نہ صرف پنجاب، بلکہ ہندستان تک کے مسلمانوں کی مدد کر سکتی تھی اَور اگر توفیق اَور دینی جذبہ ہوتا، تو جس طرح احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت توڑ دی، یہ پنجاب کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکتے تھے اَور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے تھے۔

لیکن جس نفاق و افتراق کا شکار دُرّانی خاندان تھا، وُہی اس بارک زئی خاندان کے افراد پر مسلط تھا اَور ایک باپ کے فرزند ہونے کے باوجُود کبھی اُن میں اتحاد، باہمی اعتماد اَور پُورے طور پر اشتراکِ عمل نہ ہو سکا۔ کوئی بھائی دُوسرے بھائی سے پُورے طور پر صاف نہ تھا۔ کسی بھائی کو دُوسرے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ اقتدارِ اعلیٰ کے لیے باہم اس طرح کشمکش تھی، جس طرح حریفوں اَور رقیبوں میں ہوتی ہے۔ سردار محمد عظیم خاں، فتح خاں کا حقیقی بھائی اَور اُس کے بعد پائندہ خاں کی اولاد میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا حبیب اللہ خاں تختِ کابل (مرکزی حکومت) کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ دوست محمد خاں اپنی کوششوں اَور کابل پر [illegible] کی بنا پر اپنے کو حقیقی حاکم سمجھتا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے تک تخت کے لیے کشمکش رہی۔ اس عرصے میں شیر دل خاں نے قندھار سے آ کر بھتیجے کو دھوکہ دے کر قید کر لیا اَور کابل پر خُود قابض ہو گیا۔ عرصے تک شیر دل اَور دوست محمد خاں کے درمیان حبیب اللہ خاں کی دولت کے بارے میں تنازعہ رہا۔ بالآخر پشاور سے چار بھائیوں نے آ کر تصفیہ کیا کہ شیر دل قندھار واپس جائے اَور حبیب اللہ خاں کی پُوری دولت

ساتھ لے جائے، دوست محمد خاں کابل پر حکومت کرے۔

ان بھائیوں کے باہمی نفاق و افتراق نے درۂ خیبر سے پشاور کی طرف کا سارا علاقہ کھو دیا اور آخر میں ان کو خود پشاور اور کشمیر سے ہاتھ دھونا پڑا۔[1]

نہ صرف ہندوستان، بلکہ تاریخِ اسلام کا ایک بڑا اندوہناک حادثہ اور بڑی حسرت انگیز حقیقت ہے کہ ایک ایسی قوم، جو جوانمردی، دلیری، جانبازی اور جنگی قوت و قابلیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور جو مسلمانوں کی طاقت کا ایک بڑا سرچشمہ اور سہارا ہے، ان تمام فوجی صفات اور اپنی کثیر تعداد کے باوجود اپنی قومی سیرت و مزاج کی اس بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی کوئی بڑی خدمت انجام نہ دے سکی اور خود اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت سے بھی قاصر رہی اور قوت و جرأت کا یہ خزانہ ایک ایسے نازک تاریخی موڑ پر، جب نئی غیر اسلامی طاقتیں اُبھر رہی تھیں اور دنیا پر چھائی چلی جا رہی تھیں، حقیر مقاصد اور آپس کے جھگڑوں میں بے دریغ صرف ہو کر رہ گیا اور مسلمانوں کے کچھ کام نہ آیا۔

پشاور پر سکھوں کا قبضہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے افغانستان کے ان حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ کو اطلاع ملی کہ پشاور میں اس کے مقابلہ کے لیے کوئی منظم فوج نہیں۔ ۲۰ نومبر کو اس نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ یار محمد خاں نے سکھوں کی آمد پر پشاور چھوڑ کر یوسف زئی کے پہاڑوں پر پناہ لی۔ مہاراجہ نے شہر کو تباہی سے بچا لیا، مگر بالاحصار و چمکنی کو، جو مشہور بزرگ شیخ عمرؒ کا مدفن ہونے کی وجہ سے متبرک مقام سمجھا جاتا ہے، آگ لگا دی۔ ارباب اور شہر کے سربرآوردہ لوگوں سے پچیس ہزار کی رقم نذرانے میں وصول ہوئی۔ مہاراجہ نے قبائل کے سرداروں کو باریاب کیا اور ان کو خلعت تقسیم کیے۔ چوتھے دن پشاور کو اپنے حلیف اور وفادار جہانداد خاں وزیر خیل کو سپرد کر کے لاہور کو کوچ کیا۔ بعد میں دوست محمد خاں نے پچاس ہزار کی ہنڈی اور گھوڑے پیش کر کے پشاور کو دوبارہ حاصل کر لیا۔[2]

---

(۱) دُرّانی و بارک زئی خاندان کی کشمکش اور واقعات کی تفصیل زیادہ تر Lieut. Arthur Conolly کی فاضلانہ کتاب Afghan History سے استفادہ کیا گیا ہے، جو اس کے سفر نامہ Journey to the North of India کے ضمیمے کے طور پر شامل کتاب ہے۔ یہ کتاب لندن سے ۱۸۳۸ء میں شائع ہوئی۔ بعض فارسی مآخذ سے بھی اضافہ کیا گیا۔

(۲) S. M. Lateef : History of the Punjab, PP. 415, 416

اس وقت سے پشاور اور یوسف زئی کا علاقہ حکومتِ لاہور کا باج گزار بن گیا۔ ہر سال خالصہ لشکر اس علاقے میں آکر سالانہ نذرانہ اور تحائف وصول کرتا اور واپس چلا جاتا۔

سکھ لشکر اور مہاراجہ کے نمائندوں اور فوجوں کی آمد سے اس ملک یعنی سرحدی علاقے اور اس کے باشندوں کو کن پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ اس ملک میں کتنا ہراس اور دہشت اور عام زندگی میں انتشار پیدا کر دیتے تھے، اس کا اندازہ اس بیان سے ہوگا، جو سر لیپل گریفن نے اپنی کتاب ۵ "رنجیت سنگھ" میں کیپٹن جیمس کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لیے بلائے جان تھا۔ اُن کا وہاں پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ مال و متاع اور بیش قیمت اسباب کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے، یہاں تک کہ دروازے اور کھڑکیاں تک نکال لی جاتی تھیں، عورتیں اور بچے کثیر تعداد میں گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور ملک میں جلاوطنوں کی نوآبادیاں نظر آیا کرتیں۔ یہ نفرت زدہ دشمن جہاں تک آگے ۱۰ بڑھتے، تمام قطعۂ ملک کو برباد کرتے جاتے اور جو کچھ سامنے آتا، اُسے تاخت و تاراج کرتے اور کھیتوں اور زراعتوں تک کو تباہ کر دیتے۔ وادی کے دہانے سے لے کر دریائے سندھ تک شاید ہی کوئی موضع ایسا ہو، جسے سکھ فوجی افسر نے نہ لوٹا ہو اور وہاں آگ نہ لگائی ہو۔ اُن کی آمد سے اس درجے خوف سما ہوا تھا کہ مائیں اپنے ضدی بچوں کو اُن کا نام لے کر خاموش کرتیں۔ اس ملک میں آج بھی سفر کرتے وقت بوڑھے، جن کی لمبی سفید داڑھیاں اور چہروں پر کثرت سے زخموں کے نشان ہیں، ان پہاڑیوں کی نشاندہی ۱۵ کرتے ہیں، جہاں سکھ بھیڑ بکریوں کی طرح اُن کو ہنکا دیتے تھے۔ وہ لوگ اب تک ان مقامات کو بتا سکتے ہیں، جہاں اُن کے آباد اجداد لڑ بھڑ کر گرے تھے۔ لوگوں کو ان کے آنے سے تباہی و بربادی کا اس درجہ یقین تھا کہ چند گاؤں، جہاں راستوں کی دشواری سے پہنچ نہ ہوتی اور جنھیں دشمن یا تو بالکل چھوڑ دیتے تھے یا مدافعت کی وجہ سے اُن کا بحیثیتِ مجموعی صرف ایک آدھ حصہ ہی برباد کر سکتے تھے، ایسے مقامات ناقابلِ تسخیر شمار کیے جاتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ انھیں اپنے دشمن پر ایک زبردست اور نمایاں فتح حاصل ہوئی۔[1] ۲۰

(۱) سر لیپل گریفن کی کتاب "رنجیت سنگھ" (مترجمہ مولوی نصیر حسین صاحب فاروقی، جامعہ عثمانیہ)، صفحہ ۱۰۴

افغانوں کی آخری جنگ اور نوشہرے کا معرکہ

محمد عظیم خاں، جو اس خاندان کا سب سے زیادہ حوصلہ مند اور حساس فرد تھا، پشاور کی اس ماتحتی اور اپنے بھائی یار محمد خاں کی اس بے حمیتی سے ناراض تھا۔ اسی سال (۱۸۲۳ء میں) اُس نے خیبر پار کے علاقے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ اپنے بھائی عبدالصمد خاں کو اُس نے یوسف زئی قبائل میں جہاد کی تبلیغ کے لیے بھیجا۔ سوات، بُنیر، آفریدیوں کے علاقے اور خٹک سے بھی ہزاروں مجاہدین جمع ہو گئے۔ مہاراجہ کی فوجیں بہترین سپہ سالاروں کی ماتحتی میں اکوڑہ میں داخل ہوئیں۔ بیس ہزار کوہستانی خٹک اور یوسف زئی مجاہدین اپنے پیرزادوں اور مشائخ و علما کی تبلیغ و اثر سے دریا کی بائیں جانب مقدس دینی جنگ لڑنے جمع ہوئے۔ دائیں جانب محمد عظیم خاں دوست محمد خاں کے ساتھ باقاعدہ افغانی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ مہاراجہ نے سردار کھڑک سنگھ کو جنرل الارڈ اور جنرل ونٹورا کے ساتھ محمد عظیم خاں کو روکنے کے لیے دریا کے اس پار بھیج دیا اور خود اپنی اصلی طاقت کے ساتھ یوسف زئی مجاہدوں کے مقابلے پر رہا، جنھوں نے دریا کی بائیں جانب نوشہرے کے قریب بلندیوں کے گرد اپنے مورچے قائم کر رکھے تھے۔

افغانوں نے اس موقعہ پر سخت مقابلہ کیا اور بڑی بے جگری سے لڑے۔ انھوں نے اس سے پہلے کبھی سکھوں کے خلاف اتنی منظم جنگ نہیں کی تھی اور نہ کبھی اس دینی جوش اور جذبۂ جہاد سے لڑے تھے۔ تمام دن خون آشام جنگ رہی، جس میں مجاہدین کا پلڑا نمایاں طور سے بھاری رہا اور ہزاروں سکھ مقتول و مجروح ہوئے، جن میں بڑے بڑے نامور سردار اور آزمودہ کار افسر تھے۔ مقتولین میں مشہور اکالی سردار پھولا سنگھ بھی تھا۔ اخیر وقت میں رنجیت سنگھ نے خود ایک اہم مورچے پر پوری طاقت سے حملہ کیا۔ دن چھپتے سکھوں کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ بالآخر افغانوں نے رنجیت سنگھ کی منظم اور قواعد دان فوج سے شکست کھائی اور تین ہزار اور ایک روایت کے مطابق دس ہزار افغانی مقتول و مجروح ہوئے۔

دوسرے دن افغانوں نے پیرزادہ محمد اکبر کی قیادت میں دوبارہ مقابلے کی تیاری کی، مگر محمد عظیم خاں کو، جس کو دریا کے اس پار روک دیا گیا تھا، اپنے خزانے اور حرم کی فکر ہوئی، جو میچنی میں تھا اور جسے سکھوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ اُس نے اپنا ڈیرہ اکھیڑ لیا اور خزانہ، حرم اور باقی ماندہ فوج لے کر مہمند

پہاڑوں کو عبور کرکے چلا گیا۔ افغان تنہا رہ گئے اور آخر کار مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔(۱)

لفٹننٹ آرتھر کانلے (Conolly) جس نے اس واقعے کے کچھ ہی بعد سرحد پنجاب کا سفر کیا ہے اور واقعات ان لوگوں سے سُنے ہیں، جو اس معرکے کے چشم دید گواہ تھے، اپنی کتاب (Afghan History) میں لکھتا ہے:-

"محمد عظیم خاں جب محاذِ جنگ پر پہنچا، تو اُس نے دیکھا کہ سکھ فوجیں اس کے سامنے ہیں، لیکن ایک گہرے چشمے کی وجہ سے، جو اس کے رستے میں حائل تھا، نہ وہ اپنی باقی ماندہ فوجوں کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے، نہ سکھوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اُس نے اس چشمے کو عبور کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اُس کے چند آدمی ضائع ہوئے۔ اب وہ اس جنگ کا، جو اس کے بھائی صمد خاں اور سکھوں کے درمیان ہو رہی تھی، ایک غیر متعلق تماشائی تھا۔ اس جنگ میں اپنی غالب تعداد اور بہتر نظام کی وجہ سے سکھوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اس کے ہم وطن بے جگری سے مقابلہ کرنے کے بعد پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اگر عظیم خاں اس جنگ میں حصہ لیتا، تو گمانِ غالب یہ ہے کہ سکھوں کو اس روز شکست ہوتی، اس لیے کہ بڑی خونریز جنگ اور سخت مقابلے کے بعد ہی سکھ ان پُرجوش کوہستانیوں پر فتح حاصل کر سکے۔ وہ قومی و مذہبی نفرت کے جوش سے سرشار تھے اور دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ بارہ بارہ، پندرہ پندرہ برس کے لڑکے، جو صرف چھریوں سے مسلح تھے، دیوانوں کی طرح سکھ فوجیوں پر جا پڑتے تھے اور اُن کی سنگینوں سے بے پروا ہو کر ان پر حملہ آور ہوتے تھے۔"(۲)

نوشہرے کے معرکے میں فتح حاصل کرنے کے بعد سکھ فوج نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ شہر لُوٹ سے محفوظ رہا، مگر فتحیاب لشکر نے پشاور سے خیبر تک خوب لُوٹ مار کی۔ شاید ہزار برس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یہ خالص اسلامی علاقہ غیر مسلم حکومت میں آیا۔ مہاراجہ نے یار محمد خاں اور دوست محمد خاں کو مخفی طور پر دعوت دی۔ اُنھوں نے مہاراجہ کو پانچ گھوڑیاں نذر کیں، جن میں مشہور گھوڑی گوہر بار بھی تھی۔ مہاراجہ نے پشاور پر براہِ راست قبضہ رکھنے کی دشواریوں کو سمجھتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کی خدمات کے صلے

(۱) S. M. Lateef : History of the Punjab, Pp. 428–431

(۲) Lieut. Arthur Conolly : Afghan History : P. 306 (London 1838)

کے طور پر پشاور کو اُن کے انتظام میں دے دیا اور وہ دوبارہ دربارِ لاہور کا ایک باجگزار علاقہ بن گیا۔"[1]

نوشہرے کی شکست نے افغانوں کی کمر توڑ دی اور اُن میں مایوسی اور احساسِ کہتری پیدا کر دیا۔ محمد عظیم خاں کو شکست اور اپنے بھائیوں کی بے وفائی کا سخت قلق تھا۔ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکا اور اسی سال بڑی شکستہ دلی کے ساتھ دُنیا سے چلا گیا۔ اس طرح اس خاندان کا رہا سہا وقار جاتا رہا اور اس کا شیرازہ زیادہ بکھر گیا۔ مہاراجہ نے پشاور کی فتح پر بڑا جشن منایا۔ مسلسل کئی دن تک لاہور اور امرتسر میں خوشی منائی گئی اور چراغاں کیا گیا۔[2] نوشہرے کی جنگ سے اٹک اور پشاور کے درمیان کا سارا علاقہ سکھوں کے اقتدار میں آ گیا۔

۱۸۱۹ء میں مہاراجہ نے جبّار خاں سے، جو محمد عظیم خاں کا بھائی اور کشمیر میں اُس کا نائب تھا، کشمیر کا صوبہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ پشاور، مردان، یوسف زئی کا علاقہ اور پکھلی اور ہزارہ سب سکھ فوجوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال تھا۔ ۱۸۲۲ء میں پکھلی اور دھمتور کے قبائل نے حکومتِ لاہور کے خلاف بغاوت کی۔ سردار ہری سنگھ کو، جس کی جاگیر میں یہ علاقہ دیا گیا تھا، سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ ہری سنگھ نے سارے علاقے پر اپنی فوجی کارروائیوں اور سخت گیری سے دہشت پھیلا دی۔ جو گاؤں بے قصور تھے اُن کو بھی تلوار کی نوک پر رکھ لیا۔ پکھلی اور دھمتور کو جلا دیا گیا۔ ہزاروں آدمی بے خانماں ہو گئے۔ ہری سنگھ کا افغانوں پر جو رُعب اور اس علاقے میں اس نام کی جو دہشت تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ افغان عورتیں اپنے بچّوں کو اُس کا نام لے کر چُپ کراتی تھیں۔[3] دریائے اٹک سے لے کر کابل تک سکھوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ والیِ پشاور دربارِ لاہور کا حقیر باجگزار تھا۔ نوشہرے کی جنگ کے بعد افغانوں کی قوّتِ مقابلہ جواب دے چکی تھی۔ قومی ذلّت اور شکست خوردگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

سردار خاوی خاں، اشرف خاں، فتح خاں اور سردارانِ یوسف زئی نے سردار یار محمد خاں اور سردار سلطان محمد خاں والیانِ پشاور کو ۱۷ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ میں جو درخواست بھیجی تھی، اُس کے ایک اقتباس سے اُس

---

(۱) (۲) S. M. Lateef : History of the Punjab, P. 431

(۳) N. W. F. P. Gazetteer (1931), Peshawar District, V. I, P. 31

کا صحیح اندازہ ہوگا:۔

آنچہ دریں اوقات پُر از آفات از دستِ ظلم و عُتُوّ کفارِ بدکردار بر مؤمنینِ ایں دیار انواعِ رنج و تکالیف و مصائب از قتل و نہب و شورشِ فتنہ و جنگ و بے پردگی ناموس و ننگ و تخریبِ مساجد و معابد گزشت و می گزرد، بر ہیچ یک از عاقل و غافل پوشیدہ نیست۔ چنانچہ صبیان و نسوانِ اہلِ ایمان فی الحال در بلادِ پنجاب در قبضۂ اہلِ شرک و ارتیاب مقیّد اند کہ بصد زبان مضمونِ ایں آیت قرآن، بصد آہ و فغاں با دلِ گریاں گویا، "وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا" (۴:۷۵)

اس زمانے میں اس ملک کے مسلمانوں پر کفار کے ہاتھوں جو مظالم ہو رہے ہیں اور ان پر قتل و غارت گری، لڑائی جھگڑے، بے عزتی و بے آبروئی، خانہائے خدا اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور تخریب کے جو مصائب گزرے اور گزر رہے ہیں، وہ کسی عاقل یا غافل سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ اس وقت پنجاب میں مسلمان بچے اور عورتیں اہل شرک و ارتیاب کے پنجے میں گرفتار ہیں اور وہ رو رو کر سو سو زبان سے اس آیت کا مضمون ہر شخص کو سناتے ہیں کہ کیا بات ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے، جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اس بستی سے نکال، جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار پیدا کر؟

اٹھارھواں باب

رائے بریلی سے مارواڑ کی سرحد تک

سفرِ ہجرت یہ تھے وُہ حالات، جب سیّد صاحبؒ نے جہاد کے عزم سے ہندوستان کو خیرباد کہا اور اپنے مخلص رفقا کے ساتھ، جن کو آپؒ سالہا سال سے اس مقصد کے لیے تیار کر رہے تھے، ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچنے کے لیے آپؒ نے ہندوستان، بلوچستان، افغانستان کا نہایت طویل اور بے حد پُرمشقّت سفر اختیار کیا۔ آپؒ کی بلند ہمتی، عالی حوصلگی اور جوشِ جہاد اور مجاہدین کی جفاکشی، صبر و ضبط اور شوقِ جہاد کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہندوستان سرحد اور افغانستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالی جائے اور راجپوتانے، مارواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان اور صوبہ سرحد کے ان ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور دریاؤں کا تصوّر کیا جائے، جو ان مجاہدین کو طے کرنے پڑے۔ حقیقت میں اس ہفتخواں کا سر کرنا خود ایک مستقل جہاد تھا۔ بعض جگہ پانی کی قلت، سامانِ خوراک کی کمی، راہ کی خستگی، مقامات کی دُشوارگزاری، قزاقوں کا خطرہ، بھوک اور پیاس کی شدت، اجنبی قوموں، اجنبی ملک، نئی نئی زبانوں کا سامنا، شبہات اور اندیشے، تحقیقات و تجسّس، یہ تمام چیزیں پیش آئیں، مگر اُن کے قدم میں لغزش اور ارادے میں تزلزل نہ پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ اگر اس کا تصوّر کیا جائے کہ اس قافلے میں دہلی اور اودھ کے کیسے کیسے نازک طبع، امیر گھرانوں کے کیسے کیسے ناز پروردہ اشخاص، صاحبزادے، شرفا، سادات، علما اور مشائخ تھے، تو اس رُوح اور جوش و بیخودی کا اندازہ ہوتا ہے، جو میرِ کارواں نے ان میں پیدا کر دی تھی اور جس کی پرورش اور ترقّی اس کی صحبت میں برابر ہو رہی تھی۔

رائے بریلی سے گوالیار تک[1] سفر سے پیشتر مکان میں جاکر زوجۂ محترمہ سے وُہ رقوم طلب فرمائیں، جو اُن کے پاس امانت تھیں۔ معلوم ہوا کہ دس ہزار روپے ہیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ نصف تمھارا حصّہ ہے اور نصف ہمارا۔ چونکہ اہلِ خانہ کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑنے کا ارادہ تھا اور اپنے مرکز سے اُن کے مصارف کا بھیجنا بہت مشکل اور مشتبہ بات تھی، اس لیے یہ انتظام ضروری تھا۔[2]

آپؒ نے چند بڑی بڑی تھیلیاں سلوا رکھی تھیں۔ ان میں یہ رقم رکھ کر جماعت کے معتبر افراد کو تقسیم کر دیں۔ بعض نے گلے میں حمائل کر لیں، بعض نے کمر میں باندھ لیں۔

۷ رجمادی الآخرہ ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) روزِ دوشنبہ آپؒ کی ہجرت کا دن تھا۔ جانبِ جنوب سئی ندی کی دوسری طرف آپؒ کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ دوشنبے کا دن بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے میں گزرا۔ رات کے وقت کشتی میں سوار ہوئے۔ بہت آدمی پہنچانے کے لیے چلے۔ کچھ کشتی پر تھے، کچھ پانی میں۔ آپؒ نے کنارے پر جاکر دو رکعت شکرانہ ادا کیا اور بڑے تضرع و زاری کے ساتھ اللہ سے دعا کی۔ یہ شکرانہ کسی سلطنت کی فتح کا نہ تھا، نہ کسی ایسے مقام کے چھوڑنے کا، جہاں راحت و آسائش اور عزت و سربلندی کے اسباب ناپید تھے اور جس سے دل کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یہ وُہ مقام تھا، جہاں آپؒ کا خاندان دو سو برس سے آباد تھا اور جس کے ذرّے ذرّے سے آپؒ کو اُنس تھا، جہاں ذاتی راحت و عزت کے وُہ اسباب موجود تھے، جو کسی بڑے سے بڑے انسان کو میسّر آسکتے ہیں، لیکن جس کام کو آپؒ نے مقصدِ زندگی بنایا تھا، اس کے حصول کا وہاں کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے اس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا اور جب اس عزیز و محبوب سرزمین سے جس پر زندگی کی چالیس بہاریں گزاری تھیں، قدم نکالا، تو اس پر محبوبِ حقیقی کی بارگاہ میں اس جوش و مسرت کے ساتھ

(۱) رائے بریلی سے ٹونک تک کے حالات مولوی جعفر علی کی کتاب "منظورۃ السعداء" سے ماخوذ ہیں۔ اس کے بعد کے حالات (مارواڑ سے پشاور تک) کا ماخذ مولوی سید حمید الدین خواہر زادۂ سید صاحبؒ کے مفصّل خطوط ہیں، جو انھوں نے راستے سے ہندوستان کے اعزہ و احباب کو لکھے ہیں۔ (۲) زوجۂ محترمہ جب پیر کوٹ (سندھ) میں تھیں، تو ایک بار معلوم ہوا کہ لشکرِ اسلام میں بڑی تنگی اور خرچ کی کمی ہے۔ آپؒ نے سید عبدالرحمٰن کے روکنے کے باوجود دس ہزار روپیہ لشکر کے خرچ کے لیے بھیجا جو حاجی بہادر شاہ کے ہاتھ کالا باغ اور عیسیٰ خیل کے راستے سے آپ کے پاس پہنچا (منظورۃ السعداء)۔

سجدۂ شکر ادا کیا، جس جوش و مسرت کے ساتھ کم لوگوں نے وطن کی واپسی اور سلطنت کی فتح پر سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔

تمام رات عزیز مردوں اور عورتوں کی آمد و رفت خیمے تک رہی۔ سب کے دلوں پر آپ کی ہجرت اور فراق کا بڑا اثر تھا۔ ان میں سے سوائے ان معدودے چند اعزہ کے جو سفرِ ہجرت و کارِ جہاد میں شریک تھے، پھر کسی عزیز سے اس جدائی کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ خود دونوں بیویوں، ایک صاحبزادی (سارہ) عزیز بھتیجوں سید اسمٰعیل و سید یعقوب سے پھر ملنا نہیں ہوا۔ اس وقت جانے والے اور رخصت کرنے والوں کو اس کا ضرور احساس ہوگا کہ اب ملاقات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مظفر و منصور وطن واپس لائے اور سارا ہندوستان دارالاسلام بن جائے یا اہلِ وطن اس مہاجرِ فی سبیل اللہ کے پاس پہنچ جائیں اور یہ دونوں صورتیں ایسی تھیں کہ جو بظاہر آسان معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

مکۃ اللہ معظمہ سے واپسی کے بعد ہی سے آپ اس سفر کی ترغیب دے رہے تھے۔ جن لوگوں کو اللہ نے وسعت و مقدرت دی تھی، وہ مہاجرین و مجاہدین کے سامان میں حصہ لیتے تھے۔ اس میں شیخ غلام علی الہ آبادی کا قدم سب سے آگے تھا۔ قسم قسم کے ہتھیار، خیمے اور کپڑے، نقد، سلے اور بے سلے کپڑے، قرآنِ مجید کے نسخے، کتابیں اور برتن اور جانور حاضر کیے۔ مولوی سید جعفر علی کے والد سید حسن علی کہتے ہیں کہ شیخ صاحب جتنی بار سید صاحبؒ کی خدمت میں آتے، کوئی نہ کوئی تلوار یا کٹار یا کوئی اور ہتھیار ضرور لاتے۔ آٹھ نہایت عمدہ بڑی رائفلیں اور دوسرے ہتھیار پیش کش کیے۔ خیموں کی ایک مسجد بنائی تھی، وہ مع فرش کے حاضر کی۔ بلاشبہ جس طرح حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنی دولت سے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری اور رفاقت کی، اسی طرح شیخ غلام علی الہ آبادی نے اپنی دولت سید صاحبؒ کے قدموں کے نیچے ڈال دی اور جہاد فی سبیل اللہ کے راستے میں دل کھول کر مال لٹایا۔[1]

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:۔

"انھیں دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازی پور زمنیا سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآنِ مجید تحفہ لے کر آئے اور سب سے عجیب

(۱) "منظورۃ السعداء"
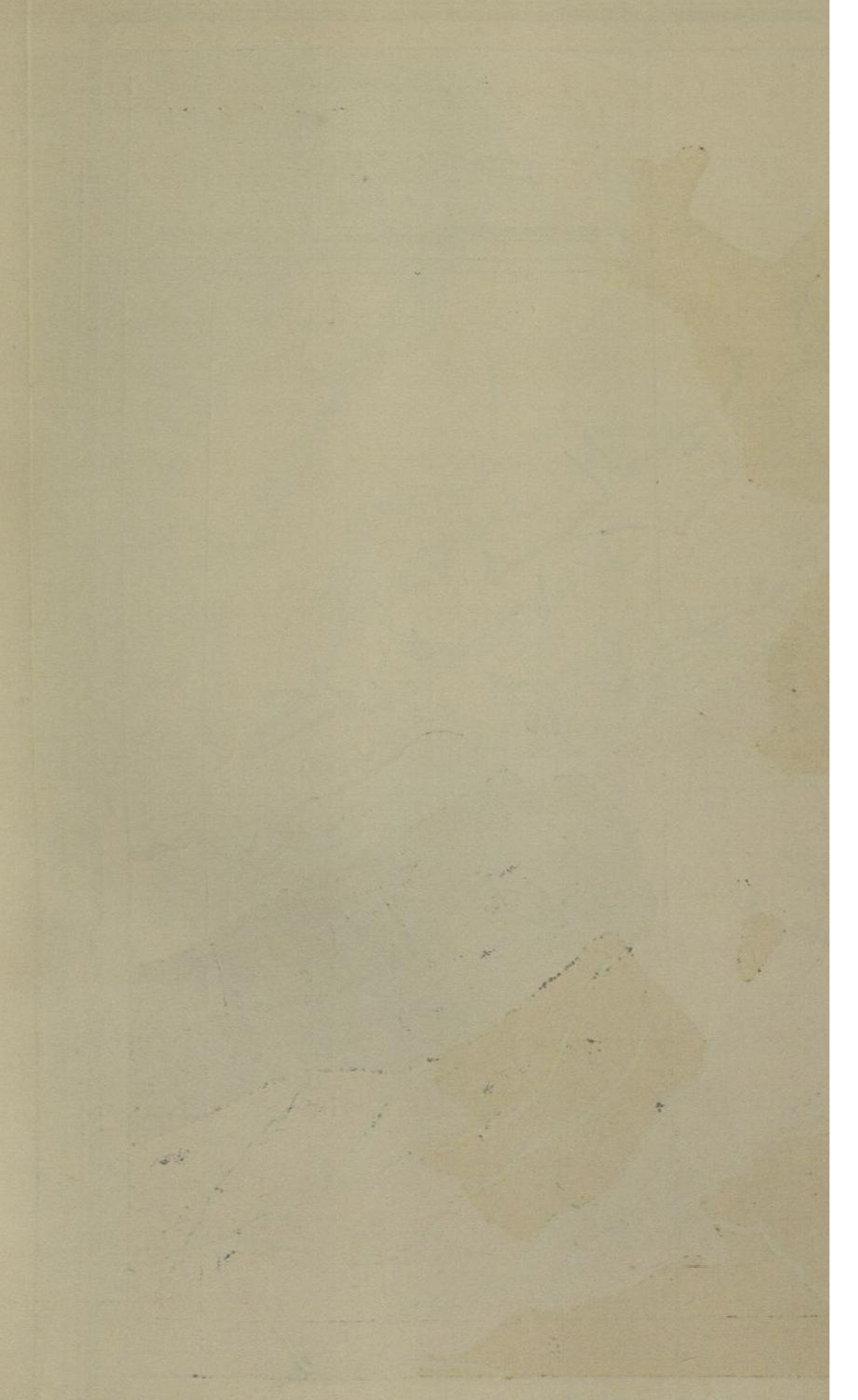
تحفہ، جو شیخ صاحب موصوف نے کر نئے وہ امجد نام اُن کا ایک نوجوان بیٹا تھا، جس کو انھوں نے

مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے راہِ خدا میں نذر کر کے سید صاحبؒ کے حوالے کر دیا اور عرض

کیا کہ اس کو اپنے ساتھ جہاد میں لے جائیے اور تیغ کفار سے اس کی قربانی کرائیے"۔ (۱)

آپؒ نے اپنے لشکر کو چند جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھے ارشاد ہوا کہ تین

چار دن کے بعد اللہ بخش کی جماعت کوچ کرے، پھر تین چار دن کے بعد شیخ بڈھن کی جماعت، پھر تین چار ۵

روز کے بعد ہماری جماعت۔

رائے بریلی سے چل کر آپؒ کی پہلی منزل دلمؤ ہوئی۔ دوسرے روز ۹ جمادی الآخرہ کو آپ رح

فتح پور میں رونق افروز ہوئے۔ فتح پور میں شیخ غلام علی نے ٹھیر کر سفر کا سامان تیار کرایا۔ یہ معلوم کر کے کہ

سندھ تک کا یہ سفر اس راستے سے ہوگا، جس میں پانی بہت کمیاب ہے اور اس ملک میں پانی بہت

دور اور کنوئیں بہت گہرے ہوتے ہیں کہ سو سو ہاتھ کی رسّی لگتی ہے انھوں نے ہلکی ہلکی ڈولچیاں اور ۱۰

لمبی لمبی ڈوریاں تیار کر کے فی کس ایک ایک قافلے میں تقسیم کیں تاکہ ایک کو دوسرے کی ضرورت نہ ہو

اسی طرح اور ضروری ضروری سامان تیار کرا کے قافلے کی نذر کیا۔

فتح پور سے بھوا ہوتے ہوئے چلہ تارا گھاٹ (ضلع باندہ) کے راستے سے دریائے جمنا عبور کر کے

ایک روز سر کنڈی (ضلع فتحپور) میں ٹھیرتے ہوئے شہر باندے میں قیام فرمایا۔ مرزا عبدالقادر وغیرہ اور

بہت سے آدمی وہاں داخلِ بیعت ہوئے۔ یہیں اللہ بخش خاں کی جماعت قافلے میں شامل ہوئی۔ ۱۵

تین روز کے بعد باندے سے کوچ ہوا اور جلال پور کے راستے جالون پہنچے۔ (۲) پیچھے سے سید عبدالرحمٰن

کا قافلہ آ کر مل گیا۔ یہاں سے چل کر شہر گوالیار پہنچے۔ دولت رائے سندھیا حاکم گوالیار کے لشکر میں

غلام حیدر خاں وغیرہ بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔

مہاراجہ گوالیار کی طرف سے دعوت گوالیار میں نواب فتح علی خاں کے باغ میں آپؒ فروکش ہوئے۔ اس وقت

نواب صاحب ہی کی طرف سے دعوت ہوئی۔ دوسرے روز چند و راؤ نے حاضر ہو کر عرض کی کہ مہاراج ۲۰

---

(۱) "سوانح احمدی"، صفحہ ۸۹۔　(۲) جلال پور ہمیر پور سے جانب مغرب تقریباً ۱۲، ۱۵ میل ہے۔

دولت راؤ نے سلام عرض کیا ہے اور کہلوایا ہے کہ میں بیمار ہوں، حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اگر سرفراز فرمائیں، تو بڑا کرم ہوگا۔ آپؒ نے فرمایا: "بہتر ہے، ہم ملاقات کے لیے آئیں گے۔ مہاراجہ صاحب کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں"۔ دُوسرے دن یا ایک دو روز کے بعد ظہر کے وقت آپؒ نماز کے بعد دولت راؤ کے محل میں تشریف لے گئے۔ یکہ کانِ سرکاری استقبال کے لیے باہر آئے اور اپنے ساتھ محل میں لے گئے۔ ایک بہت بڑا فرش بچھا تھا۔ ہندو راؤ نے آپؒ کے تمام ہمراہیوں کو اُسی پر بٹھایا اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دولت راؤ کے کمرے میں لے گیا۔ دولت راؤ نے بڑی تعظیم و تکریم کی۔ رانی چلمن کے پیچھے بیٹھی تھی۔ طرفین سے سلام و مزاج پرسی ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔

مہاراجہ کی فرمائش مہاراجہ نے عرض کیا: "میں نے سنا ہے کہ آپ کی توجہ میں بڑی تاثیر و قوّت ہے اُمیدوار ہوں کہ مجھے بھی اپنے فیض سے سرفراز فرمایا جائے گا"۔ آپؒ نے فرمایا: "آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ باطنی توجہ تو قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے اور کفر اس کے منافی ہے۔ مقوّی غذا تندرست آدمی کے لیے باعثِ تقویت ہے، نہ بیمار کے لیے"۔ مہاراجہ نے کہا: "دُوسرے بزرگانِ دین مجھے توجہ دے چکے ہیں۔ آپ ایمان کی شرط کرتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ خالقِ برتر آپ کی توجہ سے مجھے ایمان کی توفیق ارزانی فرمائے"۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا: "چونکہ آپ ایمان کو سب سے قیمتی چیز سمجھتے ہیں، اس لیے میں توجہ کرتا ہوں"۔ آپؒ نے اس کو سامنے بٹھا کر توجہ فرمائی۔

مہاراجہ کے محل میں پہلی اذان تھوڑی دیر گزری تھی کہ لشکرِ اسلام کے مؤذن شیخ باقر علی نے دروازے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے عصر کی اذان دی۔ محل میں اندر سے باہر تک ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ عورتیں تماشہ دیکھنے کے لیے کوٹھوں پر جمع ہو گئیں۔ سرکاری اہل کار کام چھوڑ کر تماشے میں لگ گئے۔ دو فرانسیسی بھی وہاں مقیم تھے۔ اُن کو تعجب ہوا کہ آج تک کسی پیر فقیر نے یہاں ایسی صدا بلند نہیں کی، یہاں تک کہ مہاراج کے پیر صاحب کو بھی آج تک یہاں نماز پڑھتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، حالانکہ اُن کی آمد و رفت یہاں بہت رہتی ہے۔ ہندو راؤ نے فوراً چوبدار کو حکم دیا۔ بھشتی حاضر ہوئے اور آن کی آن میں مہمانوں نے وضو کر کے صفیں درست کیں۔ لوگوں نے

جانمازیں، جو اُن کے ہاتھوں میں تھیں، بچھائیں۔ سید صاحبؒ آگے بڑھ کر مصلّے پر کھڑے ہُوئے اَور مکبّر نے عربی لہجے میں تکبیر کہی۔ آپؒ نے تکبیر کہی اَور نماز شروع ہُوئی۔ تمام حاضرینِ مجلس کی نگاہیں آپؒ کے چہرے پر تھیں۔ آپؒ نے سفر کی دو رکعتیں پڑھیں اَور سلام پھیرا۔

مزید قیام کی درخواست نماز کے بعد ہندو راؤ پھر آپؒ کو مہاراجہ کے کمرے میں لے گیا۔ اس وقت آپؒ کے اَور مہاراجہ دولت راؤ اَور ہندو راؤ کے سوا اَور کوئی نہ تھا۔ البتّہ مہارانی چلمن کے پیچھے بیٹھی ہُوئی تھی۔ دولت راؤ نے کہا: "آپ کو اَور پُورے قافلے کو مَیں ایک سال تک مہمان رکھنا چاہتا ہُوں۔ آپ ہمارے شہر میں قیام فرمائیں"۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ پھر اس قدر توقّف فرمائیں کہ مَیں قافلے کا سامان اَور ہتھیار درست کر دُوں۔ آپؒ نے اس کو بھی منظور نہیں فرمایا۔

احمد شاہ دُرّانی کا پوتا گوالیار میں احمد شاہ دُرّانی کا پوتا چھ مہینے سے گوالیار میں مقیم تھا۔ مہاراجہ سے مُلاقات اَور رُخصت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس نے سید صاحبؒ سے مل کر مہاراجہ کے یہاں سفارش چاہی تھی۔ جب آپؒ مہاراجہ سے رُخصت ہونے لگے، تو آپؒ نے مہاراجہ سے فرمایا: "احمد شاہ دُرّانی کے پوتے چھ مہینے سے آپ کے شہر میں آئے ہُوئے ہَیں۔ آپ جانتے ہَیں کہ اُن کے دادا کس شان و شوکت کے تھے کہ جس وقت ہندوستان میں اُن کی آمد کی اطلاع ہُوئی، تو اس مُلک کے راجاؤں، مہاراجاؤں کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اَور اُنھوں نے کس طرح دہلی کو تہ و بالا کر دیا۔ خُدا کی شان ہے کہ اُن کا پوتا آج آپ کے دروازے پر ہے۔ خدا کی شانِ بے نیازی سے ڈرنا چاہیے۔ اس کو انقلاب کرتے اَور پست کو بلند اَور بلند کو پست کرتے دیر نہیں لگتی"۔

مہاراجہ نے اس گفتگو کا پُورا اثر لیا اَور حُکم دیا کہ یہاں سے حیدر آباد تک سفر کے لیے شہزادے کا سامان درست کر دیا جائے اَور ہماری قلمرو میں جو جو مقامات اُن کے راستے میں پڑتے ہیں، وہاں پروانہ جاری کر دیا جائے کہ اُن کے لیے ضروری سامان مُہیّا کیا جائے اَور پُوری حفاظت و خدمت کے ساتھ حیدر آباد پُہنچا دیا جائے۔

آپؒ مہاراجہ سے رُخصت ہو کر محل سے باہر تشریف لائے۔ فرانسیسی اَور تمام اہلِ دربار

کی زبان پر تھا کہ پیر ہو، تو ایسا ہو کہ جو مالکِ حقیقی کے حقوق کے سامنے کسی کی پروا نہ کرے اور امیر و فقیر اُس کی نظر میں یکساں ہوں۔

مہاراجہ کی نذر مہاراجہ نے کپڑوں اور خلعتوں کے تین بڑے بڑے گٹھر، کہ ہر گٹھر کو دو دو آدمی اُٹھاتے تھے اور دو یا تین روپوں سے بھرے خریطے نذر کیے۔ سید عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ یہ معلوم نہیں کر سکا کہ خریطوں میں کس قدر روپیہ تھا اور گٹھڑوں میں کس قدر کپڑا تھا۔ اتنا معلوم ہو سکا کہ سیلے اور رومال بہت تھے اور ایک قبا، جس کے دامن میں مروارید ٹکے تھے اور گریبان میں قیمتی جواہرات تھے۔ یہ سارا سامان آپؒ کے ہمراہیوں کے حوالے ہوا۔

شہزادے کی پیش کش آپؒ محل سے نکل کر شہزادے کے یہاں تشریف لے گئے اور مہاراجہ کی گفتگو اور ملاقات کی سرگزشت سنائی اور اُن کی شایانِ شان رخصت کا مژدہ سنایا۔ شہزادے کی ایک لڑکی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا داماد ملے، جو وجاہتِ ظاہری و باطنی رکھتا ہو۔ اس نے سید صاحبؒ سے باصرار خواہش کی کہ آپؒ اُس کو اپنی زوجیت میں قبول فرمالیں۔ آپؒ نے منظور نہیں کیا اور اُن کو اطمینان دلایا کہ میرے بھانجے، بھتیجے اور دوسرے عزیز ہیں۔ ان میں سے کسی کو انتخاب کر کے بعد میں بلواؤں گا۔ اُس وقت آپ بھیج دیں۔(۱)

ہندو راؤ کی دعوت اور تواضع دوسرے روز رات کے وقت ہندو راؤ نے دعوت کی۔ آپؒ اس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور فرش پر لا بٹھایا۔ اتنے میں یکہ تازوں کی آمد شروع ہوئی۔ ہندو راؤ ہر ایک کی تعظیم کے لیے اُٹھتا تھا۔ سید صاحبؒ بھی اُس کے ساتھ تعظیم میں شریک ہوتے تھے۔ اُس نے عرض کیا کہ آپ تشریف رکھیں، آپ کو تکلیف کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک کی الگ الگ تعظیم کریں، اس لیے

(۱) سید عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ جب سید صاحبؒ نے مجھے ٹونک سے اپنے گھر والوں کو لانے کے لیے بھیجا، تو ایک خط شہزادۂ موصوف کو لکھ کر میرے حوالے کیا، جس میں شہزادی کی طلبی کا مضمون تھا۔ گوالیار پہنچنے سے پہلے سخت بارش ہوئی، جس میں وہ خط بھیگ کر خراب ہو گیا۔ بغیر آپؒ کے خط و سند کے شہزادے سے اس کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا اور قصداً ملاقات کیے بغیر ٹونک چلا گیا اور یہی عذر میں نے سید صاحبؒ کو اپنے عریضے میں لکھا۔

کہ یہ ہماری ریاست کا دستور ہے۔ آپؒ بیٹھ گئے یہاں تک کہ بہت سے بگہ گان حاضر ہوگئے
ہندو راؤ نے آپؒ کو پندرہ اشخاص اور پندرہ بگہ گان کے ساتھ اپنے ساتھ لیا اور مکان میں لے
جاکر فرش پر بٹھایا اور مہمانوں کے ہاتھ خود دھلانے لگا۔ آپؒ نے منع فرمایا۔ اس نے کہا کہ میری
سعادت اسی میں ہے کہ میں خود ہاتھ دھلاؤں اور آپؒ کے حاضرین کے سامنے کھانا چنوں۔
آپؒ نے فرمایا کہ ہمیں یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا، آپ تشریف رکھیے۔ آپؒ نے ہندو راؤ　۵
کے ہمراہیوں سے کہا کہ ان کے لیے کرسی بچھا دیجیے۔ ہندو راؤ حکم کی تعمیل میں بیٹھ گیا اور سرکاری
اہلکاروں نے سید صاحبؒ کے اور دوسرے حاضرین کے ہاتھ دھلائے۔ سب سے پہلے جو کھانا حاضر
کیا گیا، وہ مرہٹی کھانا تھا، جس میں پسی ہوئی سرخ مرچ بہت تھی۔ ابھی کسی نے چکھا ہی تھا کہ
منتظمین اٹھا کر لے گئے۔ ہندو راؤ نے عرض کیا کہ ہمارا اصلی قومی کھانا یہی ہے۔ اس کے بعد
ہندوستانی امرا کے کھانے شیرمال، پراٹھے، کئی قسم کے پلاؤ، متنجن، کئی قسم کے قلیے، فیرنی اور　۱۰
باقرخانی وغیرہ لائے۔ لوگ تھوڑا تھوڑا کھانے پائے تھے کہ ان کو اٹھا لیا اور دوسرے کھانے، کئی
قسم کے کباب، پسندے، سیخ کباب، بھنا ہوا مرغ وغیرہ لائے۔ اسی طرح کئی دور ہوئے یہاں تک
کہ کھانے سے فراغت ہوئی اور ہاتھ دھلائے گئے اور پان کے بیڑے، جن پر سونے کے ورق
لگے ہوئے تھے، لائے گئے اور عطر لگایا گیا۔ اس کے بعد کپڑوں کے خوان آئے، جن میں اکثر
سرخ رنگ کے سیلے اور مندیل تھے۔ آپؒ نے دیکھ کر فرمایا: "اس کی کیا ضرورت ہے؟" ہندو راؤ　۱۵
نے کہا: "یہ پختہ رنگ ہے۔ سو شوب میں بھی رنگ میں فرق نہ آئے گا۔ یہ سب برہان پوری
ہے۔ سنا ہے کہ پختہ رنگ شرع شریف میں درست ہے۔" جوڑوں میں ایک جوڑا کم تھا۔ سید
عبدالرحمٰن کے لیے فوراً ایک جوڑا منگوایا گیا۔

سید صاحبؒ کے جوڑے میں قیمتی مروارید کا ایک ہار تھا اور ایک زریں چوغہ۔ ہندو راؤ
اپنے ہاتھ سے سید صاحبؒ کو پہنانے لگا۔ آپؒ نے عذر فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ میری تمنا ہے　۲۰
کہ میں اپنے ہاتھ سے آپؒ کو پہناؤں، ورنہ میں جانتا ہوں کہ آپ استعمال نہیں فرمائیں گے۔ اس

کوشش میں موتی کی لڑی ٹوٹ گئی اور مروارید بکھر گئے۔ حاضرین نے چُن کر خوان میں رکھ دیا اور آپؒ کی فرودگاہ میں بھیج دیا گیا۔

قافلے کی فوجی ترتیب یہیں گوالیار میں آپؒ نے قافلۂ مہاجرین کو فوجی اصُول پر پانچ گروہوں پر تقسیم کیا اور ہر گروہ کے ذمّے ایک خدمت سپُرد کی۔ ایک جماعت خاص تھی، جو قلبِ لشکر گاہ تھی۔ اُس کے افسر مولوی محمّد یُوسف پھلتی مقرّر ہوئے۔ یہ جماعت ہمیشہ آپؒ کے ساتھ رہتی تھی اور کبھی الگ نہیں ہوتی تھی۔ دُوسری جماعت مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب کے ماتحت تھی اور وُہ مُقدّمۃُ الجَیش تھی۔ تیسری جماعت میسرہ سیّد محمّد یعقُوب[1] کے ماتحت تھی، جس کے مہتمم شیخ بُڈھن تھے۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خاں کی تھی، جو ساقۃُ العَسکر (رئیر گارڈ) تھی۔ وُہ چھکڑوں اور جانوروں کے ساتھ رہتے تھے، لشکر سے پہلے روانہ ہوتے تھے اور کبھی مغرب کے وقت اور کبھی عشا کے وقت منزل گاہ پہنچتے تھے۔ امجد خاں رئیسِ موضع گُنّنی اور چند اشخاص تھے، جن کا تعلّق کسی جماعت سے نہیں تھا۔ یہ لشکر گاہ کے میمنے میں رہتے تھے۔ بار برداری وغیرہ کا کام ایک روز مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب کی جماعت کے ذمّے اور ایک روز سیّد محمّد یعقُوب کی جماعت کے ذمّے تھا۔

گوالیار میں دُوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ قیام کی نوبت آئی، یہاں تک کہ دو جُمعے پڑھے گئے۔ ہندو سردار آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور آپؒ اُن کو پند و نصائح فرماتے رہتے تھے۔

گوالیار سے ٹونک تک گوالیار سے کُوچ فرما کے چھوٹے چھوٹے مقامات سے ہوتے ہُوئے ایک ہفتے میں آپؒ کرولی پہنچے۔ کسمنڈی، ضلع لکھنؤ کے ایک رئیس حاجی جلال الدین نے، جو وہاں اس وقت مقیم تھے، ایک روز قیام کرنے کی درخواست کی اور دعوت کی۔ بکثرت آدمیوں نے بیعت کی۔

(۱) سیّد محمّد یعقُوب سیّد ابراہیم کے صاحبزادے اور سیّد صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ وُہ خُود بعض ضرُوری کاموں کی تکمیل کے لیے ٹونک میں رہ گئے تھے۔

کھڈلی سے روانہ ہو کر خوشحال گڑھ، میڈاری (ریاست جے پور) اور جھلائی (ریاست جے پور) ہوتے ہوئے چھ روز میں آپؒ ٹونک پہنچے۔

ایک فقیر کی اصلاح و ہدایت میڈاری میں ایک فقیر ایک غریب عورت کے دروازے پر جو رسی بٹنے میں مصروف تھی، نہایت بے حیا اور مذموم طریقے پر لوگوں سے سوال کر رہا تھا۔ اس نے ایسی ہیئت بنائی تھی، جو نہایت مکروہ اور خلافِ تہذیب تھی۔ آپؒ لشکر کے ساتھ اُس کے سامنے سے گزرے اور اُس نے کچھ پروا نہیں ۵
کی۔ آپؒ نے کچھ دور جا کر آدمی بھیج کر اُس کو طلب فرمایا۔ اُس کا بخت یاور تھا، وہ فوراً حاضر ہو گیا۔ آپؒ نے اس کو اس حرکت پر سرزنش فرمائی اور سخت غیرت دلائی۔ اُس نے توبہ و بیعت کی درخواست کی اور بیعت کر کے مجاہدین میں شامل ہو گیا۔ آپؒ نے اُس کا نام عبداللہ رکھا۔ اُس کی حالت تبدیل ہو گئی۔ طاقتور آدمی تھا، تیر و کمان ساتھ رکھتا تھا۔ محمد سعید خاں کے رسالے میں شامل کر دیا گیا۔ سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ سرحد کے معرکے میں شہادت پائی۔ ۱۰

ٹونک ظہر کے وقت آپؒ ٹونک پہنچے اور قلعے کے میدان میں فروکش ہوئے۔ امیر الدولہ نواب امیر خاں والیِ ریاست ٹونک گھوڑے پر سوار ہو کر ملاقات کے لیے آئے۔ آپؒ نے عربی گھوڑا نواب صاحب کو تحفہ دیا۔ نواب صاحب نے تبرکاً قبول کر کے قلعے بھیج دیا اور آپؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر آپؒ کو نذر باغ میں لائے۔ نواب صاحب نے صاحبزادہ وزیر محمد خاں کو، جو بعد میں وزیر الدولہ بہادر والیِ ٹونک ہوئے، بلا بھیجا۔ عصر و مغرب کی نماز اسی باغ میں پڑھی گئی۔ اہلِ قافلہ شہر میں مختلف مقامات ۱۵
پر مقیم رہے۔ ایک مہینے کے قریب ٹونک میں قیام رہا۔ نواب صاحب کی طرف سے تمام مہاجرین کی دعوت و ضیافت برابر ہوتی رہی۔

ٹونک میں یہ مشورہ ہوا کہ گھر والوں کو راستے پر ہی سے بلا لیا جائے۔ ٹونک سے روانگی ہوئی اور آپؒ کا خیمہ دریائے بناس عبور کر کے گلوت میں لگایا گیا۔ نواب صاحب نے بیش قیمت تحائف پیش کیے۔ ان میں سے ایک بلند قامت، تندرست اور فربہ گھوڑا تھا، جو پوری ریاست میں مشہور ۲۰
تھا، بلکہ دوسری ریاستوں میں اس کی نظیر نہیں تھی۔ سید صاحبؒ نے اس کے قبول کرنے سے

عُذر کیا اور فرمایا کہ اس کا آپ ہی کی سواری میں رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپؒ کی قیام گاہ پر بھی کھانا نوّاب صاحب کی سرکار سے آتا تھا اور دُوسری پیش کشیں پہنچتی رہتی تھیں۔

نوّاب صاحب کی بیعت ایک روز نوّاب صاحب نے آپؒ کو ٹونک تشریف لانے کی زحمت دی اور خود صاحبزادہ وزیر محمد خاں اور اُن کی بیوی، جو نوّاب صاحب ممدُوح کی بھانجی تھیں اور بعض دُوسرے مُتعلّقین کے ساتھ بَیعت کی۔ سوار اور پیادے جُوق جُوق آکر بیعت ہُوئے اور بہُت سے لوگوں نے ان موقعوں سے فائدہ اُٹھایا۔

رسالدار عبدالحمید خاں ٹونک کے اثناے قیام میں عبدالحمید خاں رامپوری، جو ایک رند مشرب، آزاد مزاج آدمی تھے، بَیعت سے مشرف ہُوئے اور وہیں سے ہم رکاب ہو گئے۔ اُنھوں نے ایسا اعتماد اور خصُوصیت پیدا کی کہ بالآخر پُورے لشکرِ اسلام کی رسالداری کے اہم منصب پر فائز ہُوئے اور مہیار کے معرکے میں زخمی ہو کر شہادت پائی۔ نوّاب وزیر الدّولہ مرحُوم اُن کا ذِکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:۔

"رام پور کے ایک پٹھان عبدالحمید خاں، جن کی عُمر فسق و فجور میں گُزری تھی اور اپنے شجاعت و تہوُّر میں بہُت سے خونِ ناحق کیے تھے، ابتداے نشوو نُما سے میرے والد (نوّاب امیر خاں مرحُوم) کے لشکر میں مُلازم تھے۔ سیّد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جب ٹونک تشریف لائے اور آپؒ کا وہاں سے کوچ ہُوا، تو عبدالحمید خاں کی قسمت بھی جاگی۔ آپؒ ٹونک سے چار کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہُوئے تھے اور ہم سب آپؒ کو رُخصت کرنے کے لیے وہاں تک گئے تھے۔ عبدالحمید خاں اپنے ایک ہم مشرب دوست کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ اُنھوں نے سیّد صاحبؒ کو دیکھ کر تمسخُر کیا۔ سیّد صاحبؒ نے مُسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر فرمایا کہ خاں جیو، بَیعت کرو! دونوں نے والہانہ انداز سے بَیعت کی اور اس وقت سے جو آپؒ کی رکاب تھامی، تو پھر نہیں چھوڑی۔ کتنا ہی اُن کے دوستوں نے اُن کو اس رفاقت سے باز رکھنے کی کوشش کی، کُچھ اثر نہیں ہُوا۔ ان کی حالت برابر بدلتی چلی گئی یہاں تک کہ مہیار کی جنگ میں زخم

کھا کر جامِ شہادت نوش فرمایا ؎

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست　　روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم![1]

روانگی　گوت سے آپؒ جھالانا تشریف لے گئے۔ نوّاب صاحب نے یہاں تک متابعت کی۔ داؤد خاں، صالح محمد خاں اور ریاست کے دوسرے عمائد یہاں پہنچ کر بیعت سے مشرف ہوئے۔

5 آپؒ نے مولانا عبدالحی اور مولوی عبدالقدوس کو ٹونک واپس کر دیا اور سیّد عبدالرحمٰن، سیّد محمد یعقوب اور سیّد زین العابدین ابن سیّد احمد علی کو اپنے متعلقین والدۂ بی بی سارہ و والدۂ سیّد محمد اسمٰعیل وغیرہما کو لانے کے لیے وطن روانہ کر دیا۔ چلتے وقت نوّاب صاحب ممدوح کا پیش کیا ہوا گھوڑا بھی واپس کر دیا اور فرمایا کہ پروردۂ نعمت ہے، سفر کی سختیاں برداشت نہیں کر سکے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ نوّاب صاحب نے قبول نہیں فرمایا۔ آخر یہی ہوا۔ اجمیر سے نکل کر کسی منزل پر یہ گھوڑا

10 ہلاک ہو گیا۔[2]

اجمیر اور پالی　اجمیر میں مولوی سراج الدین مرحوم اور دوسرے عمائدِ شہر اور عام مسلمانوں نے بیعت کی۔ اجمیر سے چل کر آپؒ نے پالی مقام کیا، جو اجمیر سے پچاس کوس ہے اور اس زمانے میں راجپوتانے کا مشہور تجارتی مرکز تھا۔ یہاں چار روز قیام رہا۔ ہزاروں مرد اور عورتوں نے بیعت کی۔ ۱۶ رمضان کو آپؒ وہاں سے روانہ ہوئے اور کھٹیا گڑھ منزل کی، جہاں آپؒ کو ایک روز ٹھیرنا تھا۔ پالی کے

15 عقیدتمند، جن کی اس چہار روزہ قیام میں سیری نہیں ہوئی تھی، کھٹیا گڑھ تک ساتھ آئے اور ایک روز کی معیت کو غنیمت سمجھا۔ تقریباً سو آدمی روزے کی حالت میں کھٹیا گڑھ تک پہنچے اور آپؒ کے مہمان ہوئے۔

اگلے روز جب وہاں سے روانگی ہوئی، تو سب لوگ تو واپس گئے، سات آدمی اگلی منزل تک ساتھ آئے۔ ایک ضعیفہ جو پالی میں بیعت سے محروم رہی تھی، اُس روز اونٹ پر سوار ہو کر اپنے نواسے کو

20 ساتھ لے کر آئی، بیعت کی اور اس روز تمام لشکر کی ضیافت کے اخراجات جو پچاس روپے کے قریب تھے، اپنے ذمے رکھ لیے۔[3]

---

(۱) "وصایا الوزیر"، صفحہ ۱۱۰-۱۱۱　(۲) "منظورۃ السعدا" (قلمی)　(۳) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۲۳

اُنیسواں باب

مارواڑ اور سندھ

پالی سے سندھ کی سرحد (عمر کوٹ) تک مارواڑ کے ریگستان کا نہایت دُشوار گزار اور بے حد پُر مشقّت سفر تھا، جو خُود ایک مُستقل جہاد اور طویل سلسلۂ مجاہدات تھا۔ سیّد حمید الدّین نے پالی سے جودھپور کا فاصلہ بیس کوس اور جودھپور سے عمر کوٹ کا فاصلہ ایک سو بیس کوس لکھا ہے، گویا دو سو اسّی میل اس ریگستانی سفر کے طے کیے، جس کے متعلّق سیّد حمید الدّین کی، جنھوں نے رائے بریلی سے پشاور تک کا پُورا سفر طے کیا ہے، شہادت اور تاثّر یہ ہے :۔

شاید راہِ ہیچک جا در کسے بلاد بایں دُشوار گزاری و صعب المروری و ویرانی و بے آبی با خطراتِ غارتگرانِ قزاق و عدمِ نشانِ راہ نبودہ باشد۔[1]

شاید کسی مُلک میں بھی کوئی راستہ ایسا دُشوار گزار، صعب المرور، ویران و بے آب نہیں ہوگا، جتنا مارواڑ کے صحرا کا یہ راستہ۔ پھر اس پر غارتگروں اور قزاقوں کے خطرات اور راستے کا بے نشان ہونا مستزاد ہے

اُن کے مکتُوب کے مندرجۂ ذیل اقتباسات سے اس راستے کی دُشوار گزاری اور مشقّتوں اور خطروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے :۔

"سلاباس سے روانہ ہُوئے، تو سارا دن ایک ایسے جنگل میں چلتے کٹ گیا، جو سخت خاردار اور بالکل غیر آباد تھا۔ روپاباس میں منزل ہُوئی۔ وہاں ایک کُنواں تھا، جس کا قُطر تین ہاتھ اور گہرائی سو ہاتھ تھی۔ پانی نہایت کھاری، جو صرف مجبُوری ولاچاری سے استعمال کیا گیا۔

(1) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۲۲

اس پر بھی سیکڑوں آدمی پانی لے جانے کے لیے اپنے اپنے چھکڑے لیے ہوئے اور سیکڑوں اُونٹ اور گائے بکری اس طرح جمع تھے کہ کسی آدمی کا کُنویں تک پہنچنا بھی مشکل تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہُوا کہ پانچ پانچ چھ چھ کوس سے لوگ یہاں پانی لے جانے کے لیے آتے ہیں اور مویشی پانی پلانے کے لیے لاتے ہیں۔

موضع تردڑ میں ایک ندی تھی، جس کا پانی بالکل کھاری تھا۔ گھوڑے اور جانور بھی اس کو نہیں پی سکے۔ ندی کے اندر ہم نے بہت سے کُنویں کھودے۔ دو تین ہاتھ پر پانی نکل آتا، کہیں میٹھا، کہیں کھاری۔ کھاری چھوڑ دیتے اور میٹھے سے کام چلاتے۔ کسی طرح یہاں رات گزاری۔ یہ کُنویں جو کھودے جاتے تھے، ایک دن میں ریت سے بھر جاتے اور خشک ہو جاتے۔ میٹھا پانی بھی جو نکلتا، وہ دو تین گھڑی کے بعد کھاری ہو جاتا۔ دُور دُور تک آبادی کا نشان نظر نہ آیا۔ راستے میں سوائے وحشتناک اور خاردار جنگلوں کے کچھ نظر نہ آیا۔

چاندڑہ میں زمین میں سخت نشیب و فراز اور ریت کے ایسے ٹیلے تھے کہ ایک کوس چل کر ایسا تکان ہوتا تھا کہ گویا چار کوس چلے۔ ان ٹیلوں کے اُوپر خاردار جنگل اور بہت اُونچے اُونچے درخت تھے۔ دس دس بیس بیس کوس کے فاصلے پر کوئی کُنواں ہوتا۔ کہیں کسی مسافر یا چلنے والے کا نشانِ قدم نظر نہیں آتا تھا۔ نہ کہیں اس ریگزار میں راستہ نظر آتا تھا۔ رہبر کے بغیر چلنا مشکل تھا۔ اگر مسافر رہبر سے چھوٹ جائے، تو بھٹک کر پیاسا مر جائے۔

اس مقام پر پانی اتنا گاڑھا اور کالا تھا کہ کسی طرح پینے پر طبیعت آمادہ نہ ہوتی تھی، لیکن مجبوری سے پیا گیا۔

اسی حالت میں سمر ابیے کی منزل میں عید کا چاند دیکھا۔ اگلے روز عید تھی۔ پالی سے اس مقام تک متواتر و مسلسل سفر رہا۔ لوگ بہت خستہ ہو گئے تھے۔ لوگ، جو راستے سے قافلے میں شامل ہوتے گئے تھے اور ابھی تک اُن کو بیعت کا شرف حاصل نہیں ہُوا تھا، اُنھوں نے نمازِ صبح کے بعد بیعت کی اور تمام حاضرین و غائبین کے لیے بڑے خشوع و خضوع سے دُعا ہُوئی۔ یہی محفلِ بیعت دوگانہ

لشکر اَور محفلِ سرود بن گئی اَور مخلصین کی عید ہو گئی۔

۲ر شوال کو جب سوراہے سے کوچ ہُوا، تو ہم نے سُنا کہ اِس علاقے میں بلوچ اکثر ڈاکہ ڈالتے ہیں اَور غارتگری کرتے ہیں۔ اُن کو کھوسا (یعنی قزاق) کہتے ہیں۔ اِس لیے لشکر میں پہرے اَور چوکیداری کا خاص اِنتظام کیا گیا۔ سوراہے سے ہم دو کوس چلے تھے اَور نمازِ فجر میں مشغول تھے کہ بیس سوار اَور دو شتر سوار اَور چند پیادے دُور سے نظر آئے۔ اس بیابان میں، جہاں آدمی کی صورت کو آدمی ترستا ہے، اس گروہ کو دیکھ کر یقین ہُوا کہ یہ قزاق ہیں اَور جیسا کہ رہبر نے کہا تھا، ہم کو یقین ہُوا کہ صدہا سوار جنگل میں چھپے ہوں گے۔ حضرتؒ نے سواروں اَور پیادوں کو جنگی ترتیب اَور قاعدے سے آراستہ کیا اَور سارے دِن اسی ترتیب سے سفر طے کرتے رہے۔ پاڑیا یا رالیوا کے مقام پر قیام ہُوا۔ یہاں ایک کُنواں، جس کے ساتھ ایک حوض بھی تھا، موجود تھا۔ اس کا پانی کھاری تھا، لیکن مجبوری سے استعمال ہُوا۔ اس روز قزاق اس موضع کی چراگاہ سے اکثر مویشی لُوٹ لے گئے۔ لشکر کا چوکی پہرہ اَور سخت کر دیا گیا۔ رات کو ہم سب جنگ کے لیے مستعد تھے، لیکن کسی کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہُوئی۔

موضع برسالی کے باشندے ہم کو دیکھ کر بڑے خوف زدہ ہُوئے۔ وُہ سمجھے کہ قزاق آئے ہیں اَور لوٹنے کے لیے آمادہ ہُوئے، لیکن بار بردار اُونٹوں اَور مُسافروں کے قافلے کو دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ موضع کے کنارے پر خام کُنویں تھے۔ اہلِ قریہ نے خاردار درخت کاٹ کر ان کُنووں کو بھر دیا تھا کہ دُشمن پانی نہ پی سکے۔ حضرتؒ نے اُن کے سرداروں کو بُلا کر اُن کی تسلی تشفی کی اَور اپنا حال بیان کیا۔ ترجمان کے بغیر اُن سے گفتگو ممکن نہ تھی۔ آپؒ نے اُن کے ذریعے اُن کو پوری بات سمجھائی اَور اُنھوں نے کُنویں صاف کیے۔ کُنووں میں پانی بہت کم تھا۔ بڑی دِقت سے رات کاٹی اَور صُبح روانہ ہُوئے۔

برسالی سے چل کر ایک دُوسرے مقام پر پہنچے۔ وہاں کے باشندے بھی ہم کو دیکھ کر مقابلے کے لیے آمادہ ہُوئے۔ حضرت نے موضع سے دُور ہی توقف فرمایا۔ آپؒ نے اُن کو سمجھانے

کے لیے شیخ باقر علی کو بھیجا۔ انھوں نے ایک بندوق سر کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا۔
آخر وہ اپنے ریت کے ٹیلے سے نیچے اترے۔ جب بار بردار اونٹوں کو دیکھا، تو مطمئن ہوئے۔ حضرتؒ
مع لشکر کے ان کے مقام پر تشریف لے گئے اور بڑی خاطرداری اور محبت سے ان کو رام کیا۔ وہاں
سے کچھ فاصلے پر دس پندرہ کنوئیں تھے، جن میں صرف ایک دو میں پانی تھا، لیکن وہ بھی دو تین
ڈول کھینچنے سے خشک ہو گئے۔ پانی کی سخت دقت ہوئی۔ لوگوں نے وہی گدلا اور سیاہ پانی　۵
پیا۔ اونٹ اور گھوڑے پیاسے ہی رہے۔ کسی نہ کسی طرح رات گزاری۔

اڈیون میں پانچ چھ خام کنوئیں تھے۔ ڈول نکالتے ہی سب خشک ہو گئے۔ لوگوں کا پیاس
سے برا حال تھا۔ حضرتؒ نے حکم دیا کہ لوگ کنوؤں میں اتر کر کھود دیں۔ اسی حال میں شام ہو گئی
لوگ پیاس سے بیقرار تھے۔ دوسری منزل سے کچھ پانی آیا، جس سے لوگوں نے حلق تر کیے۔ رات
کو کنوؤں سے پانی نکلنا شروع ہوا، جس سے لوگوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ جانوروں کی بھی آدھی　۱۰
پیاس بجھ سکی۔ رات بسر ہوئی۔

اگلی منزل پر باشندوں کو پھر وہی شبہ ہوا اور لڑنے کے لیے تیار ہوئے۔ شیخ باقر علی نے
جا کر ان کو سمجھایا، لیکن لشکر کو دیکھ کر وہ بدحواس ہوئے اور اپنے مویشی لے کر بھاگ گئے۔ آخر
حضرت خود اس موضع کے نیچے تشریف لے گئے۔ انھوں نے نیچے اتر کر آپ سے ملاقات کی۔
یہاں معلوم ہوا کہ یہاں سے بارہ کوس تک کہیں راستے میں پانی نہیں۔ چار گھڑی　۱۵
رات رہے قافلے کا کوچ ہوا۔ ساری رات اسی خشک و بے آب بیابان میں چل کر چھ گھڑی
دن نکلے کٹھیار کے مقام پر منزل ہوئی۔ وہاں ایک پختہ کنواں تھا، جس میں وہاں کے رہنے والوں
اور ان کے جانوروں کی ضرورت بھر کا پانی تھا۔ قافلے کے پہنچنے پر وہ کنواں خشک ہو گیا۔
گرمی کی شدت اور رات بھر چلنے کی وجہ سے آدمی اور جانور سخت پیاسے اور تھکے ہوئے تھے
یہاں پانی کے نہ ہونے اور پیاس کی زیادتی سے سخت تکلیف ہوئی۔ ایسی تکلیف کسی منزل پر نہیں　۲۰
ہوئی تھی۔ جو تھوڑا سا پانی کنوئیں سے نکلتا تھا، قریب تھا کہ لوگ اس پر لڑ مریں اور جانور دلسا

کا پیاس سے دم نکل جائے۔ سیدؒ صاحب تمام دن دھوپ میں اسی کنوئیں پر بیٹھے پانی نکلواتے رہے۔ آپؒ نے گھوڑوں اور اونٹوں کو پانی پلوایا اور جو پیاس سے بہت بیقرار اور خستہ حال تھے، اُن کو اتنا دیا کہ اُن کی زندگی برقرار رہ سکی۔

یہاں سے مارواڑ کا علاقہ ختم ہوا اور سندھی بلوچیوں کی عملداری شروع ہوئی۔ یہاں سادات و فقرا کی جیسی تعظیم دیکھی، کسی ملک میں کسی طبقے کی ایسی تعظیم نہیں دیکھی۔ مارواڑ کے پورے علاقے میں کسی جانور کا شکار ممکن نہ تھا۔ جانور کا مارنا اُن کے نزدیک آدمی کے قتل کے برابر تھا۔ یہاں پہنچ کر اہلِ اسلام کی حکومت کے آثار نظر آئے۔ ایک شخص نے ایک گائے نذر کی پانی کی قلت کی وجہ سے بڑی مشکل سے اُس کا گوشت پک سکا اور قافلے نے کھایا۔"(۱)

سرحدِ سندھ جودھ پور کے علاقے اور مارواڑ کے صحرا کا یہ پُرمشقت سفر کٹھیار پر ختم ہوا اور امیرانِ سندھ کی عملداری شروع ہوئی۔ عمر کوٹ کا قلعہ یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ آپؒ نے حاجی عبدالرحیم کو اپنی آمد کی اطلاع کے لیے قلعدار کے پاس بھیجا، جو حاکمِ سندھ کی طرف سے متعین تھا۔ حکومت جودھپور اور حکومتِ سندھ کے درمیان عمر کوٹ کے معاملے میں جھگڑا چلا آ رہا تھا اور انگریزوں کی طرف سے بھی سندھی مطمئن نہیں تھے۔ اُن کی طرف سے ہر آنے والے کو خطرے اور شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود قلعدار کسی ضرورت سے حیدر آباد گیا ہوا تھا اور اپنے بھتیجے کو قائم مقام بنا گیا تھا۔ اس نے حاجی صاحب کو قلعے میں آنے اور ملاقات کرنے کی اجازت نہ دی اور اندر سے کہلوا دیا کہ اگر آپ کا سردار سید ہے اور مسافر، تو حیدر آباد چلا جائے۔ نہ ہمارے شہر میں آئے نہ اُس کے قریب سے گزرے۔ ہمارے قلعے سے دو کوس پر ٹھیر کر آگے چلا جائے۔ سید صاحبؒ نے ایسا ہی کیا اور دوسرے روز وہاں سے کوچ کر کے قلعے کو بائیں جانب ایک کوس کے فاصلے پر چھوڑتے ہوئے قلعے سے ڈھائی کوس کے فاصلے پر موضع کھاڈرہ(۲) میں قیام کیا۔ وہاں بھی قلعدار کی طرف سے دو آدمی آئے اور اُنھوں نے پیغام پہنچایا کہ کوئی شخص ہتھیار کے ساتھ قلعے کے اندر

(۱) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۵ (۲) خطوط قلمی میں اسی طرح ہے۔ غالباً یہ مقام کھارو ڑھ ہے۔

نہ آئے اور دوسرے روز قیام نہ ہو۔ سید حمیدالدین چند ساتھیوں کے ساتھ ہتھیار اور سلاح کے بغیر قلعے کی سیر کو گئے۔ قلعے کے دروازے پر پہنچے، تو گولہ اندازوں اور بندوقچیوں نے شور کیا اور گولہ فگنی اور بندوق چلانے کے لیے آمادہ ہوئے۔ سید حمیدالدین وغیرہ نے اُن کا اطمینان کیا اور شہر کی سیر کر کے آ گئے۔

سندھ کے مختلف سرحدی مقامات سے ہوتے ہوئے موضع کارو میں پہنچے۔ یہاں سید جوڑن شاہ نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ سید صاحبؒ نے سید حمیدالدین اور مولانا سید اولاد حسن قنوجی(۱) کو اُن کی خدمت میں بھیجا۔ وہ سید صاحبؒ کی ملاقات کو آئے اور ایک بھینسا بھی نذر کیا۔ سید صاحبؒ نے ایک بہت عمدہ بیل اُن کو اور ایک سلہٹی سپر اُن کے صاحبزادے کو تحفے میں دی۔

سید جوڑن شاہ کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگوں کو سید صاحبؒ اور اُن کے ہمراہیوں پر انگریزوں کے جاسوس ہونے کا شبہ ہے۔ اس لیے وہ ہر جگہ آمادۂ جنگ نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ یہاں سے دس کوس پر میر پور ہے، جو آپ کو راستے میں پڑے گا۔ میں چونکہ یہاں کے معتبر سادات میں سے ہوں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں پہلے سے جا کر آپ کا تعارف کرا دوں اور بتا دوں کہ آپ ساداتِ کرام میں سے ہیں، اپنے ملک سے ہجرت کر کے آئے ہیں اور ملکِ سندھ کو دارالاسلام سمجھ کر اس کا قصد کیا ہے۔

کارو سے چل کر راستے میں ایک منزل کرتے ہوئے میر پور پہنچے۔ علی مراد حاکمِ میر پور کو سید جوڑن شاہ نامی کی زبانی اگرچہ حقیقتِ حال معلوم ہو گئی تھی، مگر وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے خود آنے اور ملاقات کرنے کے بجائے بطورِ نذر دس ہانڈیاں بھیج دیں اور حفاظت و رہبری کے لیے دو سوار ساتھ کر دیے کہ اگلی منزل تک پہنچا دیں۔

میر پور سے چل کر آپ ٹنڈو الہ یار ٹھیرے۔ رات کو وہاں سے امیرانِ سندھ کے بھیجے ہوئے دو آدمی تحقیقِ احوال کے لیے آئے۔ اُنھوں نے پورے حالات دریافت کر کے حکام کو اطلاع دی۔

(۱) والدِ نواب صدیق حسن خاں مرحوم

وہاں سے پیغام آیا کہ سید صاحبؒ کی خدمت میں عرض کرو کہ شوق سے تشریف لائیں۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔

حیدرآباد سندھ جس وقت سید صاحبؒ نے ہجرت کی ہے، حیدرآباد اُس وقت ایک خود مختار حکومت کا دارالسلطنت تھا، جس پر میر محمد، میر کرم علی اور میر مراد علی حکومت کرتے تھے۔[1] یہ سندھ کے مشہور ٹالپور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان سے پہلے سندھ پر کلہوڑہ خاندان کی حکومت تھی۔ ۱۷۸۶ء میں میر فتح علی ٹالپور نے اس خاندان کے آخری حکمران نور محمد کلہوڑہ کو بے دخل کر کے سندھ پر قبضہ کر لیا اور اپنے ساتھ اپنے تین بھائیوں میر غلام علی، میر کرم علی اور میر مراد علی کو بھی شریک سلطنت کر دیا۔ میر فتح علی نے ۱۸۰۱ء یا ۱۸۰۲ء میں اور میر غلام علی نے ۱۸۱۲ء میں انتقال کیا۔ میر محمد اسی غلام علی کا بیٹا تھا۔

۱۸۰۹ء میں کمپنی اور حکومتِ حیدرآباد کے درمیان ایک تجارتی اور فوجی معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی حلیف بن گئیں اور یہ طے ہو گیا کہ ہر حکومت کا وکیل دوسری حکومت میں رہے گا۔ سندھ کی یہ حکومت ۱۸۴۳ء تک خود مختار رہی۔ ۲۰ فروری ۱۸۴۳ء کو امیرانِ سندھ اور کمپنی کے درمیان میانی کے مقام پر سخت جنگ ہوئی، جس میں انگریزی افواج نے اپنے جدید اسلحہ فوجی نظام اور عزم و استقلال سے اپنے کثیر التعداد حریف پر فتح پائی۔ امیرانِ سندھ نے اپنے کو جنگی قیدی کی حیثیت سے حوالے کر دیا۔ حیدرآباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۵ مارچ ۱۸۴۳ء کو (خیرپور کو مستثنیٰ کر کے، جو جنگ سے علیحدہ رہا تھا) سندھ کے پورے علاقے کے الحاق کا اعلان ہو گیا اور دریائے سندھ کی دونوں جانب سکھر سے لے کر سمندر تک پورا ملکِ سندھ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔[2]

سید حمید الدین نے اپنے مکتوب میں حکومتِ حیدرآباد کی وسعت اور اس کا رقبہ اس طرح بیان کیا ہے:

---

(۱) سید حمید الدین کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد تخت نشین تھا اور اُس کے دونوں چچا مدار المہام اور مختارِ سلطنت تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "اکنوں غلام علی فوت نمودہ میر محمد پسرش مسند نشین آں مملکت است۔ دو عموے او کرم علی و مراد علی مختارِ کل سیاہ و سپید ہستند۔ ہر چہ خواہند، بکنند" مکتوبات، صفحہ ۲۴۴

A comprehensive History of India, V. 3, PP. 468 –470 (۲)

دو جانب ایں دریائے سندھ جنوباً وشمالاً صد صد کروہ از حیدرآباد طولِ مملکت ایشاں واقع وشصت کروہ مشرق طرفِ عمرکوٹ کہ ما آمدیم وشصت کروہ تا بندرِ کراچی کہ بر لبِ دریائے شور واقع است عرضِ مملکتِ ایشاں است۔(1)

دریائے سندھ کی دونوں جانب جنوباً و شمالاً حیدرآباد سے سو سو کوس تک اُن کی مملکت کا طول اور مشرقی جانب عمرکوٹ تک جہاں سے ہم لوگ آئے ہیں، ساٹھ کوس اور دوسری طرف بندرگاہ کراچی تک، جو سمندر کے کنارے واقع ہے، ساٹھ کوس اس کا عرض ہے

اس طویل و عریض حکومت سے، جو خود مختار اور اُن مسلمان حکمرانوں کے ماتحت تھی، جو ایک ہی خاندان کے افراد تھے اور جن کے حدودِ حکومت میں لاکھوں کی تعداد میں جنگجو و جنگ آزما آباد تھے، سید صاحبؒ کی یہ توقع کہ ان کو اس حکومت اور اس مسلمان ملک سے اپنے مقصد میں مدد اور نئے رفقاء و انصار ملیں گے، کچھ بیجا نہ تھی کہ یہ ملک ایک طرف سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت، دوسری طرف انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار سے خود خطرے میں تھا اور ان دونوں خطرات سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ اس کے حاکموں اور رعیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا صحیح جذبہ پیدا ہو اور ایک عزم و نظم کے ساتھ آنے والے خطرات کا مقابلہ کر سکیں۔ انیسویں صدی کے عام مسلمان حکمرانوں کی طرح اس خاندان کو بھی حقیقی خطرات کا کوئی احساس نہ تھا اور مسلمان بادشاہوں اور رئیسوں کی جو عام روش تھی، اس سے یہ خاندان بھی الگ نہ تھا۔ بھائیوں اور بھتیجوں کی نااتفاقی نے پہلے ملک کو تقسیم کیا اور میرپور اور خیرپور کی علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں قائم ہوئیں۔ آخرکار سید صاحبؒ کی ہجرت کے پورے سترہ برس بعد یہ زرخیز و سیر حاصل ملک انگریزی اقتدار و سلطنت میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

حیدرآباد میں داخلہ اور امیرانِ سندھ کی مدارات

ٹنڈوالہ یار سے چل کر ٹنڈوجام میں ایک شب بسر کی صبح وہاں سے کوچ ہوا۔ چار کوس کے فاصلے پر پھلیلی ندی کے مشرقی کنارے پر قیام ہوا۔ حیدرآباد اُس کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔

سید صاحبؒ نے حاجی رحیم بخش اور ایک ولایتی سپاہی کو ٹنڈوالہ یار سے اپنی آمد کی اطلاع

(1) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۲۲

دینے کے لیے بھیج دیا تھا۔ امیرانِ سندھ نے سیّد صبغت اللہ ولایتی کو استقبال کے لیے دریا تک بھیجا۔ سیّد صبغت اللہ مکّۂ معظمہ میں سیّد صاحبؒ سے بیعت ہُوئے تھے اور یہاں میر کرم علی کے مقربِ خاص تھے۔ وہ سیّد صاحبؒ کو سرکاری کشتی پر سوار کرا کر شہر کے کنارے لائے اور شہر سے دو تیر کے فاصلے پر لشکرِ اسلام کا قیام ہُوا۔ اس وقت کوتوالِ شہر نے استقبال کیا اور میر کرم علی و مُراد علی صاحبان کی طرف سے شیرینی پیش کی اور اُن کا سلام پہنچایا۔ دُوسرے دن مہمانداری کی ضرُوری اجناس اور بڑی مقدار میں موسم کا میوہ اور پھل (آم اور خربوزہ) پیش کیا گیا۔ تیسرے روز جُمعہ کے دن نمازِ جُمعہ کی تقریب سے میر صاحبان نے سیّد صاحبؒ سے قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ آپؒ آٹھ آدمیوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور میر کرم علی، مُراد علی اور میر محمد سے مُلاقات کی۔ وہ آپؒ کی ملاقات سے بہُت خوش ہُوے اور آپؒ کے عزم و ہمّت و نیّت پر حیرت کی اور اپنی ریاست میں سیّد صاحبؒ کے اہل و عیال کے رہنے کی بخوشی اجازت دی اور آپؒ سے قیام کرنے کی درخواست کی، لیکن چُونکہ دریاے سندھ میں برف کی وجہ سے طغیانی اور دروں اور راستوں کے بند ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے آپؒ نے ایک ہفتے سے زیادہ ٹھیرنے سے عُذر کیا اور رُخصت چاہی۔ تینوں صاحبوں نے ایک ہزار روپیہ، ایک بندُوق اور طمنچے کی ایک جوڑی نذر کی۔ حیدرآباد کے دُوسرے رؤسا، اُمرا اور اعیان نے بیعت کی۔ میر اسمٰعیل شاہ، نائب وزیرِ حکامِ سندھ اور مولوی محمّد یوسف صاحب، وکیلِ گورنرِ کمپنی اور محمّد یوسف خاں امیرِ کبیر بیعت و خدمتِ مجاہدین سے مشرّف ہُوے۔ ان کے علاوہ صدہا اہلِ شہر نے بیعتِ توبہ کی اور دینی فوائد و برکات سے مالامال ہُوے۔ سیّد حمیدُالدّین لکھتے ہیں کہ اگر قیام رہتا، تو شاید بیعت سے کوئی محرُوم نہ رہتا۔[1]

حیدرآباد سے روانگی سیّد صاحبؒ حیدرآباد میں تیرہ روز ٹھیر کر ۵ ذی قعدہ کو روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے حالات اور امیرانِ سندھ کی مُلاقات سے آپؒ اتنے افسردہ خاطر ہُوے

(۱) مکتُوبات (قلمی)، صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۸

کہ وہاں زیادہ قیام کرنے پر بھی طبیعت رضامند نہ ہوئی اور اہل و عیال کو وہاں بلانے اور ٹھیرانے کا ارادہ بھی ملتوی فرما دیا اور ٹونک اطلاع بھجوا دی کہ آئندہ اطلاع تک متعلقین وہیں مقیم رہیں۔ شکارپور سے جیسا مناسب سمجھا جائے گا، اطلاع کی جائے گی۔(۱)

حیدرآباد سے رانی پور تک سید صاحبؒ ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۱ھ کو حیدرآباد سے قندھار کے عزم سے روانہ ہوئے۔ آپؒ نے دو کشتیاں اَسّی روپے کو کرایے پر لیں۔ ایک بجرہ امیرانِ سندھ سے منگوا لیا۔ اسباب، پیادہ پا رفقا اور کمزور ساتھیوں کو کشتیوں پر سوار کیا، گھوڑوں اور اونٹوں، مضبوط و توانا ساتھیوں اور سواروں کے ساتھ خود خشکی کے راستے روانہ ہوئے۔ سید صبغت اللہ کابلی و منشی محمد یوسف وکیلِ کمپنی مشایعت کے لیے ساتھ آئے۔ حیدرآباد سے روانہ ہو کر رانی پور تک آپؒ نے آٹھ منزلیں کیں، جن میں سے کاٹھڑی، ہالہ، کوٹ سید (سید آباد)، لالو کوٹ، ملاکوٹ، ہنگورجہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رانی پور میں سید صالح شاہ بغدادی نے، جو اس نواح کے ایک مشہور پیرزادے تھے، سارے لشکر کی ضیافت کی۔ یہیں سندھ کے مشہور شیخِ طریقت اور پیشوا پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی (بانیِ تحریکِ حُر) سے ملاقات ہوئی، جو اپنے ایک سوار ادتمندوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے اور پیرزادہ صاحب کے مہمان تھے۔

سید صبغت اللہ راشدی سید صبغت اللہ، پیر سید محمد راشد کے صاحبزادے اور جانشین تھے، جو اپنے دور (بارھویں صدی ہجری) کے ممتاز ترین شیخِ طریقت اور صاحبِ علم و ارشاد بزرگ تھے۔(۲) اُن کا سلسلہ قادری تھا، جو اُچ (ریاست بہاولپور) سے سندھ پہنچا۔

سید محمد راشد کے صاحبزادوں میں دو فرزند خاص طور پر نامور ہوئے اور خاندان کا سلسلہ

(۱) مکتوبِ سید حمید الدین صفحہ ۱۴۶ (۲) سید محمد راشد اپنے والد سید محمد بقا کے مرید و مجاز تھے۔ وہ سید عبدالقادر جیلانی خامس کے خلیفہ تھے، جو پیر کوٹ سدھانہ (ضلع جھنگ سیال، پنجاب) میں مدفون ہیں۔ یہ سلسلہ بغداد و حلب سے اُچ (ریاست بہاولپور) پہنچا، جہاں اس سلسلے کے ۹ مشائخ مدفون ہیں۔ سید محمد راشد کے ایک خلیفہ حضرت شاہ حسنؒ تھے، جن سے سندھ، ریاست بہاولپور اور پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کی بڑی اشاعت اور عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی۔ ہمارے دور میں مولانا سید تاج محمود امروٹیؒ اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ اس سلسلے کے نامور مشائخ اور صاحبِ ارشاد بزرگ گزرے ہیں۔

رشد و ارشاد اُن کی اولاد میں منتقل ہوا: ایک سیّد صبغت اللہ، جن کے سر پر دستارِ مشیخت و خلافت باندھی گئی اور اسی وجہ سے سندھیوں کی زبان میں "پیر پگاڑو" کے شہرۂ آفاق لقب سے مشہور ہوئے[1]؛ دُوسرے سیّد محمد یٰسین، جن کے حصے میں علم (جھنڈا) آیا اور وہ پیر جھنڈا کے لقب سے مشہورِ عالم ہوئے۔ پیر جھنڈا کا کتب خانہ[2] ہندوستان کے علمی حلقوں میں مشہور ہے۔

سیّد صبغت اللہ شاہ بڑے قویُّ النّسبت کثیرالارشاد بزرگ تھے۔ روشن ضمیری کے ساتھ بیدارمغزی کی دولت بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اور زمانے کے تقاضوں اور آنے والے خطرات کا احساس بھی بخشا تھا، جو اس زمانے کے عام مشائخ کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مریدین و اہلِ تعلّق کی رُوحانی تربیت و ارشاد پر اکتفا نہیں کی، بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ان میں جذبۂ جہاد اور نظم و اطاعت کا مادہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُن کو ایسے طریقے پر منظّم کرنا شروع کیا کہ اہلِ ذکر و ارادت کے حلقے اور گروہ آسانی کے ساتھ مجاہدین اور سپاہیوں کے جیش میں تبدیل ہو سکیں اور میدانِ جہاد و قتال میں اپنی روحانی تربیت کے جوہر دکھا سکیں۔ یہی "حُر" تحریک کی ابتدا تھی، جس نے مرورِ زمانہ سے بیسویں صدی تک غلط رُخ اختیار کر لیا۔

سیّد صبغت اللہ کا حلقۂ ارادت نہایت وسیع تھا۔ لاکھوں سندھی اور بلوچی اُن سے وابستہ تھے۔ سیّد حمیدالدّین اُن کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

در تمام مملکتِ سندھ ہمچو او شیخے و مُرشدے در زعمِ مردانِ مُلک نیست۔ قریب سہ لکھ مُرید اَش از قومِ بلوچ ہستند و بکمالِ جاہ و جلال در جوعاتِ خلائق خوش می گزارند	اہلِ مُلک کے بیان کے مطابق اُن جیسا شیخِ طریقت اور مُرشد پورے مُلک میں پایا نہیں جاتا۔ صرف بلوچیوں میں سے اُن کے تین لاکھ مُرید ہیں۔ بڑے جاہ و جلال اور مقبولیت کے ساتھ اچھی زندگی

(۱) سیّد صبغت اللہ کی اولاد میں پیر علی گوہر اوّل، پیر پگاڑو ۲، پھر پیر حزب اللہ شاہ پیر پگاڑو ۳، اُن کے بعد پیر علی گوہر ثانی، پھر شاہ مردان، اُن کے بعد پیر صبغت اللہ شاہ ثانی ہوئے، جن کے زمانے میں حُروں نے بدامنی شروع کی اور اس کی وجہ سے ان کو پھانسی دی گئی۔ اب اُن کے بعد سکندر شاہ شاہِ مردانِ ثانی اپنے اسلاف کے جانشین ہیں۔

(۲) اس سلسلے میں پیر رشید الدّین، پیر رُشد اللہ، پیر احسان اللہ، پیر ضیاء الدّین قابلِ ذکر ہیں۔

گزارتے ہیں۔ اُن کی طرف رجوعِ عام ہے۔ جود و کرم اور اخلاص و مروّت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں۔ || و در جود و کرم و اخلاص و مروّت ہم شہرۂ آفاق۔(۱)

سیّد صاحبؒ نے حیدر آباد ہی میں اُن کا ذکرِ خیر سُن لیا تھا اور آپؒ کو اُن کی مُلاقات کا اشتیاق تھا۔ اصل پیر کوٹ میں اُن کا قیام تھا اور وُہ حیدر آباد اور شکار پور کے درمیان واقع ہے اس لیے اُمّید تھی کہ پیر کوٹ میں اُن سے مُلاقات ہو گی۔ حُسنِ اتفاق سے رانی پُور ہی میں اُن سے مُلاقات ہو گئی۔ وُہ بڑی گرمجوشی اور اخلاص سے ملے۔ اُن کو ایک روز رانی پُور میں قیام کرنا ضروری تھا۔ اس لیے اپنے بھائی کو ہمراہ کر دیا۔ پیر کوٹ رانی پُور سے ۴۴ کوس ہے۔ راستے میں ایک منزل کرتے ہوئے اور نالوں ندیوں کو عبور کرتے ہُوئے ۷ ذی قعدہ کو آپؒ پیر کوٹ پہنچے۔ سیّد صبغت اللہ شاہ کے برادر و اعزہ بڑی تواضع اور محبّت سے پیش آئے۔ دو گھڑی بعد پیر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وُہ جُمعے کا دن تھا۔ سیّد صاحبؒ نے نماز پڑھائی۔ پیر صاحب کے متعلّقین اور اہلِ قافلہ کی ایک بڑی جمعیّت اور مجمع نے نماز پڑھی۔

تین روز تک تمام قافلہ پیر صبغت اللہ شاہ کا مہمان رہا۔ تین روز کے بعد سیّد صاحبؒ کے حکم سے تمام قافلے کو جنس تقسیم ہونی شروع ہوئی اور اپنا انتظام کیا گیا۔

پیر صاحب بڑے علمی مذاق کے آدمی تھے۔ اُن کے پاس ایک بڑا وسیع اور نادر کتب خانہ تھا۔ سیّد حمید الدّین کا بیان ہے کہ ایسا کُتب خانہ سلاطین و امرا کے یہاں بھی نہ ہو گا۔ اِس کُتب خانے میں ۱۵ ہزار مشہور و معتبر کتابیں تھیں۔ سو تو صرف فارسی کے دیوان تھے، جو نہایت عُمدہ ایرانی خط میں لکھے ہُوئے مُطلّا تھے۔ ۶۵ تفسیر کی کتابیں تھیں۔ شاہنامۂ فردوسی وغیرہ کے نہایت بیش قیمت اور نادر نُسخے تھے۔ حدیث و تصوّف کی بھی بعض نایاب کتابیں تھیں۔ پیر صاحب کی طرف سے اِذنِ عام تھا کہ جس کتاب کو جی چاہے، مطالعے کے لیے بے تکلّف ساتھ لے لیا جائے۔(۲)

(۱) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۵۵ (۲) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۵۷

سیّد صاحبؒ ۱۷ ذی قعدہ کو پیر کوٹ پہنچے تھے۔ وہاں کشتیوں کے انتظار میں جو حیدر آباد سے روانہ ہوئی تھیں، کئی روز قیام رہا۔ پیر کوٹ پہنچنے کے نویں روز وہ کشتیاں پہنچیں۔ آپؒ نے سیّد صبغت اللہ کابلی کو ۵ روپے زادِ راہ اور ایک سفید دوشالہ دے کر انھیں کشتیوں پر حیدر آباد واپس کر دیا۔ اپنے ہمراہیوں میں سے محمدی نام ایک شخص کو خط دے کر ٹونک روانہ کیا۔

۲۶ ذی قعدہ کو سیّد صبغت اللہ شاہ کی توجہ اور کوشش سے کشتیوں کا انتظام ہوا اور قافلہ بدفعات روانہ ہونا شروع ہوا۔ سب کے آخر میں ۳۰ ذی قعدہ کو سیّد صاحبؒ نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔[1] گویا آپ پیر کوٹ میں ۱۳ روز مقیم رہے۔

پیر کوٹ کا دو ہفتے کا قیام پیر سیّد صبغت اللہ شاہ سے ایک مستقل ربط و تعلق کا ذریعہ بنا۔ اہل و عیال کے ٹونک سے وہیں منتقل ہونے کی رائے قرار پائی۔ دوبارہ (سیّد صاحبؒ کی شہادت کے بعد) ٹونک منتقل ہونے تک آپ کے اہلِ خانہ پیر کوٹ ہی میں مقیم رہے۔ سیّد صبغت اللہ شاہ نے ان مہاجرین کی نصرت کے علاوہ اصل مقصدِ جہاد میں شرکت و رفاقت کا عزم بھی کیا۔ وہ اپنے حلقۂ ارادت میں جہاد کی تبلیغ کرنے کے علاوہ ایک مرتبہ خود سیّد صاحبؒ کے پاس پہنچ جانے اور آپؒ کی رفاقت کرنے پر آمادہ ہوئے، لیکن سیّد صاحبؒ نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ خود اپنی جمعیت انصار کے ساتھ سکھوں کے حدودِ حکومت کے متصل کسی موزوں مقام پر جہاد کا آغاز کر دیں اور اس کارِ خیر میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو شریک کریں اور ان اطراف و دیار میں جہاد کا آوازہ و غلغلہ بلند کریں۔ شاید آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس سے سکھوں کی حکومت دو طرف سے مقابلہ و مدافعت میں اُلجھ جائے اور اُس کی پریشانیوں اور دقتوں میں اضافہ ہو۔[2]

آپؒ نے اُن کے نام جہاد کا اعلامِ عام اور دعوت نامہ بھی بھیجا کہ اس کی نقلیں اطراف و اکناف میں بھیج دی جائیں۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگرچہ آپ سے زیادہ اس کا کوئی اہل اور مستحق نہیں کہ وہ نیابتاً میری طرف سے بیعتِ جہاد لے، لیکن چونکہ اس کا اندیشہ ہے کہ آپ کے اعزّہ اور

(۱) مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۵۸ (۲) ملاحظہ ہو مکتوب بنام سیّد شاہ صبغت اللہ سندھی مندرج سوانح احمدی، صفحہ ۲۹۹-۳۰۰ (مطبع فاروقی)

اہلِ برادری شاید رقابت و حسد کی وجہ سے اس امرِ مسنون سے محروم رہیں، اس لیے مصلحتاً دوسرے شخص کو برائے نام نائب بنا کر بھیجا جا رہا ہے، ورنہ یہ منصبِ نیابت آپ ہی کو زیب دیتا ہے۔[1]

پیر کوٹ سے شکارپور تک راستے میں نہروں میں پانی کی کثرت کی وجہ سے باربردار اونٹوں کا گزرنا دشوار تھا۔ اس لیے دو مزید کشتیاں کرایے پر لی گئیں اور بھاری سامان ان پر بار کیا گیا۔ سید صاحبؒ خود اونٹوں اور سواروں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ۵

اثنائے راہ میں دو ندیاں پڑیں، جن کو بغیر پیرے ہوئے عبور کرنا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا۔ سید صاحبؒ نے ایسا انتظام فرمایا کہ بغیر کشتی کے تمام اسباب و سامان، گھوڑے اور وہ تمام لوگ جو پیرنا نہیں جانتے تھے، پار اُتر گئے۔ وہاں سے آٹھ کوس پر جا کر موضع راکھا میں قیام ہوا، جہاں ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ کی پہلی تاریخ ہوئی۔

۱۰ وہاں سے چل کر گہری گہری ندیوں کو بڑی دقت سے عبور کر کے جلیب کوٹ پہنچے، جو شاہ غلام محی الدین کا مسکن تھا، جو ان اطراف میں "سرہندی پیرزادہ" کے لقب سے مشہور تھے[2] ان کو حیدرآباد سے سید صاحبؒ کو اپنے مسکن پر لے جانے اور قافلے کی ضیافت کرنے کی آرزو تھی۔ ایک شب ان کی مہمانداری میں بسر کر کے اگلے روز صبح وہاں سے کوچ کر کے ایک گھڑی دن کو شکارپور کے دروازے پر پہنچ گئے۔[3]

۱۵ **شکارپور** شکارپور اس وقت بھی سندھ کا بہت بڑا شہر اور اہم ترین تجارتی مرکز تھا۔ اس کا محلِ وقوع بھی ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کی بہت بڑی تجارتی منڈی اور گزرگاہ بن گیا۔ سید حمید الدین لکھتے ہیں کہ اس شہر میں ہر ملک اور ہر سمت کے لوگ رہتے ہیں اور ہر ملک کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ متعدد زبانیں سمجھتے اور بولتے ہیں۔ افغانی (پشتو)، فارسی، اردو اور سندھی بے تکلف بولی جاتی ہیں۔[4]

---

(۱) مکتوب بنام سید صبغت اللہ سندھی، حوالۂ سابق۔ (۲) ان کے والد سرہند سے نقلِ سکونت کر کے پشاور آ گئے تھے، سکھوں کی غارتگری کے بعد شاہ غلام محی الدین اس مقام پر منتقل ہو گئے، جو شکارپور کے نواح میں ہے۔ سرکارِ حیدرآباد نے ان کو ایک معقول جاگیر دے دی۔ (۳) مکتوبات، صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰۔ (۴) مکتوبات، صفحہ ۹۰۔

شاہ شجاع کے لشکر کا شبہ شکارپور تین سال سے شاہ شجاع الملک کی حکومت سے نکل کر حکامِ حیدرآباد کی حکومت میں آگیا تھا۔ شاہ شجاع مسافرت و بے سروسامانی کے ساتھ انگریزوں کی پناہ میں لدھیانے میں مقیم تھا۔

سید صاحبؒ جب ہندوستان سے اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ پہنچے، تو اہلِ شکارپور نے سمجھا کہ شاید خود شاہ شجاع خفیہ طور پر اس لشکر کے ساتھ آرہا ہے۔ چنانچہ شہر کے دروازے بند ہوگئے اور قافلے کو باہر ٹھیرنا پڑا۔ شہر کا حاکم آغا کاظم میر اسمٰعیل شاہ کا بیٹا تھا، جو میر کرم علی و مراد علی کے معتمد و نائب تھے اور سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے۔ سید صاحبؒ نے سید حمید الدین اور سید اولادِ حسن قنوجی کو آغا کاظم کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ ہم کو شاہ شجاع سے کوئی واسطہ نہیں۔ بعض ضروریات کی بنا پر ہم دو تین دن کے لیے یہاں آئے ہیں اور آگے چلے جائیں گے۔ ہمارے لیے شہر کے دروازے کھول دیے جائیں تاکہ ہم کو غلّے اور گھوڑوں کے دانے وغیرہ کی تکلیف نہ ہو۔ اگر اعتبار نہ ہو، تو دو آدمیوں کو متعیّن کر دیا جائے، جن کی معرفت ہم شہر سے ضروری سامان منگالیں۔ آغا کاظم نے جواب دیا کہ ہم کو آپ سے دشمنی نہیں، دغا کا البتّہ خطرہ ہے۔ اس لیے ہم شہر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ البتّہ ایک دو غیر مسلح آدمی شہر میں اجناس کی خریداری کے لیے آسکتے ہیں۔ جب اہلِ شہر کو اطمینان ہوجائے گا، ہم اجازت دے دیں گے۔

رجوعِ عام دروازہ کھلنے پر جوق در جوق علما، فضلا، صلحا اور ہر طرح کے لوگ غیر ملکی لوگوں کو دیکھنے اور سید صاحبؒ کی ملاقات کو آئے۔ جب حقیقت ظاہر ہوگئی کہ اس جماعت کو شاہ شجاع یا کسی بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں تو شکارپور کے ہندو مہاجن اور مسلمان شرفا بکثرت دینی و دنیوی اغراض کے لیے دعا کرانے آنا شروع ہوئے اور قافلے کے لوگ بھی بغیر ہتھیار بلا روک ٹوک آنے جانے لگے۔ خود آغا کاظم حاکمِ شہر ملاقات کے لیے آیا اور اپنے پاس سے ضروری سامان آپؒ کے پاس بھیجا۔ دونوں وقت دس آدمیوں کا پرتکلّف کھانا اپنی سرکار سے بھیجتا۔ اہلِ شہر میں سے ہر طبقے کے ہزارہا آدمی معززین و شرفا ہدایت و تلقین کے لیے حاضر ہوتے۔ کوئی کسی دنیاوی غرض کے لیے، کوئی دینی مقصد

کے لیے دُعا کی درخواست کرتا۔ آپؒ کے خیمے پر لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا کہ آپؒ کے قافلے کے لوگوں کو بات کرنے کی مُہلت نہ ملتی۔

۱۰ ذی الحجہ کو عید کے دن تمام رُؤسائے شہر اور عام مُسلمان عید گاہ میں جمع ہُوئے آپؒ بھی اپنے دو تین سو ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے۔ امامت کے لیے ہر شخص کی نگاہ آپؒ پر پڑتی تھی۔ آغا کاظم نے آپؒ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی۔ خطبہ خطیبِ شہر نے پڑھا اور بیس ہزار مُسلمانوں نے آپؒ کے پیچھے عید کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آغا کاظم اور آپؒ کی ملاقات اور مُسلمانوں کے جوشِ عقیدت اور ازدحام کا منظر قابلِ دید تھا۔ آپؒ نے تیرہ دُنبے اور بکرے ذبح کر کے قافلے میں اُن کا گوشت تقسیم کیا۔ علماء و مشائخ و رُؤساء و معززین میں سے ہزاروں آدمی عید کی مُبارک باد دینے کے لیے آئے۔ ظہر کے وقت آغا کاظم بھی ملنے کے لیے آیا۔[1]

حاکم اور اہلِ شہر کی عقیدت　آغا محمد کاظم شاہ حاکمِ شکار پور نے سیّد صاحبؒ اور جماعت کی خدمت گزاری اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور اپنے ظاہری و باطنی حُسنِ عقیدت اور حُسنِ خدمت سے سیّد صاحبؒ کی کمال خوشنودی حاصل کی۔ اُس نے سیّد صاحبؒ سے مُجاہدین کی معیّت کے ارادے کا بھی اظہار کیا، لیکن سیّد صاحبؒ نے اس وقت ہمراہ لینا مناسب نہ سمجھا اور پختہ وعدہ لے لیا کہ جس وقت آپؒ طلب کریں گے، اُس وقت وُہ ضرور حاضر ہوں گے۔ حضرتؒ نے شکار پور سے رُخصت کے وقت ایک سُرخ گھوڑا، جو مرزا امیر بیگ نے آپؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اپنی طرف سے بطورِ تبرّک حاکمِ شکار پور کو دیا اور حاکمِ شکار پور نے ایک اعلیٰ، نہایت بیش بہا اور خوش رفتار سانڈنی، جو اُمرا کی پسند کے لائق ہے، بطورِ نذر پیش کی۔ گاڑھے کے دو سو تھانوں سے، جو بیر کوٹ سے خریدے گئے تھے، لشکریوں کے انگرکھے اور پاجامے بنا کر تقسیم کر دیے گئے اور شکار پور سے دو سو جوتیاں خرید کر کے ضرورت مندوں کو تقسیم کر دی گئیں۔[2]

---

(۱) مکتوب (قلمی) سیّد حمید الدین از شکار پور ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ، مکتوبات، صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۴

(۲) مکتوبات، صفحہ ۱۶۷ - ۱۶۹

بیسواں باب

شکارپور سے شال تک

روانگی

شکارپور سے شال کا فاصلہ ایک سو بیس کوس تھا۔ یہ راستہ نہایت دُشوار گزار، کوہستانی اور غیر آباد تھا۔ اس مسافت کو طے کرنے کے لیے بڑے انتظامات کی ضرورت تھی۔ قافلے کے ساتھ ۱۱۵ اُونٹ تھے۔ اُن میں سے نصف تھک کر بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ واپسی پر چُونکہ غارتگروں کا خطرہ تھا، اس لیے قندھار تک جانے کے لیے کرایے پر اُونٹ نہیں ملتے تھے۔ بڑی سعی و تلاش سے بارہ اُونٹ مِل سکے۔ اِس تعداد پر بھی چُونکہ سارا سامان نہیں جا سکتا تھا اِس لیے بہت سی فاضل چیزیں وہیں لوگوں کو دے دی گئیں اَور پیتل تانبے کے اکثر برتن اَور بعض دُوسری چیزیں فروخت کر دی گئیں۔

شکارپور سے شال تک کا سفر خالص ریگستانی اَور کوہستانی علاقے میں تھا، موسم بھی سخت گرم تھا اَور اس مُلک میں گرمی بھی بہت سخت ہوتی ہے اَور لُو بڑے غضب کی چلتی ہے خصُوصیّت کے ساتھ شکارپور سے شہر ڈھاڈر تک دیگر مقامات کے مُقابلے میں لُو اَور زیادہ چلتی ہے اَور موسمِ گرما کی شدّت کے زمانے میں لوگوں کی آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اس راستے میں پانی بہت نایاب ہے۔ کہیں دس دس کوس اَور بیس بیس کوس تک دستیاب نہیں ہوتا۔

اِن تمام وُجوہ سے واقف کاروں اَور خیرخواہوں نے بہت ڈرایا اَور صلاح دی کہ برسات کا موسم شُروع ہو جانے کے بعد سفر کیا جائے۔ سیّد صاحبؒ نے خیال کیا کہ اگر برسات کا انتظار کیا جاتا ہے، تو اس وقت افغانستان کے حدود میں داخل ہوتے ہوتے کابل اَور قندھار اَور غزنی

میں برف باری کا موسم شروع ہو جائے گا اور پھر زیادہ توقف کرنا پڑے گا اس لیے اللہ پر بھروسہ کر کے مردانہ وار قدم اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ شکارپور پہنچنے کے نویں روز ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (۲۰ جولائی ۱۸۲۶ء) کو متوکلاً علی اللہ سفر کا آغاز کر دیا گیا۔

خدا کی قدرت وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ کے وعدے کا پورا ظہور روانگی سے ایک دن پہلے معمول کے خلاف اتنی بارش ہوئی کہ گرمی کی آدھی تیزی جاتی رہی۔[1]

شہر سے روانگی کے وقت وہاں کے اکثر معززین، اہلِ شہر، قاضی اور بعض لشکری تین چار کوس تک رخصت کرنے کے لیے آپؒ کی سواری کے ساتھ آئے اور ہزاروں آدمی اور وہاں کے رؤسا بیعت ہونے کے لیے آئے اور یہ وعدہ لے کر گئے کہ جب کفار سے جنگ ہوگی، تو ان کو طلب کیا جائے گا۔[2]

جاگن شکارپور سے چل کر جاگن میں پہلی منزل ہوئی۔ راستے میں پھر اتنی بارش ہوئی کہ جہاں سراب تھا، وہاں سیلاب جاری تھا۔ دیکھنے والوں نے صاف محسوس کیا کہ مہاجرین الی اللہ اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے اس گروہ اور اس کے امیر پر عنایت کی خاص نظر ہے۔[3]

جاگن میں چار روز سید انور شاہ کے انتظار میں آپ ٹھیرے رہے۔ اسی عرصے میں دوبارہ اس قدر زور کی بارش ہوئی کہ جہاں خاک اُڑتی تھی، وہاں کیچڑ ہو گئی۔ اگرچہ لوگوں کا کچھ سامان بھیگ گیا، لیکن انھوں نے ہر قطرے کو جانِ تازہ شمار کیا۔ جاگن کے باشندے قسم کھا کر کہتے تھے کہ آپؒ کے آنے سے پہلے جب بارش نہیں ہوئی تھی، دن نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہم مطلقاً گھر سے نہیں نکل سکتے تھے اور جو نکلتا، وہ اکثر لو سے ہلاک ہو جاتا۔ یہ بارش اس سرزمین میں تین سال کے بعد ہوئی ہے۔[4]

سید انور شاہ سید انور شاہ پنجاب کے ساداتِ عظام اور اپنے ملک کے شرفائے کرام میں سے تھے۔ شہر امرتسر ان کا وطن تھا۔ اس نواح کے اکثر مسلمان اس خاندان کے مرید اور معتقد تھے۔ رنجیت سنگھ خود پہلے ان کے ساتھ کمال اعزاز و تعظیم کے ساتھ پیش آتا تھا۔ موصوف کے بزرگ اس

(۱) مکتوبات، صفحہ ۱۷۱ (۲) مکتوبات، صفحہ ۱۷۰ (۳) مکتوبات، صفحہ ۱۷۱ (۴) مکتوبات، صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲

مُلک کے نامور دینی پیشوا اَور مقتدا تھے۔ دو تین سال پہلے امرتسر میں سیّد انور شاہ کی ترغیب سے سِکھوں کے اعلیٰ خاندان کا ایک فرد مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے خاندان والوں نے اس بنا پر بلوہ کر دیا اَور سیّد انور شاہ کی ناک پر ضرب لگاکر چہرے کے حُسن کو بگاڑ دیا۔ ہر چند اس مظلوم نے شہر کانگڑہ کے اُستادوں سے اس کا علاج کرایا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہُوا اَور اس کا نشان باقی رہ گیا۔ سیّد انور شاہ نے اپنی دینی حمیّت سے مغلوب ہوکر چاہا تھا کہ مُخلص مُسلمانوں کی ایک جماعت تیّار کرکے اس گروہ کے خلاف جہاد کیا جائے، لیکن حاکموں نے اپنے حُسنِ تدبیر اَور حکُومت کے زور سے سیّدِ موصُوف کو دو سال سے نظر بند کر رکھّا تھا۔ سیّد صاحبؒ کو اس واقعے کی اطّلاع آنے جانے والوں کی زبانی وطن ہی میں ہوگئی تھی۔ آپؒ چُونکہ اُن تمام افراد کی تلاش میں رہتے تھے، جن کے سینے میں حمیّتِ اسلامی اَور جذبۂ جہاد موجزن ہو، اس لیے آپؒ نے اُن کو اپنے پاس بلانے اَور ساتھ لینے کا خاص اہتمام فرمایا۔ وطن سے روانگی کے وقت حاجی یُوسف کشمیری کو، جو آپؒ کے قدیمی رُفقا اَور مُخلص معتقدوں میں تھے، فتحپور ہسوہ سے سیّدِ موصُوف کی رہائی اَور اُن کو اپنے پاس پہنچا دینے کے لیے امرتسر روانہ کیا تھا۔ اِس مدّت میں حاجی صاحب سیّدِ موصُوف کے پاس پہنچ گئے اَور اپنے حُسنِ تدبیر سے سیّدِ ممدُوح کو پندرہ خادموں اَور رفیقوں، تین سواری کے گھوڑوں اَور باربرداری کے اُونٹوں، خیموں اَور اسبابِ ضرُوری کے ساتھ لے کر مُلتان کے راستے سے شہر بہاول پور میں، جو نوّاب رحیم خاں کی حکُومت میں تھا، پہنچا دیا اَور وُہ سیّد صاحبؒ کی آمد کے اِنتظار میں گوش بر آواز ہوکر بیٹھ گئے۔ جب لشکر سندھ پہنچا اَور وہاں سے سیّد دین محمّد قندھاری کو دعوتِ جہاد کا خط پہنچانے کے لیے حاکمِ بہاولپور کے پاس بھیجا گیا، تو اُن کی مُلاقات سیّدِ موصُوف سے ہُوئی اَور سیّدِ موصُوف نے اُن کی ہمراہی میں مقام جاگن میں سیّد صاحبؒ کی مُلاقات کا شرف حاصل کیا۔ سیّد حمیدالدّین لکھتے ہیں: "اس موقع پر اہلِ ایمان کا اجتماع اَور دینی جوش و خروش کا نظارہ دیکھنے کے قابل تھا۔ تحریر میں اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔"[1]

(۱) مکتُوبات، صفحہ ۱۷۲-۱۷۵

جاگن سے چھتر تک ۱۸ ذی الحجہ کو جاگن سے کوچ ہوا۔ بارش کی زیادتی کی وجہ سے برشوری اور مکھن بیلہ کا سیدھا راستہ چھوڑ کر خان گڑھ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

یہ محراب خاں کی حکومت کا علاقہ تھا، جو نصیر خاں کا پوتا تھا۔ سید حمیدالدین لکھتے ہیں:

"اس زمین کا اکثر حصہ محض کوہستان ہے۔ شکارپور اور شہر شال کے درمیان آبادی کم ہے۔ حکام کی غفلت کی وجہ سے ڈاکوؤں اور لٹیروں کا اس قدر زور رہتا ہے کہ بغیر سو، دو سو سپاہیوں کی حفاظت کے قافلے کا گزرنا مشکل ہے۔ پانی کی بھی اس راستے میں بڑی کمی ہے۔ تمام خاردار جنگل ہے۔ اس جنگل میں جابجا دیہاتوں میں بلوچی رہتے ہیں، جو بڑے بے رحم، بددین اور کثیف ہیں۔"(۱)

جاگن سے چل کر ۸ کوس پر خان گڑھ(۲) میں پڑاؤ پڑا۔ سید حمیدالدین لکھتے ہیں: "وہاں خشک زمین ڈیرہ ڈالنے کے لیے بہت کم تھی۔ وہاں کا زمیندار حاضر ہوا اور اجناسِ خوردنی اور گھوڑوں کا چارہ دانہ بطورِ ضیافت لایا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بارش کی وجہ سے چونکہ سیدھا راستہ چھوڑ کر چلنا پڑ رہا تھا، اس لیے وہاں کے زمیندار نے کمال حُسنِ عقیدت کے ساتھ اپنے حقیقی بھائی کو راستہ بتانے کے لیے ساتھ کر دیا۔"

منزل منزل ٹھیرتے شہر شاہ پور پہنچے، جو بقول سید حمیدالدین ہندوستان کے قصبوں کی طرح آباد تھا۔ سید محسن شاہ، جو بلوچیوں کے پیر و مرشد تھے، کمال عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور اکثر شرفانے بیعتِ ارادت کی۔ خان گڑھ سے روانہ ہونے کے بعد تین روز سفر کرنے کے بعد یہیں آدمیوں کی شکل نظر آئی۔ اس دشتِ بے نشان میں سمندر کی طرح صرف تاروں سے راستہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر رہبر غلطی کر جائے، تو سارا قافلہ پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہو جائے۔ بارش کے علاوہ کسی اور موسم میں یہاں پانی نظر نہیں آتا۔ مسافر اپنے ساتھ پانی لے جاتے ہیں۔

خان گڑھ کے زمیندار کا بھائی شاہ پور سے رخصت ہوا اور وہاں سے محسن شاہ اپنے دو

---

(۱) مکتوباتِ قلمی، صفحہ ۱۷۵　(۲) خان گڑھ جو اب باقی نہیں ہے، اس مقام پر جنرل جان جیکب نے فوجی چوکی قائم کی، جس نے بعد میں قصبے اور شہر کی حیثیت اختیار کر لی اور جیکب آباد کے نام سے مشہور ہے۔

بیٹوں کے ساتھ کمال عقیدتمندی سے ہمراہ ہوئے۔ شاہ پور ایک روز ٹھیر کر قافلے نے کُوچ کیا اور ۸ کوس پر قصبۂ چھتر میں پہنچے۔ وہاں کا حاکم لشکر کے حالات دریافت کرنے کے لیے چند بلوچی سواروں کے ساتھ آیا اور حقیقتِ حال کے دریافت کرنے کے بعد ایسے مقام پر آپؒ کی تشریف آوری کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر فوراً مُرید ہوا۔ سیّد حمید الدّین لکھتے ہیں: "اس حاکم کا نام مُلّا محمّد ہے اور محراب خاں کی طرف سے اس نواح میں مقرّر ہے۔ روانگی کے وقت اپنی حکومت کی سرحد تک پہنچانے آیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو محراب خاں کے مزاج میں درخور حاصل ہے۔ سیّد صاحبؒ نے محراب خاں کے نام دعوتِ جہاد کا ایک خط بھیجا۔ اس میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ اگر آپ ہمارے متعلّقین کو اپنی حکومت کی سرحد میں رہنے کی اجازت دے دیں اور اُن کے ساتھ ممکن رعایتیں برتیں، تو ہم غریب الوطن اپنا کام فارغ البالی کے ساتھ کر سکیں اور مُلّا محمّد سے یہ فرمایا کہ اس خط کا جواب ہم کو کسی معتبر قاصد کے ذریعے سے جہاں بھی ہوں، پہنچا دیا جائے۔"(1)

چھتر سے بھاگ تک چھتر سے روانہ ہو کر ندیاں عبُور کرتے ہوئے قصبۂ شور پہنچے۔ اس قصبے کے نیچے جو ندی بہتی ہے، کائی اور کیچڑ کی وجہ سے اس کا عبُور کرنا بہت دُشوار تھا۔ اس سے پہلے ہراول جمعیت پہنچ چکی تھی اور باربرداری کے اُونٹ پھسل پھسل کر گر گئے تھے۔ اس لیے سیّد صاحبؒ نے بنفسِ نفیس اور دُوسرے ہمراہیوں نے جنگل کی لکڑیاں کاٹ کر کائی پر بچھا دیں اور اس طرح سوار اور پیادے اس کے اُوپر سے گزر گئے۔ وہ رات اس میدان میں بے پانی دانے کے گزاری۔

۲۶ ذی الحجہ کو شہر بھاگ میں پڑاؤ ہوا۔ سیّد حمید الدّین لکھتے ہیں کہ یہ شہر شرفا، علما اور ہر قسم کے لوگوں کا مرکز ہے اور اس نواح میں اس سے بڑا دُوسرا شہر نہیں۔ دُوسرے روز شہر کے قاضی اور حاکم اور شہر کے تمام شرفا و عُلما کمال حُسنِ عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور اُن میں سے اکثر نے بیعتِ ارادت کی۔ حاکم اور قاضیِ شہر نے ایک ایک روز سیّد صاحبؒ کی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ دعوت کی۔(2) دو روز وہاں قیام رہا۔

(1) مکتوبات، صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹ (2) مکتوبات، صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱

بھاگ سے ڈھاڈر تک تیسرے روز ۲۹ ذی الحجہ کو بھاگ سے کوچ ہوا۔ اس نواح کا ایک رئیس، جس کا مکان یہاں سے دو کوس شہر حاجی کی طرف تھا، ایک دن پہلے سے ضیافت کا انتظام کرکے بر سر راہ بڑی نیاز مندی اور عقیدت مندی کے ساتھ کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ سید صاحبؒ کی سواری پہنچی، تو اس نے وہاں کچھ توقف کرنے کی درخواست کی اور نہایت تکلف اور افراط کے ساتھ کھانا تیار کرایا اور بڑی خوش اخلاقی اور عالی ہمتی کے ساتھ ضیافت کی۔ ۵

شہر حاجی سے روانہ ہوئے، تو راہ ہی میں محرم الحرام ۱۲۴۲ھ کا چاند دیکھا۔ یکم محرم کو وہاں سے چل کر اسی روز ڈھاڈر (۱) پہنچ گئے۔ شہر ڈھاڈر کے شرفا و علما بڑی نیاز مندی و عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور ان میں سے اکثر نے بیعت کی اور بعض دوسرے فوائد اور برکات سے مستفید ہوئے۔ شہر کے حاکم بھی ملاقات کے لیے آئے۔ دونوں دن شہر کے لوگ سید صاحبؒ کو پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ اپنے گھر لے جاتے اور بڑے اخلاق و دلجوئی کے ساتھ ضیافت کرتے۔ ۱۰

درۂ بولان جنوب مشرق سے افغانستان جانے والے قافلوں کے لیے ممکن العمل راستہ صرف یہ تھا کہ وہ ڈھاڈر سے درۂ بولان میں داخل ہوں اور اس کو عبور کرکے شال (کوئٹے) کے راستے سے افغانستان کے حدود میں داخل ہوں۔

درۂ بولان ایک قدرتی راستہ ہے، جو قدرت الٰہی نے اولو العزم فاتحین اور ضرورت مند مسافروں کے لیے اس طویل سلسلۂ کوہ کے اندر پیدا کر دیا ہے، جو ہندوستان کو افغانستان سے ۱۵ جدا کرتا ہے۔ گویا اس سد سکندری کے اندر ایک طویل قدرتی شگاف ہے، جس میں سے احتیاط کے ساتھ قافلے اور جیش گزر سکتے ہیں۔

۱۸۳۹ء میں، یعنی سید صاحبؒ کی ہجرت کے پورے ۱۳ برس بعد، انگریزوں نے سر ولوبی کاٹن (Sir Willoughby Cotton) کی سرکردگی میں شاہ شجاع کو تخت افغانستان پر بٹھانے کے لیے

---

(۱) ڈھاڈر درۂ بولان کے جنوبی دہانے کا مشہور مقام ہے۔ ڈھاڈر سے درۂ بولان داخل ہوتے تھے اور اس کو عبور کرکے شال (کوئٹے) پہنچتے تھے۔ ریل بن جانے کے بعد ڈھاڈر کی جگہ سیبی نے لے لی۔

ایک فوجی مُہم روانہ کی تھی۔ یہ مُہم ٹھیک اسی ڈھاڈر اور بولان کے راستے سے افغانستان گئی۔ اس مہم میں جو انگریز شریک تھے، اُنھوں نے درۂ بولان کی عظمت و اہمیت اور اس کی جُغرافیائی کیفیت مفصّل بیان کی ہے۔ وُہ کہتے ہیں :۔

"یہ ایک گہری گھاٹی ہے، جو کوہ براہئیک (Brahuick) کو کاٹتی ہُوئی پچپن میل تک مُسلسل چلی گئی ہے۔ اس پہاڑ کا ایک بازو قریب قریب ادیۂ قائمہ بناتا ہُوا کوہِ ہندوکش سے نکلا ہے اور شمال سے جنوب کی جانب دس درجۂ عرض البلد میں پھیلا ہُوا ہے۔ مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام ہیں۔ درے سے ہو کر اسی کا ہمنام ایک دریا گزرتا ہے، جس کو صرف اس کے دھارے کی لائی ہُوئی چٹانوں اور سڈول پتھروں کے ذریعے ہی پار کیا جاسکتا ہے۔ دونوں طرف کے پہاڑ، جو اپنے بلندترین مقامات پر سطحِ سمندر سے پانچ ہزار سات سو (۵۷۰۰) فُٹ اُونچے ہیں، برابر ٹوٹتے اور شق ہوتے رہتے ہیں۔ بعض جگہ اُن میں کافی چوڑے شگاف پائے جاتے ہیں، مگر عموماً ان کی چوڑان چار اور پانچ سو گز کے درمیان ہے۔ ان کے باعث یہ پہاڑ سپاٹ چڑھائیوں والے بھدّے بھُورے رنگ کے پتھریلے مادے کے انباروں کے سلسلے نظر آتے ہیں، جو بقول اورم 'اتنے ہی کریہ المنظر ہیں، جتنے کہ عظیم'۔ کہیں کہیں دریا مستقیم چٹانوں کے درمیان سے گزرا ہے وہاں اس کی گود ساٹھ سے اسّی فُٹ تک چوڑی ہو گئی ہے۔ چنانچہ برسات میں جب وُہ بھر جاتی ہے، تو جو فوج اس میں پھنس جائے، اس کی ہلاکت ناگزیر ہے اور ان تنگ راستوں میں اسی ایک خطرے سے نہیں دو چار ہونا پڑتا۔ پہاڑی باشندے لُوٹ مار کی تاک میں دونوں طرف غاروں میں چھپے رہتے ہیں اور موقع پاکر نیچے گھاٹی سے گزرنے والے بے بسوں پر اچانک ٹُوٹ پڑتے ہیں اور بآسانی ان کا کام تمام کر دیتے ہیں۔"[1]

سیّد حمیدالدّین کا بیان بھی اس سے مختلف نہیں۔ وُہ لکھتے ہیں: "شہر ڈھاڈر سے شہر شال ساٹھ کوس کا فاصلہ غیر آباد کوہستان اور سخت دشوار گزار درہ ہے۔ راستے میں دائیں بائیں بعض جگہ

(1) A Comprehensive History of India V. III. P.P. 351 - 352
ترجمۂ ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی، پی ایچ ڈی۔
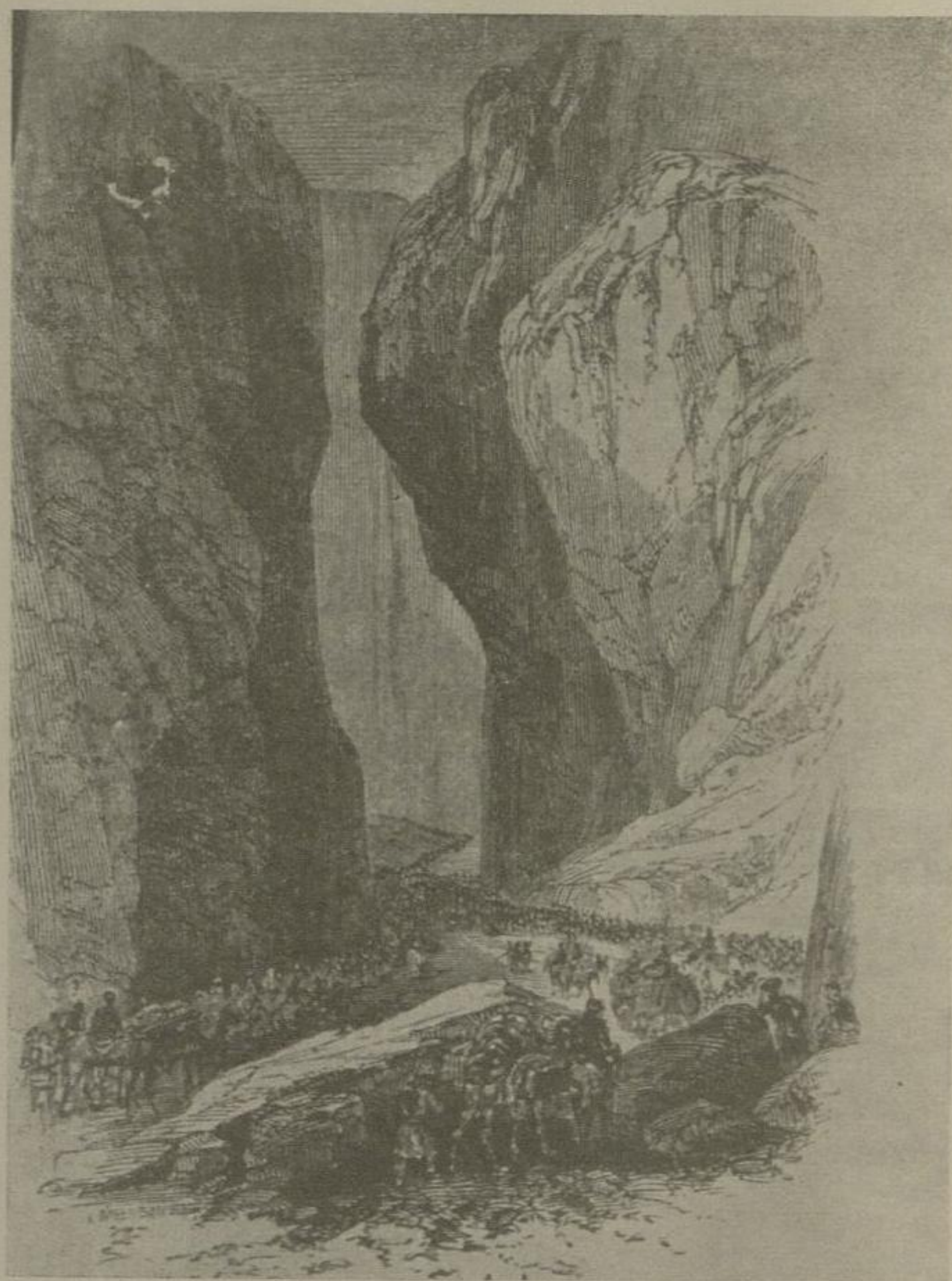
درهٔ بولان
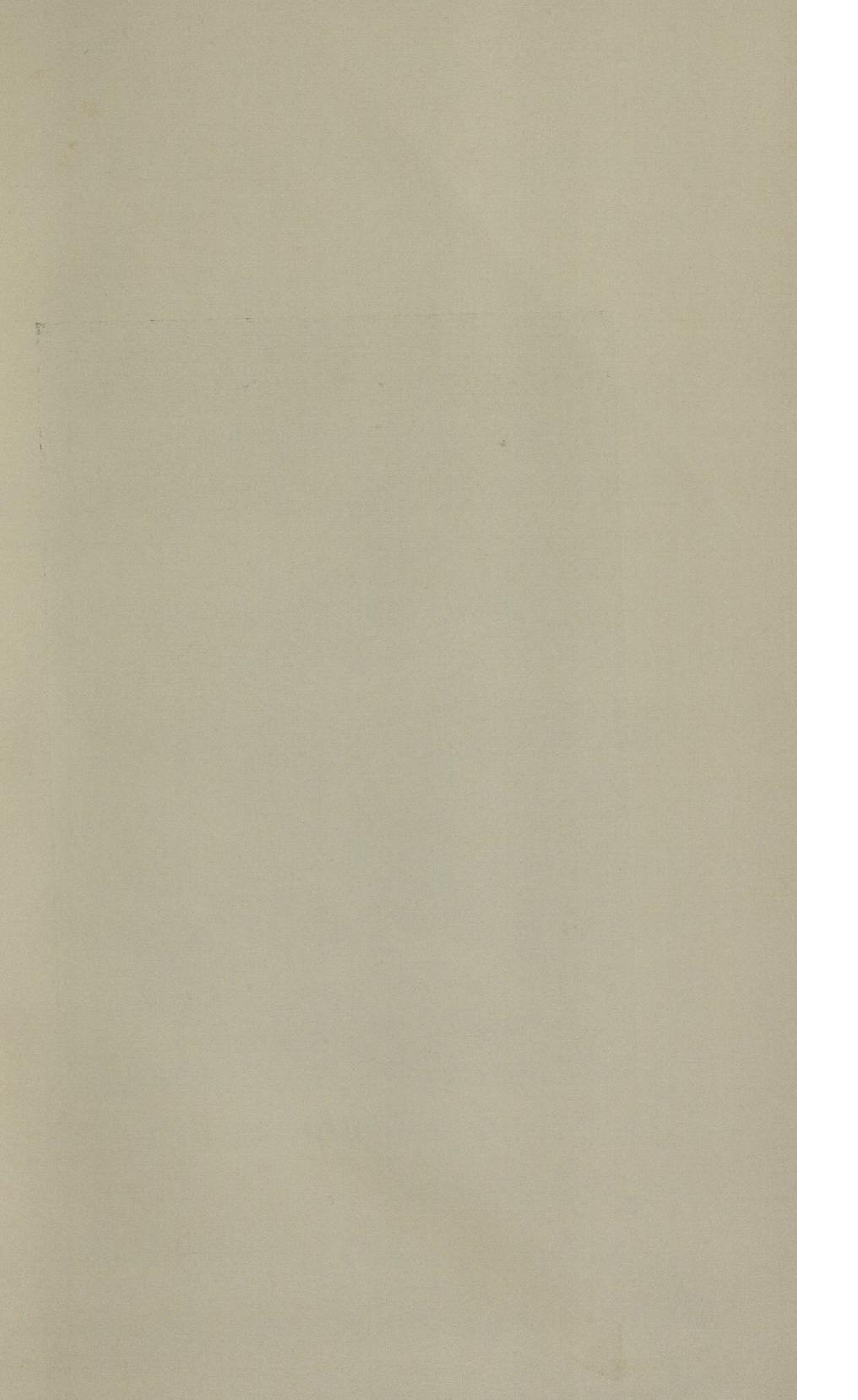
آدھا بیگھ اور بعض مقامات پر صرف چالیس قدم کی گنجائش ہے، سوائے ایک مقام کے، جس کا نام کیرتا ہے، جس میں دو سو گھر کی آبادی ہے، کوئی دوسری آبادی نہیں۔ پہاڑ کے اوپر دونوں طرف اگر سو آدمی سامانِ جنگ کے ساتھ راستہ روک کر بیٹھ جائیں، تو ایک لاکھ سوار و پیادہ کا لشکر زیادہ سے زیادہ سامانِ جنگ کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔ اس راستے سے جو جنگی لشکر گزرتا ہے، محراب خاں جو ان حدود کا حاکم ہے، ایک لاکھ روپیہ ٹیکس کے طور پر وصول کرتا ہے، ورنہ تھوڑے آدمیوں کے ساتھ راستہ روک دیتا ہے۔ پہاڑوں کے دائیں بائیں دو دو کوس کے فاصلے پر پہاڑیوں کے مکانات ہیں، جن کا بکری پالنے اور خلقِ خدا کو لوٹنے کے سوا کوئی دوسرا پیشہ نہیں۔ اس راستے کے مسافروں کا دستور ہے کہ وہ شہر ڈھاڈر اور شہر شال میں دو دو مہینے قافلے کا انتظار کرتے ہیں اور تین چار سو آدمی اکٹھے ہو کر گزرتے ہیں۔ جب حضرت یہاں تشریف لائے، تو سو اونٹ اور اسی قدر آدمی، جو پہلے کسی بڑے قافلے کے منتظر تھے، آپ کے قافلے میں شامل ہو گئے۔[1]

درۂ بولان میں سید حمید الدین لکھتے ہیں: "ڈھاڈر سے شال تک کوئی آبادی نہیں ہے اور پانی کے سوا کوئی چیز کھانے کو نہیں مل سکتی۔ اس لیے چار دن کا کھانا اپنے ساتھ رکھ لیا گیا۔ ۲۸ محرم کو عصر کی نماز کے بعد روانہ ہو کر اس درے کے اندر آئے۔ تمام رات چلے۔ صبح کے قریب بارہ کوس کے فاصلے پر ایک پرانی ببول کے نیچے لشکر کا پڑاؤ ہوا۔ دن بھر آرام کرنے کے بعد نمازِ عصر پڑھ کر پھر روانہ ہوئے اور اسی طرح صبح کی نماز کے وقت موضع کیرتا میں قیام ہوا۔ یہاں پہاڑوں کا فاصلہ نصف میل کے قریب تھا اور کچھ زمین بھی قابلِ کاشت تھی۔ اس لیے وہاں آبادی تھی۔ دن بھر وہاں قیام اور آرام کرنے کے بعد شام کو روانگی ہوئی۔ بارہ کوس پر شام کے وقت بی بی نانی[2] مقام پر پہنچے شام کو حسبِ معمول وہاں سے روانگی ہوئی۔ صبح کو مقام سرِ آب[3]، جس کو سر کھجور بھی کہتے ہیں پہنچے

(۱) مکتوبات، صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴ (۲) یہاں ایک سیدہ کی قبر بتلائی جاتی ہے۔ بلوچ یہاں عام طور پر نان تقسیم کرتے ہیں۔ اس لیے اس مقام کا نام بی بی نانی مشہور ہو گیا (سید احمد شہیدؒ) (۳) مہر صاحب کی تحقیق ہے کہ اس سے مراد وہ مقام نہیں، جو اسی نام سے اب بھی مشہور ہے اور کوئٹہ ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن ہے، بلکہ اس سے مراد مچھ قدیم ہے، جو موجودہ مچھ سے دو میل شمال ہے اور بی بی نانی سے تقریباً سولہ میل۔ براہوی میں مچھ کے معنی کھجور ہیں۔ اس لیے اس کو سر کھجور بھی کہہ سکتے ہیں (ملاحظہ ہو سید احمد شہیدؒ، صفحہ ۳۱۷)

یہ مقام عجیب ہے۔ قافلے کی فرودگاہ کے قریب پہاڑ کی جڑ میں پتھر میں دس بارہ جگہ سوراخ ہیں، جن میں سے صاف و شفاف فوارے کی طرح شیریں پانی کے چشمے رواں ہیں، جو ندیوں کی شکل میں دور دور تک بہتے چلے گئے ہیں۔ اسی لیے اس مقام کو سرِ آب کہتے ہیں۔ یہاں دونوں جانب پہاڑ کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں۔ درمیان میں بڑے بڑے گول گول پتھر اس قدر پڑے ہیں کہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں۔ ان پر آدمیوں اور اونٹوں کے پاؤں پھسلتے ہیں۔ اکثر گھوڑوں کے نعل ان پر چلنے کی وجہ سے ٹوٹ کر گر گئے۔ اس وجہ سے اکثر سوار پیدل ہو گئے اور گھوڑوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔

ظہر کے وقت مقامِ سرِ آب سے روانہ ہوئے تھے۔ وہاں سے چھ کوس تک دونوں جانب پہاڑ اس قدر قریب اور بلند ہیں کہ قلعہ کی دیوار کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ چالیس پچاس قدم سے زیادہ درمیانی فاصلہ نہیں۔ اسی تنگ گلی میں سے آدمی گزر سکتا ہے۔ سوائے پرندے کے کہ پرواز کر کے اوپر پہنچ جائے، کسی آدمی کے عبور کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ یہاں پہنچ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر پہاڑ سے کوئی بڑا پتھر یا چٹان پھسل جائے، تو جان کی خیر نہیں۔ اس جگہ ہر ہر قدم پر قزاقوں کا خطرہ تھا۔ حضرتؒ نے اس موقع پر یہ انتظام کیا کہ اونٹوں اور بندوقچیوں کو سب سے آگے رکھا اور کمزوروں کو بیچ میں اور خود سواروں کے ساتھ خبر گیری کے لیے سب سے پیچھے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام خطرات سے محفوظ رکھا اور ایک گھڑی رات کو اس درے کے دروازے سے لوگ نکلے اور کھلی ہوا میں اطمینان کا سانس لیا اور چار پانچ روز کے بعد میدان کی صورت اور دنیا کی وسعت دیکھی اور جان میں جان آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ سرنگ کے سوراخ سے نکلے ہیں۔ دروازے کے متصل ہی بعض درختوں پر سات آدمیوں کی لاشیں دیکھیں، جو قزاقوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر مر گئے تھے۔ دس بارہ روز کی لاشیں معلوم ہوتی تھیں۔

اگرچہ بارش کی وجہ سے لو بند ہو گئی تھی، لیکن بمقتضائے موسم شکارپور سے ڈھاڈر تک دھوپ میں وہی حدت تھی اور پہاڑوں کے پتھر توے کی طرح دہکتے تھے۔ اس لیے مجبوراً رات کو چلتے تھے اور دن کو خیموں کے سایے میں سوتے اور کھاتے پیتے تھے۔ رات کو بھی پسینہ

بہتا تھا۔ بی بی نانی کے مقام پر آفتاب کی وہ حدت اور پسینے کی وہ شدت نہیں رہی۔ سر آب کے مقام سے رات کو اوڑھنے کی ضرورت ہوئی۔ درے کے اندر ایک چادر سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی، لیکن جیسے ہی لوگ درے کی تنگنائے سے نکلے اور دشتِ بے دولت[1] میں پہنچے، جو ایک ہموار اور مسطح میدان ہے اور عرض و طول میں بارہ کوس ہے، جس کی زمین قابلِ زراعت ہے، لیکن پانی کا نام نہیں، تو معاً ایسا معلوم ہوا کہ برف کے دریا میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے، بدن میں کپکپی شروع ہوگئی اور دانت بجنے لگے۔ جس کو جو کپڑا ملا، اس نے اپنے اوپر ڈال لیا۔ سواروں نے زین پوش اپنے اوپر ڈال لیا۔ ایسا بھی ہوا کہ دس دس بارہ بارہ آدمیوں نے اکٹھا اپنے اوپر اونٹوں کا شلیتہ یا پال یا خیمہ ڈال لیا اور سو گئے۔ اس سردی کے عالم میں کسی کو کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ گھوڑے اور اونٹ بھی سردی سے کانپ رہے تھے۔ مجبوراً اس میدان میں ٹھیرنا پڑا اور سردی سے حفاظت کا سامان کرنا پڑا۔ تمام خراسان میں یہاں کی سردی اور برف باری مشہور ہے۔ پانی اس پورے میدان میں ناپید ہے۔ اسی لیے اس مقام کو دشتِ بے دولت کہتے ہیں۔

جب سے ہم شہر ڈھاڈر سے روانہ ہوئے تھے، اس پورے راستے میں سوائے موضع کیرتا کے کہیں ہم نے اپنے ہمراہیوں کے علاوہ کسی آدمی کی صورت نہیں دیکھی۔ بہرحال رات کسی طرح کٹی۔ صبح سب نے تیمم کر کے نماز پڑھی۔ چار گھڑی دن چڑھے تک ہاتھ سردی کی وجہ سے کام نہیں کرتے تھے۔ آخر وہاں سے کوچ ہوا اور ہم شہر شال کی طرف روانہ ہوئے۔

یہاں سے مملکتِ خراسان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ہر طرف امن و امان ہے۔ ہر جانب دیہات اور آبادیاں ہیں۔ باغات اور کھیتیاں اور پانی کے چشمے ہر طرف جاری ہیں۔"[2]

شال　سید حمید الدین لکھتے ہیں: "آخر خیر و خوبی کے ساتھ ہم ظہر کے وقت شہر شال[3] میں داخل ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کی زبان افغانی ہے۔ وہ ہم لوگوں کی بات سمجھ نہیں سکتے۔ وہ کمال خلوص اور

(۱) یہ دشت بولان کے شمالی دروازے سے عین متصل ہے۔ کچھ نہیں تو اس سے تقریباً میل ہوگا (سید احمد شہیدؒ)　(۲) مکتوبات، صفحہ ۱۴۴-۱۸۸　(۳) اس کا اصلی نام شال کوٹ ہے، غالباً اس کو شال بھی کہتے تھے۔ جو اس وادی کا نام ہے جس میں یہ قصبہ شال آباد ہے۔ انگریزوں نے اس کو کوئٹہ کر دیا۔

اعتقاد کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں کا حاکم، جو محراب[1] خاں کی طرف سے مقرر ہے، ایک عظیم الشان سردار ہے اور رؤسا اور اُمرا کے طبقے میں ایسا دیندار آدمی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ بھی حضرتؒ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور لشکر کی ضرورتوں کی تکمیل، بروقت خبر گیری اور دلجوئی کا انتہائی خیال رکھا اور حضرتؒ کی خوشنودی سے مالا مال ہوا۔ وہاں سے دو کوس پر ایک دیہات میں سادات کا ایک

۵ گھر تھا۔ تیسرے روز اس گھر کے لوگوں نے کھانے اور میوے کی بڑی ضیافت کی اور حضرتؒ کو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور بڑی خوشی سے کھانا کھلایا۔ اسی روز شال کے حاکم نے حضرتؒ کے ہاتھ پر ارادت اور جہاد کی بیعت کی اور حضرتؒ کو بہت سے مجاہدین کے ساتھ اپنے گھر لے جا کر مہمانداری کا حق ادا کیا اور اس سفر میں اپنی معیّت کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے اُس کے حق میں دُعائیں کیں اور فرمایا کہ جب ہم بُلائیں، تو تُم آ جانا۔

اس زمانے میں محراب خاں حاکمِ حدود (بلوچستان) اور حاکمِ قندھار کے درمیان تعلّقات اس حد تک

۱۰ خراب ہو گئے تھے کہ طرفین دارالحکومت سے نکل نکل کر اپنی اپنی سرحدوں پر ٹھیرے ہوئے جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ قندھار کی فوج عبداللہ خاں دُرّانی کی سرکردگی میں مع گیارہ ضرب توپ کے اپنی حکومت کی سرحد میں مقام مے زئی پر، جو شہرِ شال سے تیئیس کوس پر ہے، ٹھیری ہوئی تھی اور محراب خاں حاکمِ قلات کی فوج مُلّا فتح محمد آخون وزیر کی ماتحتی میں قصبۂ مستنگ میں، جو شال سے سولہ میل قلات کی طرف ہے، پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی اور دونوں طرف سے جنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔ حضرتؒ کا حُکم ہوا کہ سیّد انور شاہ بیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ، جو

۱۵ مولوی سیّد اولاد حسن قنوجی، حاجی بہادر شاہ رامپوری اور مولوی نظام الدّین معروف بہ حبشی اور اس کاتب الحروف (سیّد حمید الدّین) اور دُوسرے اشخاص پر مشتمل ہو، لشکر سے جُدا ہو کر قصبۂ مستنگ، جو بہت سے دیندار مُسلمانوں کا مسکن اور محراب خاں کے لشکر کی چھاؤنی ہے، جائیں، وہاں کے مُسلمانوں کو جہاد کی تبلیغ کریں اور مُلّا فتح محمد وزیر سے مل کر اس خط کا جواب لیں، جو راستے سے حاکمِ قلات کو بھیجا گیا تھا اور تین روز میں اپنا کام کر کے اپنے لشکر گاہ میں پہنچ جائیں۔ یہ جماعت روانہ ہوئی اور قصبۂ مستنگ میں پہنچ کر وہاں کے اہلِ ایمان کو جماعت

(۱) محراب خاں، جو اس وقت بلوچستان کا حاکم تھا، محمود خاں کا بیٹا اور نصیر خاں اوّل کا پوتا تھا۔ نصیر خاں نے بلوچستان کو ایک مستقل حکومت کی حیثیت دی۔ اُس نے ۱۷۹۴ء میں وفات پائی۔

کی تبلیغ و دعوت کی اور وزیرِ مذکور سے ملاقات کی۔ وزیرِ ممدوح اپنے زہد و ورع میں نادرۂ روزگار اور خوش اخلاقی اور مروّت میں ضرب المثل ہے۔ نادر شاہ کے ملازمین میں ہے۔ ایک سو بیس سال کی عمر ہے لیکن قوٰی نہایت اچھے ہیں، شہسواری اور فوج کشی کا خاص مذاق ہے۔ آغازِ جوانی سے حاکمین قلات کا وزیر چلا آرہا ہے۔ چار بادشاہ بادشاہت کرکے باری باری ملکِ بقا کو سدھارے اور یہ ابھی منصبِ وزارت پر سرفراز، نیک نام و کامگار ہے۔ عمر و اقبال اور دیانت و تقوٰی کا ایسا اجتماع کم دیکھنے میں آیا ہے۔ وزیرِ موصوف ۵
نے ہم لوگوں کے آنے کی خبر سن کر پہلے ہی سے ایک مکان فرش فروش اور ضروری سامان سمیت ہمارے لیے آراستہ کر رکھا تھا۔ جب ہم شہر کے دروازے پر پہنچے، تو وزیرِ موصوف کی طرف سے ایک سوار نے استقبال کیا، ان کا سلام پہنچایا اور ہم کو ہماری اقامت گاہ میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد ملا نور محمدؐ، جو محراب خاں کے مخصوص امرا اور مقربین میں سے تھے، وزیر صاحب کی طرف سے ملاقات اور دریافتِ احوال کے لیے آئے۔ بہر حال دلجوئی اور خاطر داری کا، جو اربابِ اخلاق اور رؤسائے مسلمین کے شایانِ شان ہے، کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ ۱۰
موسمی پھل اور میوے، گھوڑوں کے لیے چارہ دانہ اور رات کو ہمارے لیے پُر تکلف رنگا رنگ کے کھانے بھیجے۔ صبح کو وزیر صاحب کی ملاقات کے لیے گئے۔ وہ خیمے کے اندر سے لبِ فرش تک آکر مہمانوں سے بغلگیر ہوئے اور نہایت اخلاق کے کلمات، جن میں ریاست کے غرور کا شائبہ بھی نہ تھا، فرماتے رہے اور خط کے جواب کی تاخیر کا عذر بیان کیا کہ حاکمِ قندھار کے ساتھ جنگ کی تیاری تاخیر کا سبب بنی۔ فریقین کی مصالحت کے لیے حضرتؒ سے دعا کی درخواست کرنے کو فرمایا اور حضرتؒ کو اس مضمون کا ایک خط لکھ کر حوالے کیا کہ آج میں نے ۱۵
اپنے آقا کو اس خط کے جواب کی یاد دہانی کی ہے۔ جو کچھ جواب آئے گا، ان شاء اللہ دو تین روز میں آپ تک ہمارے خاص آدمی کے ہاتھ پہنچ جائے گا۔ دوسرے روز دو سوار ہماری حفاظت اور راہنمائی کے لیے اور اسباب و میوہ جات کا ایک اونٹ ہمارے ہمراہ کیا اور رات کو ہم لوگ روانہ ہو کر دوسرے روز ظہر کو شہر شال میں حضرتؒ کے پاس پہنچ گئے۔ خط کے جواب میں چار روز وہاں قیام رہا۔"[1]

(۱) مکتوبِ سید حمید الدین، مکتوباتِ قلمی، صفحہ ۱۸۹-۱۹۲

اکیسواں بابؒ

شال (کوئٹے) سے پشاور تک

شال سے روانگی

سیّد حمید الدّین اپنے خط میں لکھتے ہیں: "۱۵ محرّم کو صُبح کے وقت شہر شال سے لشکر کا کُوچ ہُوا۔ حاکمِ شال، جس کی ارادتمندی کا ذکر اُوپر ہو چُکا ہے، پچاس ساٹھ سوارانِ خاص کے ساتھ حضرتؒ کی سواری کے ساتھ بڑے جنگی ساز و سامان سے مشایعت کے لیے تین کوس تک آیا۔ وہ میدان میں دوڑتے تھے اور بندوقیں سر کرتے تھے اور فنونِ سپہ گری اور اپنے کمالات دکھاتے تھے۔ اِس موقع پر ہندی و سندھی سواروں اور پیادوں کا انبوہ اور سواری کا تزک و احتشام عجب شان رکھتا تھا۔ حاکمِ شال نے رُخصت چاہی اور سواروں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر دُعا کی۔ حاکمِ مذکور ہر خویش اور بیگانے کے سامنے حضرتؒ کی شفقت و محبّت سے زار و قطار رو رہا تھا۔ حضرتؒ نے اس کے اور اس کے رُفقا کے حق میں تمام دینی اور دُنیوی مطالب کے لیے دُعائیں کیں اور قندھاریوں اور بلوچیوں کی صُلح کے لیے بڑی گریہ و زاری کے ساتھ دُعا فرمائی، جس کی قبولیّت کا ذکر آگے آئے گا۔

شال سے روانگی کے وقت محراب خاں حاکمِ قلات کا خط فتح محمد وزیر کا بھیجا ہُوا حضرتؒ کے خط کے جواب میں آیا، جس کا مضمون تھا کہ آپ جس مہم پر جا رہے ہیں، تشریف لے جائیں۔ جن چیزوں کے متعلق آپ نے لکھا ہے، اس کا مُناسب جواب جنگ کے تصفیے کے بعد دیا جائے گا۔ اس سے اندازہ ہُوا کہ اس کو مجاہدین کے اہل و عیال کے لیے جگہ دینے میں تامّل ہے۔

محراب خاں کی حکومت سے نکل کر ہم لوگ حکومتِ قندھار کے علاقے میں داخل ہُوئے اور مقامِ حیدر زئی میں منزل ہُوئی۔ اس نواح میں سادات کی آبادی ہے، جو اس تمام علاقے میں نہایت

صحیح النسب اور معزز سمجھے جاتے ہیں اور حسنِ اخلاق، ہمت، سخاوت و شجاعت میں بہت ممتاز ہیں۔ انھوں نے بہت خلوص کے ساتھ حضرتؒ کی پچاس آدمیوں کے ساتھ دعوت کی۔ اس راستے میں جس منزل سے گزر ہوتا تھا، سادات میں سے کوئی نہ کوئی حضرتؒ کی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ دعوت ضرور کرتا تھا۔ بعض لوگ کچھ خربزہ، سردہ، تربوز یا کوئی دوسری چیز ہاتھ میں لیے ہوئے راستے پر کھڑے ہوتے اور سلام و مرحبا کہہ کر حضرتؒ سے مصافحہ کرتے، بہ تحفہ نذر کرتے اور اپنے ۵
حق میں دعا کرا کے رخصت ہوتے۔ سیکڑوں عورتیں چہروں پر نقاب ڈالے راستے پر کھڑی ہوتیں، سلام و مرحبا کہتیں اور جہاد کی فتح و نصرت کی دعائیں کرتیں اور حضرتؒ کا ہاتھ اپنے چھوٹے بچوں پر پھیر کر دارین کی بہبودی کے لیے دعائیں لیتیں۔ حضرتؒ اپنے فطری کمالِ اخلاق سے ہر شخص کے لیے کھڑے ہو جاتے اور دعا کرتے۔ ہر دِہ اور گاؤں میں چھوٹوں، بڑوں اور مردوں، عورتوں کا اس قدر ہجوم ہوتا کہ لشکر کا چلنا رک جاتا۔ پشین کی حدود سے لے کر شہر کابل میں داخلے تک روزانہ ہر منزل پر ۱۰
یہی منظر پیش آتا اور کوئی دن ایسا نہ جاتا، جس میں کوئی نہ کوئی شخص حضرتؒ کی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ دعوت نہ کرتا۔ آپؒ کے ساتھ محبت و اخلاص کی نشانیاں ہر چھوٹے بڑے مرد و عورت کے چہرے پر ظاہر ہوتی تھیں اور ہر شخص کفار پر آپؒ کی فتح و نصرت کی دعائیں کرتا تھا۔

دوسرے روز مقام جبدزئی سے چل کر ایک دوسرے مقام سدوزئی میں منزل ہوئی، جو پشین کے سادات کا مسکن تھا۔ وہاں کے سرداروں کے مشورے سے حضرتؒ نے وہاں کے سادات کے ۱۵
ذریعے حاکمِ قندھار کے سپہ سالار کو، جو محراب خاں حاکمِ بلوچستان کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادے سے یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر فوجوں اور توپخانے کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے، ایک خط اس مضمون کا بھیجا کہ ہم لوگ تمھارے ملک میں مسلمانوں سے ملاقات کرنے کے لیے اور ان کو کفار کے ساتھ جہاد کی دعوت دینے کے لیے آئے ہیں اور تمھارے شہر سے ہو کر کابل کی طرف جائیں گے، تم ہماری طرف سے اپنے دل میں کوئی برا خیال نہ کرنا، ہمیں امید ہے کہ تم اس کی اجازت دو گے۔ آدھی رات کو خط کا جواب اس مضمون کا آیا کہ کل آپ ۲۰
سدوزئی سے کوچ کر کے مقام مے زئی میں ہماری چھاؤنی میں آئیے۔ میں آپ کی آمد کی اطلاع اپنے

آقا کو کروں گا، جو قندھار میں ہے اور آپ کے لیے قندھار سے گزرنے کی اجازت طلب کر دوں گا۔ جب تک اس کا جواب نہ آئے، آپ ہمارے لشکر گاہ ہی میں توقف فرمائیے۔ اجازت آنے کے بعد قندھار کا رُخ فرمائیے۔

اس خط کے مطابق حضرتؒ نے سدو زئی سے کوچ فرما کر مے زئی میں لشکر گاہ سے ایک تیر کے فاصلے پر خیمہ لگایا اور فروکش ہو گئے۔ سردارِ فوج اکثر افسروں کے ساتھ پیادہ پا اپنے خیمہ گاہ سے نکل کر حضرتؒ کے استقبال کے لیے آیا۔ حضرتؒ کو پہلے تنہا اپنے خیمے میں لے گیا اور آپؒ سے اس سفر کے مقاصد کا پورا حال دریافت کیا۔ دو گھنٹے کے بعد حضرتؒ خیمے سے باہر تشریف لائے۔ گولہ اندازوں میں کثرت سے ہندوستانی ملازم تھے۔ وہ ہماری ملاقات کو آئے اور اپنے وطن کے حالات دریافت کیے۔ مے زئی کے سادات ان تینوں دن، جس میں ہم لوگ حاکمِ قندھار کے اجازت نامے کے انتظار میں ٹھیرے ہوئے تھے، روزانہ حضرتؒ کی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ ضیافت کرتے رہے اور دن رات آپؒ کے خیمے میں اس مقام کے اور قرب و جوار کے معززین و سادات کا ہجوم رہتا تھا، جو آپؒ کی ملاقات کرنے کے لیے آتے تھے اور اس سفرِ جہاد میں اپنی معیت و رفاقت کے خواستگار تھے۔ حضرتؒ ان کو وہی جواب دیتے تھے، جو اس سے پہلے آپؒ نے مشتاقانِ جہاد کو دیا تھا کہ جب ہم بلائیں، اُس وقت آجانا۔ تین روز کے بعد حاکمِ قندھار کا خط آیا کہ سید صاحبؒ کو لشکرِ مجاہدین کے ساتھ یہاں آنے سے کیوں روکا ہے، آنے دو۔ چوتھے روز وہاں سے کوچ ہوا۔[1]

کوزک مقامِ مے زئی سے کوچ کر کے دس کوس کے فاصلے پر عشا کے وقت کوزک[2] پر پہنچے، جو کوہِ توبہ کا درہ ہے۔ چونکہ اس سے پہلے بہت بلند و دشوار گزار پہاڑی راستہ طے کرنا پڑتا تھا اور اس کی بلندی ایک میل یا زائد تھی، جس کا رات کو طے کرنا اور تنگ گھاٹیوں سے نکلنا رات کو بہت دشوار تھا، اس لیے یہی صلاح ہوئی کہ صبح کے وقت سفر کیا جائے۔ چنانچہ صبح کا کھانا پکا کر دوپہر کے قریب کوچ ہوا اور پہاڑ کے اوپر پہنچے۔ بڑی دشواری اور مشقت سے اُترتے چڑھتے چار کوس چل کر عصر کے وقت چوکی

(۱) مکتوب سید حمید الدین۔ مکتوبات، صفحہ ۱۹۲-۱۹۷ (۲) کوزک کے متعلق بھی انگریز سیاحوں اور فوجیوں کا تاثر یہ ہے کہ وہ درۂ بولان کی طرح نہایت اہم درہ اور دشوار گزار پہاڑی راستہ ہے، ملاحظہ ہو تسویر۔
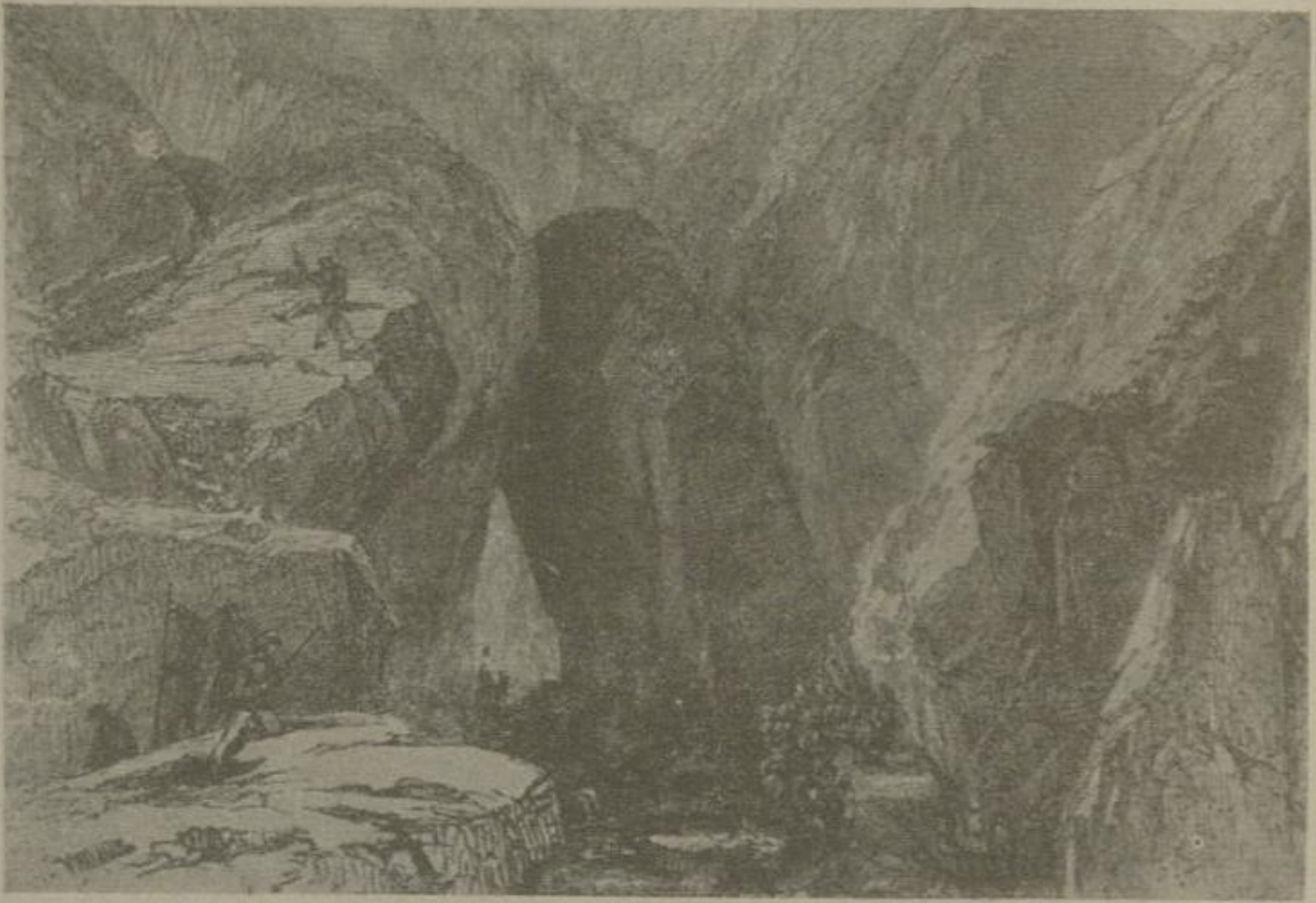
درۂ کوزک
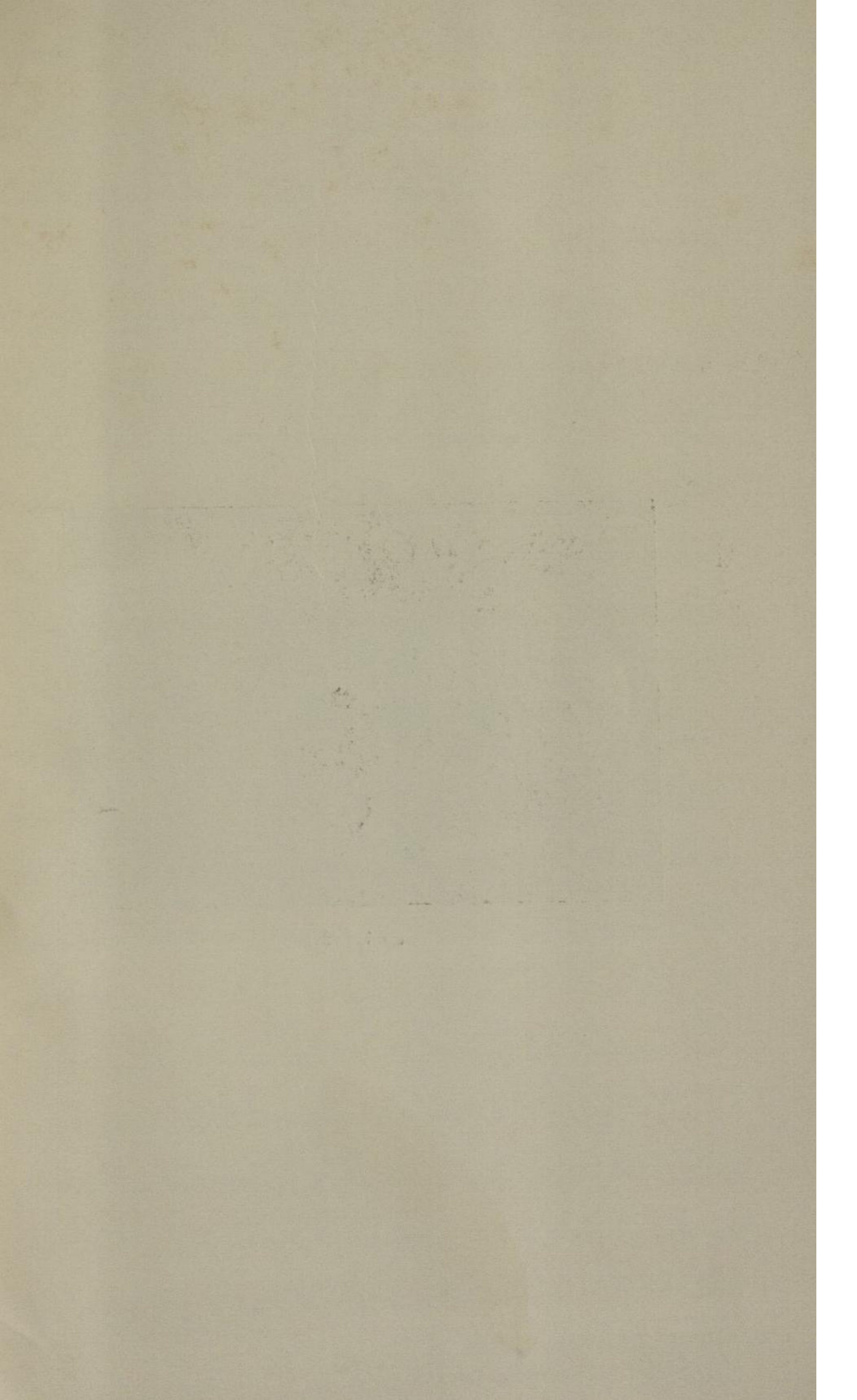
پہنچے، جہاں سے کابل اور قندھار کا راستہ پھٹتا ہے۔"[۱]

افغانستان کی حکومتوں پر ایک نظر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ زمان شاہ نے، جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا، اپنے محسن اور صاحبِ رسوخ وزیر پائندہ خاں کو قتل کرا دیا، جس کے نتیجے میں وہ تخت و تاج سے محروم ہوا اور پائندہ خاں کے بیٹے فتح خاں نے شاہ ابدالی کے دوسرے پوتے محمود کو تختِ افغانستان پر بٹھا دیا اور ساری مملکت کو اپنے بھائیوں کی صوبے داری میں دے دیا۔ کچھ عرصے کے بعد محمود کے بیٹے کامران نے جس کو اپنے باپ کی سلطنت میں بارک زئی سردار فتح خاں کی مطلق العنانی اور خود مختاری گوارا نہ تھی، فتح خاں کی آنکھیں نکال لیں اور اس کو قید خانے میں ڈال دیا۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ محمود کے حکم سے وہ قتل کر دیا گیا۔[۲]

فتح خاں کے اس انجام نے ابدالیوں کے رہے سہے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور بارک زئی بھائیوں کی خود مختار سلطنت قائم ہو گئی۔ اس وقت تمام ملکِ افغانستان ان بھائیوں کے تصرّف میں آگیا اور انھوں نے مختلف صوبوں اور علاقوں پر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ سید صاحبؒ نے جب سنہ ۱۲۴۲ھ (سنہ ۱۸۲۶ء) میں افغانستان و سرحد کا سفر فرمایا، تو پورا ملک انھیں بھائیوں میں بٹا ہوا تھا۔ قندھار پر پُردل خاں، شیر دل خاں اور ان کے تین بھائی حکومت کرتے تھے۔ غزنی میر محمد خاں کی عملداری میں تھا۔ کابل کی حکومت کے بارے میں بھائیوں اور بھتیجوں میں بارہا کشمکش اور جنگ کی نوبت آئی تھی۔ اگرچہ بالآخر کابل کا تخت اور رفتہ رفتہ افغانستان کی حکومت مستقل طور پر دوست محمد خاں کے زیر نگیں آگئی،[۳] لیکن جس وقت سید صاحبؒ تشریف لے گئے، اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ کابل سلطان محمد خاں کے زیرِ انتظام تھا۔ سید حمید الدین صاحب کے مکاتیب میں حاکمِ کابل کی حیثیت سے سلطان محمد خاں ہی کا ذکر آتا ہے۔ اس وقت ان بھائیوں میں پھر ایک بار سخت اختلاف اور کشمکش تھی اور اسی کی وجہ سے سید صاحبؒ کو کابل میں طویل قیام کرنا پڑا۔ پشاور یار محمد خاں کی تحویل میں تھا، ہشت نگر

---

(۱) مکتوبِ سید حمید الدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۹۹-۲۰۰۔ (۲) ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان "درّانی خاندان کا زوال اور اس کے اسباب"، صفحہ ۳۸۶۔

(۳) امیر امان اللہ خاں تک افغانستان کی حکومت دوست محمد خاں کی اولاد میں رہی۔ بچۂ سقّہ کی بغاوت کے بعد جب نادر شاہ نے افغانستان پر قبضہ کیا، جو سلطان محمد خاں کی اولاد سے تھے، تو تختِ افغانستان اس شاخ کی طرف منتقل ہو گیا۔

کا علاقہ سیّد محمّد خاں کے پاس تھا۔ اس طرح ہرات کو مستثنیٰ کر کے سارا افغانستان و سرحد بارک زئی سرداروں کے زیرِ حکومت و انتظام تھا، جو ایک باپ کے بیٹے تھے اور عام طور پر "دُرّانی" کہلاتے تھے۔ سیّد صاحبؒ کو انھیں سرداروں کی عملداری سے گزر کر یوسف زئیوں کے علاقے میں جانا تھا، جس کو عام طور پر سمہ[1] کہتے ہیں۔

قندھار کی جانب

"کوزک سے دوسرے روز ظہر کے وقت روانہ ہوئے۔ سات کوس تک کہیں پانی نہ تھا۔ بہ سبب راستہ طے کر کے صبح کے قریب ایک تالاب کے کنارے پہنچے، جو بارش کے پانی سے پُر تھا۔ بقیہ شب وہاں گزار کر نمازِ صبح پڑھ کر روانہ ہوئے۔ پانچ کوس پر کاریز مُلّا فتح اللہ خاں پر منزل کی۔ دوسرے روز آٹھ کوس چل کر ایک ویران مقام پر منزل ہوئی۔ وہاں سے کوچ کر کے دس کوس پر قلعۂ حاجی میں منزل ہوئی۔ وہاں کے زمیندار نے بیعت کی اور چند لوگوں کے ساتھ رفاقت اختیار کی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ پُردل خاں حاکمِ قندھار کا حقیقی بھائی شیر دل خاں، جو بڑا سفّاک اور دلیر آدمی تھا اور جس نے اپنی برزئی سے محراب خاں حاکمِ قلات والیِ حکومتِ بلوچستان سے جنگ کی نیّت سے اپنی فوج اور توپخانے کو مے زئی میں بھیج دیا تھا اور عنقریب محراب خاں پر حملے کا ارادہ رکھتا تھا، گزشتہ شب ایک ہفتہ بیمار رہ کر انتقال کر گیا اور چار و ناچار حاکمِ بلوچستان سے صلح ہو گئی اور اس طرح سے حضرتؒ کی دعا، جو آپؒ نے فریقین کی صلح کے لیے حاکمِ شال کے سامنے کی تھی، قبول ہوئی۔

چونکہ قندھار یہاں سے قریب تھا، مواضع و دیہات راستے میں کثرت سے ملتے تھے۔ زائرین اور تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر راستے پر کھڑے ہو جاتے، زیارت کرتے اور دعائیں لیتے، بہت سے موسمی پھل اور فواکہ: سردہ، تربوز اور انگور گدھوں اور اونٹوں پر لادے ہوئے کھڑے ہوتے تھے اور حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

اسی طریقے پر آپ دیہات اور قریوں سے گزرتے ہوئے چھ کوس پر جا کر کاریز مُلّا عبد اللہ پر، جو قصبۂ خوشاب کے قریب ہے، مقیم ہوئے۔ وہاں سردے اور انگور وغیرہ کے ڈھیر لگ گئے۔ ہندوستانی

---

(۱) [illegible] میدانی علاقہ ہے جو دریائے سندھ اور سرحدی پہاڑوں کے درمیان ہے۔ ضلع پشاور و ضلع مردان اسی علاقے میں واقع ہیں۔

رُفقائے، جن میں سے بہتوں نے ان پھلوں کے نام ہی نام سُنے تھے، شکم سیر ہو کر کھائے"[1]۔

استقبال حاکمِ قندھار نے آپؒ کی آمد آمد سُن کر اپنی حضوری کے اُمرا میں سے ایک کو، جسے قندھار میں شاہ غاسی کہتے ہیں، پندرہ سوار دے کر استقبال کے لیے بھیجا۔ رُؤسائے شہر میں سے بہت سے لوگ، جو مدّتِ دراز سے آپؒ کے اَوصاف سُن کر اَور تشریف آوری کی خبر معلوم کر کے مُلاقات کے مُشتاق تھے، شہر سے پانچ کوس کا فاصلہ طے کر کے کاریز مُلّا عبداللہ پہنچے"[2]۔

قندھار دُوسرے روز ۲۸ محرم الحرام کو آپؒ قصبۂ خوشاب و کاریز مُلّا عبداللہ سے کُوچ کر کے اسی عوض بیگی کی رہبری و معیت میں، جس کو حاکمِ قندھار نے آپؒ کے استقبال کے لیے بھیجا تھا، قندھار کی طرف روانہ ہُوئے۔ سیکڑوں سواروں نے اپنے گھر سے نکل کر راستے میں مُلاقات کی اَور فرودگاہ تک ساتھ آئے۔ ہزاروں شُرفا و علما و فُضلائے شہر پیادہ پا استقبال کرتے تھے اَور سواری کے ساتھ ساتھ چلتے تھے کہ راستے اَور سڑکیں تنگ ہو گئیں۔ ہجُوم کی کثرت سے خویش و بیگانہ کی تمیز مشکل تھی۔ اِس تزک و احتشام کے ساتھ آپؒ شہر کے قریب آئے۔ شہر سے ایک میل مغرب کی جانب دروازۂ ہراتی کے قریب آپؒ کا خیمہ نصب ہُوا اَور لشکر نے قیام کیا۔

پُردِل خاں حاکمِ قندھار نے اپنے بھائی شیر دل خاں کی وفات کی وجہ سے، جس کو چوتھا روز تھا، حاضری سے معذرت کی اَور ضیافت کا سامان بھیج دیا۔ آپؒ نے سلام کہلایا اَور فرمایا کہ کل صُبح مَیں خُود تعزیت کے لیے آؤں گا۔ دُوسرے دِن چالیس آدمیوں کے ساتھ آپؒ تعزیت و ملاقات اَور مرحُوم کی فاتحہ خوانی کی تقریب میں تشریف لے گئے۔ پُردِل خاں اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ دالان سے نکل کر استقبال کے لیے باہر آیا اَور بڑی عقیدت کے ساتھ مُلاقات و معانقہ کیا۔ اندر لے جا کر اپنی مسند پر بٹھایا، آداب و تعظیم بجا لایا اَور اس دُور دراز سفر کے حالات و مقاصد دریافت کیے اَور اس کی تفصیل معلوم کر کے ظاہری بے سرو سامانی کے باوجُود حضرتؒ کی اولوالعزمی پر حیرت کی اَور اس کو تائیدِ الٰہی شمار کیا۔ دو گھنٹے اسی قسم کی گفتگو اَور رسمِ فاتحہ خوانی کے بعد آپؒ باہر تشریف لائے"[3]۔

(۱) مکتوب سید حمیدالدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۲۰۰-۲۰۱ (۲) مکتوب سید حمیدالدین، مکتوبات، صفحہ ۲۰۱-۲۰۲ (۳) مکتوب سید حمیدالدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۲۰۳-۲۰۴

قندھار سے روانگی

چار روز قندھار میں قیام رہا۔ خاص و عام میں سے کوئی نہ تھا، جو حاضر نہ ہوا ہو۔ ہر شخص نے باصرارِ معیت جہاد کی درخواست کی۔ نوبت اس کی پہنچی کہ بغیر آپؒ کی اجازت کے ہزارہا اشخاص نے جہاد کے عزم سے سفر کا ساز و سامان درست کرنا شروع کر دیا۔ حکام کو معلوم ہوا، تو شہر آشوبی کے خطرے سے پریشان ہو کر بوابوں کو حکم دیا کہ شہر سے کسی کو نکلنے نہ دیں۔ لوگ اس پر بھی

5 باز نہ آئے، تو حضرتؒ کو پیغام بھیجا کہ آپ کے تشریف رکھنے سے سارا شہر شوقِ جہاد میں آپ کی معیت کے لیے بیقرار ہے، انتظامِ حکومت درہم برہم ہو رہا ہے، ہماری گزارش ہے کہ آپ کابل تشریف لے جانے میں تعجیل فرمائیے اور اہلِ شہر میں سے، جو آپ کی معیت کی درخواست کرے، قبول نہ فرمائیے۔

حضرتؒ بے لطفی کے اندیشے سے ۳ صفر کو قندھار سے روانہ ہو گئے اور کاریز حاجی عبدالعزیز پر قیام فرمایا۔ ۴ محرم کو وہاں قیام فرما کر قندھار سے کابل تک کے لیے اونٹ کرایے پر لیے اور ۵ محرم

10 کو وہاں سے کابل کی جانب روانہ ہو گئے اور قلعۂ اعظم خاں پر منزل کی۔

باوجود بندش اور شدید انتظام کے چار سو کے قریب علما و فضلا، مدارس کے طلبا اور خانقاہوں کے مشائخ کسی نہ کسی طرح باہر آ گئے اور قلعۂ اعظم خاں میں پہنچ کر آپؒ سے مل گئے۔ یہ سب شوقِ جہاد میں سرشار اور سر دینے کے لیے تیار تھے۔ حضرتؒ نے خواجہ ظہور اللہ کو حاکمِ قندھار کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ ہم تمھارے شہر کے لوگوں کو نہیں لے جا رہے ہیں، وہ خود آ گئے ہیں۔ اگر اجازت ہو،

15 تو ساتھ لے جائیں، ورنہ اپنا آدمی بھیج کر واپس کر لو۔ حاکم نے جواب دیا کہ علما و فضلا و طلبا میں سے جو اب تک پہنچا ہو، اس کو لے جا سکتے ہیں، دوسرا اگر خواہش کرے، تو اس کو جواب دے دیں۔ حضرتؒ نے ان میں دو سو ستر آدمی انتخاب کر لیے۔ باقی سے فرمایا کہ جس وقت جہاد شروع ہو جائے اس وقت آ جانا، کوئی انکار نہ ہو گا۔ دو سو ستر آدمیوں کو مناسب نصیحتیں فرمائیں اور سید دین محمد قندھاری رفیقِ قدیم کو ان کا افسر مقرر کیا اور ان کو لشکرِ مہاجرین و مجاہدین میں شامل کیا۔"[1]

غلزئی قبیلے کے علاقے میں

20 سید صاحبؒ قلعۂ اعظم خان سے چل کر قلعۂ رمضان خاں پہنچے۔ یہاں سے غلزئی

(۱) مکتوب سید حمید الدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸

سرداروں اور زمینداروں کا علاقہ شروع ہوتا ہے،(۱) جن کے آباد اجداد کچھ ہی عرصہ پہلے افغانستان، نیز ایران کے ایک بڑے حصے پر حکومت کرتے تھے اور قندھار کے تخت پر متمکن تھے۔ نادر شاہ افشار نے اُن کو ایران سے نکالا۔ آخر غلزئی فرمانروا حسین شاہ کو شکست دے کر قندھار و کابل پر قبضہ کر لیا نادر شاہ کے قتل پر افغانستان کی عنانِ حکومت احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے پوتے محمود کے عہد میں ابدالیوں کی دوسری شاخ بارک زئی افغانستان کے تخت و تاج کی ۵
مالک بن گئی۔ اس پورے عرصے میں افغانستان کے سابق فرمانرواؤں کا خاندان غلزئی جو ایک کثیر التعداد اور طاقتور قبیلہ تھا، حکومت اور اُس کے تمام مناصب و منافع سے محروم رہا۔ اس بنا پر غلزئی درانیوں اور بارک زئیوں کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ سلطنت کے غاصب ہیں اور درانی اُن کی طرف سے مطمئن نہیں رہتے۔ ان کو معلوم تھا کہ غلزئی قبیلے کا ہر فرد اپنے کو حکومتِ افغانستان کا حقیقی مالک اور وارث سمجھتا ہے۔ ۱۰

سید صاحبؒ جب ان غلزئی سرداروں اور زمینداروں کے علاقے سے گزرے، تو انھوں نے اپنی امداد و رفاقت کی پیش کش کی اور آپؒ کے ساتھ جہاد میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ سید صاحبؒ افغانستان کی قریبی گزشتہ تاریخ سے واقف تھے۔ آپؒ کو درانیوں اور غلزئیوں کے تعلقات کا علم تھا۔ آپؒ کو خوب معلوم تھا کہ غلزئیوں کی رفاقت و تائید کے معنی صرف یہ ہیں کہ درانیوں کو، جو عہد افغانستان کے حاکم اور اس کی سیاست پر حاوی ہیں اور جن کے علاقے میں آپ جا رہے ہیں، اپنا ۱۵
دشمن بنا دیا جائے اور اُن سے امداد کی ہر اُمید منقطع کر لی جائے۔ اس بنا پر آپؒ نے غلزئیوں کی اس پیش کش کے قبول کرنے سے، جو ممکن ہے مخلصانہ رہی ہو، دینی و سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سرِ دست معذوری ظاہر کی اور اُن کے پورے اعزاز اور شکر گزاری کے ساتھ اُن کو جواب دے دیا۔ سید حمید اللہ بن

---

(۱) "غلزئی افغانستان کا ایک بہت بڑا اور پھیلا ہوا قبیلہ ہے، جو جنوب میں قلاتِ غلزئی سے لے کر شمال میں دریائے کابل تک، مغرب میں گل کوہ کے حدود سے، مشرق میں ہندوستان کے حدود تک پھیلا ہوا ہے اور متعدد مقامات پر ان حدود سے بھی متجاوز ہے۔ اس قبیلے کا تعلق اسی نسل سے ہے، جس سے علیٰ خیل اور لودھی پٹھان ہیں۔ فوجی صلاحیتوں اور تجارتی کاروبار میں وہ کسی قبیلے سے کمتر نہیں۔ وہ دجیہ، بہادر اور مردانہ اوصاف کے حامل ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد دہم، اشاعت ۱۱ء)۔

اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں: "قلعۂ رمضان خان تک راستے کے تمام دیہات میں دُرّانی افغانوں کی سکونت و زمینداری تھی۔ قلعۂ رمضان خاں سے غلزئی، سالم خیل پٹھانوں کی سکونت و زمینداری شروع ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں عبدالرحمٰن قندھاری اسی قبیلے سے ہیں۔ قلعۂ رمضان خاں سے روانہ ہو کر مقام جلدک میں منزل ہوئی۔ چونکہ حضرتؒ کی ہندوستان سے تشریف آوری کی شہرت ان اطراف کے تمام باشندوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، اس لیے تمام سردارزادے اور قدیمی رئیس زادے، جو خاندانِ سلطنت کی تباہی کی وجہ سے کنجِ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے، کاشتکاری کرتے تھے۔ انھوں نے حضرتؒ کی رفاقت کو شوکتِ دُنیوی اور نجاتِ اُخروی کا وسیلہ سمجھ کر رفاقت کے لیے درخواستیں کیں اور اس مضمون کے خطوط لکھ کر بھیجے۔

انھیں میں سے شاہ حسین غلزئی سالم خیل کی اولاد میں عبدالرحیم خاں کا بیٹا خانان خاں بھی تھا، جس کے بزرگ پہلے تمام مملکتِ خراسان پر حکومت کرتے تھے۔ نادر شاہ نے حسین شاہ کو شکست دے کر افغانستان کو اس سے حاصل کیا۔ جب لشکرِ مجاہدین کا گزر قلعۂ رمضان خاں سے ہو کر جلدک کی طرف سے ہوا، تو خانانِ مذکور کے بھیجے ہوئے غلزئی قوم کے دو سوار راستے میں ملے، جنھوں نے عرض کیا کہ ہمارے آقا آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور آپ کو اس مہم کے لیے بہت مفید مشورے دیں گے۔ چونکہ دُرّانی اور غلزئی قوم کے درمیان قدیم زمانے سے رقابت اور عداوت ہے اور حضرتؒ کی رفاقت میں زیادہ تر قندھار کے آدمی تھے، جو دُرّانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ اس وقت رُخ غزنی اور کابل کی طرف تھا اور وہاں کی حکومت بھی دُرّانیوں کی تھی، اس لیے اس اندیشے سے کہ خانانِ مذکور کی ملاقات و مشورے سے اس مُلک کے حکّام کو کچھ کھٹک نہ پیدا ہو، خاناں مذکور سے ملنا دُور اندیشوں نے مناسب نہ سمجھا۔

جب یہ سوار خاناں مذکور کے پاس واپس گئے، تو اس نے کمالِ عقیدت اور اخلاص اور سعادتِ قدم بوسی کی انتہائی آرزومندی کے ساتھ حضرتؒ کو دُوسرا خط دُوسرے دو سواروں کے ساتھ بھیجا۔ ان سواروں نے لشکر میں آ کر لکھنؤ کے قندھاریوں کے حالات دریافت کیے اور کہا کہ

ہمارے آقا خاناں اور عبدالرحمٰن خاں کے والد یوسف خاں اور محمد سعید خاں آپس میں بہت قریب کے رشتے دار ہیں اور ان اطراف میں اتنی بڑی برادری اور اتنے حامی و مددگار کسی کے نہیں۔ اس کی تصدیق موافق و مخالف سے کی جا سکتی ہے۔ آخر حضرتؒ نے اس خط کا جواب کمال اعزازِ شاہانہ کے ساتھ دیا، جس میں اس کی دلجوئی اور خاطرداری پورے طور پر کی اور مکان پر تشریف نہ لانے کا عذر بیان کیا۔ صبح کو خانِ مذکور نے ایک دوسرا خط اس سرفراز نامے کے جواب میں بھیجا کہ مجھے اپنے معتقدین کی جماعت میں تصور فرمائیے ۵ اور جب کبھی کفار سے مقابلے کی صورت پیش آئے یا اس کا موقع قریب ہو، تو مجھے سرفراز نامے کے ذریعے سے یاد فرمائیں۔ میں فی الفور معبودِ حقیقی کی رضاجوئی کے لیے چالیس پچاس ہزار سوار اور پیادوں کے ساتھ کوہستان کے راستے سے ہو کر خدمتِ والا میں پہنچ جاؤں گا اور سعادتِ دارین حاصل کروں گا اور خود اس بدگمانی سے بچنے کے لیے حضرتؒ کی خدمت میں نہیں آیا۔

۱۰ یہاں سے کوچ کر کے مقام کوڑم میں قیام ہوا۔ یہاں شہاب الدین خاں نامی غلزئی سردار نے، جو غلزیوں کی سلطنت کے زمانے میں وزارت و نیابت کے عہدے پر تھا اور اب بھی اپنی قوم کی بڑی جمعیت اس کے ساتھ ہے، لیکن شہاب الدین خاں نے رہزنی اور قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے، اپنے ایک معتمد آدمی کو حضرتؒ کی خدمت میں بھیجا کہ مجھے اپنے منتسبین میں تصور فرمائیے اور جب میرا کام ہو، مجھے طلب کیجیے میں بڑی جمعیت کے ساتھ حاضر ہوں گا۔

۱۵ قندھار و غزنی کے راستے میں آپؒ متعدد منزلیں کرتے ہوئے موضع منگی پہنچے۔ آپؒ نے راستے ہی سے ملا ظہور اللہ کو بعض قندھاریوں کے ساتھ میر محمد خاں حاکمِ غزنی اور سلطان محمد خاں حاکمِ کابل کے پاس اپنے اطلاعی خط کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں اور اہلِ جمعیت کا ایک گروہ کفرستان سے تنگ آ کر جہاد و ہجرت کے عزم سے اپنے وطن سے نکلا ہے اور مسلمانوں کو دین کے اس رکنِ رکین کو قائم کرنے کی دعوت دینے کے لیے محض لوجہ اللہ اس قدر مسافت طے کر کے تمہارے ملک میں پہنچا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اسی طرح یوسف زئی کے علاقے میں، جو پشاور کے اطراف میں ہے، پہنچ جائیں۔ ۲۰ ہم آپ کے شہروں سے گزریں گے۔ دانائی و مروت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ متوحش نہ ہوں اور ہمارے پہنچنے

پہلے ہم کو تحریری اجازت دیں تاکہ ہم اطمینان کے ساتھ ان حدود سے گزر کر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں۔

اس خط کے جواب میں میر محمد کا خط آیا، جس پر اس کی مہر تھی کہ آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے سعادت و مسرت کا باعث ہے۔ آپ بلا تامّل تشریف لائیں۔ ہم سے جو کچھ خدمت بن پڑے گی، ہم دریغ نہ کریں گے۔

۵ مشکئی کی منزل پر لشکر کی قیام گاہ سے دو کوس کے فاصلے پر دامنِ کوہ میں میر محمد خاں اپنے کسی سرکاری کام سے دو ہزار سوار اور تین ضرب توپ کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ اس کے لشکر کے لوگ شام تک سیکڑوں کی تعداد میں ملاقات کے لیے آتے رہے اور ان مہاجرین کی عزیمت اور ہمت پر آفریں کہتے رہے۔ خود میر محمد خاں کا ارادہ اگلی صبح کو آنے اور ملاقات کرنے کا تھا، مگر پچھلی شب میں کوئی ایسا ضروری کام پیش آگیا کہ اسی وقت تمام لشکر اور توپ خانے کو کوچ کا حکم ہو گیا۔

۱۰ اگلے روز صبح کو مشکئی سے کوچ ہوا۔ ایک روز راستے میں منزل ہوئی۔ دوسرے روز آٹھ کوس چل کر غزنی میں داخل ہوئے۔[۱]

غزنی "رؤسائے شہر اور اہلِ علم و فضل اور بے شمار آدمیوں نے سوار اور پیادہ پا دو کوس نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے سلطان محمود غزنوی کے مزار کے متصل لشکر کا پڑاؤ ڈالا۔ میر محمد خاں، حاکمِ غزنی کے نوعمر صاحبزادے نے، جو آشوبِ چشم میں مبتلا تھا، قلعے کی دیوار کے نیچے بیس سواروں کے ساتھ آکر قدم بوسی کی اور آپ کے ساتھ رہا۔ آپ نے تکلیف کا خیال کر کے اس کو رخصت کیا۔ عصر کے وقت نائبِ حاکم بارہ سواروں کے ساتھ آیا۔ حاکمِ غزنی نے تمام ضروریات کا انتظام کیا اور حاضر ہو کر بیعت کی۔ خواص و عوام سب ہی حاضرِ خدمت ہوئے۔ عمائدِ غزنی میں سے بعض راستے ہی میں حاضر ہو کر زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ غزنی میں دو روز قیام کر کے ۲۵ صفر ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) کو آپ کابل روانہ ہوئے۔"[۲]

کابل راستے میں ہفت آسیاب، شیخ آباد، میدان ٹھیرتے ہوئے قلعۂ قاضی پہنچے، جہاں سے شہر کابل

۲۰ چار کوس ہے۔ میدان ہی میں سردار سلطان محمد خاں حاکمِ کابل کا خط پہنچ گیا، جس میں تحریر تھا کہ

---

(۱) مکتوب سید حمید الدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۱۹۹-۲۱۳ (۲) مکتوب سید حمید الدین، مکتوبات (قلمی)، صفحہ ۲۱۴-۲۱۸

آپ کا تشریف لانا فراوانیِ برکت اور زینتِ مملکت کا باعث ہے، بے تکلف تشریف لائیں اور ہم سب کو اپنے خدّام میں شمار کریں۔"

راستے میں مُلا حاجی مُلا علی ایک سردارِ فوجِ شاہی، حکومتِ کابل کی طرف سے پچاس سوار اور پیادوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور سردارِ کابل کا سلام پہنچایا اور سرکاری طور پر آپؒ کا استقبال کیا۔ اکثر رؤسا و عمائدِ دارالسلطنت اور ہزارہا خاص و عام آپؒ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر گئے تھے اور آپؒ کی سواری کے ہمراہ تھے۔ نصف راستے پر امین اللہ خاں نائب سلطان محمد خاں بڑے تزک و احتشام سے سوار اور پیادوں کے ساتھ آپؒ کا منتظر تھا، سلام و مزاج پُرسی ہوئی۔ جہاں سے شہر کا دروازہ ایک کوس رہ جاتا ہے، وہاں سوار اور پیادہ استقبال کرنے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ راستہ چلنا مشکل ہو گیا۔ حصار کے دروازے پر، جہاں کوہِ شمالی اور کوہِ جنوبی آ کر ملتے ہیں اور اُن کے درمیان سے کابل کی ندی بہتی ہے اور اس کے شمالی ساحل پر شارعِ عام ہے اور اس درے سے مغرب کی طرف، جو وسیع میدان ہے، جب سواری وہاں پہنچی، تو سلطان محمد خاں اپنے تین بھائیوں کے ساتھ پچاس سواروں کی جمعیت کے ساتھ استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ سید صاحبؒ نے دیکھ کر دُور سے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر سلام کیا۔ اس نے ادب سے سلام کا جواب دیا اور سواری سے اُتر آیا۔ آپؒ نے بھی سواری سے اُتر کر مصافحہ و معانقہ کیا پھر حضرتؒ کو سوار کرا کر، خود سوار ہو کر ہمرکاب چلا۔ بے شمار رؤسا و عمائدِ شہر جوق جوق آ رہے تھے اور سلام و مزاج پُرسی کرتے تھے۔ گھوڑوں اور ہجوم کی وجہ سے ایسی گرد اُڑتی تھی کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی سلطان محمد خاں نے اجازت چاہی اور اپنے نائب امین اللہ خاں سے کہا کہ حضرتؒ کو شہر کے بازار میں سے ہو کر لے جاؤ تاکہ تمام اہلِ شہر آپؒ کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ آپؒ بازار سے گزر کر وزیر فتح خاں کی شاندار حویلی اور دلفزا پائیں باغ میں مع قافلہ ٹھہرے۔ اس زمانے میں سردارانِ کابل میں سخت اختلاف تھا اور جنگ کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ آپؒ مصالحت کی اُمید پر ڈیڑھ مہینہ ٹھہرے رہے۔ جب کامیابی نہ دیکھی، تو پشاور روانہ ہوئے[1]۔ راستے میں مُسلمان اس جوش و محبت کے ساتھ استقبال کرتے تھے، جس کا

(۱) مکتوب سید حمید الدین (قلمی) از کابل مورخہ ۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۴۲ھ

مظاہرہ سارے سفر میں ہوتا رہا۔[1]

پشاور دو تین روز قیام رہا۔ وہاں سے ہشت نگر تشریف لے گئے۔ وہاں چند روز قیام کرکے اور وہاں کے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت و تبلیغ فرما کر خویشگی ہوتے ہوئے نوشہرے تشریف لائے جہاں سے اس محبوب عمل، عبادتِ عظمیٰ[1] کا آغاز کیا گیا، جو برسوں کی دعوت و تبلیغ اور جدّ و جُہد کا ماحصل اور اس پُر مشقّت و پُر محن سفر کا مقصد تھا جس کی نظیر پچھلی صدیوں کے فاتحین اور کشور کشاؤں کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے اور جو صرف قوّتِ ایمانی، شوق و محبّت اور اعتماد علی اللہ کا کرشمہ تھا۔ یہ سیّد صاحبؒ کی عظمت و عزیمت اور حُسنِ تربیت کی ایسی یادگار ہے، جس سے ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی تاریخ خالی ہے۔

(۱) مکتوبِ سیّد صاحبؒ، مکتوباتِ قلمی، صفحہ ۲۲۲

بائیسواں باب

چمکنی سے نوشہرے تک

چمکنی سے ہشت نگر[1] آپ چمکنی سے کوچ فرما کر دریائے لُنڈے اُتر کر چار سدہ علاقۂ ہشت نگر میں تشریف فرما ہوئے۔ آپؒ کی تشریف آوری کی خبر سُن کر اس مقام کے تمام مرد مور و ملخ کی طرح آپ رح کی زیارت کے لیے جمع ہوگئے۔ جوانب و اطراف کی عورتیں بھی مجتمع ہوگئیں۔ آپ اُس وقت اُونٹ پر سوار تھے۔ ۵ اُونٹ کے زین پوش کی جھالر کو عورتوں نے تبرک کے طور پر توڑ لیا۔ اُونٹ کی دُم کے بال تک نوچ لیے۔ اُونٹ کے پیروں کے نیچے کی خاک بھی تبرک سمجھ کر کوئی عورت اپنی آنکھ میں لگاتی تھی، کوئی مُنہ پر ملتی تھی، کسی نے گھر لے جانے کے لیے وہ خاک اپنے کپڑے میں باندھ لی۔ سب لوگوں نے آپ کو لے جاکر بستی کے کنارے آپ کا خیمہ نصب کیا اور سب قافلہ وہیں اُترا۔

لشکر کی معیشت غلّے کی تقسیم اور اخراجات وغیرہ کے مہتمم مولوی محمد یوسف صاحب پھلتی تھے۔ مولوی صاحب ۱۰ نے بیان کیا کہ آج لشکر کے کھانے کا خرچ نہیں ہے۔ سیّد صاحبؒ کو اس کا علم ہُوا، تو آپ دیر تک سکوت میں رہے۔ آپ نے فرمایا: "کچھ فکر و تشویش کی ضرورت نہیں۔ یہ سب لوگ جس کے بندے ہیں، وہ آپ اُن کی پرورش کرے گا۔" پھر فرمایا کہ "باورچی خانے کے کچھ مسّی ظروف، دیگچی، طشت وغیرہ تسلّی کے لیے کسی بقّال کے یہاں رکھ کر آج کے واسطے جنس لے لو۔ پھر جیسا ہوگا، دیکھا جائے گا۔" انھوں نے ایسا ہی کیا اور جنس لاکر حضرتؒ سے پُوچھا کہ اس کو کیونکر تقسیم کریں۔ آپؒ نے فرمایا کہ جس قدر سب کو پہنچے، بانٹ دو۔ ۱۵

---

(۱) یہاں سے جنگِ بالاکوٹ تک جو حالات و واقعات لکھے جائیں گے، اُن کا زیادہ تر ماخذ "وقائعِ احمدی" ہے جو اُن چشم دید واقعات کا مجموعہ ہے جو ٹونک میں مرتب ہوئے اور راویوں کے خود اپنے الفاظ میں نقل کر دیے گئے۔ یہاں بھی کتاب کے الفاظ و عبارت میں کم سے کم تغیر کیا گیا ہے، جہاں کہیں قلمی خطوط یا "منظورۃ السعداء" یا کسی اور ماخذ سے کوئی چیز نقل کی گئی ہے، وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

لشکر میں غلّے کی تقسیم کے لیے ایک تا ملوٹ تھا۔ اس میں تین پاؤ آٹا آتا تھا۔ ہر ایک کو ایک ایک تا ملوٹ خشکہ یا آٹا ملتا تھا۔ اس روز غلّے کی قلّت کے سبب سے تین تین آدمیوں میں ایک ایک تا ملوٹ آٹا تقسیم ہُوا۔ لوگ کھا کر اپنی خدمت پر مستعد ہو گئے۔ چوکیدار اپنے چوکی پہرے پر قائم ہُوئے، شبینے والے گشت پر گئے اور نکوں کا حُکم لشکر میں پہنچا دیا اور لوگ آرام سے لیٹ گئے۔

۵ **لشکر گاہ کی رات** سیّد صاحبؒ کی چارپائی کے گرد اکثر مشتاق لوگ آپ کی باتیں سُننے کے لیے رہا کرتے تھے اور اس کثرت سے ہوتے تھے کہ کسی کا سر، کسی کا پَیر، کسی کا پیٹ، کسی کی پیٹھ، کسی کو کسی بات کا تکلف نہ تھا۔ جس نے جہاں کہیں جگہ پائی، وہیں بے تکلّف سو رہا۔

پچھلی رات کو آپ اُٹھے اور وضو کر کے نمازِ تہجّد ادا کی۔ لوگوں نے بھی نماز پڑھی۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا: "یہ قبولیّتِ دُعا کا وقت ہے۔ مَیں جنابِ الٰہی میں دُعا کرتا ہُوں۔ تُم سب مل کر آمین کہو۔" پھر

۱۰ آپ نے سر برہنہ گریہ و زاری کے ساتھ دُعا کی: "اے پروردگار! تُو بڑا قادر و بے نیاز ہے۔ ہم سب تیرے محتاج و ناچار بندے ہیں۔ تیرے سوا کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ ہم سب تیری ہی رضامندی کے لیے اپنے شہر و دیار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ تُو ہم سب پر اپنی رحمت کی نظر کر۔" اسی طرح کے الفاظ بار بار کہتے تھے۔ اُس وقت ہر شخص کا کچھ اور ہی حال تھا، گویا سب پر فنا کی سی حالت طاری تھی۔ دُعا کے بعد کچھ حاضرین کو وعظ اور نصیحت فرمائی۔ پھر سو رہے۔ صُبح کی اذان کے بعد بیدار ہُوئے۔ استنجے سے

۱۵ فراغت کر کے وضو کیا، سُنّتیں پڑھیں۔ اس عرصے میں لشکر کے لوگوں کے علاوہ اس بستی کے تمام لوگ نماز کے لیے حاضر ہو گئے۔ آپؒ نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد بڑی دیر تک دُعا کی۔

سیّد محمد خاں کی حاضری دن نکلے سردار سلطان محمد خاں کا سب سے چھوٹا بھائی سردار سیّد محمد خاں بالا حصار سے مُلاقات کے لیے آیا۔ بہُت سے لوگ اُس کے ہمراہ تھے۔ اُس نے بَیعت کی۔ اُس کے ہمراہیوں اور بستی کے لوگوں میں سے بھی بہُت سے آدمیوں نے بَیعت کا شرف حاصل کیا۔ بَیعت کرنے والوں کی اِس قدر

۲۰ کثرت تھی کہ ہاتھ پکڑنے کی نوبت آنی بھی مشکل تھی۔ آپؒ نے اپنا دوپٹہ پھیلا دیا اور ان سب سے بَیعت لی۔

اہلِ لشکر کے اخلاق اکبر خاں لشکر میں ایک پھیلے دار تھے اور رسُول خاں نامی ملیح آباد کے رہنے والے بڑے

بہادر اور بانکوں میں مشہور تھے۔ ان کا ایک بھتیجا دس گیارہ برس کا تھا، جس کو انھوں نے تعلیم و تربیت کے لیے اکبر خاں کے بہیلے میں رکھ دیا تھا۔ ہشت نگر میں جن لوگوں نے بیعت کی تھی، وہ کچھ مٹھائی بھی لائے تھے۔ وہ بھی اکبر خاں کے بہیلے میں تھی۔ اس لڑکے نے اس میں سے ایک یا دو لڈو کھا لیے۔ اکبر خاں کو خبر ہوئی، تو انھوں نے اس کو ایک تھپڑ مارا کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ کسی نے اس کی اطلاع رسول خاں کو کی کہ تمھارے بھتیجے کو اکبر خاں نے تھپڑ مارا۔ ان کو اس کا بڑا رنج ہوا اور غصے میں ان کی زبان ۵ سے کچھ سخت سست الفاظ نکل گئے۔ پھر کچھ سوچ سمجھ کر چپ ہو رہے۔ نور خاں نے یہ سارا واقعہ سید صاحبؒ کو سنایا۔ آپؒ رسول خاں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپؒ نے ان کو بلایا اور خاطر داری سے بٹھایا۔ اس کے بعد فرمایا: "ہم نے سنا ہے کہ اکبر خاں نے تمھارے بھتیجے کو تھپڑ مارا، جس سے تم کو بڑا رنج ہوا۔ یہ بات تم کو نہ چاہیے۔ انھوں نے اپنا لڑکا سمجھ کر تعلیماً مارا ہوگا۔" رسول خاں نے کہا: "حضرت! جیسا میرا مزاج ہے، آپ بھی جانتے ہیں اور اکثر لوگ واقف ہیں کہ مجھ کو کسی سخت بات کی برداشت نہیں۔ ۱۰ جب سے میں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، تب سے وہ جہالت اور شورہ پشتی اللہ تعالیٰ نے دور کر دی۔ اگر وہی جہالت اور شیطنت، نعوذ باللہ، مجھ میں ہوتی، تو اس کے باوجود کہ آپ کے لشکر میں ہندوستانی و قندھاری وغیرہ اتنے لوگ بہادری و شجاعت میں یکتائے زمانہ ہیں، مگر میں کسی کو خیال میں نہ لاتا اور سخت بات کا جواب تلوار ہی سے دیتا۔ لیکن میں نے سچے دل سے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی ہے۔ اکبر خاں تو میرے بھائی ہیں۔ مارا، تو خوب کیا۔" ۱۵

یہ بات سن کر آپؒ ان سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دعا کی۔

ایک جاسوس کی گرفتاری ہشت نگر میں قندھاریوں نے ایک اجنبی آدمی کو گرفتار کیا اور کہا کہ بدھ سنگھ کا جاسوس ہے۔ بعض بعض قندھاریوں نے چاہا کہ اس کو مار ڈالیں۔ کسی نے یہ خبر آپؒ کو پہنچائی۔ آپؒ نے اسی وقت ایک آدمی بھیجا کہ خبردار اس پر کوئی شخص ہاتھ نہ ڈالے۔ اس کو سلامت ہمارے پاس لے آؤ۔ یہ حکم سن کر چند قندھاری اس کو لے کر آپؒ کے پاس گئے۔ آپؒ نے اس کو بلا کر اپنے خیمے میں بٹھایا اور جو قندھاری اس کو لائے ۲۰ تھے، ان کو رخصت کر دیا۔ نمازِ عشا سے فارغ ہو کر آپؒ نے اس آدمی کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: "تو اپنا حال ہم سے

سچ سچ بیان کہہ دے۔ کسی بات سے مت ڈر"۔ اس نے کہا "حضرت سچ بات تو یہ ہے کہ بدھ سنگھ لشکر کے ساتھ دریائے اٹک پر اُتر کر خیرآباد میں داخل ہوا ہے۔ اس کو یہ اطلاع ملی ہے کہ کوئی سید صاحب ہندوستان سے ملک گیری کے ارادے سے ایک بڑا لشکر لے کر ہشت نگر میں آئے ہیں۔ اس نے مجھے جاسوس کے طور پر بھیجا کہ مفصل حالات دریافت کر کے اطلاع دوں"۔

آپؒ نے اس کی گفتگو سن کر فرمایا: "ہماری طرف سے بدھ سنگھ سے کہنا کہ جیسے تم رنجیت سنگھ کے
5 مطیع و فرمانبردار ہو اور وہ تم کو جہاں کہیں بھیجتا ہے، وہاں جاتے ہو، اسی طرح ہم بھی اپنے آقا کے فرماں بردار اور غلام ہیں۔ وہ ہم کو جو کچھ فرماتا ہے، وہی ہم بجالاتے ہیں۔ ہم اسی کے بھیجے ہوئے ہندوستان سے یہاں آئے اور عنقریب ہم سے تم سے مقابلہ ہوگا"۔

اس کے بعد آپؒ نے اللہ بخش خاں جماعت دار کو بلایا اور فرمایا کہ اس آدمی کو ہمارے لشکر میں ڈیرے ڈیرے کی سیر کرا کر، کچھ رات رہے حفاظت سے لشکر کے باہر دو ڈیڑھ کوس تک پہنچا دینا، پھر وہاں
10 سے چلا جائے گا۔

لشکرگاہ کی تبدیلی صبح کو اکوڑے کا رئیس امیر خاں خٹک ملاقات کے لیے آیا اور شرفِ بیعت سے مشرف ہوا اور عرض کی: "میرا بھتیجا فیروز خاں کا بیٹا خواص خاں میرا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے بدھ سنگھ کو اکوڑہ بلایا ہے۔ اگر وہ سکھ سردار اکوڑے میں آ کر دریائے لنڈے کے ورے اُترا، تو تمام ملکِ سمہ[(۱)] کو تاراج کر دے گا۔ مناسب یہ ہے کہ آپ یہاں سے کوچ کریں اور اس کو وہیں روکیں"۔

15 **خویشگی میں** دوسرے روز آپؒ وہاں سے کوچ کر کے موضع خویشگی میں رونق افروز ہوئے۔ نمازِ مغرب کے بعد میاں عبداللہ نے آ کر عرض کیا: "یہ بستی چھوٹی ہے۔ یہاں کھانے کی جنس کم ملتی ہے اور لشکر میں لوگ بہت ہیں"۔ آپؒ نے اس وقت تمام حاضرین سے فرمایا: "ہم دعا کرتے ہیں، تم سب مل کر آمین کہو"۔ پھر آپؒ سر برہنہ دعا میں مشغول ہوئے۔ لوگ آمین کہتے تھے۔ جب دعا سے فارغ ہوئے، تو فرمایا کہ بھائیو، ہر شخص اس وقت سے عشا کی اذان تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھے۔ سب نے ویسا ہی کیا۔
20 اذانِ عشا کے بعد ایک شخص آپؒ کے پاس آیا اور عرض کی کہ آٹے کی کشتی دریا کے کنارے موجود ہے۔

---

(۱) سمہ سے مراد وہ میدانی علاقہ ہے جو دریائے سندھ اور سرحدی پہاڑوں کے درمیان ہے۔ پشاور و ضلع مردان اسی علاقے میں واقع ہیں۔

اپنے لوگوں کو بھیج کر منگوا لیں۔ آپؒ نے یہ سُن کر میاں عبداللہ سے کہا کہ تم کچھ لوگوں کو لے کر جاؤ اور
وہاں سے آٹا لاؤ اور یہاں لا کر جاجم پر جمع کر دو۔ عبداللہ تو اس طرف آٹا لینے کو گئے اور آپؒ نے وضو
کر کے لوگوں کو نمازِ عشا پڑھائی۔ جب لوگ وہاں سے آٹا لائے، یہاں لشکر میں ایک جاجم پر جمع کر دیا۔ میاں
عبداللہ نے آکر اطلاع کی کہ سب آٹا وہاں سے آگیا۔ آپؒ نے پوچھا: "کس قدر ہو گا؟" کہا: "پندرہ من
کے قریب ہو گا۔" آپؒ نے فرمایا کہ جب تک ہم وہاں نہ آئیں، آٹا تقسیم نہ ہو۔ آپؒ وہاں تشریف لے گئے ۵
اس میں سے تھوڑا آٹا اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و رزاقی اور اپنی مفلسی و محتاجی کا دیر تک بیان
کرتے رہے۔ پھر وہ آٹا بسم اللہ کر کے اسی انبار میں ڈال دیا اور جاجم کے دونوں کونے لوٹا دیے اور
فرمایا کہ دو روزہ سب کو تقسیم کر دو۔ اُس وقت لشکر میں پندرہ سو کے قریب لوگوں کی جمعیت تھی: کچھ
کم پانچ سو ہندوستانی اور کچھ اُوپر دو سو قندھاری اور کوئی آٹھ سو کے قریب مُلکی لوگ ہوں گے۔ شیخ
باقر علی صاحب آٹا تقسیم کرنے لگے۔ جو ہندوستانی اور قندھاری تھے، ان سب کو دو روزہ دیا اور ۱۰
جو لوگ وہیں نزدیک کے رہنے والے تھے، اپنے اپنے گھروں سے اکثر کھا کر آئے تھے اور جو
اپنے گھروں سے کھا کر نہیں آئے تھے، ان میں سے جس نے مانگا، اس کو بھی دیا۔ جب سب کو تقسیم
کر چکے، تو کچھ آٹا بچ رہا۔ آپؒ نے فرمایا کہ وہ آٹا ہمارے باورچی خانے کے منتظم شیخ قادر بخش کے حوالے
کر دو۔ اسی وقت لوگوں نے اپنی اپنی جماعت میں روٹیاں پکائیں اور کھا پی کر اپنے عہدے پر قائم رہے

لشکر کا انتظام لشکر میں ابتدا سے چار جماعتیں تھیں اور چار جماعت دار تھے۔ ایک جماعت خاص مشہور ۱۵
تھی اور اُس میں سیّد صاحبؒ بنفسِ نفیس تھے۔ وہ جماعت مولوی محمد یوسف صاحب کی تھی۔ وہ
ہمیشہ کوچ اور مقام میں داہنی جانب کو ہوتی تھی۔ دوسری جماعت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی
تھی۔ وہ کوچ اور مقام میں آگے ہوتی تھی۔ تیسری جماعت سیّد محمد یعقوب صاحب کی تھی۔ اس جماعت
میں اُن کے نائب شیخ بڈھن تھے۔ سیّد محمد یعقوب صاحب ٹونک میں تھے۔ یہ جماعت کوچ اور مقام
کے وقت بائیں طرف رہتی تھی۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خاں کی تھی۔ وہ پیچھے رہتی تھی۔ متفرق اشخاص ۲۰
بیچ میں ہوتے تھے۔ سیّد صاحبؒ کا خیمہ خاص جماعت کے قریب نصب کیا جاتا تھا۔

حکومتِ لاہور کو اعلام نامہ اسی نظم و انتظام کے ساتھ آپؒ نے موضعِ خویشگی سے کوچ کر کے ۸ ار جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۴۲ھ (۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۲۶ء) کو نوشہرے میں قیام کیا۔ آپؒ نے حکومتِ لاہور کو شرعی دستور کے مطابق اس مضمون کا اعلام نامہ تحریر فرمایا تھا:

(۱) یا تو اسلام قبول کر لو (اُس وقت ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو جاؤ گے، لیکن اس میں کوئی جبر نہیں)۔

(۲) یا ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کر و۔ اس وقت ہم اپنے جان و مال کی طرح تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

(۳) آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں، تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملکِ ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی، جتنی ہم کو شہادت کی ہے۔[۱]

ایک مخبر نے آکر خبر دی کہ بدھ سنگھ لشکر کے ساتھ اکوڑے میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ سُن کر آپؒ نے فرمایا کہ خبردار، کوئی شخص کمر نہ کھولے، ہوشیاری سے تیار رہے اور جس کو کھانا پکانا ہو، دن ہی کو پکا کر کھا لے۔

---

(۱) "سوانح احمدی" میں اس اعلام نامے کے ذکر کے ساتھ اتنا اضافہ اور ہے: "دربارِ لاہور نے براہِ نخوت اس اعلام نامے کا کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ قاصدِ آورندۂ اعلام نامہ کو دربار سے نکلوا دیا۔ اس سبب سے اب جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔" (سوانح احمدی، صفحہ ۳۶)

تیئیسواں باب

اکوڑے کی جنگ

شبخون کا فیصلہ اس وقت تک مجاہدین کو سکھوں سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جنگی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ پہلا معرکہ کامیاب ہو اور دشمن پر مجاہدین کی جانبازی کا نقش قائم ہو جائے۔ حریف کی تعداد سات ہزار بیان کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں جن مجاہدین پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، وہ صرف پانچ سو ہندوستانی ۵
اور دو سو قندھاری تھے۔ ملکیوں کی شجاعت اور میدانِ جنگ میں ثابت قدمی کا ابھی تک کوئی تجربہ نہ تھا۔ دراصل ابھی مجاہدین کی تعداد و استعداد اس درجے کو نہیں پہنچی تھی کہ اتنے کثیر التعداد دشمن سے میدان کی جنگ لڑی جائے۔ اس تمام نشیب و فراز کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ پہلا معرکہ شبخون کی صورت میں ہو تاکہ اصل اور مرکزی طاقت کو محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر ضرب لگائی جائے اور اس کو ہراساں کر دیا جائے۔ ۱۰

مجاہدین کی فہرست نمازِ ظہر کے بعد آپؒ نے اپنے خاص خاص لوگوں سے کچھ مشورہ کیا اور چاروں جماعت والوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی جماعت سے اچھے اچھے چست چالاک جوانوں کے نام ایک فرد پر لکھ کر لائیں اور اُن میں سے جس کے پاس اچھے درست ہتھیار نہ ہوں، دوسرے بھائیوں سے بدل لیں۔[1]

ایک بیمار مسلمان کا شوقِ جہاد وہ چاروں جماعت دار ناموں کی فرد لے کر آئے اور آپؒ کے حوالے کی۔ آپؒ نے اس فرد کو دیکھ کر چند نام اُن میں سے نکال دیے اور اُن کی جگہ دوسروں کو درج کیا۔ وہ لوگ اکثر اکڑوں میں تھے۔ اُن میں عبدالمجید خاں جہان آبادی رسالے بریلی والے بھی تھے۔ اُن کو بخار آتا تھا۔ سید صاحبؒ ۱۵

(۱) قلمی مکتوب سید صاحبؒ

نے اسی سبب سے اُن کا نام نہیں رکھا۔ یہ خبر سُن کر وُہ اسی بخار کی حالت میں بستر سے اُٹھ کر آئے اور آپؒ سے پُوچھا کہ آپؒ نے میرا نام فرد میں کیوں داخل نہیں کیا۔ آپؒ نے ان کی تسلّی کی اور فرمایا کہ تُم کو بخار آتا ہے، اس لیے ہم نے تُمھارا نام نہیں لکھایا۔ اُنھوں نے کہا: "حضرت، آج کافروں سے پہلا مقابلہ ہے گویا آج سے جہاد فی سبیل اللہ کی بنا قائم ہوتی ہے۔ مَیں ایسا سخت بیمار نہیں ہُوں کہ جا نہ سکوں۔

۵ میرا نام آپ مجاہدین میں ضرور داخل فرمائیں۔"

آپؒ نے اُن کا نام بھی فرد میں لکھایا اور کہا: "بارک اللہ وجزاک اللہ۔ اللہ تعالیٰ تُم کو دین کی کوشش کی زیادہ توفیق عنایت کریں۔"

مجاہدین کی روانگی ۲۰ جُمادَی الاُولیٰ ۱۲۴۲ھ کو نمازِ مغرب کے بعد آپؒ نے اللہ بخش خاں صاحب[1] جمعدار کو بُلایا اور لڑائی کے چند قانُون، جو آپؒ نے اس وقت مُناسب جانے، اُن کو تعلیم فرمائے اور کہا: "ہم

۱۰ نے تُم کو اس چھاپے کی جماعت کا امیر کیا۔ تُم اس وقت کُچھ لوگ لے کر دریا کے پار اس کنارے پر ٹھیرو۔ جب اور لوگ یہاں سے جا کر تُمھارے پاس جمع ہوں، تب سب صاحبوں سے کہہ دینا کہ گیارہ گیارہ بار سورۂ "لِاِیْلٰفِ" پڑھ لیں، پھر وہاں سے کُوچ کرنا۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔"

خاں ممدُوح چند آدمی ساتھ لے کر کشتی پر سوار ہو کر دریا کے پار گئے اور وہاں ٹھیر کر باقی لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں لشکر میں سیّد صاحبؒ نے نمازِ عشا کے بعد جن کے نام فرد میں تھے، اُن کو بُلایا

۱۵ اور فرمایا: "بھائیو! یہاں سے وُہ مکان، جہاں جانا ہو گا، چھ سات کوس ہے۔ جس کو اتنی دُور جانے اور پھر آنے کی بخُوبی طاقت ہو، وُہ تو جائے اور نہیں، تو نہ جائے اور جس کو بیماری وغیرہ کا کُچھ اور عذر ہو، وُہ بھی بیان کر دے۔ ہم اُس کے عوض کسی اور کو بھیجیں۔" وہاں جو حاضر تھے، وُہ تو سب جانے ہی کی نیّت سے آئے تھے اور ہر کسی کو یہی اشتیاق تھا کہ ہم جائیں، اگرچہ کُچھ عُذر بھی تھا، مگر جب آپؒ نے اپنی زبان سے یُوں فرمایا، تب اُن میں سے دو چار آدمیوں نے اپنی اپنی ناطاقتی وغیرہ کا عُذرِ

۲۰ معقُول بیان کیا۔ آپؒ نے اُن کے عوض دُوسروں کو شامل کر دیا۔

---

(۱) یہ اللہ بخش مورانوی کے وہی سپاہی ہیں جن کو دیکھ کر سیّد صاحبؒ بہت خوش ہوئے تھے اور بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے کام کے ہیں، پیرزادے ہمارے کام کے نہیں، اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے بہت کام لے گا۔

پھر آپؒ ہندوستانی و قندھاری اور مُلکی لوگوں میں سے تقریباً نو سو آدمیوں کو لے کر دریا کے کنارے تشریف لے گئے۔ آدمیوں کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سو چھتیس[۱۳۶] یا کچھ کم و بیش ہندوستانی تھے اور اسّی کے قریب قندھاری تھے اور باقی مُلکی لوگ تھے۔

اس عرصے میں اللہ بخش خاں صاحب بھی چند آدمیوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہو کر آپؒ سے ملنے اور رُخصت ہونے کو اس پار اُتر آئے۔ آپؒ نے لوگوں سے فرمایا کہ ہم جنابِ الٰہی میں دُعا کرتے ہیں، تم سب مل کر آمین کہو۔ پھر آپؒ سر کھول کر دُعا میں مشغول ہُوئے کہ: "اے پروردگار، قادرِ بے نیاز اور اے کریم کارساز، بندہ نواز، یہ تیرے بندے محض عاجز و خاکسار، ضعیف و ناچار ہیں۔ تیری ہی مدد کے اُمیدوار ہیں۔ تیرے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں۔ یہ صرف تیری ہی رضامندی اور خوشنودی کو جاتے ہیں، تُو ہی اُن کی مدد کر۔" اسی طرح کے الفاظ اپنی زبانِ مُبارک سے دیر تک فرمایا کیے۔

روانگی کا منظر دُعا کے بعد سب لوگ آپس میں ملے اور ایک دُوسرے سے اپنا کہا سُنا معاف کرایا اور کہا: "اگر اللہ تعالٰی زندہ سلامت لائے گا، تو پھر ہم تُم ملیں گے اور جو وہاں شہید ہو گئے، تو پھر اِنشاء اللہ تعالٰی ہماری مُلاقات جنّت میں ہوگی۔"

پھر ہر شخص سیّد صاحبؒ سے دست بوس ہو کر کشتی پر سوار ہُوا۔ اس وقت وہاں تین کشتیاں تھیں۔ تین تین پھیروں میں سب لوگ پار اُتر گئے اور سُورۂ "لِاِیْلٰفِ" گیارہ گیارہ بار پڑھ کر اکوڑے کی طرف روانہ ہُوئے۔

یہ سب مُجاہدین جاتے جاتے فوجِ مُخالفین کے ورے پاؤ کوس کے فاصلے پر ایک نالے پر ٹھیرے۔ وہاں امیرِ جماعت اللہ بخش خاں صاحب سے مولوی امیرالدین صاحب ولایتی نے مشورۃً کہا: "یہ مُلکی لوگ، جو ہمارے ساتھ ہیں، اگر اُن کو آگے کریں، تو ہمیں اُن پر بھروسہ نہیں، شاید وقت پر طرح دے جائیں اور اگر اپنے لوگوں کو آگے کریں، تو وہ یہاں کے راہ گھاٹ سے ناواقف ہیں۔ کیا تدبیر کرنی چاہیے؟" پھر آخر کو یہ صلاح ٹھیری کہ خدا پر توکّل کر کے اپنے ہی لوگوں کو آگے کیا جائے، مگر مُلکی لوگوں میں سے ایک شخص کو، جو وہاں کے حال سے واقف تھا، آگے بھیجا کہ جا کر لشکرِ مُخالف کی خبر لائے کہ کس طرف

لشکر کے لوگ غافل ہیں اور کس طرف ہوشیار۔

سکھوں کے لشکر کا معمول تھا کہ جہاں کہیں اُترتے، لشکر کے گرد خاردار درخت کاٹ کر سنگر بنا لیتے تھے کہ یکایک کسی غنیم کی فوج نہ آپڑے۔ کچھ دیر میں وہ آدمی وہاں کی خبر لایا اور کہا کہ فلاں طرف لوگ غافل ہیں اور لوگوں کو لے جا کر اُن کے سنگر کے قریب کھڑا کر دیا۔

۵ **راہِ خدا کا پہلا شہید** اس وقت لشکرِ کفّار میں گھڑیالی نے تین پہر پر تین گھڑیاں بجائیں۔ ادھر سے بآوازِ بلند اللہ اکبر! اللہ اکبر! کہہ کر سب مجاہدین سکھوں کی فوج میں گھس پڑے۔ اس عرصے میں اُدھر کے ایک پہرے والے نے بندوق ماری۔ قضائے الٰہی سے وہ گولی شیخ باقر علی صاحب کے لگی وہ وہیں جگہ بیٹھ گئے اور کہا: "کوئی بھائی میرے پاس کے ہتھیار لے لے۔ یہ اللہ کا مال ہے۔ میرا کام تو ہوگیا، مگر ارمان دل میں باقی رہا"۔

۱۰ **مجاہدین کی شجاعت** مجاہدین میں جو لوگ دلاور و جرّار و کار آزمودہ تھے، وہ دس دس، پانچ پانچ سکھوں کے ہر خیمے کی طرف جھکے اور اُن کی طنابیں کاٹ کاٹ کر گرانے لگے اور نو تعلیم مُجاہدین سے کہا کہ تم ان خیموں کے آدمیوں کی خبر لیتے جاؤ۔ یہ لوگ تو اُن کی مار کوٹ میں مشغول ہوئے اور مُلکی لوگ لوٹنے پر جھکے۔ کسی نے گھوڑی لی، کسی نے ہتھیار لیے، کسی نے کپڑے وغیرہ لیے اور اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ یہاں مُجاہدین میں سے کسی نے چار آدمی مارے، کسی نے دس، کسی نے زیادہ۔ عبدالمجید خاں بریلوی نے چودہ پندرہ آدمیوں کے قریب مارے۔ اس عرصے میں اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیر الدین صاحب دو تلواریں باندھتے تھے۔

۱۵ اپنی ایک تلوار خاں صاحب کو دی۔ اس تلوار سے بھی کئی سکھ مارے۔

عبداللہ بسم اللہ نام ایک مخنّث تھا۔ اُس کے پاس برچھی تھی۔ اُس نے سات یا آٹھ آدمی برچھی سے مارے۔ اسی طرح اللہ بخش خاں اور شمشیر خاں جمعدار اور غلام رسُول خاں اور غلام حیدر خاں اور شیخ ہمدانی اور علی حسن، شیخ بدھن، شیخ رمضانی، مرزا ہمایوں بیگ اور بہت صاحبوں نے دُشمن کے آدمی

۲۰ مارے اور جوانمردی اور شجاعت کی داد دی۔ بقیۃُ السّیف شکستِ فاش کھا کر بھاگنے لگے۔ جس نے جس طرف موقع پایا، اپنی تلوار بندوق لے کر فرار ہو گیا۔ دس دس، پانچ پانچ مُجاہدین اُن کے ڈیروں
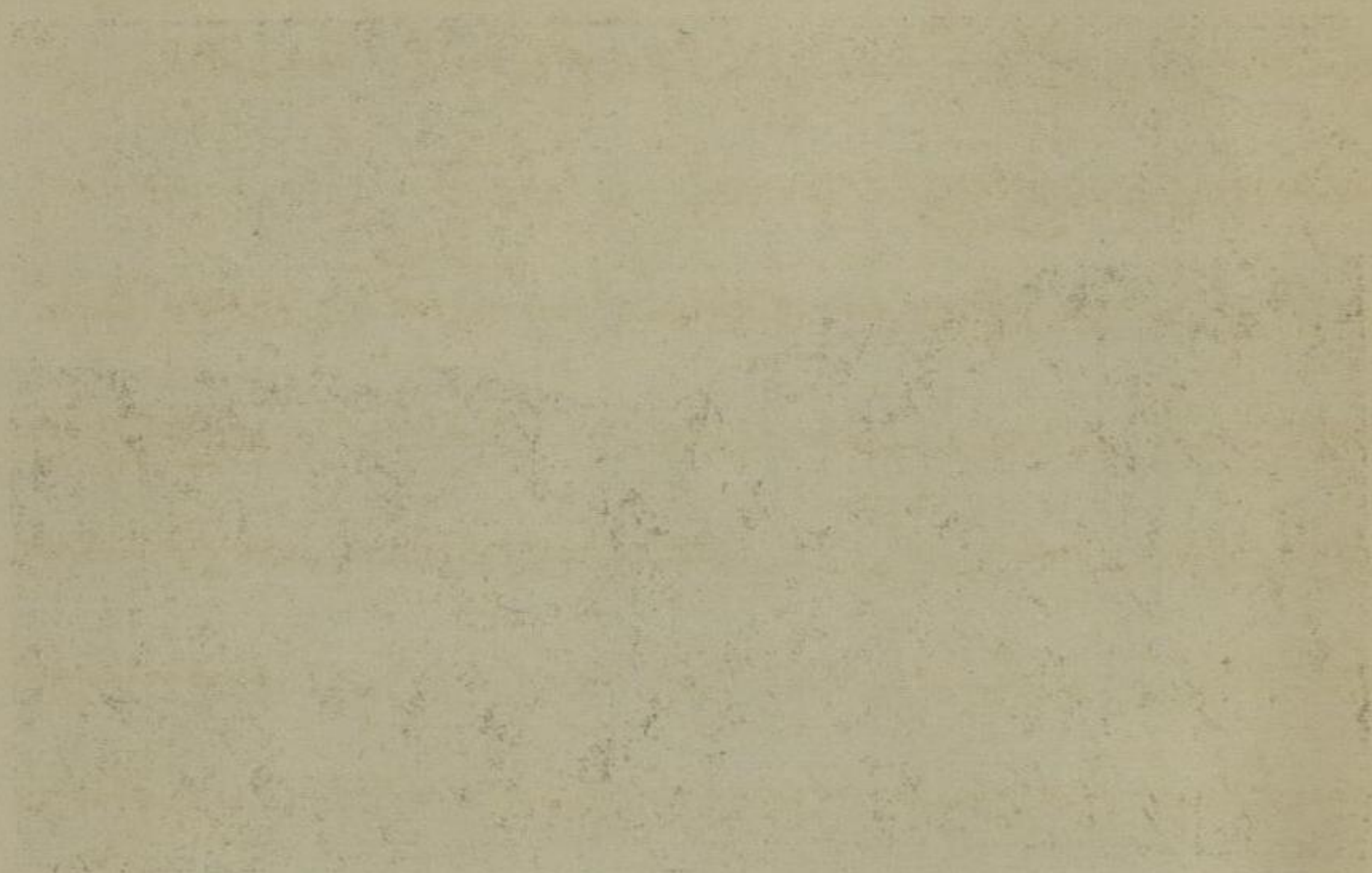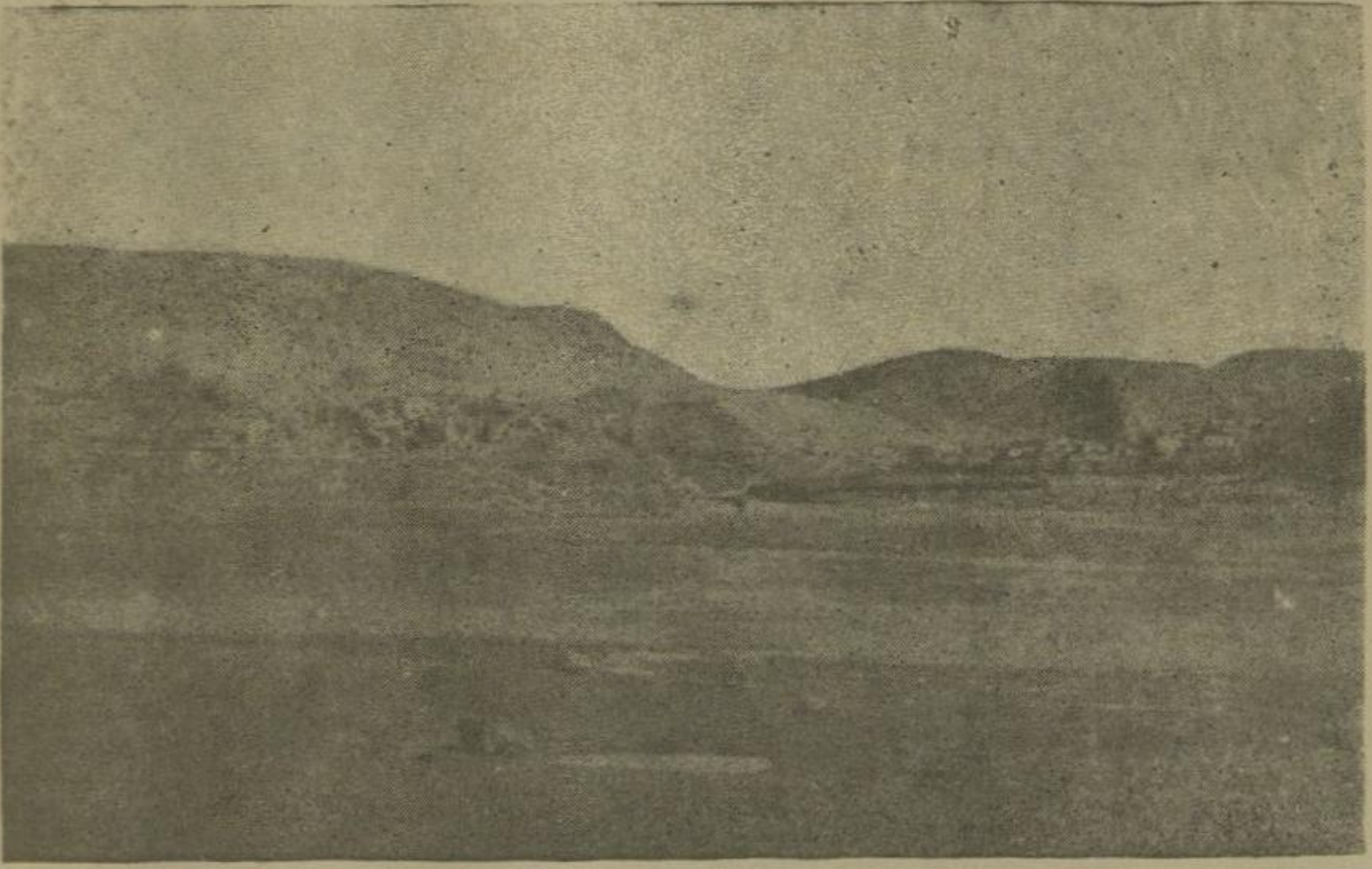
دریائے کابل کو عبور کر کے مجاہدین اکوڑہ کے میدان میں آئے

بستی اکوڑہ ، جہاں مجاہدین نے پہلی جنگ کی

خیموں کی طرف متفرق ہو گئے۔

اس عرصے میں چند مجاہدوں نے اُن کے توپخانے پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں توپخانے کے ایک خلاصی یا گولہ انداز نے رن مہتاب کو آگ دی اور اُس کی ڈور کھینچ کر اُسے بلند کیا اور آپ وہاں سے ایک طرف بھاگ گیا۔ اُس وقت روشنی سے گویا تمام لشکر میں دن ہو گیا۔ اُس وقت تک مجاہدین میں گنتی کے کوئی دس پندرہ آدمی زخمی اور شہید ہوئے ہوں گے۔ بدھ سنگھ اس رات اکوڑے میں تھا۔ لشکر میں فقط اس کا خیمہ کھڑا تھا۔ ایک طرف لشکر کے باہر ان بھاگتے ہوئے سکھوں نے ایک چھوٹا سا نقارہ بجایا اور اس روشنی میں دیکھا کہ مجاہدین تھوڑے ہیں، کہیں کہیں دس دس، پانچ پانچ نظر آتے ہیں۔ وہ بندوقیں لے کر یکبارگی حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین بھی جابجا سے سمٹ کر ایک جانب کو ہو گئے اور دونوں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ مجاہدین کی طرف سے کسی نے آواز دی کہ اب یہاں سے نکل چلو۔ لوگوں نے نکلنے کا ارادہ کیا۔ فتح علی عظیم آبادی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے دیکھا کہ اللہ بخش خاں، جو ہم لوگوں کے امیر تھے، چند آدمیوں کو اپنے ہمراہ لیے باہر نکلنے کے ارادے سے چلے آتے ہیں اور اُن کے پیچھے سکھ ہلّہ کرتے آتے ہیں۔ اُس وقت شیخ ہمدانی اور علی حسن قواعد کے ساتھ بھرماری کی بندوقیں چلا رہے تھے۔ اُس وقت ہماری طرف ایک ایک، دو دو شہید اور زخمی ہونے لگے۔ چنانچہ سید رستم علی صاحب بھی اسی جگہ زخمی ہوئے۔ اس عرصے میں اللہ بخش خاں امیر، شیخ ہمدانی اور علی حسن کے برابر پہنچے کہ لشکر سے باہر نکلیں۔ تب اُنھوں نے آواز دی: "اللہ بخش خاں صاحب، تم کو تو حضرت نے سردار کر کے بھیجا تھا۔ اب تم اس وقت کفّار کے مقابلے سے نکلے جاتے ہو!" یہ بات سن کر اللہ بخش خاں صاحب اپنے ہمراہیوں کو لے کر کافروں کے مقابلے کو چلے۔ ان کو دیکھ کر اور لوگ بھی پھرے اور ان میں شریک ہو گئے۔ سب ملا کر کوئی پچاس ساٹھ غازی ہوں گے۔ وہ بندوقیں مارنے لگے۔ جب سکھ اور نزدیک آ گئے، تب قرابین اور شہر بچے سر کرنے لگے۔ پھر آخر کو تلواروں کی نوبت آئی، یہاں تک کہ تلواروں کے مارے اُن کا ہلّہ ہٹا دیا۔ اللہ بخش خاں صاحب اور اُن کے اکثر ہمراہی اس ہلّے میں شہید ہو گئے اور بہت غازی زخمی بھی ہوئے۔

لشکر کی مراجعت | یہ حال دیکھ کر اکثر لوگوں نے، جو باقی رہ گئے تھے، قصد کیا کہ ہم بھی جاکر اُنھیں میں شامل ہوں۔ تب اکبر خاں صاحب نے، جو بڑے دلاور اور جہاں دیدہ آدمی تھے، لوگوں کو روکا اور کہا: "بھائیو، کیا آج ہی لڑنا ہے؟ اب یہاں سے چلو۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ پھر کافروں کو ماریں گے" اور سب کو سمجھا کر پھیر لائے۔

اس وقت صُبحِ صادق خُوب نمُودار ہو گئی تھی۔ وہاں سے دریا بہت ہی نزدیک تھا۔ کوئی کوئی
5 لوگ، جو آگے نکل گئے تھے، اُن میں سے کسی نے جاکر دریا پر اذان کہی، جس سے پیچھے والوں کو معلوم ہُوا کہ ہمارے کچھ لوگ آگے پہنچ گئے۔

پھر لوگوں نے لشکر سے نکل کر اِنتظام کے ساتھ راستہ لیا اور مخالفین میں سے کسی نے اُن کا تعاقب نہیں کیا۔ وہاں سے کوس بھر پر تیمم کر کے نمازِ فجر پڑھی۔ نماز کے بعد وہاں سے چلے اور اسی گھاٹ پر آئے، جہاں سے اُترے تھے۔ سید صاحبؒ بہت سے لوگوں کے ساتھ دریا پر کھڑے تھے۔ آپؒ نے
10 کچھ لوگوں کو مجاہدین کی تقویت کے لیے بھیجا کہ ایسا نہ ہو، سکھوں نے تعاقب کیا ہو۔ یہ لوگ باقی ہمراہیوں کے اِنتظار میں عصر تک اسی پار رہے۔ جب پیچھے کے اکثر لوگ دو دو، چار چار کر کے آگئے، تب سب کشتی پر سوار ہو کر اُترے اور پہر رات گئے تک اکثر لوگ دریا میں اُتر کر لشکر میں داخل ہُوئے اور سیّد صاحبؒ سے مُصافحہ کیا اور مُلاقات کی۔ آپؒ نے شہدا کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ لوگ ایک ایک، دو دو کر کے صُبح تک آیا کیے۔ زخمیوں کا مُعالجہ اور مرہم پٹّی ہُوئی۔ ڈیرے ڈیرے جہاں سے لوگ گئے تھے،
15 اُن کا شُمار کیا گیا۔ معلُوم ہُوا کہ ہندوستانیوں سے کوئی چھتیس آدمی شہید ہُوئے اور قندھاریوں سے کوئی چالیس پینتالیس اور دونوں میں سے کُل تیس چالیس آدمی زخمی ہُوئے۔ سکھوں کے سات سو آدمی مارے گئے۔

یہ واقعہ ۲۰ جُمادی الاُولیٰ ۱۲۴۲ھ (مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء) چہار شنبہ اور پنجشنبہ کی درمیانی شب کا ہے۔

جنگِ اکوڑہ کے شہدا | اِس جنگ کے شُہدا کے نام مع اُن کی وطنیت کے لکھے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اُن
20 کی سعادت اور شوقِ شہادت اُن کو کہاں کہاں سے کھینچ کر لایا تھا۔

شیخ باقر علی عظیم آبادی[1]، اللہ بخش خاں مورانوی[2] (ضلع اُناؤ) امیرِ سریہ، عبدالمجید خاں جہاں آبادی

رائے بریلوی، شمشیر خاں[۶] جمعدار مورانوی (ضلع اُناؤ)، شیخ بڈھن[۷]، شیخ رمضانی مورانوی (ضلع اُناؤ)، شیخ ہمدانی[۸] خالص پوری ملیح آبادی (ضلع لکھنؤ)، علی حسن[۹] گنگنوی (نزد مانکپور، ضلع پرتاپ گڈھ)، غلام حیدر خاں خالص پوری (ضلع لکھنؤ)، غلام رسول خاں[۱۰] خالص پوری، خدا بخش خاں[۱۱] (بمبئی)، شادل خاں[۱۲] نیر آبادی (اودھ)، کریم بخش خاں[۱۳] بڈھانوی (روہیلکھنڈ)، کریم بخش[۱۴] مسجد فتحپوری (دہلی)، میاں جی احسان اللہ[۱۵] بڈھانوی، شیخ معظم[۱۶] جگدیس پوری (ضلع پرتاپ گڈھ)، دین محمد[۱۷] کورہرستانوی[(۱)] جیسواڑہ (اودھ) ۵

عباد اللہ[۱۸] (مئو، ضلع اعظم گڈھ)، قاضی طبیب[۱۹]، امام خاں[۲۰] خیر آبادی، اولاد علی[۲۱] مادھوی، ہمایوں بیگ[۲۲] لکھنوی، امام الدین خاں[۲۳] رامپوری، سید محمد[۲۴] لہاروی (ضلع مظفر نگر)، محمد کمال[۲۵] خرم پوری، فہیم خاں[۲۶] حسین پوری (ضلع مظفر نگر)، سید عبدالرحمٰن[۲۷] شیاملی (ضلع مظفر نگر)، شیخ مخدوم[۲۸] مسجد فتحپوری (دہلی)، غلام نبی خاں[۲۹] گوالیاری، عبدالرزاق[۳۰] دیوبندی، جواہر خاں[۳۱] لکھنوی، منور خاں[۳۲] ملیح آبادی (اودھ)، عبدالجبار[۳۳] مورانوی، سید عبدالرحمٰن[۳۴] سندھی، حسن خاں[۳۵] سندھی، اکبر خاں[۳۶] خالص پوری (اودھ)۔ ۱۰

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مؤمن کا یقین مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے سید صاحبؒ سے کہا: "یہاں جو واقعہ گزرا ہے، اس کا حال ہندوستان لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟" فرمایا: "بہتر ہے۔" مولانا نے پوچھا: "جو لوگ شہید ہوئے ہیں، ان سب کے نام بھی خط میں لکھے جائیں یا یوں ہی مجمل تذکرہ کر دیا جائے؟" آپؒ ۱۵ نے کچھ دیر سکوت کیا۔ پھر فرمایا: "یوں لکھ دیجیے کہ عنایتِ الٰہی سے ہم سب لوگ یہاں خوشحال ہیں۔" مولانا نے کہا: "حضرت، میں آپؒ کے کلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ ذرا تفصیل فرمائیں۔" آپؒ نے فرمایا: "مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہاں زندہ موجود ہیں، یہ بھی خوشحال ہیں اور جو شہید ہوئے اور اپنی مراد کو پہنچے، وہ سب ہم سے زیادہ خوشحال ہیں۔"

اوڑے کی جنگ کا اثر اس جنگ کا اثر مسلمانوں اور مخالفین پر خاطر خواہ ہوا۔ مسلمانوں کے دل بڑھ ۲۰

---

(۱) کورہرستاؤں ضلع رائے بریلی میں ہے۔

گئے اور حوصلے بلند ہوئے۔ دربارِ لاہور کی بھی آنکھیں کھلیں۔ ملکی سردار جوق جوق آ کر مبارکباد دینے لگے۔

سردار بدھ سنگھ نے اس ہزیمت کے بعد موضع شیدو سے جہاں وہ اکوڑے کے بعد مقیم تھا، پیچھے ہٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن اٹک کا قلعہ دار یہ خبر سن کر مانع ہوا کہ اس وقت یہاں سے پیچھے ہٹنا مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں گے، تو مجاہدین کا لشکر خیر آباد اور اٹک کو تباہ ۵ کر دے گا۔ یہ سن کر بدھ سنگھ نے موضع شیدو میں لشکر کے گرد سنگر باندھنے کا سامان جمع کیا۔ امیر خاں سے یہ سن کر سید صاحب نے صبح کو نوشہرے سے کوچ فرمایا اور جو لوگ وہاں زخمی تھے، ان کی خدمت اور خبرگیری کے واسطے دو صاحبوں (عبدالقیوم اور سید امانت علی) کو چھوڑا اور اس روز تمام لشکر کے ساتھ مصری بھانڈے میں مقام کیا۔ دوسری منزل موضع تورڈھیر میں کی۔

چوبیسواں باب

حضرو کا چھاپہ[1]

اس وقت اہلِ سرحد کو سید صاحبؒ کی جماعت کی قوت اور جنگی صلاحیت کا کوئی اندازہ نہ تھا
لاہور کی منظم حکومت کے مقابلے میں وہ اس بے سر و سامان قافلے سے کوئی بلند توقعات نہیں رکھتے تھے،
لیکن اکوڑے کے شبخون اور اس میں مجاہدین کی جانبازی و مردانگی کے جوہر دیکھ کر سب کو اس کا احساس ہوا کہ یہ ۵
سرفروش مجاہدین کی ایک جماعت ہے، جس میں عزم اور نظم دونوں جوہر پائے جاتے ہیں اور سرحد کے اُن
مجاہدین میں، جو وقتاً فوقتاً "غزا" کے نام سے جمع ہو جایا کرتے تھے، ان دونوں کا امتزاج و اجتماع بہت کم
پایا جاتا تھا۔ خود سکھوں کو بھی ایسے سر بکف اور جانباز مجاہدین سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مشہور تھا کہ "سکھاں
ایں چنیں مقابلان دیدہ و شنیدہ نہ شدہ"۔ اطراف و جوانب میں بھی اس واقعے سے مجاہدین کی دھاک بیٹھ
گئی اور ہر طرف سے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ایک مکتوب میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "بہ ظہورِ ایں واقعہ ۱۰
مسلمینِ ایں دیار فراہم شدن شروع کردند"۔

جن ملکی سرداروں کو اس واقعے نے خاص طور پر متوجہ کیا اور اُن کے دل میں سید صاحبؒ کے پاس
آنے اور آپؒ سے اشتراکِ عمل کرنے کی تحریک پیدا کی، اُن میں سردار خادے خاں[2] رئیسِ ہنڈ[3] خاص طور پر

---

(۱) یہ چھاپہ نہ تو سید صاحبؒ کے ایما اور حکم سے ہوا تھا، نہ جماعتِ مجاہدین کی اس میں باضابطہ شرکت تھی۔ قندھاریوں میں سے صرف تیس چالیس اشخاص اپنی خواہش اور آپؒ کی اجازت سے شریک ہو گئے تھے۔ اس کا تذکرہ ضمنی طور پر سیرت میں آنا چاہیے۔ اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے انعقادِ بیعتِ امامت اور جماعت کی تنظیم کے خیال کو تقویت ہوئی اور اس کے بعد سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر باقاعدہ بیعتِ امامت کی گئی تاکہ تمام امورِ شرعی طریقے پر انجام دیے جا سکیں۔ (۲) اصل نام شادی خاں تھا، پشتو میں اکثر "ش" کو "خ" سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ (۳) ہنڈ بہت پرانا اور اہم مقام ہے۔ پہلے زمانے میں اسے اُنڈ اور ویہنڈ بھی کہتے تھے۔ مشہور چینی عالم و سیاح ہیون تسانگ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ سکندر نے اسی جگہ سے اٹک کو عبور کیا تھا۔ اکبر نے اس جگہ ایک مضبوط قلعہ بنا دیا تھا، جو اب تک باقی ہے۔ یہ اٹک سے سترہ میل مشرق میں دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے (سید احمد شہیدؒ)۔

قابلِ ذکر ہے، جو اِس نواح کا ایک نامی گرامی سردار اور اِس علاقے کا ایک طاقتور رئیس اور خان تھا، وہ چالیس پچاس سواروں کے ساتھ مُلاقات کے لیے آیا، خلوت میں آپؒ سے کچھ مشورہ کیا اور وہیں آپؒ سے بیعت کی اور کہا: "آپ کو اس بستی میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں سے آپ میرے پاس چل کر ٹھیریں۔ وہاں ہر ایک چیز کا آرام ہے۔" چونکہ ہنڈ میں ایک مضبوط قلعہ موجود تھا، وہاں کا سردار اصرار سے دعوت دے رہا تھا اور نصرت و رفاقت کا وعدہ کرتا تھا اور چونکہ شروع ہی سے یہ بات سید صاحبؒ کے پیشِ نظر تھی کہ سرحدی خوانین اور سرداروں کی رفاقت و تعاون سے جہاد کا کام انجام دینا ہے، اس لیے آپؒ کو اس پیشکش کے منظور کرنے میں کوئی عُذر نہیں ہو سکتا تھا۔ آپؒ نے اس کی دعوت منظور فرمائی۔ صبح سردار خادے خاں آپؒ کو تمام لشکر کے ساتھ لے گیا اور موضع بازار میں جو ہنڈ کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر لبِ دریا واقع تھا، آپؒ کا قیام تجویز کیا۔

سید صاحبؒ کی آمد کی اطلاع سُن کر اطراف و جوانب کے سردار و خوانین مُلاقات کے واسطے حاضر ہوئے۔ کچھ کم یا زیادہ پانچ ہزار آدمیوں کی جمعیت ہو گی۔

حضرو پر چھاپہ ان سرداروں اور خوانین نے سید صاحبؒ سے عرض کی کہ یہاں سے ڈھائی تین کوس دریائے اباسین کے پار ایک بستی حضرو[1] سِکھوں کی عملداری میں ہے اور وہ بڑی منڈی ہے۔ لاکھوں روپے کا مال و اسباب وہاں ہے۔ اس بستی کے کنارے ایک چھوٹی سی گڑھی بھی ہے۔ اس میں ایک توپ بھی ہے۔ اگر آپ وہاں چھاپہ بھیجیں، تو بہت مالِ غنیمت ہاتھ لگے گا۔

سید صاحبؒ نے اخوند ظہور اللہ صاحب سے فرمایا: "اُن کی زبان پشتو ہے۔ تم ہماری طرف سے کہو کہ ہمارے بہت غازی اکوڑے میں شہید ہوئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ باقی یہاں ہمارے پاس تھوڑے لوگ ہیں اور یہ آپ کے مُلک کی راہ و رسم سے واقف بھی نہیں۔ آپ کے ہمراہ بہت لوگ ہیں اور یہاں کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ اگر آپ اس بات کا ارادہ کریں، تو ہو سکتا ہے۔"

اخوند صاحب نے آپؒ کی طرف سے ترجمانی کی، تو ان سرداروں نے عرض کیا کہ: "ہماری طرف سے

(۱) حضرو علاقۂ چھچھ ضلع کیمبل پور کا مشہور مقام ہے اور دریائے اباسین (سندھ) سے تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔

حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ ہم فقط آپ کی اجازت ہی کے منتظر تھے۔ اب آپ ہمارے حق میں دُعا کریں۔ ہم یہ معاملہ سمجھ لیں گے"۔

یہ گفتگو سُن کر ہندوستانی لوگ خاموش رہے کہ حضرتؒ کے دل میں ہم کو بھیجنے کی صلاح نہیں ہے، مگر قندھاریوں میں تیس چالیس شخصوں نے سید صاحبؒ سے اجازت چاہی کہ ہم کو حکم ہو، تو ہم جائیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ خیر، بہتر، تم کو اجازت ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہاں جو لوگ مُسلمان ہوں، اُن کو کسی طور کا صدمہ نہ پہنچے، اس لیے کہ اُن کو ابھی جہاد کی دعوت نہیں پہنچی، لیکن اُن میں جو ہتھیار لے کر تُمہارا مقابلہ کرے، اُس کو مارنے کا تُم کو اختیار ہے"۔

رات گئے لوگ کشتیوں، جالوں[1] اور شناسوں[2] پر سوار ہو کر اباسین کے پار اُترے اور آدھی رات کے قریب سب اُتر کر روانہ ہوئے اور جا کر اپنا کام کیا۔ صُبح کو سید صاحبؒ نمازِ فجر کا سلام پھیر کر بیٹھے تھے کہ ان چھاپے والوں میں سے ایک شخص ایک بہت عُمدہ گھوڑا لے کر آیا اور سید صاحبؒ سے کہا "مُبارک ہو، غازیوں نے حضرو کو لے لیا اور آپؒ کے قندھاریوں نے گڑھی پر قبضہ کر لیا۔ یہ گھوڑا آپؒ کی نذر ہے۔"

وہ یہی باتیں کر رہا تھا اور آپؒ خاموش بیٹھے سُنتے تھے کہ کسی نے کہا کہ وہ دیکھو، دریا کے پار تمام چھاپے والے غازی چلے آتے ہیں۔ یہ بات سُن کر لشکر کے تمام لوگ اور جو وہاں تھے، اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ ابھی سُورج نہیں نکلا تھا۔ جب لوگ اور قریب آئے اور خُوب اُجالا ہو گیا، تو دیکھا کہ تمام مُلکی لوگ مال و اسباب کی گٹھڑیاں اپنے اپنے سر پر رکھے سب کے آگے آگے چلے آتے ہیں اور اُن کے پیچھے قندھاری سکھوں کے چودہ پندرہ سوار جنھوں نے وہاں سے اُن کا تعاقب کیا تھا، اُن کو بندوقیں مارتے چلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک نالے کو آ پکڑا اور اُن سواروں کو گولیاں مار مار کر وہیں روکا۔ یہ مُلکی لوگ مالِ غنیمت لیے ہوئے اباسین کے کنارے پہنچے۔ کچھ لوگ شناسوں پر اُترنے لگے اور کوئی گھاس کے گٹھوں پر۔ باوجودیکہ یہ مُلکی لوگ مسلح تھے، اُن قندھاریوں کے سوا اُن میں سے کسی نے سکھوں کا مقابلہ نہ کیا

(۱) اہلِ سرحد بڑے ڈکرے کو چمڑے سے منڈھ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے پانی اندر نہیں آسکتا۔ اس سے وہ دریا عبور کرتے ہیں اور اس کو جالہ کہتے ہیں۔ (۲) شناس مشکیزے کو کہتے ہیں۔

اور اکثر بدحواسی کے مارے دریا میں اُترتے اُترتے مال و اسباب سمیت ڈوب گئے۔

یہ حال دیکھ کر آپؒ نے سردار خادے خاں سے کہا کہ جلد اپنے لوگ ہمارے سید انور شاہ کے ہمراہ کر کے قندھاریوں کی مدد کو بھیجو اور اپنے سب ہندوستانیوں سے فرمایا کہ اس وقت تم مسلّح ہو کر ہمارے پاس تیار رہو۔ یہ حکم ہندوستانیوں میں سے حیات خاں بریلوی، شیخ برکت اللہ بنگالی، شیخ فیض الدین بنگالی، محمد صلاح سندھی اور نظام الدین اولیا کو نہیں پہنچا۔ نادانستہ وہ بھی خادے خاں کے آدمیوں کے ساتھ چلے گئے۔ اس عرصے میں سکھوں کی مدد کے لیے جابجا سے چار پانچ سو آدمی آگئے۔ سید انور شاہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ سکھوں کے مقابلے میں قندھاریوں کے ساتھ شریک ہوئے اور حیات خاں بریلوی وغیرہ پانچوں اشخاص آگے بڑھ کر قواعد کے ساتھ بندوقیں چلانے لگے اور ایسی شجاعت اور جواں‌مردی سے مقابلہ اور حملہ کیا کہ وہ چار پانچ سو سکھ شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔ مجاہدین دریا پار سے یہ حال دیکھ رہے تھے جب پیادہ اور سوار سکھ مقابلے سے بھاگے، تو سید صاحبؒ نے سردار خادے خاں سے کہا کہ اب جلد لوگوں کو کشتیوں پر اُتارنا شروع کراؤ۔ گھاٹ پر تین کشتیاں تھیں۔ خادے خاں نے ان پر اپنے نوکر چاکروں کا بندوبست کر کے اُتروانا شروع کیا۔ ایک کشتی پر بہت لوگ سوار ہو گئے۔ وہ کنارے ہی پر بیٹھ گئی۔ چند آدمی بھی ڈوب گئے۔ دو کشتیاں اس پار سلامت آئیں۔ ان میں چند زخمی اور باقی ملکی مالِ غنیمت لیے ہوئے تھے۔ خادے خاں کے لوگوں نے اُن سے مالِ غنیمت لے کر ایک جگہ جمع کیا۔ پانچ ہندوستانیوں میں سے شیخ برکت اللہ بنگالی اور حیات خاں شہید ہوئے۔ اُن کی لاشیں آئیں۔ شیخ فیض الدین بنگالی، محمد صلاح سندھی اور نظام الدین اولیا زخمی ہو کر آئے۔ جب کشتیوں کا دوسرا پھیرا آیا اور خادے خاں کے آدمی اُن کا اسباب لینے لگے، تو انھوں نے دینے سے انکار کر دیا اور لڑنے کو تیار ہو گئے۔ یہ معاملہ خادے خاں نے اپنی رائے سے کیا تھا۔ سید صاحبؒ کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ جب اس قصّے کی خبر سید صاحبؒ کو ملی کہ ملکی لوگ غنیمت کا سامان حوالے نہیں کرتے اور لڑنے کو تیار ہیں، تو آپؒ نے حاجی عبداللہ رامپوری اور اخوند ظہور اللہ ولایتی کو بھیجا کہ خادے خاں سے جا کر کہو کہ کسی سے مال و اسباب کے بارے میں تعرّض نہ کریں اور جس کا لیا ہو، اُس کے حوالے کر دیں، آپس میں فساد کرنا مناسب نہیں۔ خادے خاں نے اس پیغام پر کچھ مال حوالے

کر دیا اور کچھ دبا رکھا۔ عصر کے وقت تک سید انور شاہ بھی اپنے لوگوں کے ساتھ اس پار اُتر آئے۔

سردار بدھ سنگھ اور سید صاحبؒ کی خط و کتابت، مقاصدِ جنگ کی وضاحت

اکوڑے کے شبخون اور حضرو کے حملے کے بعد ۱۵ر جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ کو سردار بدھ سنگھ نے سید صاحبؒ کو حسبِ ذیل خط لکھا:۔

شرافت منزلت سیادت مرتبت، فضیلت پناہ، عبادت انتباہ، زبدۃ الفضلاء العظام، یگانۂ بلا اشتباہ، سید احمد جیو سلمہٗ۔ اظہر و ہویدا باد کہ باوجود چندیں مسافت دراز ملک ِ خود دست محض بنا بر ہنگامہ برپا ساختہ و لباسِ شہادت بر خود آراستہ اند، لازم بود کہ مقابلۂ جنگ در پیکار در میدان شدن بُود۔ اگر بطمعِ نفسانی شبخون و تاخت بر غربا و بیوپاریانِ شہرِ حضرو نمودند، سراسر ننگ جہان جاودانی گردید و معہذا بیچارگانِ ہمراہی چوں شیشہ سرِ سنگ زدہ معدوم شدند۔ الحال لازم کہ اگر اصلِ سیادت و کبیر اُمرا اند، مقابلِ صریح باشند، از مخفی روی سود جہانی و بہبودِ ملکِ جاودانی نیست و اگر فرار شوند، از نفعِ ہر دو جہانی خالی خواہند ماند۔ (مجموعۂ خطوط قلمی)

شرافت منزلت، سیادت مرتبت، فضیلت پناہ، عبادت انتباہ، زبدۃ الفضلاء العظام، یگانۂ بلا اشتباہ، سید احمد صاحب سلمہٗ۔ واضح ہو کہ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد اور اتنے دور دراز ملک سے آ کر آپ نے لڑائی کی طرح ڈالی اور لباسِ شہادت کو اپنے اوپر آراستہ کیا ہے، تو لازم تھا کہ جنگ و مقابلہ میدان میں نکل کر ہو۔ طمعِ نفسانی سے شہرِ حضرو کے غربا اور بیوپاریوں پر شبخون اور چھاپہ مارنا ذلت اور ہمیشہ کی بدنامی کی بات ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کے ہمراہی جس طرح شیشے کو پتھر سے مارا جائے، اسی طرح معدوم ہو گئے۔ اب بھی اگر آپ اصل سید اور بڑے سردار ہیں تو باہر نکل کر صاف صاف مقابلہ کیجیے۔ چھپ کر لڑنے سے دُنیا اور دین کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور اگر فرار اختیار کریں گے، تو دونوں جہان کے نفع سے خالی ہاتھ جائیں گے۔

سید صاحبؒ نے اس کا جو جواب دیا، وہ ذیل میں درج ہے[1]:۔

از امیر المؤمنین سید احمد بر ضمیرِ ابہت تخمیر،

امیر المؤمنین سید احمد کی طرف سے سپہ سالارِ

---

(۱) یہ خط ۱۵ر جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ہے، یعنی انعقادِ بیعتِ امامت (۱۲ر جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ) کے تیسرے روز لکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس میں پہلی مرتبہ "امیر المؤمنین" کا لقب آیا ہے۔ چونکہ اس خط و کتابت کا تعلق حضرو کے چھاپے سے ہے، اس لیے اس کا ذکر یہاں کر دیا گیا ہے۔

سپہ سالارِ جنود و عساکر، مالکِ خزائن و دفاتر،
جامعِ ریاست و سیاست، حاویِ امارت و ایالت
صاحبِ شمشیر و جنگ، عظمت نشان سردار بدھ سنگھ
ھَدَاہُ اللّٰہُ سَوَاءَ الطَّرِیْقِ وَأَمْطَرَ عَلَیْہِ
۵ سَحَابَ التَّوْفِیْقِ! پوشیدہ نماند کہ نامۂ فصاحت
شمامہ مشتمل بر اظہارِ مراتبِ دعاویِ شجاعت و
شہامت رسید، مضامینِ مندرجہ واضح گردید۔
ظاہراً آنچہ ایں جانب را ازیں ہنگامہ آرائی و معرکہ
پیرائی مقصود است آں را خوب نہ فہمیدہ اند
۱۰ کہ نامۂ مذکورہ نگارش نمودہ اند۔ الحال بگوش ہوش
شنید و خلاصۂ آں بغور تمام باید فہمید کہ منازعت
با اہلِ حکومت و ریاست بنا بر اغراضِ متعددہ
می باشد: بعضے را از منازعتِ مذکورہ حصولِ
مال و ریاست مقصود می باشد و بعضے را اظہارِ
۱۵ شجاعت و شہامت و بعضے را فقط تحصیلِ مرتبۂ
شہادت و ایں جانب را امرِ دیگر مقصود است و
آں فقط بجا آوردنِ حکمِ مولائے خود کہ مالکِ علیٰ
الاطلاق و ملک بالاستحقاق است کہ در مقدمۂ نصرت
دینِ محمدی وارد شدہ است، خدائے عز و جل گواہ
۲۰ است بر ایں معنی کہ ایں جانب را ازیں ہنگامہ آرائی
غیر از امرِ مذکورہ غرضِ دیگر از اغراضِ نفسانیہ

جنود و عساکر، مالکِ خزائن و دفاتر، جامعِ ریاست
و سیاست، حاویِ امارت و ایالت، صاحبِ شمشیر
و جنگ، عظمت نشان، سردار بدھ سنگھ کو (اللہ
اُس کو سیدھے راستے کی ہدایت دے اور اُس پر
توفیق کی بارش کرے) واضح ہو کہ آپ کا گرامی نامہ،
جو اظہارِ مراتبِ شجاعت و شہامت کے دعاوی پر
مشتمل ہے، پہنچا اور اُس کے مضمون سے آگاہی
ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی اور معرکہ
پیرائی سے جو مقصود ہے، آپ نے اُس کو اچھی طرح
نہیں سمجھا اور اسی لیے آپ نے اس طرح کا خط لکھا۔
اب کان لگا کر سُنیے اور غور کر کے سمجھیے کہ اہلِ حکومت
و ریاست سے لڑائی جھگڑا چند اغراض سے ہوتا ہے۔
بعض آدمیوں کا مقصود مال و ریاست کا حصول ہوتا
ہے، بعض کو محض اپنی شجاعت اور دلیری دکھانی ہوتی
ہے اور بعض آدمیوں کا مقصد شہادت کا مرتبہ حاصل
کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے میرا مقصد ہی دوسرا ہے؛
یعنی، فقط اپنے مولا کے حکم کی بجا آوری جو مالکِ مطلق
اور بادشاہِ برحق ہے۔ اس نے دینِ محمدی کی نصرت و اعانت
کے بارے میں جو حکم دیا ہے، محض اس کی تعمیل مقصود
ہے۔ خدائے عز و جل اس بات کا گواہ ہے کہ میرا اس
ہنگامہ آرائی سے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصود

در میان نیست، بلکہ آرزوے حصولِ آں ہم نہ گاہے
بر زبان جاری می گردد و نہ گاہے در دل می گزرد۔ پس
در نصرتِ دینِ محمدیؐ ہر سعی بہر وجہ کہ ممکن می باشد
بجا می آرم و ہر تدبیرے کہ درآں مفید می نماید، بروے
کار می آرم و ان شاء اللہ تا دمِ مرگ در ہمیں سعی مشغول
خواہم ماند و تمام عمر در ہمیں تدبیرات مبذول خواہم
کرد۔ تا زندہ ام، ہمیں راہ می پویم و تا موجودم ہمی مقصد
می جویم۔ تا سرو پا است، ہمیں راہ است و ہمیں سودا
خواہ مفلس شوم، خواہ غنی، خواہ منصبِ سلطنت
یابم، خواہ منصبِ رعیت گری، خواہ متہم بجبن شوم،
خواہ متسم بشجاعت، خواہ برتبۂ غزا فائز شوم، خواہ
بمنزلِ شہادت۔ آرے، اگر بینم رضاے مولاے
من در ہمیں منحصر است کہ در معرکۂ جنگ تنہا
بجانِ خود بیایم، پس باللہ و تاللہ کہ بصد جان
سینہ سپر نمایم، در مجامعِ عسکر بے دغدغہ و وسواس
در آیم۔ بالجملہ مرا با اظہارِ دعاویِ شجاعت و تحصیلِ
ریاست غرض نیست۔ علامتش ہمیں است کہ
اگر کسے از امراے کبار و رؤساے عالی مقدار
دینِ محمدی قبول نماید، فی الحال مردانگی او بصد
زبان اظہار نمایم و از دیادِ سلطنتِ او بہزار جان
می خواہم، بلکہ در بابِ ترقیِ ریاست و مساعی

نہیں اور اس میں کوئی نفسانی غرض ہرگز شامل نہیں،
بلکہ کسی نفسانی غرض کے حصول کی آرزو نہ کبھی زبان
پر آتی ہے، نہ کبھی دل میں گزرتی ہے۔ دینِ محمدیؐ کی نصرت
میں جو کوشش بھی ممکن ہوگی، بجا لاؤں گا اور جو تدبیر بھی
مفید ہوگی، عمل میں لاؤں گا اور ان شاء اللہ زندگی کی آخری
سانس تک اسی کوشش میں مشغول رہوں گا اور اپنی پوری
عمر اسی کام میں صرف کروں گا۔ جب تک زندہ ہوں اسی
راستے پر چلتا رہوں گا اور جب تک دم میں دم ہے اسی
کا دم بھرتا رہوں گا۔ جب تک ہاتھ پاؤں ہیں، اس وقت تک یہی
راستہ ہے اور جب تک سر ہے، اس وقت تک یہی سودا، خواہ
مفلس ہوں، خواہ دولتمند، خواہ منصبِ سلطنت سے سرفراز ہوں،
خواہ کسی کی رعیت بنوں، خواہ بزدلی کا الزام سہوں، خواہ بہادری
کی تعریف سنوں، خواہ میدانِ جہاد سے زندہ واپس آؤں، خواہ شہادت
سے سرخرو ہوں۔ ہاں اگر میں دیکھوں کہ میرے مولیٰ کی خوشی
اسی میں ہے کہ میدانِ جنگ میں تنہا سر بکف آؤں، تو خدا
کی قسم کہ سو جان سے سینہ سپر ہوں گا اور لشکر کے نرغے
میں بے کھٹکے گھس آؤں گا۔ مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت
کا اظہار مقصود ہے، نہ ریاست کا حصول۔ اس کی علامت
یہ ہے کہ اگر سربرآوردہ حکام اور عالی مرتبت سرداروں
میں سے کوئی شخص دینِ محمدیؐ قبول کر لے، تو میں اس کی
مردانگی کا سو زبان سے اعتراف و اظہار کروں گا اور ہزار جان

بے شمار می آرم۔ ایں امر را فی الحال امتحان کنند، اگر خلاف برآید الزام دہند۔ اگر بنظرِ انصاف غور نمایند، ایں جانب دریں مقدمہ اصلاً مطعون و ملام نیست، زیراکہ وقتیکہ آں عظمت نشان در مقدمۂ بجا آوردنِ احکامِ حاکمِ خود، ہیچ عذرے و حیلہ نمی توانند، دراں حالیکہ آں حکومت نشان از افرادِ انسان، بلکہ از جملہ برادرانِ ایشان است۔ پس ایں جانب در مقدمۂ بجا آوردنِ حکمِ احکم الحاکمین چہ گونہ عذر تواند، درآں حالیکہ آں جلیل الشان، خالقِ جمیع افرادِ انسان، بل مکوّنِ سائرِ اکوان است، وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔

تحریر بتاریخ پانزدہم شہر جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۴۲ھ[1]

سے اُس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا اور اُس کی حکومت کی ترقی کے لیے بیحد کوشش کروں گا۔ اس بات کا آپ فوراً امتحان کر سکتے ہیں۔ اگر اس کے خلاف ہو تو مجھے الزام دیجیے۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں، تو مجھے اس معاملے میں ہرگز قابلِ ملامت اور قابلِ الزام نہ پائیں گے، کیونکہ جب جناب اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں جو آپ جیسا ایک انسان، بلکہ آپ کی برادری کا ایک فرد ہے، کوئی عذر اور کوئی حیلہ نہیں کر سکتے، تو میں احکم الحاکمین کے حکم کی تعمیل میں، جو زمین و آسمان کے تمام افرادِ انسانی اور ساری کائنات کا خالق ہے، کیا عذر کر سکتا ہوں۔ والسلام علی من اتبع الھدٰی (سلام اُس پر جو ہدایت کا راستہ اختیار کرے)۔ مؤرخہ ۱۵ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۴۲ھ۔

موضع بازار سے آپ خادے خاں کی خواہش و اصرار پر ہنڈ منتقل ہوئے۔ قلعۂ ہنڈ کے جنوبی گوشے میں تالاب کے کنارے آپ کا خیمہ نصب ہوا اور تین مہینے آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ اس عرصے میں آپ نے خادے خاں، اشرف خاں اور فتح خاں پنجتاری کے درمیان صلح کرادی۔ اشرف خاں اور فتح خاں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور کہا کہ ہم جان و مال سے آپ کے شریک ہیں۔ سرداروں کی مصالحت کے بعد دور دور سے ان اطراف و جوانب کے علما جمع ہونے لگے۔

(۱) مجموعۂ خطوطِ قلمی

پچیسواں باب

بیعتِ امامت

بیعتِ امامت اکوڑے اور حضرو کے چھاپے کے واقعات سے صاف تجربہ ہو گیا کہ ملکی لوگ کسی نظام اور ضابطے کے پابند نہیں۔ جنگ کے موقع پر وہ فوراً لوٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور مالِ غنیمت شرعی اصول پر تقسیم نہیں ہونے پاتا۔ اس لیے علمائے لشکر کا بالاتفاق فیصلہ ہوا کہ سب سے زیادہ ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اپنا امام مقرر کر لیا جائے تاکہ اُس کی قیادت و امامت میں شرعی جہاد ہو، محض بلوہ اور لوٹ مار نہ ہو، منظم جنگ ہو، مالِ غنیمت کی شرعی تقسیم ہو، احکامِ شریعت و قوانین و حدودِ شرعیہ کا اجرا، قضاۃ و محتسبین کا تقرر و انتظام ہو اور جو نافرمانی کرے وہ باغی اور خارج از جماعت ہو۔ چنانچہ پنجشنبہ کے دن ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ کو بالاتفاق سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت و خلافت کیسی لی گئی۔ ۱۳ جمادی الآخرہ کو جمعے میں وہ سرے روز آپؒ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

یہاں پر ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے،[1] جس میں آپؒ نے ہندوستان کے اہلِ تعلق کو اکوڑے کی جنگ اور حضرو کے چھاپے کے واقعات اور بیعتِ امامت کی اطلاع دی ہے اور ان واقعات کو تحریر فرمایا ہے جو اس کے لیے محرک و موجب بنے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؏

از فقیر سید احمد بخدمتِ فضائل مآب مناقب اکتساب

بعد از سلامِ مسنون و دعائے اجابت مقرون	سلامِ مسنون و دعائے مقبول کے بعد واضح ہو کہ
واضح آنکہ الحمد للہ والمنۃ کہ فقیر مع جمیعِ رفقائے	اللہ کا شکر و احسان ہے کہ فقیر اپنے تمام رفقا کے ساتھ

---

(۱) یہ مکتوب نصیر آباد کے قلمی ذخیرے میں دستیاب ہوا۔ اس کی شانِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سید صاحبؒ کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

خود بشمولِ کفایتِ یزدانی و حمایتِ ربّانی بخیر و عافیت
تمام تا باضلاعِ یوسف زئی رسیدہ۔ چنانچہ اخبارِ کوچ و
مقامِ فقیر تا بلدۂ شکارپور بسمعِ مبارک رسیدہ باشد۔
بعد ازاں از راہِ بھاک و شال و درۂ ڈھاڈر بعافیت
گزر نمودہ بدر بلدۂ قندھار رسیدہ، ہفت روز مقام
کردہ عزمِ کابل نمودیم۔ اثنائے راہ مسلمینِ راسخین و
مؤمنینِ صادقین از امراء و ضعفاء، صغار و کبار بکمالِ
محبّت و وداد و اخلاص و اتحاد پیش آمدند۔ چوں
بدار السلطنتِ کابل رسیدیم، اہالیِ بلدۂ مذکور و اطراف
و جوانبِ آں از ساداتِ کرام و علمائے عظام و
مشائخِ ذوی الاحترام و رؤسائے عالی مقام و سائرِ خواص
و عوام بکمالِ وفورِ رغبت و غایتِ اظہارِ مودّت
ملاقات نمودند۔ درآں ایام فیما بین سردارانِ کابل
مقدمۂ جنگ و جدال پیش بود۔ فقیر بنا بر دفعِ منازعت
ایشاں سی و ہفت روز مقام نمودہ۔ آخر الامر چوں صورت
صلحِ ایشاں نہ بستہ، فقیر نہضت بسمتِ پشاور
نمودہ۔ در اثنائے راہ ہم مثلِ حالِ سابق، بل ازید
ازاں ازدحامِ مؤمنینِ مخلصین و اجتماعِ مسلمینِ صادقین
پیش آمدند۔ بعد ازاں ببلدۂ پشاور رسیدہ، با صغار
و کبارِ آنجا ملاقات نمودہ، دو سہ روز دراں مقام
اقامت نمودہ، بسمتِ موضعِ ہشت نگر آمدہ، چند

اللہ تعالیٰ کی حفاظت و حمایت سے خیر و عافیت کے ساتھ
اضلاعِ یوسف زئی پہنچا۔ شہر شکارپور تک فقیر کے کوچ
و مقام کی روداد آپ تک پہنچ چکی ہوگی۔ اس کے بعد بھاگ،
شال اور درۂ ڈھاڈر سے عافیت کے ساتھ گزرتا ہوا شہر
قندھار میں پہنچا۔ سات روز وہاں قیام کر کے کابل کا عزم کیا۔
راستے میں راسخ العقیدہ مسلمان اور مخلص اہلِ ایمان، کیا
امیر، کیا غریب، کیا چھوٹے، کیا بڑے، کمال محبّت، مودّت
اور اخلاص و اتحاد سے پیش آئے۔ جب ہم دار السلطنت
کابل پہنچے، تو وہاں کے باشندے اور اطراف و
جوانب کے ساداتِ کرام، علمائے عظام، مشائخِ
ذوی الاحترام اور رؤسائے عالی مقام اور ہر طرح کے
خواص و عوام بڑے ذوق و شوق سے ملاقات کرتے
تھے۔ ان ایام میں سردارانِ کابل کے درمیان کچھ
جنگ و جدل تھا۔ فقیر نے اُن کے نزاع کو دور کرنے
کے لیے ایک مہینہ سات دن قیام کیا۔ جب مصالحت
کی کوئی صورت نہ نکلی، تو پشاور کی جانب کوچ کر دیا۔
اثنائے راہ میں پہلے ہی کی طرح، بلکہ اس سے کچھ
زیادہ ہی مخلص مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ وہاں سے پشاور
پہنچے اور اہلِ شہر سے ملاقات کی۔ دو تین روز
وہاں ٹھیر کر موضع ہشت نگر میں آئے۔ چند
روز وہاں قیام کر کے وہاں کے اہلِ ایمان کو

روز مقام کردہ۔ مؤمنینِ آں دیار را بسوئے اقامت
جہاد و ازالۂ کفر و فساد دعوت نمودہ۔ از فضلِ ربِّ
قدیر جمّے غفیر از مؤمنینِ آں اطراف و اکناف بہ نیّت
خلوص بر ارادۂ ادائے ایں عبادتِ عظمیٰ و عطیۂ
کبریٰ و ادراکِ ایں سعادتِ علیا فراہم آمدند۔
بعد ازاں بہ موضعِ خویشگی آمدہ و از آنجا بموضع نوشہرہ
رسیدہ، قصدِ اقامتِ چند روز نمودہ۔ دریں اثنا لشکرِ
سیکھاں کہ بقدرِ ہفت ہزار سوار و پیادہ بسرکردگی
بدھ سنگھ ابنِ عمِّ رنجیت سنگھ بہ موضعِ اکوڑہ کہ بفاصلۂ
ہفت کروہ از موضعِ نوشہرہ واقع است، رسیدہ۔
ہر چند درمیانِ جنودِ مجاہدین و لشکرِ کفّارِ ملاعین
دریائے کہ مسمّٰی بہ لنڈے است، حائل بودہ، امّا ہیبت
و رعبِ یکے بر دیگرے از قربِ مجاورت ہویدا گردید۔
لابد مصلحتِ وقت چناں اقتضا کردہ کہ جمّے را از
مہاجرین و مجاہدینِ صادقین شبا شب بہ دریائے مسطور عبور
کنانیدہ بر سرِ کفّارِ بدکردار بطریقِ شبخون روانہ ساخت۔
چنانچہ مجاہدین حینِ شبِ بستم جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ
ہجریِ قدسی بر سرِ اہلِ کفر و ارتیاب بمشابہ ملائکۂ
عذاب قریبِ صبح تاخت آوردند بمثلِ روزِ قیامت۔
در آخرِ ہماں شب بر سرِ آں غافلین دفعۃً رسیدند
توپ و تفنگ معطل گذاشتہ کار و بار بسیوفِ قاطعہ

اقامتِ جہاد اور ازالۂ کفر و فساد کی دعوت
دی۔ خدائے قدیر کی مہربانی سے ان
اطراف و اکناف کا ایک جمِّ غفیر اس عبادت
کی ادائگی اور اس سعادت کے حصول کے
لیے جمع ہوگیا تھا۔ وہاں سے موضعِ خویشگی میں
آنا ہوا، جہاں سے نوشہرے پہنچے اور
چند روز قیام کا ارادہ کرلیا۔ اس اثنا میں سکھوں کا
ایک لشکر، جو سات ہزار سوار و پیادہ کی تعداد میں تھا،
رنجیت سنگھ کے چچازاد بھائی بدھ سنگھ کی سرکردگی میں
موضعِ اکوڑہ میں پہنچ گیا، جو موضعِ نوشہرہ سے سات
کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ مجاہدین اور سکھ
لشکر کے درمیان ایک ندیا حائل تھا، جو لنڈے کے نام
سے مشہور ہے، لیکن ہر ایک کا دوسرے پر رعب طاری
تھا۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا ہوا کہ مجاہدین و مہاجرین
کے ایک گروہ کو راتوں رات دریا عبور کرا کے مخالفین
پر شبخون مارنے کے لیے روانہ کیا جائے۔ چنانچہ
مجاہدین ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ کو بوقتِ صبح اہلِ
کفر پر ملائکۂ عذاب کی طرح جا پڑے اور دفعۃً
ان لوگوں کے سر پر پہنچ گئے، جو بالکل غافل تھے
توپ، بندوق بالکل بیکار ہوگئی۔ تلواریں چلنے
لگیں اور موت کا بازار گرم ہوگیا۔ آٹھ سو کے

رسانیدند۔ ودمِ صبح آبِ شمشیرِ پٹّاں مثلِ ریزشِ باراں
برسرِ ایشاں بارید۔ چنانچہ جمعے از کفارِ بدکردار کہ قریب
ہشت صد نفر باشند، بدار البوار فرستادند و بسیارے
را بزخمہائے پُرخطر تالبِ سقر رسانیدند و اجناسِ نفیسہ
از قسمِ سلاح و یراق وغیرہ و ہزار راس اسپ غنیمت
آوردند۔ چند از مجاہدین بدرجۂ شہادت فائز گردیدند۔
بالجملہ بابے از ابوابِ فتوح بر رُوئے مجاہدین کشادہ گردید
و درے از درہائے جہنم برائے تعذیبِ کفار
وا کردہ شد۔ بعد ازاں مجاہدین مذکورین بقرودگاہِ
خود مراجعت بخیر و خوبی نمودند۔ بعد چند روز از موضع
نوشہرہ کوچ نمودہ بموضع ہنڈ کہ گزرِ دریائے اباسین
است، رسیدند بار دیگر جماعتے از جنودِ مجاہدین شباشب
از دریائے اباسین عبور نمودہ، بر سرِ حضرو کہ مرکزِ کفار بود
و مجمعِ متمولانِ آں اقطار بود، تاخت آوردہ جمعے را
از ایشاں زیرِ تیغِ بے دریغ گرفتند، جمعے را بطریقِ سبی
مقید کردہ آوردند و دریں نوبت اموالِ خطیرہ و غنائمِ
کثیرہ از نقود و اجناس بدستِ عمومِ ناس آں قدر
افتاد کہ تخمیناً بہ پانزدہ شانزدہ لک روپیہ باشد و
لشکرِ بدھ سنگھ مخذول، چوں دو بار نوبت شجاعتِ
مومنین و جلادتِ مجاہدین ظاہر و باہر دید، مرعوب
از ہیبتِ ایشاں گردیدہ از قرودگاہِ خود فرار نمودہ بجائے

قریب سکھ مارے گئے اور بہت سے
خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔ بہت سلاح
اور ہتھیار، ایک ہزار گھوڑے مالِ غنیمت
میں آئے۔ چند مجاہدین بھی درجۂ شہادت
کو پہنچے۔ یہ مجاہدین کے لیے ایک
بڑی فتح اور مخالفین کے لیے بڑی
ہزیمت تھی۔ اس کے بعد مجاہدین اپنے
پڑاؤ پر بخیر و خوبی واپس آ گئے۔
چند روز کے بعد موضع نوشہرہ
سے کوچ کر کے موضع ہنڈ میں آ گئے، جو
دریائے سندھ کی گزرگاہ ہے۔ دوسری
بار لشکرِ مجاہدین کے کچھ لوگوں نے
دریائے سندھ عبور کر کے راتوں رات
حضرو پر چھاپہ مارا، جو سکھوں کا ایک
مرکز اور دولتمندوں کا ایک اڈہ ہے۔ کچھ
لوگ تلوار کی نذر ہوئے، کچھ گرفتار
ہو کر آئے۔ اس مرتبہ بہت بڑا مالِ غنیمت
جس میں نقود و اجناس تھیں، عام لوگوں کے ہاتھ
لگیں۔ لوگ پندرہ سولہ لاکھ روپے کا اندازہ کرتے
ہیں۔ بدھ سنگھ کے لشکر نے دونوں مرتبہ اہلِ ایمان
کی شجاعت اور مجاہدین کی جوانمردی دیکھی اور مرعوب ہو کر اپنی

دگر سنگرِ کلاں گردا گرد زدند۔ چنانچہ وقتِ تحریرِ ایں
رقیمہ بدستِ خود جانِ خود را در زندانِ سنگر مقید ساختہ
بودند، نہ ملجا مفر از امیدِ اعانت می داشتند۔ واز
اعظمِ سوانحِ عجیبہ غیبت کہ ہر نوبت مجمعِ جنودِ مجاہدین
مثلِ بلوائے عام و لشکرِ بے سر بود در کوچ و مقام
بے انتظام و لہٰذا غنائم ہر بار بر قانونِ شرعِ شریف
منقسم نہ گردید۔ بناءً علیہ جمہورِ مومنینِ حاضرین از
ساداتِ کرام و علمائے اعلام و مشائخِ ذوی الاحترام
و امرائے عالی مقام و سائرِ خواص و عوام از اہلِ ایمان
و اسلام کہ در آں مقام حاضر بودند، برایں معنی
اتفاق نمودند کہ اقامتِ جہاد و ازالۂ کفر و فساد
بدونِ نصبِ امام بروجہِ مشروع صورت نمی بندد۔
بناءً علیہ بتاریخِ دواز دہم جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ ہجری
قدسی بیعتِ امامت نمودند و ربقۂ اطاعتِ فقیر در
گردنِ خود انداختند و بروزِ جمعہ خطبہ ہم بنامِ فقیر
خواندہ شد۔ ان شاء اللہ ببرکتِ ادائے ایں رکنِ رکین،
یعنی، نصبِ امام کہ مدارِ اکثرِ احکامِ دین است روز
بروز ضرور بالضرور ان شاء اللہ الغفور مظفر و منصور
خواہند گردید۔ اینست بیانِ اجمالیِ احوال، غرض
فقیر از نگارش آنکہ وقتِ کار بر سر رسید و مقدمۂ
کار زارِ پیش مد انجامیدہ پس ہر مومنِ راسخ الاعتقاد

فرودگاہ سے دور جا کر ایک دوسری جگہ بہت بڑا
سنگر لگایا۔ اس خط کے تحریر کے وقت وہ اس سنگر
کے اندر مقیم و مقید ہے۔ کمک پہنچ جانے کی
امید پر اس نے بھاگ جانے کا سہارا نہیں لیا۔
ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے، کہ ہر مرتبہ مجاہدین کا لشکر ۵
ایک بے سری فوج اور عام بلوائیوں کی طرح تھا اور
کوچ و مقام میں کہیں کوئی نظم نہیں تھا۔ اس سبب مالِ غنیمت
شرعِ شریف کے قانون کے مطابق تقسیم نہ ہو سکا۔
اس بنا پر تمام مسلمانوں نے جو موجود تھے، جن میں
سادات، علما، مشائخ، امرا اور خواص و عوام تھے، ۱۰
بالاتفاق اس بات کو کہا کہ جہاد کا قیام اور کفر و فساد
کا ازالہ امام کے تقرر کے بغیر مسنون اور شرعی
طریقہ پر انجام نہیں پا سکتا۔ اس بنا پر ۱۲ر جمادی
الآخرہ ۱۲۴۲ھ کو ان سب نے اس فقیر کے ہاتھ پر
بیعتِ امامت کی اور اس کی اطاعت کا عہد کیا۔ جمعے ۱۵
کے روز خطبہ بھی اس فقیر کے نام کا پڑھا گیا۔ ان شاء اللہ
اس رکنِ رکین کے ادا کرنے کی برکت سے، جس پر دین
کے اکثر احکام کا مدار ہے، فتح و نصرت ظاہر ہوگی۔ یہ
حالات کی مختصر روداد تھی۔ اس تحریر سے فقیر کی
غرض یہ ہے کہ کام کا وقت سر پر آ گیا ہے اور معرکۂ ۲۰
کارزار درپیش ہے۔ ہر صاحبِ ایمان اور ہر مسلمان کو

راہِ مسلمِ کامل الانقیاد را لازم است کہ خود را بہر وجہ کہ ممکن باشد، نزدِ فقیر رسانَدہ در سلکِ مجاہدین و مہاجرین منسلک گردانَد۔ ہر چند حق جَلَّ وَعَلا بر طبقِ منطوقِ لازم الوثوق وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ

۵ الْمُؤْمِنِينَ (۳۰ : ۴۷) ایں مقدمہ بانجام خواہد رسانَد و دینِ متینِ سیّدِ المرسلینؐ را بر سائرِ ادیان بر وفقِ وعدۂ خود غالب خواہد کرد، امّا ہر کہ جانِ خود را دریں معرکہ حاضر کردہ گوئے سعادت ربودہ، و کسے کہ دریں مقدمہ تقاعد و تکاسل

۱۰ ورزید، لابد فردائے قیامت دستِ افسوس و ندامت خواہد گزید۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ (۳۶ : ۱۷) وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (۲۰ : ۴۷)۔

جسے اللہ نے اطاعت و انقیاد کی دولت عطا فرمائی ہے، اس وقت لازم ہے کہ جس طرح ممکن ہو، فقیر کے پاس پہنچ جائے اور مجاہدین اور مہاجرین کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ اگرچہ یہ سلسلہ انجام کو پہنچ کر رہے گا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (۳۰ : ۴۷) اور اللہ کے وعدے کے مطابق یہ دینِ متین تمام ادیان پر غالب ہو کر رہے گا لیکن جو شخص اس معرکے میں خود حاضر ہوگا، وہ سعادت سے مشرف ہوگا اور دوسروں سے سبقت لے جائے گا اور جو اس معاملے میں کاہلی اور سستی سے کام لے گا، وہ کل قیامت میں کفِ افسوس ملے گا۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ (۳۶ : ۱۷) وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (۲۰ : ۴۷)۔

بیعتِ امامت کے بعد آپؒ نے پوری تصریح و وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ امام کی

۱۵ مکمّل اطاعت اور احکام و قانونِ شریعت کی پوری پابندی کرنی ہوگی، تمام رسومِ جاہلیت اور امورِ غیر مشروع، مخالفِ شریعت رواج و دستور یکقلم چھوڑنے پڑیں گے اور اس کے لیے ہر طرح کا ایثار و قربانی، ترکِ مال و جاہ و عزّت کرنا پڑے گا۔ فتح خاں، اشرف خاں، فتح خاں، سعادت خاں، بہرام خاں اور علما و سادات و خوانین نے بیعتِ امامت کی اور آپؒ کی امامت کی خبر اس ملک میں جابجا مشہور ہوئی۔ وہاں کے چھوٹے بڑے جتنے خان اور رئیس تھے، سب نے آکر بیعتِ امامت کی یہاں تک کہ پشاور سے ایک بڑے جلیل القدر پیرزادے، جو

۲۰ گدڑی شاہزادے کے نام سے مشہور تھے، تشریف لائے اور بیعت کی اور کہا کہ: "میں خالصاً لوجہِ اللہ آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ان شاء اللہ آپؒ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔"

خادے خاں، اشرف خاں اور دوسرے یوسف زئی سرداروں نے یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں والیانِ پشاور کو سید صاحبؒ کی امامت و امارت کی اطلاع دی اور مسلمانوں کی زبوں حالی، اُن کے انتشار، جہاد کی ضرورت اور سید صاحبؒ کی امارتِ حقہ کا ذکر کرنے کے بعد ان سے آپؒ کے جھنڈے کے نیچے دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے کی اور مجاہدین کی رفاقت و اعانت کی درخواست کی۔

اُنھوں نے والیانِ پشاور کو جو مکتوب بھیجا تھا، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

به عالی جناب معلّی القاب رفعت قباب
سرداران سردار یار محمد خاں صاحب و سردار
سلطان محمد خاں صاحب أیّدهما الله جلالهما و ضاعف
اقبالهما! از کمترین هوا خواهانِ اخلاص کیشاں و خیر
اندیشاں بعد ادائے آنچه شایانِ شانِ آں جلالت
نشان است معروضِ رائے فیض انجلائے آنکه
آنچه دریں اوقاتِ پر از آفات از دستِ تطاولِ کفارِ
بدکردار بر مومنانِ ایں دیار انواعِ رنج و تکالیف و
مصائب از قتل و نهب و شورشِ فتنه و جنگ و بے پردگیِ
ناموس و ننگ و تخریبِ مساجد و معابد گذشته و می گذرد، بر
هیچ یک از عاقل و غافل پوشیده نیست، چنانچه صبیان و
نسوانِ اهلِ ایمان فی الحال در بلادِ پنجاب در قبضهٔ اهلِ شرک
و ارتیاب مقید اند که بصد زبان مضمونِ ایں آیتِ قرآن بصد
آه و فغاں با دلِ بریان و چشمِ گریاں بحضورِ هر کس و
ناکس گویاں وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي

عالی جناب، معلّی القاب، رفعت قباب، سردارِ
سرداراں، سردار یار محمد خاں صاحب اور سردار
سلطان محمد خاں صاحب، أیّدهما الله جلالهما و ضاعف
اقبالهما(۱)، کی خدمت میں مخلص نیاز مندوں اور حقیر
بہی خواہوں کی طرف سے آداب ضروری کے بعد عرض
ہے کہ اس زمانے میں اس ملک کے مسلمانوں پر کفار
کے ہاتھوں سے جو ظلم ہو رہے ہیں اور ان پر قتل و
غارت گری، لڑائی، جھگڑے، بے عزتی و بے آبروئی،
خانہائے خدا اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور
تخریب کے جو مصائب گزرے اور گزر رہے ہیں،
وہ کسی عاقل یا غافل سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ
اس وقت پنجاب کے مسلمان بچے اور عورتیں اہلِ
شرک کے پنجے میں گرفتار ہیں اور رو رو کر سو سو
زبان سے اس آیت کا مضمون ہر شخص کو سناتی ہیں
وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي

(۱) اللہ اُن دونوں کے جلال کو ہمیشہ قائم رکھے اور اُن کے اقبال کو کئی گنا بڑھائے!

سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ
اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّ
۵ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا (۴: ۷۵)۔

بالجملہ عمرے گزشت کہ ایں رنج و تکالیف
می کشیدیم و انتظارِ ہمیں معنی می نمائیم کہ تا کدام وقتِ
محمود و کدام ساعتِ سعد رسد کہ آفتابے بر فلکِ
سلطنت طلوع نماید و تا ستارہ از افقِ حکومت
۱۰ درخشد کہ از اشراقاتِ اشعۂ انوارِ آں منیر ظلماتِ
شرک و طغیان مضمحل و مفقود گردد و لیکن مدتِ
مدیدہ و عرصۂ بعیدہ منقضی گردید کہ نہ شاہے از
سیستان مستعدِ ایں معنی گردید، نہ از خراسان و نہ
سردارے از قندھار و کابل سر بر آوردہ و نہ از پشاور
۱۵ و کوہستان۔ بالجملہ کسے از سردارانِ زمان و
سلاطینِ دوراں بآہ و فغانِ مظلوماں گوش
نہ نہاد و در دستگیریِ افتادگاں دست نکشاد،
آخر الامر نورِ محمدی علمِ حمایت برافراخت و جمالِ
احمدی نقاب از چہرہ برانداخت یعنی سلالہ و
۲۰ خاندانِ نبوت نقاوۂ دودمانِ ولایت شمعِ شبستانِ

سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ
اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّ
اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا (۴: ۷۵)۔

مختصر یہ کہ عمر گزری کہ ہم لوگ یہ رنج و تکلیف
اٹھا رہے ہیں کہ وہ کون سی مبارک ساعت ہوگی کہ
آسمانِ سلطنت میں وہ آفتاب طلوع ہوگا اور
افقِ حکومت پر وہ ستارہ ظاہر ہوگا، جس کی
چمک سے شرک و سرکشی کی تاریکیاں
کافور ہو جائیں گی۔ لیکن ایک طویل مدت ہو
گئی اور ایک زمانہ ہونے کو آیا کہ
نہ کوئی بادشاہ سیستان یا خراسان سے
یہ مقصد لے کر اٹھا اور نہ کوئی سردار قندھار
و کابل یا پشاور و کوہستان سے عزم لے کر چلا۔ سردارانِ
وقت اور سلاطینِ زمانہ میں نہ کسی نے ان مظلوموں کی آہ
و فغاں پر کان دھرا اور نہ ہی گرتے ہوؤں کو تھامنے کے
لیے ہاتھ بڑھایا۔ آخر الامر نورِ محمدی نے حمایت کا پرچم لہرایا
اور جمالِ احمدی نے چہرے سے نقاب ہٹایا، یعنی اسلافِ ولہ
خاندانِ نبوت نقاوۂ دودمانِ ولایت شمعِ شبستانِ

(۱) لوگو تم کو کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں لڑتے نہیں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے واسطے نہیں لڑتے، جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم کو نکال اس بستی سے، جس کے رہنے والے ظلم کر رہے ہیں اور بنا ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار بنا۔

سیدِ مختار، چراغِ سلسلۂ ائمۂ اطہار، الامام الاوحد والسیّد الامجد، امیر المجاہدین السیّد احمدؒ از بلادِ ہندوستان صعود فرمودہ بدیارِ ما منتظران نزول نمودہ و اظہارِ دعوتِ عام بسوے قتالِ کفّارِ لئام بجدّ و جہدِ تمام و سعیِ مالاکلام محض للّٰہ و فی اللّٰہ بے شائبۂ طلبِ مال و عزّت و جاہ و حکومت کردہ۔ ہمیں توجہاتِ آں امامِ ہمام ما ضعفا را ہم حمیّتِ دینی جوش زدہ ہم غیرتِ ننگ و ناموس یاد آمد۔

سیّدِ مختار، چراغِ سلسلۂ ائمۂ اطہار، امامِ اوحد، سیّدِ امجد امیر المجاہدین سیّد احمدؒ ملکِ ہندوستان سے تشریف لائے اور ہم منتظروں کے ملک میں نزولِ اجلال فرمایا اور محض للّٰہ فی اللّٰہ طلبِ مال و عزّت و جاہ و حکومت کے شائبے کے بغیر پوری کوشش اور جدّ و جہد سے کفّار سے جہاد کی دعوتِ عام دی۔ انھیں امامِ ہمام کی توجّہات کا نتیجہ ہے کہ ہم کمزوروں کے دل میں بھی دینی غیرت کا جوش پیدا ہوا اور ہم کو عزت و آبرو کی غیرت آئی۔

خود سیّد صاحبؒ نے سردار سلطان محمّد خاں، سردار سیّد محمّد خاں، نواب شیر محمّد خاں، سردار احمد خاں، نواب بہاول خاں، شاہ سلیمان وغیرہ کو نہایت پُرجوش اور پُراثر خط لکھے، جن میں اپنی امامت کی اطلاع کے ساتھ اُن کی غیرتِ ایمانی اور حمیّتِ اسلامی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

سردار یار محمّد خاں، سلطان محمّد خاں اور پیر محمّد خاں کی عرضیاں آئیں کہ ہم بھی آپ کی اطاعت میں جان و مال سے حاضر ہیں۔ وہاں کے خوانین اور رئیسوں نے کہا کہ سردار یار محمّد خاں نے یہ دنیا سازی کی بات کی ہے۔ وہ اعتبار کے قابل نہیں۔ اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا: "آپ سچ کہتے ہیں مگر اللّٰہ تعالیٰ ہادیِ مطلق ہے۔ یہ شخص ہماری شرکت کا اظہار کرتا ہے، دل کا حال خدا کو معلوم ہے، ہمارے لیے ظاہر شریعت کا حکم ہے۔"

سیّد صاحبؒ کا خط امامت کے متعلق بیعت کے بعد سیّد صاحبؒ نے اطّلاع نامے جاری کیے اور تمام علاقے میں نیز ہندوستان میں اس کی خبر دی۔ آپؒ کے ایک والانامے کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو غالباً سرحد میں کسی مقام کو بھیجا گیا تھا:-

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

"اہلِ انصاف و ہدایت سے پوشیدہ نہیں کہ اہلِ کفر و ضلال کے ساتھ جو جنگ و جدال اور قتل و قتال ہوتا ہے، اگر محض مال و عزّت اور حکومت و ریاست حاصل کرنے کے لیے ہو، تو اللّٰہ تعالیٰ کے ہاں اُس کا کچھ اعتبار

نہیں اور اگر نصرتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ اور ترویجِ سنّتِ نبوی کے لیے ہو، تو اس کو عُرفِ شرع میں جہاد کہتے ہیں اور وُہ تمام عبادات میں افضل اور تمام طاعات سے اکمل ہے کہ کوئی عبادت رفعِ درجات اور تکفیرِ سیئات میں اس کے مساوی نہیں، جیسے کہ آیۂ کریمۂ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ○ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ط (۴: ۹۵، ۹۶) سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ فرض قانونِ شریعت کے مطابق ادا کیا جائے تاکہ آخرت میں وسیلۂ نجات اور دُنیا میں مُثمرِ ثمرات اور نزولِ رحمتِ یزدانی اور تائیدِ آسمانی کا باعث ہو۔ جہاد کے لیے سب سے بڑی شرط امام کا مقرّر کرنا ہے۔ چنانچہ آیت ہے أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴: ۵۹) اور وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ (۴: ۸۳) اور حدیث میں ہے مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدْ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً اور حدیث صَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَأَطِيْعُوْا ذَا أَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ اور حدیث مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَايَةٍ عَمْيَاءَ فَقَدْ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً اور حدیث مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ مُجَاهِدًا وَّأَصْلَحَ ذَاتَ الْبَيْنِ وَأَطَاعَ الْإِمَامَ فَنَوْمُهٗ وَيَقَظَتُهٗ حَسَنَةٌ وَّمَنْ خَرَجَ وَأَفْسَدَ فِي الْأَرْضِ وَلَمْ يُطِعِ الْإِمَامَ، فَلَمْ يَرْجِعْ كَفَافًا۔ اسی طرح بے شمار آیات و احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں اور چونکہ اقامتِ جہاد اور ازالۂ کُفر و فساد اس زمانے میں کہ اہلِ کُفر و طغیان کی شورش کا زمانہ ہے، عام مسلمانوں کے ذمّے واجب و مؤکد ہو گیا ہے، پس امام کا مقرّر کرنا بھی اُن پر واجب و مؤکّد ہے۔

اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے فضل سے اس فقیر، یعنی سیّد احمدؒ کو پہلے اشاراتِ غیبی و الہاماتِ لاریبی سے اس منصبِ شریف کی بشارت دی۔ پھر مومنین صادقین، سادات و علمائے عظام، مشائخِ کرام، خوانینِ عالی مقام اور خواص و عوام کی ایک جماعتِ کثیر کا دل مائل کر کے مجھ کو اس منصبِ شریف سے مشرف فرمایا۔ چنانچہ بروزِ پنجشنبہ بتاریخ ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ مخلص

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے جس میں خادے خاں، اشرف خاں، فتح خاں، سعادت خاں، بہرام خاں اور علما و سادات و خوانین تھے، اس فقیر کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی اور فقیر کو اپنا امام قرار دیا اور اس کی امامت و ریاست کو تسلیم کیا اور اطاعت کا حلقہ اپنی گردنوں میں ڈالا اور اسی مہینے کی ۱۳ تاریخ کو جو جمعے کا دن تھا خطبے میں فقیر کا نام داخل کیا۔ انشاء اللہ عنقریب اس سُنّت کی ادائگی کی برکت سے مظفر و منصور ہوں گے۔

ان مسلمانوں کو بھی، جو یہاں موجود نہیں، لازم ہے کہ جہاد کے لیے اور کفر و فساد کے مٹانے کے لیے کمرِ ہمّت باندھیں اور اس فقیر کی امامت کی بیعت اس کے نائبوں، مثلاً سعادت مآب کمالات انتساب اخوی اعزّی شیخ صابر صاحب کے ہاتھ پر کریں اور پوری توجّہ کوشش اور بلند ہمّتی سے جہاد میں مشغول ہوں اور فقیر کے نام کا خطبہ پڑھیں تاکہ کفّار سے جنگ اور جمعہ و عیدین کی نماز مشروع طریقے پر ہوں اور دنیا و آخرت میں ثمراتِ جلیلہ اور اجورِ جزیلہ کی موجب ہوں۔"[۱]

شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کا خط

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ہندوستان کے کسی صاحب کے نام سیّد صاحبؒ کی امامت کے بارے میں ایک جوابی خط لکھا ہے، جو بیش بہا علمی اور دینی اور فقہی فوائد و نکات پر مشتمل ہے اور جس سے بہت سے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کی طرف سے بخدمتِ معدنِ غیرتِ ایمانی، منبعِ حبِّ اسلامی، مقبولِ بارگاہِ ربِّ قوی، میر شاہ علی، سلّمہ اللہ تعالیٰ۔ سلامِ مسنون اور دعائے اجابت مقرون کے بعد واضح ہو کہ آپ کا وہ گرامی نامہ پہنچا، جس میں چند مخلصین اور بعض منافقین کے ایک مباحثے کا تذکرہ ہے۔ منافقین سے آپ جو جہاد باللّسان کر رہے ہیں اور راہِ ایمان کی طرف طالبین کو جو آپ دعوت دے رہے ہیں، اس پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے!

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ سوال و جواب کے مضامین کو منقح کر کے اور ان کو ایک رسالے کی شکل میں تحریر کر کے آپ کو بھیجوں، تو مخدومِ من! اگرچہ ان مسائل میں تقریر و تحریر بھی جہاد کی ایک قسم ہے، لیکن یہ ضعیف بلکہ اس مقام کے تمام حاضرین ایسے کام میں مشغول ہیں کہ تقریرات و تحریرات کی اس میں قطعاً گنجائش

(۱) مجموعۂ خطوطِ قلمی۔

نہیں۔ ہمارا حال اہلِ تقریر و تحریر کی نسبت سے بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص خود نماز کی ادائگی میں مشغول ہے، تو اگرچہ نماز کے مسائل کی تعلیم بھی مقدّماتِ صلوٰۃ میں سے ہے، لیکن ادائے نفسِ صلوٰۃ مسائلِ صلوٰۃ کی تعلیم میں مشغول ہونے سے مانع ہے۔ جو شخص مجاہدین کا حال دیکھے، اُس کو تعین ہو جائے کہ قیل و قال اور بحث و جدال کا مسلک، خواہ وہ حق ہو، خواہ باطل، دُوسرا ہے اور ان لوگوں کا مسلک دُوسرا۔ پہلا مسلکِ علما کی جنس سے ہے اور دُوسرا، مسلکِ سپاہ کی جنس سے وَشَتّانَ بَیْنَھُمَا۔ آپ کی خاطر سے چند کلمے لکھے جاتے ہیں، اگرچہ وُہ بھی طبیعت پر بہت بار ہیں۔

حدیث و کلام و فقہ کے مطابق جنابِ امیر المومنین کی بیعت کے انعقاد میں قطعاً کوئی شُبہہ نہیں۔ باقی مخالفین آنجناب یا آپ کے متبعین کے متعلق جن قبائح کی نسبت کرتے ہیں، تو اوّل تو آپ کی ذات سے متعلق جن باتوں کی نسبت کرتے ہیں وُہ سراسر باطل اور صداقت سے معرّا ہیں اور جو آپ کے رُفقا سے نسبت کرتے ہیں، تو ان کا بھی بیشتر حصّہ مطابقِ واقعہ نہیں ہے۔ بر تقدیرِ تسلیم رُفقائے امام کی خرابی اس امام کی امامت میں ہرگز قادح نہیں، جیسے کہ اُمتیوں کی خرابی نبی کی نبوت پر ہرگز اثر انداز نہیں۔ آپ کی ذات سے متعلق جن چیزوں کی نسبت کرتے ہیں، اُن کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ثبوتِ امامت پر قطعاً اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ وُہ زیادہ سے زیادہ مراتبِ ولایت کے خلاف پڑتی ہیں اور مراتبِ ولایت کا ثبوت سرے سے امام کی شرائط میں سے نہیں ہے، بلکہ فسق و ظلم بھی امامت کے ثابت ہو جانے کے بعد امامت کے زوال کا سبب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ احادیثِ متواترہ اور متقدمین و متاخرین فقہائے متکلمین کی عبارات اس پر دلیل ہیں۔ مختصراً گفتگو کا دارومدار دو باتوں پر ہے: ایک ثبوتِ امامت، دُوسرے اس کے بعد اس کا زائل ہو جانا۔ اعتراضاتِ مذکورہ کی وجہ سے پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ امامت کے ثبوت کے طریقے کی تحقیق حدیث و کلام و فقہ کی کتابوں سے کرنی چاہیے اور اس مسئلے میں قوی و ضعیف، راجح و مرجوح روایات میں تمیز کرنی چاہیے اور اس کے بعد مضمونِ قوی کا خلاصہ ذہن میں محفوظ رکھنا چاہیے اور پھر غور کرنا چاہیے کہ ہمارے اس مسئلے میں یہ بات پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگرچہ ان مسائل میں مشاہدے سے حقیقت ظاہر ہوتی ہے، لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ اور شنیدہ کے بُود مانندِ دیدہ، لیکن چونکہ مشاہدۂ حال ان لوگوں کو میسّر نہیں جو خود موجود نہیں، اس لیے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ان لوگوں کو اس مجمعِ اخیار کا مجملاً حال معلوم ہو

اسی لیے اس مضمون کا ایک خط اور ان حالات کے چند اور خطوط آپ کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں تاکہ کسی طرح حقیقت حال منکشف ہو جائے۔ جو شخص بھی ان دونوں مقدموں میں اچھی طرح غور کرے گا، اس کو یقیناً آنجناب کی امامت کے انعقاد کا اذعان ہو جائے گا۔

رہا دوسرا مسئلہ (امامت کے زوال کی بحث) تو اس کی بھی حدیث، کلام و فقہ کی کتابوں سے تحقیق کرنی چاہیے کہ کون سا امر امامت سے امام کی علیحدگی کا باعث ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ ان میں سے کوئی آنجناب میں نہیں پایا جائے گا، بلکہ وہ قبائح، جو منصبِ امامت سے امام کی علیحدگی کا باعث ہیں آپ کی شان سے اس قدر بعید ہیں کہ کافر سکھوں اور فرنگیوں میں سے بھی کوئی اُن کی آپ سے نسبت نہیں کر سکتا۔ پھر جب آپ کی امامت ثابت ہو گئی اور کوئی امر جو اس منصب سے آپ کی علیحدگی کا سبب ہو، نہ پایا گیا، پس آپ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہو گئی۔ جو آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے، وہ باغی مستحقُ الدم ہے اور اُس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور اس کی بے عزتی تمام اہلِ فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے، اس لیے کہ ایسے لوگ بحکمِ احادیثِ متواترہ کلابُ النار اور ملعونین اشرار ہیں۔

اس مسئلے میں اس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر۔

باقی، آپ نے جو اس کا ذکر کیا ہے کہ اہلِ شوکت کے مقابلے کے لیے مقابل شوکت چاہیے، پس اوّل تو یہ مقدمہ ممنوع ہے، کیونکہ شوکت کی تحصیل کی کوشش بقدرِ استطاعت کافی ہے، مخالفین کی شوکت کے مماثل ہونا ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم (۸: ۶۰) یہ نہیں فرماتا: وَأَعِدُّوا لَهُم مِّثْلَ مَا أَعَدُّوا لَكُمْ۔ دوسرے یہ کہ شوکت کے وجود کے یہ معنی نہیں کہ امام کے جسم میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ اس قوت سے مخالفین کی سلطنت کو درہم برہم کر دے اور اکیلے ان کے لشکروں اور فوجوں کو شکست دے دے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ موافقین کی ایسی جماعت اس کے ساتھ ہو جائے کہ باعتبارِ ظاہرِ عقل ان کی قوت سے مخالفین کی مدافعت کر سکے اور اجتماع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر وقت اس کے چاروں طرف وہ لوگ کھڑے رہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس کی ذات سے ایسا تعلق ہو کہ اس سے وہ اس کے احکام کی اطاعت کرنے لگیں، جیسے نوکری کا تعلق سلاطین کے عرف میں اور قرابت و برادری کا تعلق افغانوں کے عرف میں۔ اسی لیے شریعت نے تعلقِ بیعت کا

اعتبار کیا ہے۔ پس جس طرح کہ صاحبِ شوکت سلاطین وہ ہوتے ہیں کہ نوکروں کا مجمعِ کثیر اُن کے ہمراہ ہوتا ہے اور اغنیاء
کے عُرف میں وہ ہوتے ہیں کہ "فلوس" کا مجمعِ کثیر اُن کے پاس ہو، اسی طرح شریعت کے عُرف میں امامِ صاحبِ شوکت
وہ ہے جس کے ہاتھ پر مسلمانوں کے مجمعِ کثیر نے بیعت کی ہو، کیونکہ بیعت کا تعلق شرع کے نزدیک ملازمت اور قرابت
کے تعلق سے قوی مانا گیا ہے۔ پس جنابِ امامِ ہمام کو بالفعل اس درجے کی شوکتِ شرعی حاصل ہے جو مخالفین کی شوکت
سے کئی درجے زیادہ ہے، کیونکہ لشکر و فوج و توپ و شاہین کے مالک سردارانِ پشاور و سوات و بنیر و دمہ کے خوانین اور اُن کے
تمام عوام و خواص پائندہ خان وغیرہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی ہے اور اُن اشخاص کا شمار لاکھوں کو پہنچتا ہے۔
غرض یہ ہے کہ آپ کے لشکروں کی تعداد اس درجے تک پہنچتی ہو کہ مخالفین میں سے کسی کی قوت اس درجے کی نہ ہو۔ باقی رہا
یہ کہ بعض لوگوں نے بیعت توڑ دی ہے اور احتمال ہے کہ دوسرے بھی یہی عمل کریں، پس یہ بات شوکتِ شرعیہ میں اصلاً قادح نہیں،
اس لیے کہ بہت سے نوکر نمک حرامی اور آقا کی بدخواہی کرتے ہیں اور احتمال ہوتا ہے کہ دوسرے بھی یہی طریقہ اختیار کریں، پس
جس طرح یہ بات سلاطین کی شوکتِ عُرفیہ میں قادح نہیں، اسی طرح یہ احتمال ائمہ کی شوکتِ شرعیہ کے بھی منافی نہیں۔

تیسری یہ بات ہے کہ مشرق و مغرب کے کفار کی شوکت کے مماثل شوکت مراد نہیں، ورنہ اگلے پچھلے اماموں سے
کسی کی امامت ثابت نہیں ہوگی۔ پس اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اِن مخالفین کی شوکت کے مماثل شوکت ہو جو بالفعل
مقابل ہیں اور اس وقت یہ شوکت محقق ہے، یعنی ضلع چھچھ، ہزارہ اور پکھلی کے ناظموں کی شوکت کے مماثل شوکت
موجود ہے، اگرچہ رنجیت سنگھ اور کمپنی کی شوکت کے مماثل شوکت نہ ہو۔

کس شخص نے آپ کو یہ خبر دی ہے کہ جنابِ امامِ ہمام اسی مختصر جمعیت کے ساتھ لاہور اور کلکتے کا عزم
رکھتے ہیں؟ آپ تو رات دن مسلمانوں کی جمعیت کی زیادتی اور اُن کی شوکت کی ترقی کی کوشش کرتے رہتے
ہیں اور اسلامی شوکت کے عروج کی تدریجاً امید رکھتے ہیں اور یہ بات بالکل مستبعد نہیں، بلکہ قوموں اور سلطنتوں
کے انقلاب میں اللہ کی یہ سنّت جاری ہے کہ معمولی لوگوں میں سے کوئی کمزور فرد جیسے نادر شاہ وغیرہ سر اُٹھاتا ہے
اور آہستہ آہستہ رفقا کی ایک جماعت فراہم کر لیتا ہے اور تدریجاً قوت اور شوکت حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ
بڑے بڑے سلاطین کی سلطنت اور بڑے بڑے صاحبِ اقتدار شہنشاہوں کی مملکت درہم برہم کر دیتا ہے۔ کس قدر
بے انصافی ہے کہ جو شخص محض دنیا کی طلب میں کمربستہ ہوتا ہے اُس کے حق میں فتح و نصرت کا گمان کر لیا

جاتا ہے اور اسی گمان پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے، لیکن جو شخص محض اللہ کے لیے اور اللہ کی خوشی کے لیے دین کی مدد کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اُس کے حق میں فتح و نصرت کا حصول مستبعد سمجھا جاتا ہے اور اس کو بھی دُور کے وہموں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس پر عجیب عجیب اشکالات اور قسم قسم کے اعتراضات کیے جاتے ہیں؛ اُس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا اور عام مسلمانوں کو بھی اس کی رفاقت سے روکا جاتا ہے اور نوبت بایں جا رسد کہ اس کے کارخانۂ جہاد کو درہم برہم کرنے کی سعیِ نامشکور کی جاتی ہے: "أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا" (۱۱: ۱۸، ۱۹)۔

چوتھے یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ شوکتِ قویہ کا حاصل ہونا اہلِ شوکت کے ساتھ جہاد کرنے کی شرط ہے اور آنجناب کو بالفعل شوکت حاصل نہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ امامِ وقت کے لیے شوکت حاصل کرنے کا طریقہ آخر کیا ہے۔ کیا شوکت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنی ماں کے پیٹ سے فوجوں، لشکروں اور سامانِ جنگ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے؟ یا جس وقت جہاد کرنے کے لیے مستعد ہو جاتا ہے، اُسی وقت فی الفور غیب سے تمام لشکر و افواج اور سامانِ جنگ عطا ہو جاتا ہے؟ یہ بات نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ جس طرح امام کا مقرر کرنا تمام مسلمانوں کا فرض ہے اور اس میں مداہنت موجبِ معصیت، اسی طرح امامِ وقت کے لیے شوکت کا حاصل کرنا بھی اُن کا فریضہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق سامانِ جنگ فراہم کرنے کی کوشش کرے اور اس کو امامِ وقت کے سامنے پیش کرے۔ اسی لیے آیۂ کریمہ "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم" (۸: ۶۰) اور آیتِ "جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ" (۹: ۴۱) میں تمام مخاطبین کو خطاب تھا، نہ کہ صرف ائمہ کو۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ امام کی شوکت جہاد کی شرط ہے اور یہ شوکت ہم کو حاصل نہیں، اس کو لازم ہے کہ پہلے خود آئے اور بقدرِ استطاعت سامانِ جنگ اپنے ساتھ لائے اور اس معاملے میں کسی دوسرے کی شوکت کا انتظار اصلاً جائز نہیں۔ جہاد کے معاملے میں جو تعویق و تعطیل واقع ہو گی، اُس کا وبال تمام خانہ نشین و پس ماندہ لوگوں کی گردن پر ہو گا۔ جس طرح نمازِ جمعہ کی ادائی ہر شخص پر واجب ہے اور اس کا ادا کرنا جماعت کے بغیر متصور نہیں اور انعقادِ جماعت امام کے بغیر ممتنع ہے۔ پس اگر ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا ہے کہ جس وقت امام آ جائے گا، جماعت مجتمع ہو جائے گی، میں بھی حاضر ہو جاؤں گا، تو یقیناً جمعے کی نماز فوت ہو جائے گی

اور ہر شخص گنہگار ہوگا۔ اس لیے کہ ارکانِ مقدسہ میں سے کسی امام کا اُترنا اور فرشتوں کی جماعت میں سے کسی جماعت کا مجمعہ قائم کرنے کے لیے آنا ہونے والی بات نہیں۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے گھر سے خواہ تنہا ہو، باہر آئے اور مسجد میں چلا جائے۔ اگر جماعت مجتمع ہو تو اس میں شریک ہو جائے ورنہ مسجد میں بیٹھا رہے اور دوسرے کا انتظار کرے۔ اگر اس نے مسجد خالی دیکھ کر اپنے گھر کا رستہ لیا تو سمجھے کی جماعت و امامت قائم ہو چکی! اسی طرح لازم ہے کہ ہر شخص اگرچہ تنہا، کمزور، قلیل الاستطاعت ہو، امام کی دعوت کا آوازہ سن کر اپنے گھر سے نکل دوڑے اور جس قدر سامان میسر آسکے اس کے ہمراہ مسلمانوں کی جماعت میں پہنچ جائے تاکہ جہاد کے قائم ہو جانے کی صورت پیدا ہو، نہ یہ کہ اپنے کو اللہ کے بندوں کے زمرے سے نکال کر ڈرپوک بندوں میں شامل کرے اور دین متین کے اس رکن رکین کو ہاتھ سے جانے دے، سرکش دولتمندوں کی کاسہ لیسی اور ناقصات العقل عورتوں کی کنگھی چوٹی میں مشغول رہے۔ سبحان اللہ! اسلام کا حق یہی ہے کہ اس کے رکن اعظم کی جڑ کھود کر پھینک دی جائے اور اس شخص کو جس کے سینے میں کمزوری و ناتوانی کے باوجود اسلامی حمیت جوش مار رہی ہے طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیا جائے؟ یہ لوگ نصاریٰ و یہود و مجوس و ہنود کی طرح ہیں کہ ملتِ محمدیہ کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں "محمدیت" کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کھیل اور مذاق سے بھی جہاد کا نام لے، تو مسلمانوں کے دل سنتے ہی پھول کی طرح کھل جائیں اور سنبل کی طرح لہلہانے لگیں اور اگر دور دراز کے مقامات سے بھی جہاد کا آوازہ اہلِ غیرت کے کانوں تک پہنچ جائے، تو دیوانہ وار دشت و کوہسار میں دوڑنے اور شہباز کی طرح اڑنے لگیں، نہ یہ کہ جہاد کا مسئلہ اس عظمت کے باوجود کتاب الحیض والنفاس کی تعلیم و تعلم کے درجے سے بھی کم سمجھا جائے۔

مناسب ہے کہ ان ہوا و ہوس نفسانی اور وسواس شیطانی کو دل سے دور کریں اور ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کو جوش میں لائیں اور مردانہ وار مجاہدین کے لشکر میں داخل ہو جائیں، زمانے کے نشیب و فراز پر صبر کریں اور دور دراز کے خیالات کو چھوڑ دیں اور دنیاوی تعلقات کو جو اس مشغولیت سے مانع ہوں خیرباد کہیں۔

مصلحت دید من آں ست کہ یاراں ہمہ کار بگزارند و خمِ طرۂ یارے گیرند!

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اپنے دل کو وادیوں میں ڈال دے اور ڈانواں ڈول رکھے تو اللہ کو پروا نہیں ہوتی کہ کس وادی میں وہ مرتا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے، اللہ ان تمام راہوں کا انتظام فرماتا ہے۔"(1)

(1) "مجموعۂ خطوطِ قلمی"

شکر و اعتراف

الحمد للہ کہ "سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ" کی جلدِ اوّل، جو وِلادت سے بیعتِ اِمامت تک کے حالات پر مُشتمل ہے، ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مصنّف کو احساس و اعتراف ہے کہ یہ کتاب غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہی ہے۔ اہلِ ذوق و اہلِ خُلوص کی ایک جماعت عرصے سے کتاب کی مشتاق اَور اُس کی اِشاعت کی منتظر ہے۔ بعض اَحباب نے جس اِشتیاق اَور بے چینی کے ساتھ اِس کتاب کا اِنتظار کیا، وُہ سیّد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ! کی شخصیّت و سیرت سے والہانہ تعلّق کے سوا کسی اَور چیز کا نتیجہ نہیں۔ مصنّف کو اِن کے اِشتیاق و انتظار کو دیکھ دیکھ کر اِس کتاب کی اِشاعت کی پُرزور تحریک ہوتی رہی، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ کتاب اِتنی تاخیر سے شائع ہو اور ارادۂ اِلٰہی اِنسانی ارادے پر غالب آ آ کر انسان کی بے بسی اَور بے چارگی کے ثبوت فراہم کرتا رہے۔

لیکن کتاب جس شکل میں شائع ہو رہی ہے اَور اِس عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی تکمیل کے لیے جو جو غیبی سامان مہیّا کیے، اُن کو دیکھتے ہُوئے قلب اللہ تعالیٰ کی حمد سے معمور اَور زبان اس کے شُکر میں مشغول ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔

کتاب اپنے علمی مواد اَور تحقیقی مباحث کے عِلاوہ متعدّد تاریخی دستاویزوں اَور تصاویر سے مُزیّن ہے۔ دو نقشے بھی شاملِ کتاب ہیں۔ اِن نقشوں میں چھوٹے سے چھوٹے مقامات کی نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ملک کی سیاسی تقسیم اَور ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء میں، جن میں سفرِ حج اَور سفرِ ہجرت بالترتیب پیش آئے تھے، ہندوستان کی سیاسی حالت اَور مختلف

رنگوں میں اُس کے مختلف علاقے دکھائے گئے ہیں۔ اِن نقشوں کی تیاری میں اُن نادر اور بیش قیمت تاریخی نقشوں اور تاریخی کتابوں سے مدد لی گئی ہے، جو لاہور کے علمی ذخیرے میں دستیاب ہو سکی ہیں۔ یہ نقشے بجائے خُود اِس کتاب کے لیے ایک بڑی زینت اور اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہیں۔ اُمید ہے کہ اِن پر نظر ڈالنے سے ہندوستان کا قدیم سیاسی مُرقّع سامنے آجائے گا اور ایک ہی نظر میں سیّد صاحبؒ اور اُن کے رُفقا کی بلند ہمّتی، جفاکشی، اُولُوالعزمی اور دِلی لگن کا اندازہ ہو جائے گا، جنھوں نے اِس ہفتخواں کو سر کیا۔ اُن کے سفرِ ہجرت کے طویل، لیکن نُورانی خط نے اِس برِّ عظیم کے تِین گوشوں کو اس طرح اپنے دائرے میں لے لیا ہے، جس طرح سمندر کسی جزیرہ نُما کے تین حصّوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔

اپنے مُحسنوں اور عنایت فرماؤں کا شکریہ مُصنّف کے لیے ہمیشہ سعادت و مسرّت کا مُوجب رہا ہے۔ دیباچہ تحریر کرنے کے بعد بھی بعض احباب نے اِس کتاب کی طباعت و تکمیل میں اِعانت فرمائی۔ مصنّف اِس عزیز فہرست میں بڑی مسرّت کے ساتھ مہر محمّد صاحب (ساکن لاوا، ضلع اٹک) اور سیّد انور حسین نفیسؔ رقم صاحب سیالکوٹی کا اضافہ کرتا ہے۔ مہر محمّد صاحب نے سنگسازی کی پڑتال میں نہایت قابلِ قدر مدد دی اور اپنے عزیز وقت کا بڑا حصّہ بڑے انہماک کے ساتھ صرف کیا۔ نفیس رقم صاحب نے سرورق کے صفحات اور آیات و اشعار، نیز نقشوں کے اسما کی کتابت میں بڑے ذوق سے حصّہ لیا اور ان کی مہارتِ فن اور نفاستِ قلم نے کتاب کے حُسن میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اِسی طرح محترمی پروفیسر شیخ محمّد ناظر صاحب، بی اے آنرز (لندن)، پی ای ایس I ریٹائرڈ، سابق پرنسپل، سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کا شکریہ بھی واجب ہے، جن کی عنایت سے بعض نہایت نادر اور اہم نقشے دیکھنے میں آئے، جن سے اِن نقشوں کی تیاری میں قابلِ قدر مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ موصُوف کو عِلمی خدمت کے لیے طویل حیات اور صحت عطا فرمائے! اسی طرح میں اپنے عزیز و مخلص دوست جناب لالا نُور محمّد صاحب کا بھی ممنون ہُوں کہ اُنھوں نے کتاب کی تیاری

میں مدد دی اور لاہور کے قیام میں میری رفاقت فرمائی۔ جَزَاہُ اللّٰہُ خَیْرًا!

اندازہ ہے کہ دُوسرا حصّہ زیادہ ضخیم ہوگا۔ وُہ بیعتِ امامت کے بعد سے معرکۂ بالاکوٹ اور شہادت تک کے حالات پر مشتمل ہوگا۔ اِس کتاب کا ایک اہم حصّہ سیّد صاحبؒ کے اوصاف و اخلاق اور صفات و خصُوصیّات کا باب ہے، جو خاصی تفصیل کے ساتھ مرتّب کیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ آپؒ کے تجدیدی و اصلاحی کارنامے، آپؒ کی جماعت کی سیرت و اخلاق، خُلفا اور اہلِ اِرادت پر مستقل ابواب ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ سے اُمید اور اپنا اندازہ ہے کہ دُوسرے حصّے کی طباعت میں زیادہ تاخیر نہیں ہوگی اور یہ حصّہ توفیقِ الٰہی سے رجب ۱۳۷۸ھ (جنوری ۱۹۵۹ء) میں شائع ہو جائے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالیٰ

اللّٰہ تعالیٰ اِس سعی کو قبُول فرمائے اور اس کے مصنّف، اُس کے معاونین اور کتاب کے پڑھنے والوں کو اُس حلاوتِ ایمانی اور حمیّتِ اِسلامی کا کوئی حصّہ عطا فرمائے، جو صاحبِ سیرت، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ! کی زندگی کا جوہر اور اُن کے رفقا کی متاعِ گراں مایہ تھی!

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

۱۸/۴۸، ایمپرس روڈ، لاہور
۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۷۸ھ
(۲۶ ستمبر ۱۹۵۸ء)

ابوالحسن علی
کان اللّٰہ لہٗ